# امداد الاحکام

## امداد الفتاویٰ کا تکملہ

جو سنہ ۱۳۳۲ھ کے بعد کے فتاویٰ پر مشتمل ہے

تالیف


حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا عبد الکریم گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ


زیر نگرانی

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ


ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی

پوسٹ کوڈ : ۷۵۱۸۰

امداد الاحکام

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (القرآن)

اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔ (بیان القرآن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# فہرست امداد الاحکام جلد چہارم

## کتاب الھبۃ

صفحہ

| صفحہ | عنوان |
|---|---|
| | **کتاب الإکراه** |
| ۵۱ | اکراہ علی التزکیل بالنکاح باطل ہے ............ |
| | **کتاب الامارة و السیاسة** |
| ۶۲ | حضرت تھانوی کی تحریر بابت حمایت خاکسار ان و مسلم لیگ ............ |
| | **کتاب الدعوی و الشهادات و القضاء** |
| ۶۳ | مجلس قضاء کے بغیر شہادت شرعاً معتبر نہیں ............ |
| ۶۵ | دو گواہ عورتوں کے درمیان تفریق کرنے کا حکم ............ |
| ۶۶ | شاہدان طلاق اگر مدت طویل گزر جانے کے بعد گواہی دیں تو ان کی شہادت معتبر نہیں ............ |
| ۶۹ | حکم کے فیصلہ کر دینے کے بعد کسی ایک فریق کو رجوع کرنا جائز نہیں ............ |
| ۷۰ | مشرک عورت ایک مرد مسلمان کے پاس رہی دونوں سے بچے بھی پیدا ہوئے اور عورت نے اسلام بھی بظاہر قبول نہ کیا اب عورت اپنے مسلمان ہونے اور مسلمان کی بیوی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ |
| ۷۳ | زوجہ کی وفات کے بعد اس کے ورثہ اور زوج میں ایک قطعہ زمین پر اختلاف ہونے کا حکم جبکہ وہ قطعہ زوجہ کے نام پر ہو ............ |
| ۷۴ | زوجہ کی وفات کے بعد اس کے ورثہ اور زوج میں ان زیورات پر اختلاف کا حکم جو شوہر نے نکاح کے وقت بیوی کو دیئے تھے ............ |
| ۷۵ | زوجین کے منکر طلاق ہونے کی صورت شہادت طلاق معتبر ہے یا نہیں اور شہادت میں گواہوں کی تاخیر کرنے کا حکم ............ |
| ۷۸ | باوجود بینہ کے مدعی علیہ کا قسم کھانا ............ |
| ۸۰ | دعویٰ کے اندر شاہد اور مدعی میں تاریخ کے اندر اختلاف یا تردد ہو جانے کا حکم ............ |
| ۸۱ | نکاح خواں کی شہادت قبول کرنے میں تفصیل ہے ............ |
| ۸۴ | جو احکام تحت القضاء و عمل نہیں ان کا حوالہ ............ |
| ۸۴ | زوجہ ثانیہ کا اس رقم کا دعویٰ کرنا جو اول کے گھر کے دور ہونے کی وجہ سے کرایہ میں صرف ہوئی ہے ............ |

| صفحہ | عنوان |
| --- | --- |

# کتاب القصاص والدیات



# کتاب الحدود والتعزیرات



# کتاب الاقرار والصلح



# کتاب الوکالۃ والکفالۃ

| عنوان | صفحہ |
| --- | --- |



# کتاب الشفعۃ



# کتاب المزارعۃ و المساقاۃ

| عنوان | صفحہ |
|---|---|
| **کتاب الصید والذبائح والاضحیۃ والعقیقہ والختان** | |

## کتاب الحظر و الاباحة

## باب الرّشوة و الهدايا و الضيافات

# باب الأكل و الشرب

| عنوان | صفحہ |
| --- | --- |


## باب التداوی

| عنوان | صفحہ |
| --- | --- |

# کتاب اللباس و الزینة

## باب اللعب و الغناء و التصاویر

| عنوان | صفحہ |
| --- | --- |


## معاملات المسلمین باہل الکتاب والمشرکین

| عنوان | صفحہ |
| --- | --- |

# کتاب المتفرقات

## كتاب الوصية

## کتاب الفرائض

# كتاب الهبة

**هبہ میں عوض لینے کے بعد اس کی بیع کرنا صحیح نہیں، اور رجوع عن الھبہ کے لئے قضاء قاضی شرط ہے**

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ مندرجہ ذیل میں کہ زید ششش قطعہ مکانات کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، بوجہ ملکیت خود زید نے اپنے رشتہ داروں کو ششش قطعہ مکانات زبانی ہبہ کر دیئے، اور اسی وقت مبلغ پانچ سو روپیہ بعوض ہبہ زید کے رشتہ داروں نے زید کو دیا، اور زید نے اس کو قبول ومنظور کر لیا، اور تقسیم کر کے مکانات قبضہ مالکانہ میں دے دیئے، بعد وفات زید از موہوب لہما جائیداد موہوبہ اس کے ورثہ کے قبضہ میں آگئی، ورثہ نے چند اپنے حصص ایک دوسرے سے تبدیل کر لئے اور یہ انتقال جائیداد واہب کی حیات میں ہوا شہادت کافی شمول مثل موجود، بعد چند روز زید نے تاکید دستاویز ہبہ نامہ مرتب کرادی، اور دستاویز کے مضمون اول میں یہ عبارت ہے (بصحت ہوش وحواس وثبات عقل بلا اکراہ واجبار غیرے مع اس کے تمامی حقوق داخلی وخارجی شرعیہ کے ہبہ کر دیئے یعنی بخش دیئے)۔

مضمون دوم میں یہ عبارت ہے۔

(تاحیات خود من معترقابض ودخیل ہوں، اور بعد فوتی میری مسماتان کے قبضہ مالکانہ میں رہیں گے۔)

آخری دستاویز کی یہ عبارت ہے۔

(یہ ہبہ صحیح وشرعی جائز ونافذ خالی شروط مفسدہ سے بتراضی متعاقدین واقع ہوئی، اور مکانات موہوبہ کو قبضہ مالکانہ میں دے دیئے، اب میں یا میرے کوئی بھی ولی وارثان ورثا قائم مقامان وجانشینان نسبت مکانات موہوبہ کچھ کسی قسم کا حق ودعویٰ کریں تو باطل و

ناجائز ونا مسموع متصور ہوں)

دستاویز ھبہ نامہ میں معاوضہ پانچ صد روپیہ تقسیم مکانات موھوبہ کا تذکرہ نہیں ہے، اول زبانی ھبہ ہوا، اس پر اعتبار کیا جائے گا یا دستاویز ھبہ نامہ پر؟ جو بعد چند روز بنا بر تائید معاہدہ زبانی مرتب ہوئی، اگر دستاویز ھبہ نامہ تحریر ہو یا نہ ہو، تو زبانی ھبہ جو پہلے ہو چکا ہے وہ با اثر ہے، تو زید ایسی صورت میں مکانات موھوبہ کو قبل استرداد عمل قانونی و شرعی کے بیع کرسکتا ہے، یا بعد استرداد؟ اگر حسب عمل قانونی و شرعی زید نے ھبہ نامہ کو مسترد نہ کرایا تو ایسی صورت میں لیے مکانات موھوبہ و مقبوضہ موھوب الیھا کو کس خریدار کے نام بیع کرسکتا ہے یا نہیں؟

محمد عبداللہ خان، بھوپال

## الجواب

قال فی العالمگیریۃ: لیس لہ حق الرجوع بعد التسلیم فی ذی الرحم المحرم وفیما سوی ذلک لہ حق الرجوع إلا أن بعد التسلیم لا ینفرد الواھب بالرجوع، بل یحتاج فیہ إلی القضاء او الرضاء، وقبل التسلیم ینفرد الواھب بذلک، ھکذا فی الذخیرۃ،

وفیہ ایضا، أما العوارض المانعۃ من الرجوع فانواع: ومنھا خروج الموھوب عن ملک الموھوب لہ بأی سبب کان من البیع والھبۃ ونحو ھما، وکذا بالموت، لأن الثابت للوارث غیر ما کان ثابتا للمورث، إلی أن قال: ومنھا العوض اھ وفیہ أیضا، ولا یرجع فی الھبۃ من المحارم بالقرابۃ، کالآباء والأمھات وأن علوا، والأولاد وإن سفلوا، وأولاد البنین والبنات فی ذلک سواء، وکذا الأخوۃ والأخوات والأعمام والعمات الخ (ج ۵ ص ۳۸۵)

صورت مسئولہ میں زید نے جن رشتہ داروں کو اپنے مکانات ھبہ کئے ہیں اگر وہ ذی رحم محرم[1] ہیں، تو اس صورت میں خود محرمیت مرجوع فی الھبہ سے مانع ہے بعد تسلیم

---

[1] ذی رحم محرم میں اصول و فروع اور اولاد ذکور و اناث کی اولاد، اور بھائی بہن، اور ان کی اولاد، اور چچا پھوپھی سب داخل ہیں، مگر چچا پھوپھی کی اولاد محرم نہیں ۱۲ منہ

نے، اور اگر وہ ذی رحم محرم نہیں ہیں، تو جب بھی زید کو اس ہبہ میں رجوع کا حق نہیں، کیونکہ اس نے پانچ سو روپے بعوض ہبہ کے موہوب لہم سے وصول کر لئے ہیں، اور عوض لے لینا اجنبی سے بھی مانع رجوع ہے، رشتہ داروں سے بطریق اولیٰ۔

باقی اس عوض کا تذکرہ دستاویز میں نہ ہونا کچھ مضر نہیں، جبکہ شہادت سے کافی ثبوت ہو، اور اگر موہوب لہم محارم بالقرابت بھی نہیں، اور پانچ سو روپیہ بعوض ہبہ دیئے جانے کا بھی ثبوت شرعی نہیں، تو اس وقت یہ حکم ہے کہ جو موہوب لہ فوت ہو گیا ہے، اور اس کا حصہ اس نے ورثہ کو پہنچ گیا ہے، اس میں تو زید کو کسی طرح حق رجوع نہیں، اور جو موہوب لہ زندہ ہے، اس کے حصہ میں بھی زید خود رجوع نہیں کر سکتا، بلکہ قضاء قاضی یا موہوب لہ کی تراضی ضروری ہے، لیکن اگر درحقیقت اس نے ہبہ کا عوض وصول کیا ہے، تو ثبوت بہم نہ پہنچ سکے، تو اس صورت میں دیانۃً زید کو رجوع فی الہبہ حرام اور باعث گناہ شدید ہے۔ واللہ اعلم

۲۰ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۳۱ھ

## ہبہ فرضی اور ہبہ مشاع کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ عمر نے ایک مشترکہ جائیداد غیر منقسمہ کہ جس میں دیگر برادر و برادرزادگان اور ہمشیرہ اور پھوپی کا حصہ شریک تھا، ۱۸۹۲ء میں اپنے ذاتی اغراض و مصالح وقتی کی وجہ سے فرضی طور پر چند روز کے لئے دفع الوقتی کے طریقہ پر حصہ ۸/ کا داخل خارج سرکاری کاغذات تحصیل میں، جس کو زمانہ اکتیس سال کا ہوا، بذریعہ ہبہ زبانی اپنے نابالغ پسر زید کے نام بولایت خود کرا دیا، جبکہ اس کارروائی داخل خارج کا حال سن کر شرکاء مذکور لمعترض ہوئے، تو عمر نے جملہ شرکاء سے اس کارروائی کا راز صاف طور پر ظاہر کر کے ذکر کیا کہ چند روزہ فرضی طریقہ پر کارروائی داخل خارج عمل میں لائے گئے ہیں، محل اعتراض نہیں ہے، اور اگر کوئی اندیشہ آپ شرکاء کو اس کی بابت ہے تو اب جلد سے جلد میں پھر اس فرضی کارروائی داخل خارج کو واپس کئے لیتا ہوں، چنانچہ عمر نے دوسرے سال ۱۸۹۳ء میں جس کو تیس سال کا ہوا، بذریعہ درخواست محکمہ تحصیل سے کارروائی داخل خارج واپس لے کر پھر اپنے مشترکہ جائیداد

کا داخل خارج بدستور سابق اپنے نام کرالیا، اور مالکانہ قابض و متصرف جیسا کہ ہمیشہ سے تھا رہا، اور تا ایں دم ہے، بعد واپسی داخل خارج فوراً ہی ہر دو برادران خالد و عمر میں باصرار گفتگو تقسیم جائیداد مذکور شروع ہوگئی، چونکہ پھوپی بیوہ اور لاولد تھیں، اور بجز مذکورہ برادر زادگان خالد و عمر کے کوئی وارث شرعی ان کا نہ تھا، اور خورد و نوش بھی پھوپی موصوفہ کے ہر دو برادر زادگان خالد و عمر کے ساتھ ہمیشہ سے شریک تھا، بروقت تقسیم جائیداد اپنا حصۂ شرعی خالد و عمر کے حق میں بخوشی چھوڑ کر دست کش ہوگئیں: بعد اس کے ہمشیرہ ہندہ نے بھی اپنا شرعی حصہ جائیداد مذکور کا بلا کسی دباب کے بطیب خاطر خود اپنے برادران خالد و عمر کو دے دیا، اور وہ بھی دست کش ہوگئیں، آخر کار ۱۸۹۸ء میں خالد و عمر نے جائیداد مذکور باہم نصفا نصف بذریعہ عدالت تقسیم کر کے مالکانہ قابض و متصرف ہوگئے، چنانچہ اس عرصہ تیس سال میں بہت سے انتقالات رہے و بیع جائیداد مذکور ظہور میں آئے، تا ایں دم ہوتے رہے، تقریباً سات آٹھ انتقالات رہے و بیع جائیداد مذکور اس وقت سے آج تک عمر کے مالکانہ طریق پر بلا شرکت غیرے و مساہمت احدے کے، حتی کہ واقع ۱۷ر اکتوبر ۱۹۲۲ء جس کو زمانہ ایک سال نو ماہ کا ہوا، اسی جائیداد سے ایک موضع بضرورت خود، اور بغرض ادائے قرضہ ذاتی فروخت کیا، کوئی مخالفت اور کسی قسم کا کوئی عذر زید کی جانب سے نہیں ہوا، اب عمر کے بسبب اپنی پیرانہ سالی اپنی جائیداد مذکور کو وقف لوجہ اللہ کر کے اپنے ورثۂ شرعی کا حسب حصص شرعی گزارہ مقرر کیا، عمر کے ورثۂ شرعی دو پسر اور ایک دختر ہے، زوجۂ اول متوفیہ کے بطن سے زید اور ہندہ ہیں، اور زوجۂ ثانیہ متوفیہ کے بطن سے بکر ہے، اور اس وقت زید کی عمر چالیس سال کی ہے، اب تحریر وقف لوجہ اللہ کے وقت بسبب اغوا چند برادران یوسف زید عذر دار ہے کہ جائیداد مذکورہ کا داخل خارج ۱۸۹۴ء میں جو ایک سال کے لئے زید کے نام رہا خواہ وہ کسی نوع پر رہا، لہٰذا جائیداد مذکورہ سب مجھ زید کو ملنا چاہیئے بکر برادر مختلف البطن کو گزارہ نہ دیا جائے، کیونکہ جائیداد مذکورہ میں صرف مجھ زید کا حق ہے، زید کا مقصد اصلی اس عذر سے صرف اس قدر ہے کہ بکر کو گزارہ نہ دیا جائے۔ اور وہ محروم کیا جائے، پس اس بارے میں محقق علماء کرام احکام شرع شریف کے موافق جیسا حکم فرمائیں گے اس کی تعمیل کی جائے گی۔ بینوا توجروا؟

## الجواب

چونکہ عمر نے اس بات کا اقرار شرکاء کے سامنے کرلیا تھا کہ اس نے جو داخل خارج بذریعۂ ھبہ اپنے پسر زید کے نام کیا ہے، وہ کارروائی محض فرضی تھی، اس لئے وہ ھبہ قابل اعتبار نہیں۔

فقد صرح فی شرح الأشباہ، أن الھزل مبطل للھبة للاصح لو صدق الموھوب له، (ص۲۵) وقلت: وقد وجد تھا التصدیق من الموھوب له بسکوته عند بیع عمر أرضاً من الموھوب لأداء دینه، والسکوت فی مثل ذلك اقرار، کما صرح فی الشامیة نقلاً عن الأشباہ، سکوته عند بیع زوجته أو قریبه عقاراً إقرار بأنه لیس له علی ما افتی به مشایخ سمرقند، خلافاً لمشایخ بخارا، قال: لکن المتون علی الأول اھ (ج ۲ ص۶۸۹)

دوسرے وہ ھبہ اس حالت میں ہوا تھا کہ عمر کا حصہ دوسرے شرکاء کے حصہ سے ممتاز نہ تھا، اور وہ داخل خارج زمین مشترک پر واقع ہوا تھا، جس میں دوسرے شرکاء کا حصہ بھی ھبہ ہوگیا تھا، اس لئے بھی وہ ھبہ قابل اعتبار نہیں۔

قال فی الھندیة فی شرائط صحة الھبة وأن یکون الموھوب مقسوماً إذا کان مما یحتمل القسمة، وأن یکون الموھوب متمیزاً عن غیر الموھوب، ولا یکون متصلاً ولا مشغولاً بغیر الموھوب، ومنھا أن یکون مملوکاً للواھب، فلا تجوز ھبة مال الغیر بغیر إذنه، لاستحالة تملیك ما لیس بمملوك للواھب، بدائع اھ (ج ۵ ص۳۷۸)

لہٰذا زید کی ذمہ داری بناء بر اس ھبہ سابقہ کے محض لغو ہے، البتہ اس واقعہ میں یہ بات قابل تنبیہ ہے کہ پھوپی اور ہمشیرہ اپنے حق سے عمر اور خالد کے حق دستکش ہوئی تھیں اس دستکشی سے ان کا حق ساقط نہیں ہوتا بلکہ بدستور باقی رہتا ہے۔

قال فی الاشباہ: ولو قال الوارث ترکت حقی لم یبطل حقه، إذا الملك لا یبطل بالترك،

پس پھوپی اور ہمشیرہ کا حق خالد و عمر کی ملک جب ہوسکتا ہے جبکہ انہوں نے ان کے

باتو اپنا حصہ بیع کردیا ہو، یا ہبہ کردیا، مگر صحت ہبہ کے لئے تقسیم املاک شرط ہے اور ہبہ مشاع درست نہیں، اور صورت مذکورہ میں اول تو ہبہ نہیں ہوا صرف دست کشی ہوئی ہے جو لغو ہے اور ہبہ بھی ہوا تو مشاع کا ہوا جو درست نہیں۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

سنہ ۱۳۴۸ھ

### تحقیق ہبہ مکان وچھت وغیرہ وہبۂ علو بدون سفل؟

سوال:- حضور والا مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، عریضہ سابق میں جو مکان بنوانے کی بابت دریافت کیا تھا، اسی کے متعلق یہ عرض ہے کہ جس جگہ پر میرا قصد کمرہ بنوانے کا ہے، وہ دالانوں کی چھت ہے، در صورت ہبہ قبضہ کی کیا صورت ہوگی، جب تک کہ اس پر کچھ عمارت نہ بن جائے اور ہبہ کرنے کا طریقہ یہی ہے یا کچھ اور، کہ مالک زمین جناب والا صاحب قبلہ یہ فرمادیں، کہ فلاں فلاں زمین میں تجھ کو ہبہ کرتا ہوں، اور میں منظور کرلوں۔ اور اس پر قبضہ کرلوں، اس کی ضرورت نہیں کہ ہبہ تحریری ہو، محض زبانی بھی کافی ہے، اگر اس زمین کو خرید لیا جائے، تو بھی ایک بیع نامہ لکھنا ضروری ہے یا صرف دو چار مردوں اور عورتوں کے سامنے زبانی بیع بھی کافی ہوگی، چونکہ یہ نیچے والے دالانوں اور کوٹھریوں کی چھت ہوگی، اور ان دالانوں اور کوٹھریوں کی اندرونی چھت میں جو کڑیاں لگی ہیں، وہ بعض یا کل جب ناقابل استعمال ہوجائیں، تو ان کی مرمت اور درستی کس کے ذمہ ہوگی، جو زمین ہبہ یا بیع ہوگی وہ چھت کا محض اوپری حصہ ہوگا اور دراصل تمام چھت پر اوپر رہنے بسنے کا اثر ہوگا، یہ تفصیلات اس لئے دریافت کرتا ہوں، کہ معاملہ میں کسی جزو میں شرعاً گنہگار نہ ہوں، اور نہ کوئی نقصان مالی ہوجائے، جب تک پورا اطمینان نہ ہوجائے ہاتھ نہ ڈالا جائے، عریضہ سابق بھی ہمراہ اس عریضہ کے ارسال خدمت ہے۔

راقم

قاسم علی سیتاپور

۴ رمضان المبارک

سنہ ۱۳۴۳ھ

## الجواب

قال فی الدر: وصح بیع حق المرور تبعاً للأرض بلاخلاف ومقصود اوحدہ فی روایۃ وبہ اخذ عامۃ المشائخ، شمنی اھ قال الشامی قال السائحانی: ھو الصحیح وعلیہ الفتوی مضمرات: والفرق بینہ وبین حق التعلی حیث لایجوز ھو ان حق المرور حق یتعلق برقبۃ الارض، وھی مال ھو عین، فما یتعلق بہ لہ حکم العین اما حق التعلی فتعلق بالہواء، وھو لیس بعین مال اھ فتح (ج ۴ ص۱۴۳)

وفی الدر ایضاً: فی اٰخر کتاب الحقوق، نعم ینبغی ان تکون الھبۃ و والنکاح، والخلع، والعتق علی مال کالبیع، والوجہ فیھما لایخفی، اھ
صورت مسئولہ میں حق تعلی کی بیع نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ حق مجرد ہے، جس کا تعلق عین سے نہیں، بلکہ ہوا سے ہے، اور اگر حق تعلی کی بیع مع السقف ہو، تو گو بظاہر یہ مثل بیع الطریق مع الارض ہے، مگر پھر بھی دونوں میں فرق ہے، کیونکہ بیع الطریق مع الارض میں زمین مستقل چیز ہے، اور سقف مستقل چیز نہیں، بلکہ متعلق بالجدران ہے، جو بدون ضرر کے ممکن التسلیم نہیں،

قال فی الھدایۃ: وبیع جذع فی السقف لأنہ لایمکن تسلیمہ إلا بضرر (أی فیفسد ۱۲)
لہٰذا سقف کی بیع نہیں ہوسکتی، لیکن درمختار کے ایک جزئیہ سے جواز ہبہ مفہوم ہوتا ہے
فانہ قال: تجوز ہبۃ حائط بین دارہ ودار جارہ لجارہ وہبۃ البیت من الدار فھذا یدل علی أن کون سقف الواھب علی الحائط، ولختلاط البیت بحیطان الدار لایمنع صحۃ الھبۃ، مجتبیٰ اھ (ج ۴ ص۷۱ مع الشامی)
میں کہتا ہوں کہ جب سقف واہب کے جدار پر ہونا مانع ہبہ جدار نہیں، تو جدار واہب کا تحت السقف ہونا مانع ہبہ سقف بھی نہ ہوگا، لاشتراک العلۃ بلکہ صورت ثانیہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہونی چاہیئے، کیونکہ جدار مشغول ہے اور سقف شاغل ہے اور ہبۂ الشغول میں تو نادر روایت عدم جواز ہے اور ہبۂ الشاغل کے جواز کو فقہاء تصریحاً لکھتے ہیں،

قال فی الدر: والاصل ان الموھوب ان مشغولاً بملك الواھب منع تمامھا وان شاغلا لا، اھ (ج ۴ ص۷۹۲ مع الشامی)
پس اگر باپ محض حق تعلّی کو ھبہ نہ کرے، بلکہ سقف کو ھبہ کر دے، تو ھبہ صحیح ہو جائے گا، اور اس صورت میں کڑیوں کی مرمت موھوب لہ کے ذمہ ہوگی، اور ھبہ کی صورت ایجاب وقبول اور قبض ہے، اور قبض کے لئے چھت پر کچھ سامان ڈالدینا کافی ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۱ر شوال ۱۳۴۳ھ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین، اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے اپنی کل جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ شوہر کے نام بذریعہ رجسٹری بیع کردی پوری قیمت پر لیکن زرثمن اس کا شوہر کو معاف کر دیا، یہ بیع ہندہ نے حالت علالت بعارضہ دق جو سالوں

بیوی نے مرنے سے تیرہ دن قبل جبکہ وہ دق کی مریضہ تھی، اپنی تمام جائیداد شوہر کے نام بذریعہ رجسٹری بیع کردی اور پوری قیمت شوہر کو معاف کردی تو معاف کرنا صحیح ہے یا نہیں، اور بیوی کے ورثاء کو اس جائیداد میں سے مل سکتا ہے یا نہیں؟

سے آرہا تھا کی ہے، بوجہ عارضہ کمزوری روز بروز بڑھتی گئی اور چلنے پھرنے سے مجبور ہوگئی، لیکن بعد کرنے بیع کے چلنا پھرنا موقوف ہوگیا، لیکن زندگی سے ناامیدی نہ تھی گو مرض مہلک ضرور تھا، بعد ہونے بیع ہندہ کو ولادت ہوئی، جو بچہ چھٹے مہینہ پیدا ہوا، چونکہ بچہ پورے دن گزرے نہ پیدا ہوا، اس وجہ سے دو گھنٹہ زندہ رہ کر قضا کر گیا، لیکن اس بچہ کے دن میں ولادت ہونے کی سبب ہندہ کو سرسام کا عارضہ پیدا ہوا، جو کہ تین دن جنون کی کیفیت طاری رہی آخرش اسی حالت میں انتقال کیا، بیع انتقال کے قبل ۱۳ دن ہوئی اور ولادت انتقال کے قبل ۳ دن ہوئی اب ہندہ کے اور وارثان اس کی جائیداد کے مستحق ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

آپ کا خادم
عبدالرؤف

## الجواب

صورت مسئولہ میں معاف کرنا کل زرثمن کا صحیح ہے۔

کما فی الدر المختار، والمقعد والمفلوج والمسلول إذا تطاول ولم یقعدہ فی الفراش کالصحیح، مجتبی۔ ثم رمز حد التطاول سنۃ (شامی ج ۵ ص ۶۲۶)

وفی العالمگیریۃ (ج ۲ ص ۲۲) والمقعدۃ والمفلوج والأشل والمسلول إذا تطاول ذلک فصار بحال لا یخاف منہ الموت فھو کالصحیح حتی تصح ھبتہ من جمیع المال، فلو صار صاحب فراش بعدہ صار بمنزلۃ حدوث المرض۔

پس ورثائ اس جائیداد میں کوئی استحقاق وراثت نہیں رکھتے، واللہ اعلم

الجواب صحیح

احقر عبدالکریم عفی عنہ

خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون

ظفر احمد عفا عنہ

۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ

**جن افعال یا الفاظ سے ھبہ یا بیع کا مفہوم ہونا مشکوک ہو ان سے ھبہ اور بیع کا ثبوت نہیں ہو سکتا،**

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں:۔ زید نے اپنی بہن و پھوپی کو مع ان کے شوہروں کے بوجہ قلت آدمیوں کے کہ ان کے پاس کوئی رہنے والا ایسا نہ تھا جس سے انس و تقویت ہو، اور زمین بہت سے افراط سے تھیں، مگر اس زمانے میں زمین کی قدر نہ تھی، یہاں تک جمع سرکاری بھی مشکل سے ادا ہوتی تھی ان رشتہ دار مذکور بالا کو زید نے اپنے پاس بلا لیا، اور وہ شامل ہی اپنا کاروبار چلاتے رہے، اور کھاتے پیتے رہے، اور زید نے اپنی زندگی ہی میں خواہ اپنے مورث اصلی کی جائیداد میں شریک سمجھ کر، یا دوست اور انیس جان کر اپنی کچھ مزروعہ زمین اور کچھ بنجر ان بہنوں کے شوہروں کے نام مکان سرکاری پہ موروثی کرا دی، اور یہ موروثیت ایسے وقت میں کرائی گئی کہ جب زید اور زید کے متعلقین خوب اپنے کاروبار میں ہوشیار ہو گئے،

اور اپنی جائیداد پر قابض ہو گئے۔ اس وقت ان بہنوں نے اور ان کے شوہروں نے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی تو زید نے کہا کہ ہم تمہارے نام بھی جائیداد اور گھر موروثی کے دیتے ہیں، وہاں جانے کی ضرورت نہیں، لڑکیاں اور ان کے شوہر راضی ہو گئے، اور سگان سرکاری پر زمین موروثی پر کرادی گئی، اور اس زمانہ میں لوگ بوجہ جہالت کے ھبہ وغیرہ کے مسائل سے ناواقف تھے، اور اب بھی اس خطہ میں ناواقفیت ہے، اور اور بیع وغیرہ کا خرچ بھی گوارا نہیں کرسکتے، بوجہ نقد کی قلت کے۔

اب ایسی صورت میں دریافت طلب امر یہ ہے، کہ یہ صورت بیع یا ھبہ یا وراثت کے قائم مقام ہو سکتی ہے یا نہیں جبکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ معطی کے ذہن میں ھبہ کا لفظ یا معنی تھے یا نہیں؟ اور لڑکیوں میں سے کوئی اپنے مورث کے مال میں حصہ کے مستحق ہوتی یا نہیں؟ چونکہ یہ پتہ نہیں کہ انتقال کس کا کب ہوا؟ اور اس ملک میں اکثر اس قسم کی موروثی بیع اور رہن کا حق بھی معطی اور معطی کے ورثہ جائز رکھتے ہیں، چنانچہ اس صورت میں بھی جس کے متعلق خاص سوال کیا گیا ہے، کئی پشتوں کے بعد اب لب کشائی کی گئی ہے ورنہ پہلے سے جیسے اصل مالک کو زمین کا مالک سمجھا جاتا ہے ان کو بھی زمین کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

عبدالمجید بچھرایونی

## الجواب

چونکہ ھبہ یا بیع عقود میں سے ہیں، جن کے لئے الفاظ موضوعہ قطعیۃ والدلالۃ کا ہونا شرط ہے، اور ایسے الفاظ یا افعال ثبوت ھبہ یا بیع کے لئے کافی نہیں جن سے ھبہ وغیرہ کا مفہوم ہونا مشکوک و محتمل ہو۔ اور جو لفظ اور عمل سوال میں مذکور ہے، اس کی دلالت ھبہ پر صریح نہیں، بلکہ نہایت مشکوک ہے، اس لئے اس سے ھبہ یا بیع کا ثبوت نہیں ہو سکتا، پس ضروری ہے کہ معطی کے ورثہ کو یہ جائیداد واپس کی جائے، یا کچھ دے دلا کر صلح کے ساتھ ان کو راضی کر کے اس زمین کو حاصل کیا جائے، بدون اس کے کوئی صورت نہیں، فان الیقین لا یزول بالشک۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون، ۱۷ جمادی الثانیہ ۱۳۴۶ھ

## ہبہ کی ایک خاص صورت کا حکم

سوال :- معروض خدمت والا آنکہ والدہ صاحبہ کو پندرہ سو روپیہ کی جائیداد والد صاحب کے ترکہ میں سے ملی ہے، اور ایک ہزار کی جائیداد اور ایک مکان نانا صاحب کے ترکہ میں سے ملا ہے، اور ہم لوگ چار بھائی اور دو بہنیں ہیں، مکان کی قیمت کم از کم اگر چھ سو روپے لگائی جائے، تو اس طرح کل جائیداد مع مکان کی قیمت اس وقت اکتیس سو روپیہ کی ہوئی، فرائض کی رو سے ہر بہن کا حصہ دس سہم میں ایک سہم قرار پاتا ہے، اس لئے ہر بہن کا حصہ ما۳۱ روپیہ کا ہوا، اب دریافت طلب یہ امر ہے، کہ والدہ صاحبہ چاہتی ہیں کہ محی الدین پور کی جائیداد کہ جو خود والد صاحب کے ترکہ میں سے ان کو ملی ہے اس کو ہم لوگوں کو ہبہ کر دیں، تاکہ اس میں ان کے بعد بہنیں نہ لے سکیں، جس کا اندیشہ بھی ہے، اور چاآل کا مکان اس لڑکی کو دے دیں جو چاآل میں منسوب ہے، اور یہ بھی چاہتی ہیں کہ گو ہم تملیکاً تم لوگوں یعنی لڑکوں کو جائیداد دے دیں، مگر بہتر ہے اس کی آمدنی سے ہماری خدمت کرتے رہو جس کی قوی امید ان کو اپنے لڑکوں سے ہے لیکن لڑکیوں سے نہیں ہے، کیونکہ وہ اختیار میں اپنے شوہر کے ہیں اس لئے دریافت فرماتی ہیں کہ اگر شرعاً کسی قسم کا مواخذہ نہ ہو تو محی الدین پور کی کل جائیداد، اور چاآل کی دو تہائی جائیداد لڑکوں کو ہبہ کر دی جائے، اور مکان چاآل کا، اور ایک تہائی جائیداد چاآل کی اپنے نام باقی رکھی جائے، تاکہ میرے بعد لڑکیاں اپنا حصہ لے سکیں، جبکہ مکان تو ایک بہن کو دے بھی دیا، اور یہ جائیداد ان کے شرعی حصے سے کہیں زائد ہے، کیونکہ دونوں لڑکیوں کا حصہ شرعاً ۲۶۲ عـ۱۱ روپیہ کا ہوتا ہے، اور مکان اور ایک تہائی جائیداد جو چھوڑی جاتی ہے، اس کی قیمت یعنی نو سو تینتیس روپیہ تک ہے، ایک بہن کو کل مکان دینے کے بعد بھی دوسری بہن کا حصہ شرعی یعنی ما عـ۱۱ روپیہ بلکہ زائد کی جائیداد باقی رہتی ہے۔ والسلام مع الاکرام

از خادم احقر محمد عیسیٰ

## تنقیح

جو جائیداد وہ اپنے نام رکھنا چاہتی ہیں، وفات کے بعد اس میں لڑکوں کا حق بھی ثابت ہوگا، حیات میں لڑکوں کو ہبہ کرنے سے ان کا حق اس قدر سے ساقط

نہ ہوگا، جو وفات کے وقت ان کی ملک رہے گا، اور اس صورت میں لڑکیوں کو بہت کم ملے گا، اور خلاف عدل لازم آئے گا، اور والدین پر اولاد کے ھبہ میں تسویہ، یا للذکر مثل حظ الانثیین مامور بہ ہے، اس لئے یہ صورت مناسب نہیں، بلکہ جس طرح وہ لڑکوں کو اسی وقت ھبہ کر رہی ہیں، اسی طرح لڑکیوں کو بھی ھبہ مع القبض کردیں اور ان کی اجازت سے مکان وجائیداد کی آمدنی سے منتفع ہوتی رہیں، یا کل جائیداد مکانات کو وقف علی الاولاد للذکر مثل حظ الانثیین بشرط انتفاع واقف وقف کردیں، اس میں کوئی خدشہ نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون
۱۷ شعبان ۱۳۴۷ھ

## ھبۂ مشاع کا حکم

سوال ۹: جب والد صاحب مرحوم کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنی زرعی اور سکنی جائیداد، یعنی گاؤں اور مکانات کے پانچ وارث چھوڑے، (۱) جلیل احمد (۲) سعید احمد (۳) ابوالقاسم (۴) اتقیا بیگم۔ (۵) احمدی بیگم۔ جلیل احمد اور سعید احمد حقیقی بھائی، اور ابوالقاسم سوتیلے بھائی، یہ تینوں بھائی متوفی کے پسر تھے اور اتقیا بیگم متوفی کی زوجہ ہیں جن کے بطن سے ابوالقاسم مذکورہ بالا تھا، احمدی بیگم متوفی کی والدہ تھیں، اور جلیل احمد وسعید احمد وابوالقاسم کی دادی تھیں۔

بعد انتقال متوفی یعنی والد صاحب مرحوم منشی حافظ مصلح الدین احمد خان صاحب یہ جائیداد مشترکہ کبھی تقسیم نہیں ہوئی، اور نہ بٹوارہ ہوا، بلکہ یکجائی رہی، اور اس جائیداد کا کام یعنی تحصیل وصول کا میں (یعنی جلیل احمد) اور سعید احمد کرتے تھے، والد صاحب کے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد ہمارے سوتیلے بھائی یعنی ابوالقاسم کا انتقال ہوگیا، والد صاحب کے انتقال کے بعد ہر شخص کا حصہ جائیداد میں اس کا نام قانونی طریقہ سے پڑ گیا تھا، موافق شرعی سہام کے جب ابوالقاسم کا انتقال ہوا، تب بھی شرعی اور قانونی اصول سے اس میں تبدیلی ہوگئی، یعنی ابوالقاسم کا نام کاٹ دیا گیا، اور اس کے بجائے اس

کے ورثہ کا نام چڑھا دیا گیا، والد صاحب کے انتقال کے بعد جب ابوالقاسم کا انتقال ہو چکا اور جائیداد اب بھی یکجائی اور مشترک تھی، اور ہم دونوں بھائی یا ہم دونوں بھائیوں سے ایک ہی جائیداد کا کام کرتا تھا، باقی نام ہر وارث کا اس کے حصہ جائیداد میں پڑا ہوا تھا، کہ اسی زمانہ میں ہم دونوں بھائیوں کی دادی جو اب بھی ہیں مسماۃ احمدی بیگم جو کہ والدہ اور شرعی وارثہ تھیں۔ متوفی کی انہوں نے (اپنی جائیداد کا) یہ کیا کہ موضع ایواڑہ ضلع بلند شہر میں اور موضع قطب پور ضلع علی گڑھ (ان کی کل) زرعی جائیداد کا، اور خاص شہر علی گڑھ میں ان کی سکنی جائیداد کا جو کچھ حصہ تھا وہ کل کا کل ہم دونوں بھائیوں کے نام منیف جلیل اور سعید احمد کے نام (اس وقت ابوالقاسم کا انتقال ہو چکا تھا البتہ ابوالقاسم کی والدہ زندہ تھیں، انہوں نے دادی صاحبہ کے اس فعل پر کچھ اعتراض نہیں کیا، کیونکہ دادی صاحبہ نے اپنا ہی حصہ ہم کو ھبہ کیا تھا) ھبہ کر دیا، بذریعہ ھبہ نامہ رجسٹری شدہ، وہ دادی صاحبہ اب بھی زندہ ہیں، اس ھبہ کو سات سال کے قریب ہو چکے، ان کے حصہ کی ہم ہی تحصیل کرتے اور اپنے خرچ میں لاتے ہیں۔ تو اب یہ ھبہ صحیح ہوا یا نہیں؟ اور ہم ان کی جائیداد کے مالک ہوئے یا نہیں؟ اور جو کچھ روپیہ ان کی جائیداد سے اس ھبہ کے بعد ہم نے وصول کیا آیا ہم اس روپیہ کے مالک ہیں یا نہیں؟ شبہ یہ ہوتا ہے کہ مشترک جائیداد زرعی کا ھبہ بغیر تقسیم کے صحیح نہیں ہوتا، اگر ھبہ صحیح نہیں ہوا تو اس کی صحت کی کیا صورت کی جائے؟ کیونکہ تقسیم میں تو بڑی دقت اور کچھ نقصان بھی ہے یعنی تقسیم کے اندر خرچہ کافی پڑے گا۔ اور کسی وارث کو اس ھبہ پر اعتراض بھی نہیں۔

اگر یہ ھبہ صحیح نہیں ہوا تو اب تک جتنا روپیہ کل مشترکہ جائیداد میں سے بقدر دادی صاحبہ کی حصہ کے ہم نے وصول کیا ہے، کیا ہم اس کے ذمہ دار ہیں دادی کو بعد اس ھبہ کے؟

اب قابل غور یہ امر ہے کہ دادی صاحبہ نے اپنے حصہ کو ہم دونوں بھائیوں کے نام ھبہ کیا، اور ہم دونوں بھائی دوسری جائیداد میں شریک ہیں اور غالباً دادی صاحبہ کے جائز وارث بھی ہیں اور ھبہ سے پہلے بھی، اور ھبہ کے بعد بھی اس کل جائیداد پر متصرف ہیں، اگر یہ ھبہ صحیح نہیں ہوا تو کیا یہ ترکیب ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں بھائی ایک قلیل رقم مثلاً دس روپیہ کی دادی صاحبہ کو دے کر کہیں کہ آپ اپنا حصہ ان دس روپیوں میں ہم کو بیع کر دیجئے کیونکہ بیع تو بغیر تقسیم کے صحیح نہیں ہے؟

## الجواب

اصل مذہب ھبۃ المشاع المنقسم میں یعنی ایسی چیز کے ھبہ جو قابل تقسیم ہے، اور تقسیم کر کے ھبہ نہیں کئے گئے) یہی ہے کہ ھبہ فاسد ہے مگر ایک روایت یہ ہے کہ فساد ھبہ اس وقت ہے جبکہ اجنبی کو ھبہ کیا جائے، اور شریک جائیداد کو ھبہ بدون تقسیم کے بھی صحیح ہے، اور بعض نے اس کو مختار بھی کہا ہے۔

قال فی الدر: وفی الصیرفیۃ عن العتابی، وقیل یجوز لشریکہ، وھو المختار

اھ ج ۴ ص ۵۰۹۔

مگر یہ قول ظاہر مذہب کے خلاف ہے، اس لئے بدون مجبوری کے اس پر عمل درست نہیں، اور غالباً آج کل تقسیم جائیداد میں جس قدر خرچ اور پریشانی ہوتی ہے وہ مجبوری اور دشواری کی حد میں داخل ہے، اس لئے اس صورت میں اگر اس روایت پر عمل کر کے شریک کے لئے ھبہ بدون تقسیم کے صحیح کہا جائے تو گنجائش ہے، اور قبضہ کے بعد اس کو مفید ملک کہا جائے گا، لیکن بہتر یہ ہے کہ آئندہ کے لئے یا تو جائیداد تقسیم کرلی جائے یا اس کا بیع نامہ کرلیا جائے اور بیع زبانی بھی کافی ہے، تحریر کی ضرورت نہیں، اور پھر ھبہ زرثمن کو معاف کردے، یا زرثمن اس قدر قلیل رکھی جائے جس کا ادا کرنا دشوار نہ ہو، اور گذشتہ مدت وصول کردہ سے بھی واھب کی معافی و اجازت حاصل کرلی جائے تاکہ قطعاً روایت مشہورہ کے موافق بھی سبکدوشی ہو جائے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

۲۳ شوال سنہ ۱۳۴۶ھ

### ملک غیر کا ھبہ درست نہیں اور مرض الموت میں بدون قبضہ موھوب لہ ھبہ کی ایک صورت کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ میاں عبدالرحیم خان و عبدالعزیز خان ساکنان قصبہ کیرانہ تا ہم علاتی بھائی تھے، اور اپنے باپ پیر خان کے مرنے پر ان کے ترکہ کے وارث ہوئے تھے، ان میں سے عبدالرحیم خان نے جو معاش

کا کام سیکھ گیا تھا، اس نے باپ کے متروکہ احاطہ خام میں ایک پختہ مکان تیار کر لیا۔ اور عبدالعزیز خان بدستور سابق اسی احاطہ کے ایک کچے مکان میں سکونت پذیر رہا، کچھ عرصہ بعد عبدالرحیم خان مذکور فوت ہو گئے، جس کی زوجہ اس کی زندگی ہی میں فوت ہو چکی تھی، صرف ایک بیٹا "اللہ دے خان" اس نے چھوڑا تھا جو اس کا وارث ہوا، مگر اس کی شادی تھانہ بھون میں ہوئی تھی، اور وہاں ہی اس کی ملازمت کا سلسلہ ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے باپ کا بنا ہوا مکان اپنے چچا عبدالعزیز خان کی تحویل میں دے کر تھانہ بھون ہی رہتا رہا، جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

وارث ایک بیوہ (بہار افزا خانم) دو لڑکے (شریف احمد کمال و صغیر احمد خان) اور ایک لڑکی (شریفہ خانم) اس نے چھوڑے ہیں، بچے تینوں نابالغ ہیں۔ اور ان کی والدہ بہار افزا خانم ان کی پرورش کر رہی ہے۔ اب عبدالعزیز خان بھی لاولد فوت ہو گیا ہے، زوجہ اس کی حیات ہی میں مر چکی تھی، اللہ دے خان کی اولاد کے سوا کوئی عزیز قریب اس کا نہیں تھا۔ مگر اس نے مرض الموت میں مبتلا ہونے پر ایک غیر شخص عمر خان کو اپنا پروردہ ظاہر کیا۔ اور ایک دستاویز ہبہ نامہ اس کے حق میں لکھ کر رجسٹری کرا دی، جس میں صرف اپنا ہی حصہ ہبہ نہیں کیا، بلکہ اللہ دے خان کے باپ کا بنایا ہوا مکان بھی عمر خان کو دے دیا، مگر رجسٹری کے بعد جب تک وہ زندہ رہا بدستور سابق اسی مکان میں اس کی سکونت رہی، اور اسی میں فوت ہوا۔ اور رجسٹری کے لئے وہ اپنے مکان سے تحصیل جانے کا قابل نہ تھا اور اسی مرض میں ان کا انتقال بھی ہوا، اس کے علاوہ مرنے سے کچھ دن پہلے اس کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی، اور اس نے چند اشخاص سے استدعا کی کہ اس دستاویز سے اصل وارثوں کی حق تلفی ہوئی ہے، اور مجھ کو لوٹ لیا گیا ہے، لہٰذا وہ دستاویز عمر خان سے واپس دلا دی جائے؛ لیکن عمر خان کے آنے کے پیشتر انہیں الفاظ کے تکرار کرتے کرتے اس کی جان نکل گئی۔ اب عمر خان خود کہتا ہے کہ اگر شرعاً کوئی حق اللہ دے خان کے بچوں کا ہو تو وہ ان کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتا۔ ایسی صورت میں امور ذیل کے متعلق حکم شرعی سے آگاہی بخشی جائے۔

(۱) عبدالعزیز خان کی متذکرۃ الصدر کارروائی کا اثر صرف اسی کے ذاتی حصہ پر عائد ہوگا یا عبدالرحیم خان کے حصہ پر بھی؟ جس کی اولاد موجود ہے؟

۲۔ اگر صرف عبدالعزیز خان ہی کے حصہ پر اس کارروائی کا اثر پڑے گا تو وہ دستاویز ھبہ نامہ جو حالت مرض الموت میں رجسٹری کرائی گئی، عبدالعزیز خان کے پورے حصہ میں مؤثر ہوگی یا اس کے کسی جزو پر؟

۳۔ اگر عبدالعزیز خان کی اس دستاویز کا اثر عبدالعزیز خان کے حصہ کے کسی جزو پر پڑے گا، تو اس کو چھوڑ کر مابقی ترکہ عبدالعزیز خان کے جائز حقدار کون اشخاص ہوں گے۔

بینوا توجروا اجرکم اللہ

## الجواب

ملک غیر کا ھبہ کسی طرح بھی درست نہیں، نہ شرعاً، نہ عرفاً، نہ قانوناً، پس عبدالرحیم خان کے حصہ کو عبدالعزیز خان کا عمر خان کے نام ھبہ کرنا بالکل لغو و باطل ہے ہاں: عبدالعزیز کا یہ ھبہ اس کی مملوکہ میں ثلث کے اندر صحیح ہو جاتا، اگر موہوب کو ھبہ کے وقت تقسیم کر کے موہوب لہ کے قبضہ میں دے دیا جاتا، اور جب عمر خان نے عبدالعزیز خان کی حیات میں قبضہ نہیں کیا۔

کیونکہ موہوب مقسوم و مفرز نہیں، تو یہ ھبہ نامہ عبدالعزیز خان کے حصہ میں بھی صحیح نہیں ہوا، بلکہ اب یہ سب مکانات اللہ دے اور عبدالعزیز کے ورثہ کے ہیں، یعنی اللہ دے کی اولاد کے، کیونکہ اس کے بعد وارث کوئی نہیں۔

قال فی الدر: وھبتہ ووقفہ کل ذلک حکمہ وصیۃ فیعتبر من الثلث

قال الشامی: وھبتہ أی إذا اتصل بھا القبض قبل موتہ، أما إذا مات ولم یقبض، فتبطل الوصیۃ، لأن ھبۃ المریض ھبۃ حقیقۃ، وإن کانت وصیۃ حکماً، صرح بہ قاضیخان وغیرہ اھ (ج ۴ ص ۶۶۸)

واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۸ ربیع الاول ۱۳۴۹ھ

### ھبہ فاسدہ کی ایک صورت

سوال:۔ کسی نے اپنے پوتے کو اپنی زمین ھبہ کر دی بعوض اس کے کہ جب تک واھب یا واھب کی بیوی یا ان میں سے کوئی ایک زندہ رہیں، کل سالانہ غلہ اس موہوبہ کا انھیں کو ملے گا کیا

یہ ہبہ صحیح ہوا؟ اور عوض کا دینا موہوب لہ پر واجب ہوگا؟ کیا اس پر قاضیخان کی یہ عبارت "رجل وهب لرجل أرضاً، وسلمها إليه، وشرط أن ينفق الموهوب له على الواهب من الخارج، كانت الهبة فاسدة"۔ صادق آئے گی؟ واضح رہے کہ اس ہبہ میں بشرط العوض کا ذکر ہے۔

سائل ..........

## الجواب

ہاں: یہ ہبہ فاسد ہے، جیسا کہ قاضی خان کے قول سے معلوم ہوا بشرطیکہ یہ باغ کی زمین نہ ہو، بلکہ زراعت کی زمین ہو، عالمگیریہ ج ۵ ص ۳۹۲، اور اس کو ہبہ بشرط العوض صحیح کہنا غلط ہے، کیونکہ عوض معدوم ومجہول ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ۔ از تھانہ بھون

۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۹ھ

### بیٹے کو تعمیر مکان کے لئے زمین دینا ظاہر عرف میں اس کو ہبہ کرنا ہے دلیل ہبہ نہیں۔

سوال:۔ مسئلہ ذیل میں حکم شرعی سے مطلع فرمایا جائے: سنہ ۱۹۰۶ء سے کچھ عرصہ قبل والد صاحب مرحوم کا زیور طلائی ونقرہ چوری ہو گیا، اور بعد کو پتہ چلا کہ ایک شخص نے عزیزوں ہی میں سے لے لیا تھا، چوری کرنے والے کے والد سے جب کہا سنا گیا، تو انہوں نے اپنا مکان اس کے عوض میں دینے کو کہا، چوری شدہ زیور قیمت میں مکان سے بہت زیادہ تھا، لیکن چونکہ ان کے پاس اور کچھ تھا ہی نہیں، اس لئے والد صاحب مرحوم نے اسی کو منظور کر لیا، اور صورت اس کی یہ قرار پائی کہ مکان کا رھن نامہ بالعوض کچھ روپیوں کے لکھ دیا جائے، اور بعد ختم میعاد ادائگی دین اس پر قبضہ تحریر کر دی جائے۔ جیسا کہ نقل رھن نامہ سے ظاہر ہوگا، رجسٹری سرکاری ہو گئی، یہ دستاویز والد صاحب نے میرے نام لکھوائی، میری عمر اس وقت چار برس کی ہو گئی، اور مضمون رہن نامہ محض فرضی تھا محض روپیہ وصول کرنے کی ایک صورت تھی، چنانچہ مالک مکان نے کئی برسوں کے بعد سکونت اس مکان کی ترک کر دی، اور اس پر والد صاحب کا قبضہ رہا، اور مالک مکان کے وارثوں میں سے کسی نے کبھی دعوی نہیں کیا، بڑے ہو کر مجھ کو

اس کا علم ہو کہ مکان میرے نام سے ہے، لیکن تاحیات دستاویز رھن نامہ والد صاحب نے اپنے ہی پاس رکھا، اور اس کو اپنی ہی ملک سمجھتے رہے۔ امور دریافت طلب یہ ہیں:۔

۱۔ منشی رجب علی صاحب جنہوں نے رھن نامہ لکھا تھا، مکان شرعی تقسیم کی رو سے نہیں پایا تھا، اور نہ اس زمانہ میں اس خاندان میں مکانات کی شرعی تقسیم ہوئی تھی جس نے جہاں بنالیا وہیں رہنے لگے، اور وہی اس کے حصہ میں آگیا، چنانچہ ان کو بھی اجازت دے دی گئی تھی کہ اپنے رہنے کے لئے مکان بنالیں، رجب علی صاحب کے والد نے جو زمین کے مالک تھے رجب علی کو اجازت مکان بنانے کی دی تھی، اور جب رھن نامہ کی رجسٹری ہوئی تب کسی دوسرے عزیز نے عذرداری بھی نہیں کی کہ زمین ان کی ملکیت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان کو حق اس بات کا تھا یا نہیں کہ اس مکان کو علیحدہ کرسکیں؟ خواہ رھن یا بیع کے ذریعہ سے؟

۲۔ یہ مکان ملک جناب والد صاحب مرحوم کی ہوگی یا میری؟ دستاویز میں نام میرا ہی ہے، لیکن ۱۹۴۲ء تک جب تک والد صاحب زندہ رہے، مکان سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں رہا۔

۳۔ عرصہ دس بارہ سال سے یہ مکان بالکل گر گیا ہے، صرف زمین باقی رہ گئی ہے دوسرے اعزا جن میں رجب علی صاحب مرحوم کی اولاد شامل نہیں ہے، یہ دعوی کرتے ہیں کہ رجب علی صاحب کو مکان بنانے کی اجازت دی گئی تھی، اور مکان اب رہا نہیں، لہذا یہ زمین تمام عزیزوں میں تقسیم ہونا چاہئے۔ رھن نامہ میں مکان مع زمین تحریر ہے اور تحریر و رجسٹری کے وقت یہ اعزا موجود تھے، کسی نے بھی عذرداری نہیں کی تھی ایسی صورت میں رھن نامہ میں زمین شامل سمجھی جائے گی یا نہیں؟

"نقل رھن نامہ رجسٹری شدہ سرکاری"

منکہ شیخ رجب علی ولد شیخ خادم علی ساکن: قصبہ سندیلہ: محلہ جھتوانہ ضلع ہردوئی کا ہوں جو کہ فی الحال ضرورت خود یعنی کدخدائی دختر خود ایک منزل مکان پختہ وخام مع اراضی متعلقہ آن موقوعہ محلہ جھتوانہ مسکونہ و مملوکہ و مقبوضہ خود بحدود ذیل بالعوض مبلغ پچاس روپیہ نصف جس کے مبلغ پچیس روپیہ ہوتے ہیں، بلا سود پاس شیخ ثامن علی والد شیخ ضامن علی حقانی ساکن قصبہ سندیلہ، محلہ جھتوانہ ضلع ہردوئی، رھن دکھل یک مشت مرتھن سے وصول پاکر اپنے تحت و تصرف میں لایا، اقرار یہ کہ بمدت پانچ سال روپیہ مذکورہ خواہ بدفعات: خواہ یک مشت حوالہ مرتھن کرکے مکان اپنا فک رھن کرلوں گا،

اور در صورت خلاف وعدہ کے مرتھن کو اختیار ہے کہ بعد انقضاء میعاد مذکورا لصدر مکان مرھونہ پر دخل وقبضہ اپنا کرلیں گے، مجھ راھن کو کچھ عذر نہ ہوگا۔ حد شرقی (مرود مکان مرھونہ) حد غربی (مرود کوچہ نافذہ) حد جنوبی (مرود مکان مرھونہ) حد شمالی (مکان شیخ حسن عطا)۔ لہٰذا یہ چند کلمات بطور رھن نامہ لکھ دیئے کہ سند رہے، بروقت کام آئے۔

المرقوم ۹ راکتوبر ۱۸۹۲ء بقلم حسن عطا رہوازی، ساکن سندیلہ ضلع ہردوئی

العبد: رجب علی بقلم خود۔

گواہ شد: سید محمد ذکی ولد سید شرافت علی مخدوم زادہ

گواہ شد: طالب علی بقلم خود۔

گواہ شد: سید محمد تقی بقلم خود

احقر شیخ ناصر علی

۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ

## الجواب

۱۔ باپ جس زمین میں بیٹے کو مکان بنانے کی اجازت دیتا ہے، ظاہر عرف یہ ہے کہ یہ زمین بیٹے کو ھبہ کردیتا ہے، اس لئے جب تک اس کے خلاف کوئی صریح دلیل نہ ہو اس زمین ومکان کو رجب علی مرحوم ہی کی ملک مانا جائے گا۔

۲۔ کسی کے نام زمین نامہ لکھ دینا دلیل ھبہ کی نہیں، اس لئے جب تک اس کے علاوہ کوئی دلیل ھبہ کی نہ ہو، اس مکان کو والد کی ہی ملک مانا جائے گا۔

۳۔ محض ان اعزہ کا قول دلیل نہیں ہوسکتا، جب تک اس کا کوئی ثبوت نہ دیں کہ رجب علی کے باپ نے زمین ان کو ھبہ نہ کی تھی۔ فقط

ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ

**رجوع فی الھبہ کی ایک صورت کا حکم**

سوال:- مسماۃ دلن نے اپنا مشترک مشاع حصہ زمین مرود عمر کا اپنی ماں کو جو کہ اس

ملکیت میں حصہ اُسے بھی ہبہ کیا، اور سرکاری رجسٹری کرا کر دفتر میں اس کا نام داخل کرا دیا چند برس وہ موہوب لہ اس حصہ کی پیدائش پر قابض رہی، پھر اس موہوب لہ نے وہ حصہ اپنے باپ کو فروخت کرکے سرکاری نام داخل کرا دیا۔ چند برسوں سے وہ مشتری بھی فوت ہوگیا ہے۔ اس کی اولاد اس حصہ پر قابض و متصرف ہے کہ مشاع پیدائش سے حصہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ اب وہ واہبہ مسماۃ ربل رجوع کرنا چاہتی ہے، کیا اس کا رجوع صحیح ہے یا نہیں؟

غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہبہ مشاع فاسد ہے، مگر قبض سے مفید ملک ہوجاتا ہے جیسا کہ بیع وغیرہ۔ اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟ اور لائق فتویٰ وعمل ہے یا نہیں؟ اور ایک روایت میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہبہ مشاع شریک کو صحیح ہے، یہ بھی مفتی بہ ہے یا نہیں؟

اگر مسماۃ ربل کا ہبہ مشاع فاسد ہے تو چونکہ قبض اور تصرف اس میں چند برسوں سے جاری ہوگیا ہے، تو اب اس کو حسب فتویٰ حق رجوع ہے یا نہیں؟ اور موہوب لہا اس کی محرم ماں ہے، اور خود اس ملکیت شریک بھی ہیں۔ اگر اس کا رجوع صحیح ہے تو اتنے برسوں کی پیدائش جو موہوب لہ اس کی ماں اور مشتری اس کے نانا، اور اب مشتری کی اولاد لڑکے جو اب پیدائش اٹھاتے رہتے ہیں، ان میں سے کسی سے لے سکتی ہے یا نہیں؟ اور مشتری نے جو قیمت دی تھی، اب وہ مشتری کی اولاد کس سے لیویں یعنی واہبہ سے جو رجوع کرتی ہے یا موہوب لہ سے جس نے مبلغ لیے، اور حصہ فروخت کیا، یا جو اتنے سال جو پیدائش اٹھائی ہے، اس قیمت میں محسوب ہوگی، اور چونکہ پیدائش انہوں کے یعنی مشتری کے خرچ اور سعی سے ہوتی تھی، کیا وہ حق ان کا ہے یا اب تک واہبہ کا ہے؟ یا اس میں بھی غصب کی طرح حکم ہے کہ مشتری اپنا خرچ اور حق کمائی کا لے کر باقی صدقہ کرے، اور رجوع کی صورت میں قیمت بھی موہوب لہا یا واہبہ سے لے؟

جیسا حکم ہو تحریر فرمائیں۔

## الجواب الاول من جامع امداد الاحکام

صورت مسئولہ میں واہبہ کو حق رجوع نہیں ہے، کیونکہ قبض سے وہ حصہ موہوب لہ ملک میں آگیا ہے، اور اس کے بعد جب اس نے بیع کردی، اور اپنی ملک سے نکال دیا تو

ھبہ کا حق رجوع باطل ہوگیا ہے۔

فان من موانع الرجوع تصرف الموھوب لہ فی الموھوب بھبۃ أو بیع ونحوھما، کذا فی العالمگیریۃ۔ ط

اور ھبۃ المشاع للشریک میں بعض کا فتویٰ صحت ھبہ پر ہے۔ اور یہ احقر بھی بعض دفعہ اس پر فتویٰ دیدیتا ہے، واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون
۱۴ / رجب ۱۳۳۸ھ

نوٹ:۔ سائل نے مسئلہ مذکورالصدر کو مکرر دوسری جگہ سے زبان فارسی میں دریافت کیا، وہ سوال وجواب بعینہٖ مذکور ہے۔

۔ استفتاء ۔

مساۃ ربل حصہ مشترکہ خود از زمین برائے مادر خود ھبہ کرد و مادرش نیز در آں زمین حصہ می داشت، و دفتر سرکار انگریزی بنام مادر واھبہ ثبت شد، چند سال موھوب لھا از آں حصہ منافع می گرفت، و قابضہ بود، و اولاد مشتری بر زمین موھوب قابض و متصرف شدند، بعد از آں واھبہ مساۃ ربل رجوع را خواہش دارد، آیا در ایں صورت رجوع واھبہ درست است یا نہ؟ بینوا توجروا

الجواب الثانی من مولوی غلام نبی
مدرس مدرسہ قاسم العلوم گھوٹکی

مساۃ ربل در ایں صورت رجوع می تواند، بلکہ ایں در حقیقت رجوع نیست، زیرا کہ رجوع صحت ھبہ می خواہد، و ھبہ در ایں صورت صحیح نیست، نزد امامنا الاعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ و تصرف موھوب لھا کہ بطریق بیع و ھبہ واقع شدہ بہ غیر صحیح واقع شدہ و مثل ایں چنیں تصرفات مانع از رجوع نمی شود، و آں چہ در فتاویٰ ھندیہ آمدہ است "فان من موانع الرجوع تصرف الموھوب لہ فی الموھوب بھبۃ أو بیع ونحوھما" ۔ در ھبہ صحیح است، و در ایں صورت استفتاء ھبہ فاسد است زیرا کہ ھبہ مشاع فیما یقسم است، و کتب ظاہر روایت مشحون ست، بفساد ھبہ مشاع فیما یقسم

ط ھندیۃ ج ۴ ص ۳۸۴، باب الخامس فی الرجوع فی الھبۃ۔

چنانچہ در ہدایہ گفتہ۔

ولا تجوز الهبة فيما يقسم إلا محوزة مقسومة، ولو وهب شقصاً مشاعاً فالهبة فاسدة۔

و در کنز الدقائق کہ مشتمل بر ظاہر الروایۃ ست، وارد ساخت، وتصح في محوز مقسوم ومشاع فيما لا يقسم، لا فيما يقسم۔

و صاحب بحر در تحت ایں عبارت نوشتہ:۔

وقيد المشاع بما لا يقسم لأن هبة المشاع الذي تمكن قسمته لا يصح وإطلاقها فشمل الهبة من الشريك مشاعاً،

ونیز صاحب بحر آوردہ است در تحت ایں عبارت کنز،

فإن قسمه وسلمه صح، أفاد أنه لو قبضه مشاعاً لا يملكه لئلا ينفذ تصرفه فيه، لأنها هبة فاسدة مآلاً، وهي مضمونة بالقبض، ولا تفيد الملك للموهوب له، وهو المختار فلو باعه الموهوب له لا يصح۔

و ہمچنیں در فتوی خیریہ آوردہ:۔

ولا تفيد الملك في ظاهر الرواية، قال الزيلعي، ولو سلمه شائعاً لم يملكه، حتى لا ينفذ تصرفه فيه، فيكون مضموناً عليه، وينفذ فيه تصرف الواهب، ذكره الطحاوي، والقاضي خان اه مختصراً،

و امام محمدؒ در مبسوط کہ از کتب ظاہر الروایۃ ست تصریح کردہ،

لو وهب نصف داره من آخر، وسلمه إليه، فباعها الموهوب له لم يجز.

ایں عبارت امام محمدؒ دلالت واضح دارد کہ موہوب لہ مالک نمی گردد، زیرا کہ بیع بعد القبض، غیر جائز گفت، حاصل ایں کہ نقول درباب بسیار ست کہ ایں اصل مذہب ست و آنچہ در بعض روایت آمدہ کہ مشاع مفید ملک ست، فتوی بعض مشائخ ست، نہ اصل مذہب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پس چگونہ بفتوی بعض مشائخ اصل مذہب را گذشتہ شود، و عمل بفتوی بعض مشائخ کردہ شود؟ با وجودیکہ اصحاب فتوی اکثر ایشاں نیز فتوی باصل مذہب دادہ، و ظاہر روایت را معمول بہا ساختہ، چنانچہ صاحب ہدایہ و قاضی خان و طحاوی کہ صاحبان ترجیح اند، و صاحب فتوی خیریہ، و زیلعی و صاحب بحر کہ

از محققین حنفیہ ست، و صاحب نور العین الزام این کرد فتوی بفتوی معارض شد و اصل مذہب باقی ماند بلا معارض۔

پس فتوی باصل مذہب مقصد امام صاحب را لازم ست در این چنین صورتیکہ فتوی اہل فتوی مختلف باشد۔ و در توافق اصل مذہب کبار و محققین حنفیہ باشد،

واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ فقط

حررہ غلام نبی جلال آبادی

مدرس اول مدرسہ قاسم العلوم

واقع گھونٹی ۔۔۔ ،،

## الجواب الثالث

من مولوی محمد قاسم، متوطن گرونی، من مضافات سست ۔۔۔

قال فی رد المحتار فی کتاب الهبة تحت قول الدر " وسلمه شائعاً لا يملكه فلا ينفذ تصرفه فيه " قال فی الفتاوى الخيرية : ولا تفيد الملك فی ظاهر الرواية، قال الزيلعي : ولو سلمه شائعاً لا يملكه، حتى لا ينفذ تصرفه فيه، فيكون مضموناً عليه، وينفذ فيه تصرف الواهب ذكره الطحاوي وقاضي خان، وروى عن ابن رستم مثله، وذكر عصام أنه تفيد الملك، وبه أخذ بعض المشائخ ، ه، ومع إفادتها الملك عند هذا البعض اجمع الكل على أن للواهب استردادها في الموهوب له، ولو كان ذا رحم محرم من الواهب قال في جامع الفصولين رامزا الفتوى الفضلي ثم إذا هلكت أفتيت بالرجوع للواهب هبة فاسدة لذي رحم محرم منه، إذ الفاسدة مضمونة على ما مر، وإذا كانت مضمونة بالقيمة بعد الهلاك كانت مستحقة الرد قبل الهلاك ولما يكون للواهب الرجوع فيما يكون هبة فاسدة فلورثته نقضه، لأنه مستحق الرد، ومضمون بالهلاك، ثم رفق المقرون ان القضاء يتخصص، فإذا ولى السلطان قاضياً ليقضي بمذهب أبي حنيفة، لا ينفذ قضائه بمذهب غيره لأنه معزول عنه بتخصيصه، فالتحق فيه بالرعية،

نص على ذلك علمائنا رحمهم الله تعالى اه ما فى الخيرية. وافتى به فى الحامدية ايضاً، والتاجية، وبه جزم فى الجوهرة والبحر، ونقل عن البتغى (بالغين المعجمة) أنه لو باعه الموهوب له لا يصح۔

وفى نور العين عن الوجيز، الهبة الفاسدة مضمونة بالقبض، ولا يثبت الملك فيها إلا عند أداء العوض، نص عليه محمدؒ فى المبسوط وهو قول أبى يوسفؒ، إذ الهبة تنقلب عقد معاوضة اه وذكر قبله هبة المشاع فيما يقسم لا تفيد الملك عند أبى حنيفةؒ، وفى القهستانى، لا تفيد الملك، وهو المختار كما فى المضمرات، وهذا مروى عن أبى حنيفةؒ وهو الصحيح اه فحيث علمت أنه ظاهر الرواية نص عليه محمدؒ، وروى عن أبى حنيفةؒ ظهر أنه الذى عليه العمل، وإن صرح بأن المفتى به خلافه ولا سيما أن يكون ملكاً خبيثاً كما يأتى. ويكون مضموناً كما علمته. فلم يجد نفعاً للموهوب له، فاغتنمه، وإنما اكثرت النقل فى مثل هذه لكثرة وقوعها، وعدم تنبيه اكثر الناس للزوم الضمان على قول المخالف، ورجاء لدعوة نافعة بالخير انتهى۔

وايضاً قال فى رد المحتار تحت قوله فى البزازية، ونص فى الاصل أنه لو وهب نصف دار من آخر وسلمها إليه، فباعها الموهوب له لم يزل أنه لا يملك، حيث ابطل البيع بعد القبض. ونص فى الفتاوى أنه هو المختار الخ هذا هو ظهر لى فى هذا الباب، والله اعلم بالصواب۔

حررہ الفقیر محمد قاسم

المتوطن فی گڑھی یٰسین مہر

الجواب الرابع ثانیاً من جامع امداد الأحكام

---

میں اپنے پہلے جواب سے جو شعر اس کا ہے کہ واہب ہبۂ فاسدہ کو بعد تصرف موہوب لہ ظاہر روایت میں بھی حق رجوع نہیں، رجوع کرتا ہوں، اصل مذہب اور ظاہر روایت کے موافق وہب ہبۂ فاسدہ کو ہمیشہ حق رجوع حاصل ہے، البتہ اس

روایت کی بنا پر جس میں ہبۃ المشاع للشریک جائز قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کو کبھی صاحب در نے ہوالمختار سے تعبیر کیا ہے، جو جواز افتاء کے لئے عند الضرورت کافی ہے، صورت مسئولہ ہبہ فاسدہ کی نہیں تو قبض و تصرف کے بعد واہب کو رجوع کا حق نہ ہوگا،

هذا هو الذى اردت به الافتاء فى الجواب، ولكن لم أصرح به كما ينبغى ولم أذكره أول الباب، فتبادر من كلامى انقطاع حق الرجوع على ظاهر الرواية۔

اس کے بعد تمام مفتیوں کو اس باب میں غور کرنا چاہیئے کہ جائیداد مرزوعہ پر قبضہ کی حقیقت کیا ہے۔ میرے خیال میں کسی شخص کو یہ معلوم ہوجانا کہ فلاں فلاں نمبر زمین کا میرا ہے اور اس کے نام داخل خارج کاغذات مال میں ہوجانا قبض عقار کے لئے کافی ہے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، ورنہ اراضی مقبوضہ کا تحقق بہت کم ہوگا۔ وفيه من الحرج ما لا يخفى۔ پس جن اصحاب فتوی نے صورت مسئولہ میں فساد ہبہ کا فتوی دیا ہے، ان کو یہ تحقیق کرلینا چاہیئے کہ صورت مسئولہ میں واہب اور موہوب لہ کے نمبر ہائے زمین ممتاز ہوکر موہوب لہ کے نام ان نمبروں کا داخل خارج ہوگیا تھا یا نہیں؟ اگر ہوچکا تھا تو یہ موہبہ ظاہر روایت پر بھی موہبہ فاسدہ نہیں۔ ولم اتنبه عن ذلك لعدم الحاجة إليه فتأتى بالرواية الثانية۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ

۱۰؍ شعبان ۱۳۴۸ھ

**مسئلہ ہبہ** سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ :-

۱؎ زید نے اپنے انتقال پر اپنے وارثوں دو لڑکے ایک لڑکی نابالغان، اور باپ اور بیوی کو چھوڑا، باپ نے کل اپنا حصہ جو کہ زید کے ترکہ میں اس کو پہنچتا تھا، زید کے بقیہ حصہ داروں کو دے دیا۔ اور یہ بات چند آدمیوں کے علم میں بھی آگئی۔ چنانچہ تقسیم جائیداد ثالث نے زید کے باپ کا حصہ بقیہ وارثوں میں لگا کر سرکاری کاغذات میں درج کرادیا، اور اس بات کا زید کے باپ نے بارہا اقرار بھی کیا۔

نمبر ۲: لیکن جو مال بصورت نقد تھا ثالث سے تقسیم ہونے سے رہ گیا بلکہ جہاں بقیہ وارثوں کا روپیہ تجارت میں لگا ہوا تھا وہیں لگا رہا، اور اس بات کا کسی کو علم بھی نہ ہوا، چنانچہ اس واقعہ سے پانچ برس بعد زید کا باپ حج بیت اللہ کو جانے لگے، چلتے وقت یہ بھی کہہ جاتا ہے کہ آپ نے اپنا کل حصہ تم سب کو دیا، لیکن اب گیارہ برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد جب اس کو علم ہوا ہے کہ جو روپیہ نقد تھا، وہ سب وارثوں کو نہیں پہنچا بلکہ صرف دو وارثوں کے پاس ہے، تو وہ اپنا کل حصہ جو نقد روپیہ کا تھا واپس لینا چاہتا ہے سب وارثوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہے لہٰذا جواب مرحمت فرمایا جائے کہ اس کو واپس لینے کا شرعی حق حاصل ہے یا نہیں؟

السائل: انوار

الجواب وهو الموافق للصواب

۱: جائیداد کا ہبہ مشہور قول پر تو صحیح نہیں ہوا، مگر امام عتابی[1] کے قول پر صحیح ہو گیا،

لما في الدر: فإن قسمه وسلمه صح لزوال المانع، وقال العلامة الشامي رحمه الله تحت قوله (فإن قسمه) أي الواهب بنفسه، أو نائبه أو أمر الموهوب له بأن يقسم مع شريكه كل ذلك تتم به الهبة، كما هو ظاهر لمن عنده أدنى تفقه، اهـ شامي (ج ۴ ص ...)

قلت: زوال الشيوع من بين الأملاك الموهوب لهم، وأما الشيوع بين الواهب والموهوب لهم فهو باق، وهو يمنع من الهبة، ولكن فيه اختلاف، في الصيرفية عن العتابي

وهذا القول وإن كان خلاف المشهور، ولكن مولانا العلامة التهانوي مد ظلهم العالي سوغ الأخذ هذه الرواية بعد التسليم شائعا

---

۱ (وهو الإمام العلامة الزاهد المنعوت زين الدين، أحد من سار ذكره من تصانيفه الكبار شرح الزيادات المشهور رواه عنه جماعة، منهم حافظ الدين وشمس الأئمة الكردري وغيرهما ا ه الجواهر المضية ۲ ص ...)

وقيل يجوز لشريكه، وهو المختار (در ص ...)

بالضرورة وكثرة ابتلاء الناس، وفي قلعهم عن العادة حرج كما هو الظاهر۔

۲:- اور نقد کا ھبہ صحیح نہیں ہوا، اور زید کے والد کو حق ہے کہ وہ کل روپیہ خود وصول کرے اور خود رکھے۔ جن کے پاس وہ روپیہ ہے ان کو کہنا جائز نہیں۔

كما في الدر المختار: وأما تمليك الدين من غير من عليه الدين فإن أمر بقبضه صحت لرجوعها إلى هبة العين۔ وفي رد المحتار تحت جواب عن سوال مقدر وهو أن تقييده بالعين مخرج لتمليك الدين من غير من عليه الدين، مع أنه هبة، فيخرج عن التعريف. فأجاب بأنه يكون عيناً مالاً، فالمراد بالعين في التعريف ما كان عيناً حالاً أو مالاً، قال بعض الفضلاء، ولهذا لا يلزم إلا إذا قبض، وله الرجوع قبله، فلو منعه حيث كان بحكم النيابة عن القبض اھ (ج ۴ ص ۵۱۲)

قلت والقبض في الواقعة المسئولة عنها كان شائعاً، فلم يصح القبض، كما هو مصرح في الدر المختار، ونصه هذا :- (وهبة مشاع لا يملكه) الخ

تنبیہ:- جائیداد کے متعلق اس صورت میں ہے جبکہ تقسیم جائیداد حسی طور پر ہوتی ہو۔ اور اگر محض کاغذات میں تقسیم ہوئی، اور خارج میں جائیداد مشترک ہی رہی ہو تو جائیداد کا ھبہ بھی صحیح نہیں ہوا، واھب کو حق ہے کہ جائیداد بھی واپس لے لے، لأن الشيوع بين الموهوب لهم مانع، ورواية العتابي مخصوص بالشائع بين الواهب والموهوب له، فقط، والله أعلم بالصواب وإليه المرجع والمآب،

كتبه الاحقر عبد الكريم عفي عنه

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

مورخہ ۳۰ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ

**بیٹوں کو ھبہ بالعوض اور ورثہ کے لئے وصیت کا حکم**

سوال :- نحمدہ ونصلی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین صورت ذیل میں کہ زید نے اپنے مرنے سے پندرہ سال پیشتر اپنے کل مکانات مسکونہ وجملہ اثاث البیت اور متعدد اراضیات

مختصراً اپنے چار بیٹوں کے نام ھبہ بالعوض کردیئے، اور ھبہ نامہ بصورت رجسٹری مکمل اور دفتر سرکاری میں نام داخل و خارج ہوگیا، اور موہوب لہم کو قبضہ کرا دیا، چونکہ موہوب لہم اس پندرہ سال کی مدت میں بسلسلۂ ملازمت اپنی اپنی جگہ متعین رہے اس لئے بظاہر قبض و دخل جملہ جائیداد منقولہ و غیر منقولہ در جملہ انتظامات بابت حفاظت آمدنی اراضی مذکورہ زید کے ہاتھ رہا کئے۔ اسی سال زید نے بقیہ اراضی بذریعۂ ایک وصیت نامہ کے کردہ جس رجسٹری شدہ ہے، اپنی دو بیٹیوں اور زوجۂ ثانی اور تین محروم الارث ناتیوں کے نام بشرائط ذیل تقسیم کردی۔

(۱) شرط اول: میں جائیداد مذکورہ وصیت نامہ پر تاحین حیات قابض اور متصرف رہوں گا۔

(۲) شرط دوم: میرے مرنے کے بعد میری تجہیز و تکفین اور خیر و خیرات میرے بیٹے کریں گے، اور اس جائیداد کی ایک سال کی آمدنی میرے مرنے پر میرے بیٹے لینے کے بعد دوسرے سال موافق تقسیم وصیت نامہ ہر شخص اپنے اپنے حصہ پر قابض و دخیل ہو جائے گا۔

اب موصی لہم کو دو باتوں میں نزاع ہے۔

۱۔ امر اول یہ کہ وصیت نامہ کی شرط ثانی کی صحت سے انکار کرتے ہیں کہ اول تو "لا وصیة للوارث" حدیث ہے۔ اور اگر وصیت صحیح بھی ہو تو اس میں اس قسم کی شرائط کا لگا دینا تو ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا لہٰذا ہم ایک سال کا انتظار نہیں کرسکتے، بلکہ مرنے کے بعد ہی سے فوراً وارث ہیں۔ (موصی لہم)

۲۔ امر ثانی اراضی موجودہ ھبہ نامہ کی آمدنی کے بقدر حصہ وراثت ہم لوگ بھی مستحق ہیں۔ (حالانکہ زید نے وصیت اور ھبہ کی آمدنی کہیں الگ الگ نہیں رکھی بلکہ یکجائی رکھ کر اپنے اور اپنی اہلیہ اور بالائی شخص کی پرورش، اور دین لین اسی شخص سے کرتا رہا، اور موصی لہم میں سے کسی کسی کو بھی سالانہ کچھ کچھ دیتا رہتا تھا، اور ادھر ھبہ نامہ میں منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کو اپنے لڑکوں کے نام دے دیا تھا۔)

اب دو سوال ہیں (۱) اول یہ کہ صورت مسئولہ میں زید کو بعض وارثوں کے لئے اس شرط سے وصیت کر دینا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اگر مطابق "لا وصیة للوارث"

یہ وصیت نامہ ہی باطل ہے تو پھر زید کے یہ چار بیٹے اس جائیداد مندرجہ وصیت نامہ میں وارث ہوں گے یا نہیں۔

ثانیاً۔ آمدنی جائیداد ہبہ نامہ جو زید نے بحیثیت متقبلا نہ اپنے چار بیٹے (موہوب لہم) کے لئے بطور سرمایہ جمع کی ہے، اس میں موصی لہم کو حق وراثت پہنچتا ہے یا نہیں؟ واضح ہو کر موھوب لہم اپنی مالیت کے جو آج پندرہ سال سے جمع ہوتی رہی ہے، گاہ بگاہ کچھ کچھ لے کر اپنی اپنی جگہ جہاں وہ ملازم ہیں خرچ میں لاتے رہے۔ فقط بینوا توجروا۔

احقر العباد محمد ساجد
مقام ادرگاہ بازار
شہر کٹک (اڑیسہ)

## الجواب

زید نے جو زمین چار بیٹوں کے نام ہبہ بالعوض کی ہے، وہ تو اس کے بیٹوں کی ملک ہوگی، اور جو زمین بذریعہ وصیت نامہ کے بیٹوں اور زوجہ اور محروم الارث ناتیوں کے نام کی ہے، اس میں چونکہ بیٹیاں اور بیوی وارث ہیں، ان کے لئے وصیت باطل ہے، ہاں اس بقیہ جائیداد کے تہائی میں محروم الارث ناتیوں کے لئے وصیت صحیح ہے، اگر ان کے لئے تہائی کی یا اس سے کم وصیت کی ہو، فبہا، اور تہائی سے زیادہ کی ہو تو باطل ہے، جو بدون وارثوں کی اجازت کے صحیح نہیں ہو سکتی، اور اس بقیہ جائیداد کی دو تہائی میں چاروں بیٹے بھی وارث ہیں، اور بیٹیاں بھی، اور زوجہ بھی، اور جائیداد ہبہ نامہ میں اور اس کی آمدنی میں چاروں بیٹوں کے سوا کوئی حقدار نہیں، کیونکہ وہ ترکہ سے خارج ہے، جبکہ زید نے اپنی حیات میں اس کا مالک بیٹوں کو بنا دیا۔

(نوٹ) یہ جواب اس صورت میں ہے جبکہ وصیت نامہ میں بیع یا ہبہ کے الفاظ نہ ہوں، صرف وصیت ہی کا ذکر ہو، ورنہ وصیت نامہ کی نقل بھیج کر سوال دوبارہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون ۲۹ شوال ۱۳۴۹ھ

گورنمنٹ کی طرف سے معافی اور سکڑبری اراضی میں بڑے بیٹے کے نام ہونے کی شرط، اور اس میں سب ورثاء کا حقدار ہونا۔

سوال:- نہایت ادب سے گذارش ہے کہ فدویان ایک ایسی جگہ آباد ہیں جہاں جناب مولوی صاحبان کا کم گذر ہوتا ہے اس لئے ہم شرعی قواعد و قانون سے بے بہرہ ہیں، اس لئے حضور والا کو تکلیف دی جاتی ہے، امید کہ حضور غور فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

ایک باپ دادا کو گورنمنٹ کے عہد میں معافی یا سکڑبری اراضی عطا ہوئی، گورنمنٹ موجودہ کے قانون میں یہ مقرر ہے کہ تین پشت تک بڑے بیٹے کے نام ہوتی چلی آتی ہے اس لئے حضور بیان فرمائیں کہ ان تین پشتوں میں جو چھوٹے بھائی ہوئے ہیں، شرع کی رو سے ان کا حق اس اراضی میں تھا کہ نہیں؟

## الجواب

جب معافی یا سکڑبری اراضی گورنمنٹ کی طرف سے باپ دادا کو ہبہ کردی گئی اور انہوں نے اس پر قبضہ مالکانہ کرلیا، تو وہ ان کی ملک ہوگئی، اور ان کی وفات کے بعد تمام وارثوں کا حق اس میں جاری ہوگا، گورنمنٹ کی اس میں شرط فاسد لگانے سے دوسرے وارثوں کا حق باطل نہ ہوگا، تینوں پشتوں میں جو چھوٹے بھائی ہوئے ہیں، وہ بھی شرعاً ان معافی و اراضی میں بڑے بھائی کے برابر حقدار ہیں۔

کسی ایک بیٹے کو بے وجہ میراث سے محروم کرنا یا حصہ کم دینا

سوال:- ایک باپ کے تین لڑکے ہیں، بڑا لڑکا اپنے باپ کو ناخوش رکھتا ہے، باپ ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے، گھر در باہر روز روز جھگڑے ہوتے ہیں آخر کار یہی فیصلہ ہوا کہ بڑا لڑکا الگ ہو گیا، یعنی گھر میں جو چیزیں موجود ہیں ان کے چار حصے کئے گئے، یعنی تین لڑکوں کے، اور ایک خود باپ نے اپنا حصہ لیا، بڑا لڑکا شادی شدہ ہے، مگر دو چھوٹے لڑکے بغیر شادی شدہ ہیں، اس لئے باپ نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں لڑکوں کی شادی کے نام سے آٹھ سو روپیہ ٹھہر کر بڑے لڑکے سے چوتھا حصہ یعنی دو سو روپیہ لے لئے، اور زمین میں سے بڑے لڑکے کو حصہ نہیں دیا، باپ نے یہ فیصلہ درست کیا یا غلط؟

از ساکنان ۔ رفیع محمد خان، وقدیر خان پیلفنشر

## الجواب

باپ کو اپنی زندگی میں اختیار ہے کہ اپنی جائیداد جس بیٹے کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے، البتہ بلا وجہ کسی کو محروم کرنا یا کم دینا برا ہے۔ اور اگر وجہ معقول سے ایسا کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

خانقاہ امدادیہ، از تھانہ بھون

۱۹ ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ

**مسئلہ متعلق کتاب الھبۃ** | **سوال**:۔ حضرت اقدس مولانا ومقتدانا مدظلہم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عرض اقدس! بانسلاک عریضہ سابقہ مورخہ ۲ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ باادب عرض ہے کہ زید نے از قسم زیور توڑے اور کچھ اپنی زوجہ ھندہ کو دیا تھا، پھر اس سے معافی مہر پر خلع کیا، ھندہ نے مہر معاف کر دیا، مگر جاتے ہوئے زید نے اس سے زیور اور کچھ بھی لے لئے، اس کی نسبت یہ تصحیح صادر فرمائی گئی ہے کہ یہ زیور ھندہ کی ملک کر دیا گیا تھا، یا اس کو عاریۃً پہننے کو دیا تھا، جوابًا عرض ہے کہ ان دوا شیاء میں سے کچھ زید کی والدہ نے دیا تھا، اب نہیں معلوم ھندہ کی ملک کر دیا تھا یا عاریۃً پہننے کو دیا تھا، اس لئے اب والدہ زید کا انتقال ہو گیا ہے۔

اب رہے توڑے، اس میں تھوڑی چاندی ھندہ کی ہے، زید کی والدہ نے مزید چاندی ھندہ کی چاندی میں شریک کر کے توڑے بنوائے، اس کی نسبت بھی معلوم نہیں ہو سکتا، کہ مزید چاندی ھبہ کی تھی یا عاریۃً دی تھی۔

براہ کرم ایما فرمایا جائے کہ ذیل کی صورتوں میں کیا حکم ہے؟

۱۔ اگر ثابت ہو جائے کہ زید کی والدہ نے اپنی بہو ھندہ کو مہر و زیور ھندہ کی ملک کر دیا تھا؟

## الجواب

اس صورت میں ان زیوروں کا ھندہ سے لینا جائز نہیں کیونکہ خلع مہر پر ہوا ہے،

پس مہر سے زیادہ لینے کا شوہر کو کوئی حق نہیں، اور مہر وہ لے چکا ہے، کیونکہ ھندہ نے مہر اُسے معاف کر دیا۔ پس زیورعین کا واپس کرنا لازم ہے۔

۲۔ یا ثابت ہو جائے کہ عاریۃً پہننے کو دیا تھا؟

## الجواب

اس صورت میں اس زیور کا لے لینا جائز ہے، کیونکہ وہ ھندہ کی ملک نہیں۔

۳۔ یا معلوم نہ ہو سکے کہ ملک کر دیا تھا یا عاریۃً پہننے کو دیا تھا؟

## الجواب

اس صورت میں زوجہ اور زوج دونوں میں سے اگر کوئی بینہ قائم کر دیں تو اس کی ملک ثابت ہوگی۔ اگر دونوں بینہ قائم کریں، تو جس کا بینہ عرف کے خلاف ہو وہ [illegible] اگر بینہ کسی کے پاس نہ ہو تو عورت کا قول مع قسم کے قابل قبول ہوگا۔

۴۔ یا اس بارے میں ھندہ کا قول معتبر سمجھا جائے گا۔ اگر وہ دریافت کرنے پر کہے کہ زیور میری ملک کر دیا گیا تھا؟

خادم فقیر محمد

ناظم تعلیمات۔ نلگنڈہ۔ دکن

## الجواب

۳ میں تفصیل گذر چکی، اگر زوجین کے پاس بینہ نہ ہو تو عورت کا قول مع قسم کے معتبر ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۹ محرم ۱۳۴۹ھ

ہبہ میں عوض لینے کے بعد اس کی بیع کرنا صحیح نہیں
اور رجوع عن الہبہ کیلئے قضا یا تراضی شرط ہے

السوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ مندرجہ ذیل میں :

زید شش قطعہ مکانات بلا شرکت غیرے مالک ہے بوجہ ملکیت خود زید نے اپنے رشتہ داروں کو شش قطعہ مکانات زبانی ہبہ کر دیے اور اسی وقت مبلغ پانچ سو روپے بعوض ہبہ زید کے رشتہ داروں نے زید کو دیا اور زید نے اس کو قبول و منظور کر لیا اور تقسیم کر کے مکانات قبضہ مالکانہ میں دیدیے ۔ بعد وفات یکے از موہوب لہا جائداد موہوبہ اس کے ورثہ کے قبضہ میں آگئی ورثاء نے اپنے اپنے حصص ایک دوسرے سے تبدیل کر دیے اور یہ انتقال جائداد واہب کی حیات میں ہوا شہادت کافی منقولہ مثل موجود ۔ بعد چند روز زید نے تائیدات دستاویز ہبہ نامہ مرتب کرادیے اور دستاویز کے مضمون اول میں یہ عبارت ہے ( بصحت ہوش وحواس وثبات عقل بلا اکراہ و اجبار غیرے مع اس کے تمامی حقوق داخلی و خارجی شرعیہ کے ہبہ کر دیے یعنی بخشدیے ) مضمون دوم یہ عبارت ہے : ( تاحیات خود منتفع قابض و دخیل رہنے اور بعد فوتی میرے یہ مکانات ان کے قبضہ مالکانہ میں رہیں گے ) آخری دستاویز کی عبارت یہ ہے : ( یہ ہبہ صحیح و شرعی جائز و نافذ خالی شروط مفسدہ سے بتراضی متعاقدین واقع ہوئی اور مکانات موہوبہ کو قبضہ مالکانہ میں دیدیے اب میں یا میرے کوئی بھی وارثان قائم مقامان و جانشینان نسبت مکانات موہوبہ کچھ کسی قسم کا حق و دعوی کریں تو باطل و ناجائز و نامسموع متصور ہو ) دستاویز ہبہ نامہ میں معاوضہ پانچسو روپیہ و تقسیم مکانات موہوبہ کا تذکرہ نہیں ہے ۔ اول زبانی ہبہ ہوئی اس پر اعتبار کیا جائے گا یا دستاویز ہبہ نامہ پر جو بعد چند روز بنا بر تائید معاہدہ زبانی مرتب ہوئی اگر دستاویز ہبہ نامہ تحریریہ باطل ہو تو زبانی ہبہ جو پہلے ہو چکی ہے وہ بااثر ہے تو زید ایسی صورت میں مکانات موہوبہ کو قبل استرداد و عمل قانونی و شرعی کے بیع کر سکتا ہے یا بعد استرداد ۔ اگر حسب عمل قانونی و شرعی زید نے ہبہ نامہ کو منسوخ کرایا تو ایسی صورت میں زید مکانات موہوبہ و مقبوضہ موہوب الیہما کو کسی خریدار کے نام بیع کر سکتا ہے یا نہیں ؟

محمد عبد اللہ خان پنشنر از بھوپال بیرون دروازہ

# الجواب

قال فی العالمگیریہ لیس لہ حق الرجوع بعد التسلیم فی ذی الرحم المحرم وفی ما سوی ذلک لہ حق الرجوع الا ان بعد التسلیم لا یتفرد الواھب بالرجوع بل یحتاج فیہ الی القضاء او الرضاء وقبل التسلیم یتفرد الواھب بذلک ھکذا فی الذخیرۃ ۔ و فیہ ایضاً اما العوارض المانعۃ من الرجوع فانواع ومنھا خروج الموھوب عن ملک الموھوب لہ بای سبب کان من البیع والھبۃ ونحوھما ۔ وکذا بالموت لان الثابت للوارث غیر ما کان ثابتاً للمورث الیٰ قال : ومنھا العوض اھ وفیہ ایضاً ولا یرجع فی الھبۃ من المحارم بالقرابۃ کالاٰباء والامھات وان علوا والاولاد وان سفلوا ۔ واولاد البنین والبنات فی ذلک سواء وکذا الاخوۃ والاخوات والاعمام والعمات الخ ص۳۲۵ ج ۴

صورتِ مسئولہ میں زید نے جن رشتہ داروں کو اپنے مکانات ہبہ کیے ہیں اگر وہ ذی رحم محرم ہیں (ذی رحم محرم میں اصول و فروع اور اولاد ذکور و اناث کی اولاد اور بھائی بہن اور ان کی اولاد اور چچا پھوپھی داخل ہیں مگر چچا پھوپھی کی اولاد محرم نہیں) تو اس صورت میں خود محرمیت رجوع فی الھبہ سے مانع ہے بعد تسلیم کے ۔ اور اگر وہ ذی رحم محرم نہیں ہیں تو جب بھی زید کو اس ھبہ میں رجوع کا حق نہیں کیونکہ اس نے پانچسو روپے بعوض ہبہ کے موہوب لہم سے قبول کیے ہیں اور عوض لے لینا بھی مانع رجوع ہے ، رشتہ داروں سے بطریق اولیٰ ۔ باقی اس عوض کا تذکرہ دستاویز میں نہ ہونا کچھ مضر نہیں جبکہ شہادت سے کافی ثبوت ہوا ہو اگر موہوب لہم محارم بالقرابت بھی نہیں اور پانچسو روپیہ جو عوض ہبہ دیے جانے کا بھی ثبوت شرعی نہیں تو اس وقت یہ حکم ہے کہ جو موہوب لہ فوت ہو گیا ہے اور اس کا حصہ اس کے ورثاء کو پہنچ گیا ہے پس میں تو زید کو کسی طرح حق رجوع نہیں اور جو موہوب لہ زندہ ہے اس کے حصہ میں بھی زید خود رجوع نہیں کر سکتا بلکہ قضاء قاضی یا موہوب لہ کی تراضی ضروری ہے لیکن اگر در حقیقت اس نے ہبہ کا عوض وصول کیا ہے گو ثبوت بہم نہ پہنچ سکے تو اس صورت میں دیانۃً زید کو رجوع فی الہبہ حرام اور باعث گناہ شدید ہے ۔ واللہ اعلم ۔

# کتاب الاکراہ

## اکراہ علی التوکیل بالنکاح باطل ہے

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ برادری نے مسماۃ ھندہ بالغہ کا جبراً نکاح زید کے ساتھ کر دیا جس کو ھندہ نے قطعی اقرار نہیں کیا، اور متنفر رہی اور یہاں تک نفرت رہی کہ نکاح کے شب کو ھندہ مکان کے اندر قفل لگا کر سو رہی، اور زید دروازے کے باہر سویا، اور تمام شب مقفل کواڑوں سے باہر خوشامد کواڑ کھولنے کی کرتا رہا، آخر کار صبح ہو گئی، زید اپنے مکان کو رفع ضرورت پیشاب یا پاخانہ کے لئے وہاں سے علیحدہ ہو کر چلا گیا، ھندہ قفل اپنا کھول کر وہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ جا کر امن اس فرضی نکاح سے حاصل کیا۔ اور اس وقت ھندہ کو اس فرضی نکاح کی رضامندی نہیں ہے؟

کیا یہ نکاح قائم رہا یا خارج رہا؟ اور دوسری جگہ اپنی رضامندی اور خواہش سے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ جواب سے مطلع فرمائیں۔ والسلام

رقیمہ نیاز محمد روشن روغنگر و شیرانی آہنگر

از قصبہ نانوتہ محلہ کوٹ، تحصیل: دیوبند

ضلع سہارنپور۔

### تنقیح

۱۔ کیا ان جبر کرنے والوں نے مسماۃ ہندہ کی زبان سے نکاح سے پہلے اجازت نکاح کے الفاظ بھی جبراً کہلوائے تھے؟ اگر ایسا ہوا تو سوال دوبارہ کیا جائے۔ اور وہ الفاظ بھی لکھے جائیں جو جبراً اس سے کہلوائے گئے تھے۔

۲۔ نکاح کی خبر سن کر ھندہ شخص نفرت ہی ہوئی یا اس نے خبر سنتے ہی زبان سے بھی انکار

کیا، یا محض تنا، تو شمار کریں؟

بدون ان تنقیحات کے جواب کے جواب نہیں دیا جائے گا۔

فقط والسلام

ظفر احمد عفی عنہ۔ از تھانہ بھون

خانقاہ امدادیہ،

۹ رشوال ۱۳۴۳ھ

## جواب تنقیح

۱۔ ہندہ نے بوجہ اپنی شرم و حیا کے جبکہ ہندہ کو برادری کے مجمع نے یہ الفاظ کہے کہ "تجھ کو برہنہ کر کے زنجیروں سے درخت میں لٹکایا جائے گا" تو اگر ہندہ وہ الفاظ جواب خط سے آگے تحریر ہوں گے نہ کہتی، تو ضرور برادری کے لوگ ایسا کرتے، اس کو برہنہ کر کے لٹکایا جاتا، اور مار پڑتی، کہا کہ "جو آپ لوگوں کو اختیار ہے" اس تحریر سے چراغ جلے گا، کل نہیں جلے گا۔

۲۔ نکاح کی خبر سے فوراً انکار کیا، اور تمام رات برادری کی وجہ سے مکان میں مقفل رہ کر علی الصباح موقع پا کر پولیس میں رپورٹ درج کرادی کہ مجھے زبردستی نکاح کیا گیا، میں ہرگز ہرگز راضی نہیں ہوں۔

۳۔ جبکہ برادری نے ہندہ سے دریافت کیا تھا کہ جس شخص سے تو راضی ہو اس سے نکاح کردیں! تو ہندہ نے نام (روشن) نے کہ شیخ کو مخاطب کیا کہ اس سے نکاح کردو، مگر برادری کے مجمع نے ایسا نہیں کیا، بلکہ دوسرے شخص سے نکاح کردیا تھا جبراً۔

## الجواب

صورت مسئولہ میں عورت نے اکراہ و جبر کے ساتھ برادری کو وکیل نکاح بنایا ہے اور اکراہ علی التوکیل بالنکاح ہمارے نزدیک باطل ہے۔ اس لئے نکاح صحیح نہیں ہوا، اور ہندہ جس سے چاہے اپنا نکاح رضامندی کے ساتھ کرسکتی ہے۔

قال فی الدر فی باب الاکراہ: و (صح) توکیلہ بطلاق وعتاق، وما فی الأشباہ من خلافہ فقیاس، والاستحسان وقوعہ. والأصل عندنا أن کل مایصح مع الھزل یصح مع الاکراہ. لان مایصح مع الھزل لایحتمل الفسخ،

وکل ما لا یحتمل الفسخ لا یؤثر فیہ الاکراہ اھ

قلت: والقیاس أن لا تصح الوکالۃ لأنہا تبطل مع الہزل کما صرحوا بہ، کما ذکرہ الشامی (ج ٥ ص۱۱۱) وھذا ھو الراجح عندنا، لأن صحۃ بعض العقود مع الہزل انما ھی بناء علی الحدیث "ثلث جدھن جد، وھزلھن جد" ولیست الوکالۃ من ھذہ الثلث لما قالوا إنہا تبطل بالہزل فالراجح ما فی الأشباہ،

وأیضاً، فصحۃ التوکیل بالنکاح اکراھاً لم یرہ أحد منقولاً، کما ذکرہ الشامی، وإنما ألحقوھا بالطلاق والعتاق۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

١٥ رشوال سنہ ١٣٤٦ھ

# کتاب الامارۃ والسیاسۃ

## حضرت تھانویؒ کی ایک تحریر بابت حمایت خاکساران و مسلم لیگ
(ایک تحریف کا انکار بقلم حضرت تھانوی قدس سرہ)

نقل جواب حضرت مولاناؒ بر اشتہار سرخ شائع کردہ جماعت احرار سہارنپور بعنوان "مسلم لیگ میں شریک ہونا حرام ہے"[۱]

### جواب

اس اشتہار میں جتنی عبارت میری ہے اس پر میں نے خط بنا دیا ہے، ابتداء اس لفظ سے ہے "اس جماعت کے اقوال..." اور انتہا اس لفظ پر ہے "واجب ہے" اور دستخط اسی عبارت پر ہے۔ اور اس کا تعلق صرف جماعت خاکساران سے ہے، نہ کہ مسلم لیگ سے۔"

بس اتنی حقیقت ہے باقی کا میں ذمہ دار نہیں، اس جماعت کے متعلق اور اس سے تعاون کے متعلق یہاں مضمون مرتب ہو رہا ہے، اس کا انتظار کیا جائے۔ بلا وجہ نزاع مناسب نہیں۔

اشرف علی

(تاریخ ۸/ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۸ھ

بجواب استفتاء آمدہ از کیرانہ بتوسط پیر جی ظفر احمد صاحب)

---

[۱] یہ پوری تحریر مسودہ "امداد الاحکام" کے رجسٹر نمبر ۱ کے شروع میں درج ہے۔ سوال درج نہیں۔ مگر جواب سے سوال کو سمجھا جا سکتا ہے، اس لئے وہ تحریر بعینہٖ یہاں نقل کر دی گئی۔ حاصل اس تحریر کا یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

# کتاب الدعوی والشہادات والقضاء

## مجلس قضاء کے بغیر شہادت شرعاً معتبر نہیں

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ: مسماۃ ھندہ کا شوہر اپنی جائیداد مکانات وغیرہ چھوڑ کر فوت ہوگیا، اور دین مہر اس کا اس کے شوہر کے ذمہ باقی ہے، آیا یہ جائیداد مذکورہ ورثہ پر تقسیم ہوجائے گی یا عوض دین مہر کے ھندہ کو ملے گی، اور اقرار شوہر واسطے دین مہر زوجہ اپنی کے عند الشہود درست ہے یا نہیں؟ اور تعداد شہود عند الشرع کتنی ہے؟ بینوا توجروا۔

### جواب

درصورت مرقومہ باقی رہے دین مہر ذمہ شوہر کے جائیداد مذکورہ بدلے اس کے ھندہ کو ملے گا، اور اگر جائیداد اس قدر ہے کہ بعد ادا مہر کے باقی رہے تو ورثہ پر تقسیم ہوگی، کما فی الشامی. قال فی الدر المختار: ثم تقدم دیونہ التی لہا مطالب من جہۃ العباد، ویقدم دین الصحۃ علی دین المرض اھ ثم یقسم بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ـــ) نے ایک مضمون جماعت خاکساران کے متعلق تحریر فرمایا تھا جس میں بعض لوگوں نے تحریف کرکے ایک سرخ رنگ کا اشتہار شائع کیا جس میں ظاہر کیا گیا کہ حضرت تھانوی کی وہ تحریر مسلم لیگ کے متعلق ہے، اسی پیراگراف سے ایک سوال حضرت کے پاس آیا، جس کا جواب حضرت ہی نے تحریر فرمایا اور اس کی نقل امداد الاحکام میں محفوظ کی گئی جو یہاں بعینہٖ نقل کیا جارہا ہے۔ فقط

محمد رفیع عثمانی

دارالعلوم کراچی

۲۹ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ

ذالك بين ورثته انتهى ـ وايضًا فيه ـ قال العلامة الشامى عن قول الدر المختار ـ ومثل دينه ـ أى مثله جنسا ونوعًا وقدرًا إذا كان من جنسه ونفى الشافعيّ أخذ خلاف الجنس أى من النقود والعروض لأن النقود يجوز أخذها عندنا على ما قررناه آنفا ـ لكن رأيت فى شرح نظم الكنز للمقدسى من كتاب الحجر ـ قال ونقل جد والدى لأمه الجمال الأشقر فى شرحه للقدورى أن عدم جواز الأخذ من خلاف الجنس كان فى زمانهم لمطاوعتهم فى الحقوق ـ والفتوى اليوم على جواز الأخذ عند القدرة من أى مال كان ـ لاسيما فى ديارنا لمداومتهم فى العقوق انتهى ـ

اور اقل تعداد شہود دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت

كما فى الهداية ـ أقل الشهادة رجلان أو رجل وامرأتان ـ

اور درستی شہادت میں فقط موافقت دعویٰ کافی ہے ـ

كما فى الهداية ـ الشهادة إذا وافقت الدعوى قبلت انتهى ـ وقال فى العناية ـ قوله إذا وافقت الدعوى بأن تتحد النوعًا وكمًّا وكيفًا وزمانًا وفعلًا وانفعالًا ووضعًا وملكًا ونسبة انتهى ـ

اب چونکہ شہادت شاہدین متفرد یعنی کوئی میاں اور مظفر خان نوع و کم و کیف و زمان و فعل و انفعال و وضع و ملک و نسبت میں اتفاق ہیں لہٰذا دعویٰ مسماۃ مذکورہ صحیح و ثابت و اموال مقررہ بسبب اقرار مقر مسماۃ مذکورہ کو ملے گا ـ

ہذا حکم الکتاب ـ واللہ اعلم بالصواب

اجیب محمد خلیل الرحمن عفی عنہ

قلت وشرط لصحة الشهادة مجلس القاضى أيضًا فلا تقييد بوقته ـ قال فى الدر المختار هى إخبار صدق لإثبات حق بلفظ الشهادة فى مجلس القاضى وفى رد المحتار قال فى البحر لكنه ذكر أولًا أن شرائط الشهادة نوعان ما هو شرط تحملها وأدائها فالأول ثلثة ـ وقد ذكرها الشارح والثانى أربعة أنواع ما يرجع إلى الشاهد وما يرجع إلى الشهادة وما يرجع إلى مكانها وما يرجع إلى المشهود به ـ وذكر أن ما يرجع إلى الشاهد السبعة عشر

العامة والخاصة، ومايرجع إلى الشهادة ثلاثة، لفظ الشهادة والعدد في الشهادة، بما يطلع عليه الرجال، واتفاق الشاهدين ومايرجع إلى مكانها واحد، وهو مجلس القضاء الخ۔ (ج ۴ صفحہ ۵)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ شہادت کے معتبر ہونے کے لیے مجلس قضا بھی شرط ہے۔ پس اگر ہندہ میں اور اس کے شوہر کے ورثہ میں مقدار مہر کی بابت اختلاف ہو تو محض دو گواہوں کا ورثہ کے سامنے گواہی دینا شرعی شہادت شمار نہ ہوگا جب تک کہ وہ دونوں کسی قاضی مسلم کے سامنے مجلس قضا میں گواہی نہ دیں، اور اگر ورثہ نے بدون مجلس قضاء کے اس شہادت پر عمل کیا، تو جو وارث نابالغ ہوں ان کے حق میں یہ شہادت حجت نہ ہوگی، اور نہ محض اس گواہی کی بناء پر ان کے حق میں سے عورت کو کچھ دیا جا سکتا ہے۔ البتہ جو ورثہ بالغ ہوں، وہ اگر رضامندی سے ان گواہوں کے بیان پر عمل کرنا چاہیں تو ان کو اپنے حصہ میں اختیار ہے۔ اگر یہ گواہی مجلس قضا قاضی مسلم میں پیش نہ ہوتی ہو تو ورثہ کو چاہیے کہ مہر کی جتنی مقدار بطور تواتر کے یقینی معلوم ہو اس کا اعتبار کریں، ان گواہوں کے قول پر اعتماد نہ کریں۔ اور اگر تواتر سے کوئی مقدار معلوم نہ ہو تو اس عورت کا مہر مثل (یعنی خاندانی مہر) معلوم کر کے وہ ادا کرے بشرطیکہ عورت نے پہلے سے معاف نہ کیا ہو۔ اور شوہر نے بھی ادا نہ کیا ہو۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۳ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ

### دو گواہ عورتوں کے درمیان تفریق کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر ایک مقدمہ میں دو عورتیں اور ایک مرد گواہ ہوں اور قاضی عورتوں میں تفریق کر کے ان کے بیانات سنے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

### الجواب

بہتر تو یہ ہے کہ قاضی عورتوں میں تفریق نہ کرے، کیونکہ دو عورتیں مل کر بمنزلہ ایک گواہ کے ہیں، لیکن اگر کسی ضرورت سے تفریق کرے تو جائز ہے بشرطیکہ حیثیت میں اس سے

پر نقصان نہ لازم آئے گا۔

قال فی البدائع (ج ۶ صہ) وإذا اتہم الشہود فلا بأس بأن یفرق عند اداء الشہادۃ، فیسئلہم أین کان؟ ومتی کان؟ فإن اختلفوا اختلافاً یوجب رد الشہادۃ ردّہا وإلا فلا اھ

قلت: وہذا بعمومہ یجوز التفریق بین المرأتین أیضاً، وقال فی الدر: أو رجل وامرأتان ولا یفرق بینہما، لقولہ تعالیٰ: (فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ) الآیۃ۔

وفی رد المحتار حکی أن أم بشر بن شہدت عند الحاکم فقال الحاکم فرقوا بینہما، فقالت: لیس لک ذلک، قال اللہ تعالیٰ: (أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ) فسکت الحاکم، کذا فی الملتقط، ج ۴ ص ۵۱۶

واللہ اعلم

۴ رجب ۱۳۸۲ھ

**شاہدان طلاق اگر مدت طویل گذر جانے کے بعد گواہی دیں تو ان کی شہادت معتبر نہیں**

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اہل سنت والجماعت مسئلہ مندرجہ ذیل میں کہ زید نے ہندہ کو عرصہ چودہ سال کا ہوا کہ طلاق رجعی دی تھی، اور ہفتہ عشرہ کے اندر رجعت کرلی تھی، بوقت رجعت برادران کو شبہ ہوا کہ شاید طلاق بائن دی ہو تحقیق کی تو طلاق رجعی ہی ثابت ہوئی، چنانچہ ہندہ زید کے پاس نو دس سال رہی، کسی قسم کا جھگڑا نہیں تھا، بعد دس سال کے زید کے ساتھ بجنے کا ولیمہ دنیوی میں شرکت کرلی۔ بعد چند روز کے ہندہ سے اور بکر سے آشنائی ہوگئی لہٰذا

---

لہ قلت: ہذا محمول عندنا علی أدب القاضی، ومما ینبغی له أن لا یفعل ۱۲ منہ۔

ھندہ کو چھپا دیا، جب چند برادریوں کو معلوم ہوا، دس پانچ آدمی جمع ہو کر دریافت کرنے لگے، معلوم ہوا کہ ھندہ کہتی ہے کہ ہم کو دس سال ہوا زید نے تین طلاق دے دی تھی۔ چنانچہ گواہ تلاش کیا تو کوئی نہیں ملا، لہٰذا زید سے دریافت کیا، زید نے کہا کہ ہم نے ایک بار طلاق دی تھی، اور ہفتہ عشرہ کے اندر رجعت کر لی تھی، چنانچہ اس وقت یہ تجویز ہوئی کہ زید سے قسم لی جائے، لہٰذا مولوی شمس الدین صاحب، اور حافظ رحم اللہ شاہ صاحب بلرام پوری کے سامنے زید نے قسم کھا کر حلفیہ بیان کیا کہ ہم نے صرف ایک طلاق دے کر ہفتہ عشرہ کے اندر رجعت کر لی تھی، جناب مولانا موصوف نے کہا کہ ھندہ زید کے لئے جائز ہے سو ھندہ کو زید کی سپرد کرا دی، بعد چند روز کے پھر بکر نے ھندہ کو چھپا دیا۔ اور ھندہ سے بکر نے مہر کا دعویٰ کرا دیا اور دو گواہ کاذب سے عدالت گورنمنٹ میں شہادت دلوادی عدالت نے ھندہ کو ڈگری دے دی بعدہ بکر نے ھندہ کو اپنے یہاں رکھ لیا جب برادران کو معلوم ہوا، بکر کو جماعت سے علیحدہ کر دیا، اور برادران پنچ طلاق کا ثبوت ڈھونڈنے لگے، بہت کوشش کے ساتھ تحقیق کی، مگر طلاق کا ثبوت نہیں ملا ۵ مرتبہ پنچایت ہوئے مگر تحقیق نہیں ہوئی، اور اسی درمیان میں مولوی محمد ادریس صاحب دہلوی کے پاس مسئلہ مقدمہ ھذا پیش کیا گیا، مولانا موصوف نے باقاعدہ گواہ طلب کیا، بکر نے چار گواہ پیش کئے مولانا موصوف نے حلفیہ بیان لیا۔ چاروں گواہوں نے قسم کھا کر حلفیہ بیان کیا کہ صاحب ہم لوگ نہیں جانتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ جو بات سچ معلوم ہو بیان کرو، گواہوں نے کہا کہ صاحب، ہم نے اپنے کانوں سے نہیں سنا ہے کہ زید نے ھندہ کو طلاق دی ہے غرض کہ سب گواہوں نے قطعی انکار کیا، بعد چند روز کے بکر نے ایک تاریخ مقرر کر کے جملہ پنچ چودہ کوس کو مدعو کیا، چنانچہ تاریخ مقررہ پر جملہ پنچ جمع ہوئے، گفتگو ہونے لگی، پنچوں نے کہا کہ اس بات کا کوئی گواہ ہے؟ کہ زید نے عرصہ بارہ برس کا ہوا ھندہ کو طلاق دی تھی بکر نے کہا چار گواہ ہیں۔ پنچوں نے کہا کہ گواہوں کو بلاؤ! قسم کھا کر حلفیہ بیان کریں، اور تم ھندہ کو اس وقت علیحدہ کردو، اور اسی وقت چاروں گواہوں کا بیان اور مفصل حال لکھ کر علماء دین کے پاس استفتاء بھیج دیا جائے، جیسا علماء دین فیصلہ کر دیں گے مانا جائے گا، اور ھندہ جس کے لئے جائز ہوگی، اس کے سپرد کی جائے گی۔ بکر نے شہادت دلوانے اور ھندہ کو نکالنے سے انکار کیا، اور کہا کہ ہم ھندہ کو نہیں نکال سکتے ہیں، کیونکہ ہم نے

عدالت سے ڈگری پائی ہے، اس پر پنچوں نے بہت کچھ سمجھایا، غرض آٹھ بجے عشاء کے وقت سے لے کر دس بجے دن تک گفتگو ہوئی، مگر بکر راہ راست پر نہیں آیا، پنچوں نے کہا، ہم سب چودہ کوس بائیکاٹ کر دیں گے، اور کہا کہ تمہارے یہاں ہرگز نہ کھائیں گے، اس پر بکر نے پنچوں کو گستاخانہ کلام بھی کہا، آخر مجبور ہو کر پنچوں نے بکر کو جماعت سے علیحدہ کر دیا، اور دو دو وقت بھوکے رہ کر اپنے مکان یا موضع کو واپس گئے، چنانچہ بکر عرصہ سے جماعت سے علیحدہ ہے۔ فی الحال زید و بکر نے ایک مولوی صاحب کے پاس یہ شرط لگی کہ تو آپ از روئے شرع شریف کے فیصلہ کر دیں ہم دونوں کو منظور رہے، چنانچہ مولانا موصوف نے باقاعدہ گواہ طلب کیا، لہٰذا اسی وقت گیارہ گواہ نے قسم کھا کر حلفیہ بیان کیا کہ زید نے ہندہ کو طلاق مغلظہ دیدی تھی، مولانا نے کہا کہ کب دی تھی، گواہان مذکورہ نے کہا کہ چودہ سال ہوئے چنانچہ جملہ پنچ چودہ کوس کو بہت برداشت گزرتا۔ یہ کیا وجہ ہے جوا بھی تک ہر پنچایت میں کہتے تھے کہ ہم لوگ نہیں جانتے ہیں، اور مولوی محمد ادریس صاحب نے جب باقی عدہ دریافت کیا تھا جب بھی حلفیہ چار گواہ نے انکار کیا تھا۔ اور آج وہی قدیم چار گواہ جو پہلے انکار کرتے تھے ساتھ جدید مل کر گیارہ گواہ اظہار کرتے ہیں۔ پہلے جب پنچوں نے دریافت کیا تھا، یا جب مولوی شمس الدین صاحب نے زید سے قسم لی تھی، یا جب مولوی محمد ادریس صاحب نے دریافت کیا تھا جب کیوں نہیں اظہار کیا تھا؟ اگر سچے تھے تو پہلے ہی کہہ دیتے تو کیوں اس قدر فتنہ پیدا ہوتا؟ اور بکر کو مع ساتھیوں کے کیوں بائیکاٹ کیا جاتا؟ اور ہندہ کیوں زید کے پاس دس برس رہتی، اور مرتکب زنا کی ہوتی؟ چنانچہ جملہ پنچ چودہ کوس بہت کشمکش میں ہیں کہ پہلے کا قول معتبر ہوگا۔ یا آج کا قول معتبر مانا جائے گا۔ چنانچہ ایسے گواہان مذکورین کا قول حلف وقسم از روئے شرع شریف کے معتبر ہوگا یا نہیں؟ اور سماۃ ہندہ کس کے لئے جائز ہوگی۔

المستفتی: افضر القوم میاں رحم اللہ صاحب
ضلع: گونڈہ، ڈاکخانہ: قصبہ بلرام پور
متصل سنی گھاٹ، موضع: بلھا

---

۱؎ یہ چار گواہ جس وقت مولوی شمس الدین صاحب نے پہلے قسم زید سے لیا تھا موجود تھے ۱۲۔

## الجواب

صورتِ مسئولہ میں جن چار گواہوں نے پہلے طلاق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی تھی اور اب وہ طلاق مغلظہ کی گواہی دیتے ہیں ان کی گواہی تو یقیناً جھوٹی اور غلط ہے۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ، وفی جواھر الفتوی من الشھادات، شھد علی وجہٍ فیہ خلل، ثم أعاد الشھادۃ فی غیر ذلک المجلس بدون الخلل، فإن کان یحتاج إلی زیادۃ فزاد لا یقبل، وإن لم یمکن بین الأول والثانی تناقض فإنما کان اھمالاً، لأن الظاھر أن لا شھادۃ عندہ إلا علی ما شھد أولاً، وإنما زاد ثانیاً لتلقین انسان تزویراً واحتیالاً فلا یقبل استدلالاً بما ذکرہ محمدٌ فی الجامع الصغیر رجلٌ شھد، ولم یبرح عن مکانہ حتی یقول، أوھمتُ بعض شھادتی، ان کان عدلاً تقبل شھادتہ وقولہ لم یبرح دلیل علی أنہ إذا برح ثم عاد لا تقبل اھ (ج ۱ صـ۳۱۷)

اور جو باقی سات گواہ ہیں ان کی شہادت بھی باطل اور جھوٹی ہے۔ کیونکہ جب چودہ سال کے بعد وہ طلاق مغلظہ کی گواہی دے رہے ہیں تو تنے عرصہ تک گواہی کو مؤخر کرنے کی وجہ سے وہ فاسق ہوگئے۔ قاعدہ یہ ہے کہ طلاق مغلظہ کی گواہی کو پانچ دن تک مؤخر کرنے سے بھی گواہ فاسق ہو جاتے ہیں۔ چودہ برس تک مؤخر کرنے سے تو کیوں نہ فاسق ہوں گے، لہٰذا یہ شہادت بالکل باطل ہے۔ اور ہندہ زید کی بیوی ہے۔ بکر کو اس سے ہرگز ہرگز نکاح جائز نہیں۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ (سئل) عن شھود شھدوا بإقرار الرجل بالطلقات الثلث بعد شھر، (الجواب) لا تقبل شھادتھم بعد أن أخروا خمسۃ أیام من غیر عذر، إن عالمین بأنھما یعیشان عیش الأزواج، والشھادۃ بدون الدعوی (من المرأۃ) یجوز فی ھذہ المسئلۃ اھ (ج ۱ صـ۳۲۸)

۲۳ / رمضان۔

### حَکم کے فیصلہ کردینے کے بعد کسی ایک فریق کو رجوع کرنا جائز نہیں

سوال:۔ اگر دو چار آدمی باہم کسی قوم پر تصفیہ کردیں، اور دونوں فریق منظور کرلیں، اور

جب تحریر نے ایک شب کے اگلے روز کوئی ایک فریق اس تصفیہ منظور شدہ سے انکار کردے تو وہ گنہگار اور وعدہ خلاف ہے یا نہیں؟ اور قرآن پاک اور شریعت کا اس کے لئے کیا حکم ہے:

## الجواب

جبکہ فریقین رضا مندی کے ساتھ کسی کو حکم تجویز کرلیں، اور وہ حکم اپنا فیصلہ سنادے تو پھر کسی فریق کو رجوع کرنا تحکیم سے درست نہیں ہے،، وراس فیصلہ سے رجوع کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ قاضی کے فیصلے سے، اور وہ یقیناً گنہگار ہے۔

فان حکم لزمهما۔ ولا یبطل حکمه بعزلهما۔ لصدوره عن ولایة شرعیة۔ در مختار علی الشامی باب التحکیم (ج ۴ ص ۳۲۹)

| | |
|---|---|
| واللہ اعلم بالصواب | الجواب صحیح حق |
| احقر عبد اللطیف عفا اللہ عنہ | عنایت الٰہی عفی عنہ |
| مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور | مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور |

الاجوبة کلها صحیحة

احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون، خانقاہ امدادیہ

۸ رشوال سنہ ۱۳۴۱ھ

مشرک عورت ایک مرد مسلمان کے پاس رہی دونوں سے بچے بھی پیدا ہوئے، اور عورت نے اسلام بھی بظاہر قبول نہ کیا اب عورت اپنے مسلمان ہونے اور مسلمان کی بیوی ہونے کا دعوی کرتی ہے۔

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ:

ملہ زید ایک مسلمان مرد نے ایک ھندو عورت کو اپنے گھر میں رکھا جس سے اولاد ہوئی، اور اس کا نام وہی ھندوانی رہا، جو مسلمان مرد کے گھر میں آنے کے وقت تھا، اور بعد موت بھی اسی نام سے یاد کی جاتی ہے، اس صورت میں عورت مذکورہ کس مذہب کی سمجھی جائے گی، اور اولاد مذکورہ مرد مسلمان کی جائز اولاد مانی جائے گی یا نہیں:

ملہ زید ایک مشہور شخص تھا، باوجودیکہ اس تعلق کے ناجائز ہونے کی نسبت عام شہرت ہوچکی

تھی۔ لیکن زید نے اپنی حیات میں کوئی تردید اس مشہور واقعہ نا جائز کی نہیں کی پس اگر اس کی اولاد مسلمان اور منکوحہ ہونے کے ثبوت کے لئے ایک نکاح نامہ پیش کرے، تو کیا یہ نکاح نامہ اس کے اسلام اور نکاح کے ثبوت کے لئے کافی ہے یا نہیں؟

س ۲ بر تقدیر ثبوت اسلام کے کیا یہ عورت مذکورہ اور زید کو اس کے بطن سے اولاد ان لوگوں کی (جن کو ماں باپ دونوں کی طرف سے قدامت اسلام کا شرف حاصل ہے) ہم کفو ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور نجیب الطرفین اس کی اولاد کو کہا جائے گا یا نہیں! بینوا توجروا

محمد عنایت اللہ عفا اللہ عنہ

افسر مدرس مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ

## الجواب وھو المصوب

س ۱ ہندو عورت کا کسی مسلمان کے گھر میں رہنا، اور اس سے اولاد ہونا، عورت کے مسلمان قرار دیے جانے کے لئے کافی نہیں۔ جبتک وہ بینہ یا دلائل سے اس کا ثبوت نہ دیں کہ وہ حیات زید میں اسلام لا چکی تھی۔ اور اسلام کے بعد باقاعدہ نکاح ہوا تھا یا ورثاء زید بغیر بینہ ہی کے اس کے اسلام و نکاح کی تصدیق کر دیں اگر بینہ یا تصدیق ورثاء سے اس کا ثبوت ہوگیا تب تو اس عورت کو وقت نکاح زید ہی سے مسلمان سمجھا جائے گا۔ اور اولاد بھی جائز اولاد مانی جائے گی، اور وہ اس کی وارث بھی ہوگی،

اور اگر بینہ سے یا تصدیق ورثاء سے اس کا ثبوت نہ ہوسکا تو اس عورت کے اور اس کی اولاد کے اقرار کو صرف ان کی ذات کے حق میں قبول کیا جائے گا، لیکن اس اقرار کو ورثاء پر حجت نہ قرار دیا جائے گا، یعنی جب وہ عورت اپنے اسلام و نکاح کا دعوی کرتی ہے اور اس کی اولاد بھی، تو عورت کو ابتداء سے مسلمان مانا جائے گا۔ اور اس کا ہندوانی نام بدل دیا جائے گا۔ اور اس کی اولاد کو مسلمان کہی جائے گی۔ لیکن ان کو زید کی اولاد۔ اور اس کا وارث اور اس کے خاندان کا کفو نہ مانا جائے گا۔ لما فیہ من تحمیل النسب علی الغیر بلا حجۃ۔

س ۲ نکاح نامہ جو پیش کیا جاتا ہے اگر ورثاء زید اس کی تصدیق کرے۔ یا اس پر کم از کم دو مسلمان گواہوں کی شہادت موجود ہو اور وہ دونوں مسلمان اس وقت زندہ ہوں اور اس وقت بھی گواہی دیں کہ یہ نکاح بحالت حیات زید ہمارے سامنے ہوا تھا اور اس وقت یہ ہندو عورت مسلمان ہوچکی تھی تب تو یہ نکاح نامہ اس عورت کے اسلام یا ثبوت ہو

نکاح کے ثابت ہونے کے لئے حجت ہے۔ ورنہ نہیں۔ اور دونوں صورتوں کا حکم اوپر گذر چکا۔

۳: اس کا جواب دوسرے سوالات متعلق کفایت کے ضمن میں آجائے گا۔

## الدلیل علی الجوابین الاولین

قال فی الهداية: ولومات المسلم وله امرأة نصرانية فجاءت مسلمة بعد موته، وقالت اسلمت قبل موته، وقالت الورثة اسلمت بعد موته، فالقول قولهم ایضاً (ای وعلی المرأة البينة ۱۲) ولایحکمه الحال، لأن الظاهر لا يصلح حجة للاستحقاق، وهی محتاجة إليه (قلت فيه دلالة على قبول اسلامها فی الماضی فی حق نفسها من غير استحقاق ۱۲) ۔ أما الورثة فهم الدافعون. ويشهد لهم ظاهر الحدوث أيضاً۔ (فيه أنه لو صدقها الورثة، او اقامت بينة، يقبل قولها) اه ج ۳ ص ۱۳۳ ـ وفيها ايضاً، ويقبل إقرار المرأة بالوالدين والزوج والمولى لما بينا، ولايقبل بالولد، لأن فيه تحميل النسب على الغير وهو الزوج إلا أن يصدقها الزوج (أو ورثته، لأن الحق له، أو تشهد بولادته قابلة، لأن قول القابلة فی هذا مقبول قال فی الحاشية إذا الفرض أن الفراش قائم، فيحتاج إلى تعيين الولد، وشهادتها فی ذلك مقبولة

وقد مر فی الطلاق، وقد ذكرنا فی إقرار المرأة تفصيلاً فی كتاب الدعوى. (قال المحشی: وهو أنها إذا كانت ذات زوج (معروف بنكاح معروف ۱۲) لم يجز دعوها حتى تشهد امرأة على الولادة، ولو كانت معتدة، فلا بد من حجة تامة عند أبی حنيفة رحمه الله، وإن لم تكن منكوحة ولامعتدة، قالوا يثبت النسب منها بقولها ۱۲) ولا بد من تصديق هؤلاء، (ج ۳ ص ۲۲۸)

**زوجہ کی وفات کے بعد اس کے ورثاء اور زوج میں ایک قطعہ زمین پر اختلاف ہونے کا حکم جبکہ وہ قطعہ زوجہ کے نام ہبہ ہو**

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس بارے میں کہ زید نے ایک زمین خرید کی، اور اس کی قیمت ڈھائی ہزار روپیہ بھی بائع کو دیدی،
اور بائع نے اس زمین پر مشتری یعنی زید کو قبضہ بھی کرا دیا، ایک سال تک دستاویز نہیں
لکھا گیا تھا، کیونکہ حساب کے دفتر میں پہلے تاریخ بیع میں درج کردی گئی تھی۔ زید کی بیوی جو
ان دنوں موجود تھی، لاولد ہونے کی وجہ سے زید نے دوسرا نکاح کرنا چاہا، تب بائع اور اس
کے چند رفقاء جو زید کی بیوی کے رشتہ دار واقارب تھے انہوں نے زید سے کہا کہ آپ دوسرا
نکاح کرنا چاہتے ہیں تو اپنی موجودہ بیوی کے نام مذکورہ زمین کی دستاویز بائع سے لکھوا دیں۔
کچھ زمین مہر کے لئے، اور کچھ زمین ہبہ کے طور پر، اور یہ نہیں معین کیا کہ کتنی زمین مہر کے لئے
اور کتنی ہبہ میں؟ اور کس جانب کا مہر کے لئے، اور کس جانب کی ہبہ میں؟ اس موجودہ بیوی کے
خاندان میں سے سب سے بڑے رئیس نے کہا کہ صرف دستاویز موجودہ بیوی کے نام کردو، ہم اس
بیوی کے بعد اس زمین سے حصہ لینا نہیں ہے، انہوں نے صرف تسلی کے لئے زمین اس بیوی کے
نام دستاویز لکھوا دیا، تاکہ دوسری بیوی کی طرف رجحان زید کا زیادہ ہونے سے زوجہ اولی غمگین نہ ہو جائے
زمین کی دستاویز لکھانے کے بعد ہبہ کی شروط کے مطابق زید نے موہوبہ قطعہ کو معین بھی نہیں
کیا، اور موہوبہ قطعہ پر زوجہ اولی کا قبضہ بھی نہیں کرایا، اور بالمشافہ یا بالواسطہ واہب و
موہوب لہا کا ایجاب وقبول بھی نہیں ثابت، اور قرینی کوئی زمین وقت اشتراء سے زوجہ اولی
کی حیات تک، اور بعد وفات زوجہ اولی زید ہی کے قبضہ میں ہے۔ اور اس کا آمد وخرچ اب تک
زید اپنے ہی اختیار واقتدار سے کرتا چلا آرہا ہے، زید نے بائع سے دستاویز لکھواتے وقت بائع سے یہی
دستاویز میں ہبہ لکھوا دیا کہ کچھ مہر کے لئے اور کچھ حصہ ہبہ میں خاوند سے فلاں تاریخ سے بیع کی
ہوئی زمین کو میں نے آج دستاویز لکھی ہے، اس لکھنے کے بعد دوسرا نکاح زید نے کرلیا ہے
سال دو سال کے بعد زوجہ اولی بلا قبض وتصرف واختیار انتقال کر گئیں، زوجہ اولی کے
انتقال اور بیع کے وقت تخمیناً چالیس سال کی عمر کی تھی بالغ راشدہ تھی پس وہ خرید کردہ
زمین زوجہ اولی کے ترکہ میں شمار کی جائے گی یا خاوند کی ہی رہے گی؟ (مذکورہ اظہار کو جانتے ہیں
مانتے ہیں) بینوا توجروا

## الجواب

صورت مسئولہ میں وہ خرید کردہ زمین خاوند ہی کی ملک ہے، زوجۂ اولیٰ کے ترکہ میں شمار نہ ہوگی، کیونکہ جب نہ بیع کی تعیین ہے، نہ موہوب کی، تو بیع اور ھبہ دونوں فاسد ہیں نیز جب زوجۂ اولیٰ سے ایجاب وقبول کچھ نہیں ہوا، نہ بیع کا نہ ھبہ کا: تو یہ معاملہ محض لغو ہوا نیز ھبہ کے لئے بعد صحت کے قبضہ بھی شرط ہے، وہ بھی مفقود ہے لہٰذا زمین مذکور میں ورثۂ زوجہ کا کوئی حق نہیں۔ البتہ شوہر سے مہر وصول کرنے کا ان کو حق حاصل ہے۔ جس میں بصورت زوجہ کے لاولد ہونے کے شرعاً نصف مہر تو خاوند کا ہی حق ہے، اور نصف باقی زوجہ کے ورثاء کا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲ رجب سنہ ۱۳۴۲ھ

**زوجہ کی وفات کے بعد اس کے ورثاء اور زوج میں ان زیورات پر اختلاف کا حکم جو شوہر نے نکاح کے وقت بیوی کو دیئے تھے۔**

سوال:- زید کی جانب سے نکاح کے وقت زوجۂ اولیٰ کو پچاس روپے کے قریب گلے میں ایک سونے کا منکا (بنول کا منکا جس کو کہتے ہیں) اتنا ہی ڈالے، اور زوجہ مذکورہ کی ماں کے گھر کی جانب سے تقریباً چار سو کا زیور ڈالے تھے، نکاح کے بعد زینت دیکھنے کی خاطر زید امانۃً ڈیڑھ ہزار کے قریب زیور بنا بنا کر ڈالے تھے، خود زید کہتا ہے کہ نکاح کے بعد کا بنایا ہوا زیور سب امانت ہے اور وہ میرا ہے زوجہ اولیٰ کا ہرگز نہیں، مگر زوجہ اولیٰ کا وارث بھائی کہتے ہیں کہ وہ زیور زوجۂ اولیٰ کو پہنچنا چاہیے، اور زوجۂ اولیٰ نے وہ سارا زیور بھائی کی اولاد کے لئے وصیت کردی ہے، پس آیا یہ زیور امانت میں شمار ہوگا خاوند کا ہوگا یا عورت کے ترکہ میں جائے گا، یا کل زیورات کے حق میں وصیت قبول کی جائے گی۔ اور خصوصاً خاوند جبکہ وصیت سے انکاری ہے۔ بینوا توجروا

## الجواب

قال فی الدر: ولو ادعت انہ ای المبعوث من المھر، وقال ھو ودیعۃ، فان کان من جنس المھر فالقول لھا: وان کان من خلافہ فالقول لہ بشہادۃ الظاھر لہ وفیہ ایضاً جھز ابنتہ، ثم ادعیٰ ان ما دفعہ لھا عاریۃ وقالت

ھو تملیك، اوقال: الزوج ذالك بعد موتها لیرث منه، وقال الأب بورثته بعد موته عاریة، والمعتمد ان القول للزوج، ولهاان کان العرف مستمراً أن الأب یدفع مثله جهازاً لاعاریة، اما ان مشترکاً کمصر والشام فالقول للأب أي مع الیمین، اھ مع الشامی (ج ۱ ص ۱۰۲)

صورت مسئول میں عرف کو دیکھا جائے، کہ زید کے خاندان میں نکاح کے بعد جو زیور عورت کو بنا کر دیتے ہیں، وہ اس کی مالک کر دیتے ہیں یا بطور امانت کے دیتے ہیں، اگر عرف یہ ہے کہ مالک کر دیتے ہیں، تو اس صورت میں اقارب زوجہ کا قول معتبر ہوگا مع قسم کے، اور شوہر کو شہادت سے ثبوت دینا ہوگا، کہ میں نے بطور امانت یہ زیور دیا تھا۔

اور اگر عرف امانۃً دینے کا ہے، تو زید کا قول معتبر ہے مع قسم کے، اور ورثۂ زوجہ کے ذمہ ثبوت دینا ہوگا شہادت سے، کہ یہ تملیکاً دیا گیا تھا۔

اور اگر اس کے خاندان میں دونوں طرح دستور ہے (جیسا کہ ہندوستان میں عموماً ایسا ہی ہے) کہ بعضے مالک کر دیتے ہیں اور بعضے مالک نہیں کرتے، بلکہ امانۃً دیتے ہیں، تو اس صورت میں بھی معتبر قول زید کا ہے مع قسم کے اور ورثۂ زوجہ پر بار ثبوت ہے، واللہ اعلم (اور یہ قسم یا ثبوت کسی ثالث کے جو برضائے فریقین تجویز ہوا ہو، یا حاکم کے سامنے ہونا چاہئے) اور ترتیب یہ ہوگی، اول اس شخص سے جس پر بار ثبوت ہے شہادت طلب کی جائے گی، اگر وہ شہادت پیش نہ کر سکے تو دوسرے سے جس پر قسم ہے قسم لی جائے گی، اور قسم کے بعد اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲ رجب سنہ ۱۳۴۳ھ

### زوجین کے منکر طلاق ہونے کی صورت شہادت طلاق معتبر ہے یا نہیں؟ اور شہادت میں گواہوں کی تاخیر کرنے کا حکم

سوال (اول): انظار الدین نے اپنی زوجہ مسماۃ چندربانو کو باہم تنازع کر کے غصے میں آکر کہا کہ تیرے ہاتھ کا طعام ہمارے لئے کھانا حرام ہے، اور طلاق دینے سے منکر ہوا پھر اس کی زوجہ بھی بولی کہ میرے زوج نے مجھ کو طلاق نہیں دیا، تو اس بارے میں تین شاہد عل

گئے، اول باپ، دوسرے ماں، تیسرے بھائی، سو تینوں نے گواہی دی۔

تنقیح ۱

کیا ان تینوں نے عورت کے سامنے یہ طلاق دینا بیان کیا؟

جواب تنقیح ۱

طلاق کے پہلے مسئلہ میں تینوں گواہوں نے عورت کے سامنے طلاق دینا بیان کیا ہے۔
سوال بالا۔ کہ ہم سب نے سنا ہے کہ اقتفرالدین نے اپنی بیوی مذکورہ کو کوئی کلام
سو پر متاذہ کر کے غضبناک ہو کر کہا کہ میں تجھ کو ایک طلاق دو طلاق تین طلاق دیتا ہوں،
اور تیرے ہاتھ کی بجات ہمارے لئے حرام ہے الغرض یہ ہے کہ اس صورت مرقومہ سے
طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟ درشہادت والدین مقبول ہے یا نہیں؟

تنقیح ۲

یہ گواہی دینے والے دین دار ہیں یا نہیں؟

جواب تنقیح ۲

یہ گواہی دینے والے پورے دیندار نہیں۔ اس لئے کہ صلوٰۃ و صوم تو کچھ تو ادا کرتے ہیں
لیکن پردہ و ستر عورت وغیرہ کی پابندی نہیں کرتے۔

سوال ثانی۔

اور دوسرے ایک طلاق کے واقعہ میں چار گواہ پائے گئے، ایک مرد تین عورتیں، تو
چاروں نے اس طور پر شہادت دی۔

تنقیح ۱

کس کے سامنے شہادت دی، اور عورت نے بھی سنا یا نہیں۔

جواب تنقیح

طلاق کے دوسرے مسئلہ میں شاہدوں نے دو مولوی صاحب اور دو مفتی صاحب
اور بہت عام لوگوں کے سامنے شہادت دی۔ اور عورت نے بھی سنا۔
سوال بالا۔ کہ شوہر نے اپنی زوجہ کو صریح تین طلاق دی لیکن مرد انکاری ہے۔

## تنقیح ۲

اس سے پوچھو کہ تو جب دیکھتا نہیں، تو کیسے گواہی دیتا ہے۔

## جواب تنقیح

انہوں نے کہا کہ میں اپنے گھر کے سامنے بیٹھا تھا، تو سنتا ہوں کہ میرا چچا زاد بھائی میرے ہی مکان میں اپنی باورچی خانہ میں زوجہ پر غصہ ہو کر، اور ان کو مار کر دوسرے گھر کی طرف ہنکایا، اور کہا کہ میں نے تجھ کو طلاق دی ہے، طلاق دی ہے، طلاق دی ہے تین بار سے بھی زیادہ کہا، اس میں کوئی شک نہیں۔

سوال بالا:-

اور یوم طلاق سے ایک سال سات ماہ کے بعد شواہد کی شہادت لی گئی۔

## تنقیح ۳

شاہد اس تاخیر کا کیا عذر بیان کرتے ہیں؟

## جواب تنقیح

شاہد کوئی عذر بیان نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے بالیقین شہادت دی، یہ فقط علماء کا ظن ہے۔ آیا کہ اتنی مدت کے بعد شہادت قبول ہوتی ہے یا نہیں؟ کتابیں زیادہ نہیں جو ڈھونڈ کر مسئلے استخراج کریں، اس لئے جناب کی خدمت میں سپرد کی، مہربانی فرما کر جواب عطا فرمائیں۔

سوال بالا ــــــ تو بارگاہ میں مرجو ہے کہ آیا اندھے کی شہادت معتبر ہوگی یا نہیں؟ اور اتنی مدت طویلہ کے بعد طلاق کی گواہی مقبول ہے یا نہیں؟

ازروئے شفقت ومرحمت دونوں مسئلوں کے جواب شافی دے کر خوش ومسرور کریں۔

عبد الحمید عفی عنہ

## الجواب

(۱) صورت اولیٰ میں جب زوج وزوجہ دونوں طلاق سے منکر ہیں، اور قاضی شرعی کا وجود ہندوستان وبنگال میں نہیں ہے جس کے سامنے شہادت کا گذرنا شرعاً معتبر ہو، اس لئے وقوع طلاق کا حکم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ چونکہ قاعدہ فقہیہ ہے "المرأۃ کالقاضی" اس لئے اگر زوجہ کو ان گواہوں کے سچا ہونے کا ظن غالب ہو تو اس پر ان گواہوں کی گواہی

سننے کے بعد یہی واجب ہے کہ وہ اپنے کو مطلقہ الثلث سمجھ کر زوج سے علیحدگی اختیار کرے۔ اور نہ اپنے نفس پر اس کو قبضہ نہ دے، اور اگر عورت کو ان گواہوں کے قول کا اعتبار نہ ہو (بوجہ ان کے عادل نہ ہونے کے یا باہم دشمن و مخالف ہونے کے) تو پھر یہ گواہی کالعدم ہے۔ اور نکاح بلا ضرر باقی ہے، وعلمها باطن موکول إلی من یعلم السرائر۔

(۲) صورت ثانیہ میں بھی اس گواہی سے وقوع طلاق کا حکم نہیں ہوسکتا اور نہ اس گواہی کی بنا پر عورت پر علیحدگی کو واجب کہا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ گواہ اس تاخیر شہادت کی وجہ سے فاسق ہیں جن کی شہادت شرعاً معتبر نہیں۔

قال فی الدر: ومتی أخر شاهد الحسبة شهادته بلا عذر فسق فترد کطلاق امرأة أی بائنا وعتق أمة وتدبیرها وکذا عتق عبد وتدبیره۔ وفی رد المحتار عن الظهیریة إذا شهد اثنان علی امرأة أن زوجها طلقها ثلثا، أو علی عتق أمة، وقالا: کان ذلک فی العام الماضی جازت شهادتهما وتأخیرهما لا یوهن شهادتهما۔ قیل وینبغی أن یکون ذلک وهنا فی شهادتهما إذا علما أنه یمسکها امساك الزوجات والا مار فا ذا أخروها صاروا فسقة اھ ج ۴ ص ۵۲۳۔

قلت: وبالنظر إلی العلة ینبغی أن لا تقبل شهادتهما بالتأخیر فی زماننا بحال، فإن الزمان زمان الفساد، وربما یطلق الزوج امرأته ویمسکها امساك الزوجات، فعلی الشهود التعجیل فی مثل هذه الشهادات، فإذا أخروا فسقوا، واللّٰہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللّٰہ عنہ
۵ / ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ

**باوجود بینہ کے مدعی علیہ کا قسم کھانا**

سوال (۸۰) ہندہ مدخولہ نے دعویٰ کیا کہ میرے زوج نے مجھ کو تین طلاق دی ہے بلفظ صریح۔ ہندہ کے گواہوں نے دو طلاق کی شہادت دی ہے، عورت مدعیہ نے ایک گواہ سے کہا کہ تو قسم کرتا ہے؟ کہ مجھ کو اس نے دو طلاق دی ہے تین نہیں، اس نے کہا کہ ہاں کرتا ہوں، ایسے حلف کرکے دو طلاق کی شہادت دے گیا، اور دوسرے کو مدعیہ نے حلف نہ دی، بعدہ

قاضی نے زوج کو قسم بھی نہ دی، خالد کہتا ہے کہ زوجہ نے جبکہ گواہ کو قسم دی تو گویا اس نے مدعی علیہ کو قسم سے بری کر دیا، اور اپنے حق تحلیف کو ساقط کر دیا، لہٰذا اب زوج پر حلف نہ آئے گی، بکر کہتا ہے کہ جبکہ گواہ مطابق دعوی نہ گزرے کہ دعوی میں تین طلاق کا ذکر ہے، اور وہ دو بیان کرتے ہیں تو وہ گواہ کالعدم ہوئے، اور گواہ پر اس مقام میں قسم بے قاعدہ ہے، بلکہ زوج پر قسم عائد ہوتی ہے۔ جب تک کہ زوج قسم نہ کرے تب تک عورت کے بقاء نکاح کا حکم دینا غلط ہے، اور بعد قسم کے بھی، اگر عورت جانتی ہے کہ مطلقہ ثلثہ ہوں، مگر اثبات سے عاجز ہوں، تو اس کو عند الدیانۃ خاوند کے پاس رکھنا حرام ہے، کیونکہ مرد نے دروغ قسم کی ہے۔

قال الشامی فی کتاب القضاء فی باب الحبس وکما لو حکم القاضی بکذب الشہود حیث لا ینفذ أصلاً کالقضاء بالیمین الکاذبۃ، لو ادعت أن زوجہا أبانہا بثلث. وأنکر الزوج فحلّفہ القاضی. فحلف والمرأۃ تعلم أن الأمر کما قالت، لا یسعہا المقام معہ، ولا أن تأخذ شیئاً من میراثہ وفی الخلاصۃ لا یحل وطئہا اجماعاً اھ

حضور کتاب کی عبارت سے سنداً تحریر فرماویں کہ کس کا قول درست ہے، اسی کی پشت پر جواب عنایت فرمائیں۔

## الجواب

قاعدہ یہ ہے کہ اول مدعی پر بینہ قائم کرنا ضروری ہے، اگر وہ بینہ قائم نہ کر سکے، تب مدعی علیہ سے قسم لی جاتی ہے، اور اگر مدعی نے بینہ قائم کیا، مگر بینہ سے اثبات دعوی نہ ہو سکا، یا اس کے خلاف ہوا۔ تو دعوی خارج کر دیا جائے گا، مدعی علیہ سے قسم نہ لی جائے گی، پس صورت مذکورہ میں ہندہ کا دعوی خارج ہے اور زوج پر حلف عائد نہیں۔

قال فی العالمگیریۃ: فإن صحت الدعوی سئل المدعی علیہ عنہا، فإن أقر أو أنکر فبرھن المدعی. فقضی علیہ ولا حلف بطلبہ، کذا فی کنز الدقائق۔ وفیہ ایضاً، ولا یحلف مع وجود البرھان إلا فی مسائل أعدہ منا، قلت: وھذہ المسئلۃ لیست منہا۔

ہاں صورت مستورہ میں اگر عورت کو معلوم ہے کہ شوہر نے مجھ کو تین طلاق دی ہیں جیسا کہ اس کے دعوی سے ظاہر ہے تو اس کو شوہر کے پاس رہنا، اور اس کو اپنے اوپر قابو دینا جائز نہیں بلکہ علیحدگی واجب ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۴ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

## دعوی کے اندر شاہد اور مدعی میں تاریخ کے اندر اختلاف یا تردد ہوجانے کا حکم

سوال: زید نے ہندہ پر دعوی نکاح میں کہا کہ تقریباً دس برس سے ہندہ کے ساتھ میرا نکاح ہوا ہے گواہوں نے بھی لفظ تقریباً یا تخمیناً دس برس کا بیان کیا، قاضی نے جواب دیا کہ دعوی بھی غلط اور شہادت بھی مردود ہے، کیونکہ نکاح میں تعیین وقت ضروری ہے۔

لسان الحکام میں ہے: إذا اختلف الشاهدان في الزمان والمكان في الخيانة والغصب والقتل والنكاح لا تقبل اھ

اور لفظ حسبان و تقریباً سے جزم نہیں پیدا ہوتا، ہوسکتا ہے کہ دعوی میں دس روز کم دس برس ہوں، اور شہادت میں پانچ روز یا زیادہ ہوں۔ ان سب صورتوں پر تقریباً دس برس کا اطلاق کئے جاتے ہیں (یہ دعوی رجلین علی امرأۃ واحدۃ نہیں جو کہ تعیین و سبقت وقت ضروری ہو)

کنز الدقائق کی کتاب الشہادات میں ہے: هي إخبار عن مشاهدة وعيان لا عن تخمين وحسبان۔ اھ

طحطاوی علی الدر میں ہے:

ويبقى من الشروط أن لا تنطلي على الجزم اھ

اس قسم کے الفاظ صد ہا دعاوی فیصل شدہ سابق قضاۃ میں موجود ہیں، کسی اہل علم نے کہا ہے کہ اگر لفظ حسبان و تقریباً صلب دعوی و شہادت میں نہ ہوں بلکہ زوائد اور تفصیل بیان میں ہو تو مضر نہیں، مثلاً دعوی کیا کہ ہندہ میرے منکوحہ ہے مدعی سے پوچھا ہوا کہ کتنا زمانہ ہوا، جواب دیا کہ تخمیناً دس برس ہوئے گواہوں نے بھی کہا کہ بے شک ہندہ اس کی منکوحہ ہے ان سے سوال ہوا کہ کتنا زمانہ ہوا، جواب دیا تقریباً دس برس ہوئے

ہوں گے۔ تو اس صورت میں اصل دعوی و شہادت میں جزم ہے۔ حسبان نہیں، بلکہ حسبان جواب سوال میں آیا جو کہ اصل دعوی سے زائد ہے، مگر اس اہل علم نے کتاب نہ بتائی، اب حضور سے سوال ہے کہ اس اہل علم کا قول کہاں لکھا ہے؟ یا کہ مطلقاً دعوی و شہادت ایسا لفظ مفسد دعوی ہے۔ عبارت کتاب سے تشفی فرمایئے۔ زادک اللہ اجراً وذخراً وعلماً وعملاً۔

## الجواب

دعوی اور شہادت دونوں میں تاریخ کا ذکر بلفظ جزم لازم ہے۔ اگر ذکر کرتے، گو تاریخ کا ذکر فی نفسہ ضروری نہیں پس اگر تاریخ بلفظ محتمل بیان کی گئی، تو دعوی اور شہادت مسموع نہ ہوگا۔

وکذالک إذا ذکر التاریخ فی الدعوی علی ھذا الوجہ، بأن قال: ایں عین ملک من ست از دہ دوازدہ سال" فانہ لاتسمع دعواہ، وکذلک إذا ذکر الشھود التاریخ فی شھادتھم علی ھذا الوجہ لاتقبل شھادتھم، کذا فی العالمگیریۃ ج ۳ ص ۲۲۔

**نکاح خواں کی شہادت قبول کرنے میں تفصیل ہے**

سوال:- نکاح کا وکیل تو جدا ہے۔ مگر امام مسجد نے ایجاب وقبول کرایا، بعدہ شہادت بھی دی، کہ ھندہ منکوحہ زید ہے، اور میں نے خود نکاح پڑھایا ہے آیا اس عبارت طحطاوی سے "قولہ لو بإثبات النکاح أی لاتقبل لإثبات النکاح لانھا شھادۃ علی فعل نفسہ، قال الشامی انکر الورثۃ النکاح فشھد رجل قد تولی العقد، یذکر النکاح ولا یذکر انہ تولاہ، اھ" آیا نکاح خواں کو متولی عقد نکاح کا کہا جائے گا یا نہ؟ اور اس کی شہادت منظور ہوگی یا کیا؟

## الجواب

نکاح خواں متولی عقد نہیں ہے وہ سفیر محض ہے۔ وکیل بالنکاح جس کی شہادت قبول نہیں وہ ہے جو ایجاب وقبول کرتا ہے پس اگر وہ شخص جس نے نکاح خواں کو ایجاب کا وکیل بنایا، اور نکاح پڑھنے کی اجازت دی ہے مجلس عقد میں حاضر ہو، تب تو نکاح خواں کوئی چیز نہیں، محض سفیر ہے۔ اور اگر موکل حاضر عقد نہ ہو تو نکاح خواں ہی وکیل بالنکاح

ہے۔ پس اگر اس صورت میں وہ شاہد نکاح بنایا جائے تو اس کو صرف اتنا کہنا چاہیے کہ یہ عورت فلاں کی منکوحہ ہے میں اس کی شہادت دیتا ہوں یہ نہ کہے کہ میں نے اس کا نکاح پڑھایا تھا، ورنہ اپنے فعل پر شہادت ہوگی جو معتبر نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ متولی عقد ہے اور صورت اولیٰ میں، یعنی جبکہ موکل حاضر عقد ہو معتبر شخص ہے متولی عقد نہیں، اس لیے اس کی شہادت مطلقاً معتبر ہے، تو اپنے نکاح پڑھنے کا ذکر بھی کر دے، مگر شرط یہ ہے کہ ذکر نکاح خوانی کے ساتھ موکل کا حاضر مجلس نہ ہونا بھی بیان کر دے جبکہ شہادت سے کوئی نفع نکاح خواں کو بھی پہنچتا ہو، اس صورت میں اس کی شہادت مطلقاً معتبر نہ ہوگی، مثلاً مدعی نے دعوی کیا کہ منکوحہ وقت نکاح کے معتدہ یا نابالغہ تھی، اور نکاح خواں اس کے فارغ یا بالغ ہونے کی شہادت دے تو معتبر نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ اپنے فعل کی صحت کو ثابت کر رہا ہے، جس میں یہ متہم ہے۔ ھذا ما فھمتہ من القواعد، واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

تاریخ بالا۔

**جو احکام تحت القضاء داخل نہیں ان کا حوالہ**

سوال: جو احکام تحت القضاء داخل نہیں، آیا وہ حصر کے ساتھ کہیں بیان ہیں یا کہ ان کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ ہے جس سے کل افراد و احکام بالقوۃ معلوم ہو جائیں، جناب حوالہ کتاب و باب تحریر فرماویں تو خوب ہے،

الجواب

عالمگیریہ (ج ۳ ص ۱۹۰ و ۱۹۱ و ۱۹۳) میں باب فیما یجوز فیہ قضاء القاضی وما لا یجوز منعقد کیا ہے، قابل ملاحظہ ہے۔

فقط حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

تاریخ بالا۔

**زوجہ ثانیہ کا اس رقم کا دعوی کرنا جو زوجہ اول کے گھر کے دور ہونے کی وجہ سے کرایہ میں صرف ہوتی ہے**

سوال: ایک شخص کی دو بیوی ہیں، ایک کے مکان دور ہونے کی وجہ سے للعہ ماہ روپیہ راہ خرچ ہوتا ہے

دوسرے کے مکان نزدیک ہونے کی وجہ سے خرچ نہیں ہے۔ اب دوسری بیوی کیا للعسم
یلم روپیہ شوہر سے دعویٰ کرسکتی ہے؟

## الجواب

القسم عبارۃ عن التسویۃ فی البیتوتۃ والنفقۃ والسکنیٰ اھ شامی
(ج ۲ ص ۶۵۶)

اور ظاہر ہے کہ جو روپیہ سفرخرچ میں صرف ہوتا ہے وہ زوجہ کے نفقہ کے زیادہ نہیں ہوا
لہٰذا دوسری بیوی کو اس میں برابری کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۵/ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ

### شہادت علی الطلاق کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ ایک شخص کی دو عورتیں ہیں دوسری عورت کا باپ کہتا ہے کہ شخص مذکور نے جب میری لڑکی کے ساتھ نکاح کیا تھا تو پہلی عورت کو میرے اور ایک دوسرے شاہد کے روبرو طلاق ثلثہ سے چھوڑا تھا، مگر شخص مذکور منکر ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی، گواہ اس کا دوسرا خسر اور ایک مرد ہے، کیا شخص مذکور کا خسر ثانی شرعاً شاہد ہوسکتا ہے یا نہیں، کیونکہ عرفاً وہ متہم ہے کہ اپنی دختر کی خاطر شہادت دے رہا ہے کہ اس پر سوکن نہ ہو۔ درمختار میں "ولا تقبل شھادۃ عدو بسبب الدنیا" رد المحتار (إذا یجلب بھا منفعۃ، أو یدفع بھا عن نفسہ مضرۃ لا تقبل اھ بتغیر (ج ۴ ص ۳۸۱)

نام بردہ کے خسر کی لڑکی اپنے باپ کے گھر میں ہے اور پہلی عورت جس کی نسبت طلاق کا الزام ہے، شخص مذکور کے پاس ہے، کیا عبارت بالا کی وجہ سے اس کی خسر کی عداوت بھی دنیوی قرار دے کر اس کے گواہ مردود ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا

بندہ منظور حق ۔ از نوشہرہ
ضلع شاہپور، تحصیل ...
۱۷/ محرم الحرام ۱۳۴۳ھ

## الجواب

شہادت علی الطلاق وہ معتبر ہے جو کسی قاضی مسلم کے اجلاس میں ہو، بدون اس کے شہادت کا اعتبار نہیں، لہذا یہ شہادت اگرخسر کی یہ شہادت مقبول نہ ہوتی جب بھی اس سے ثبوت طلاق نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن آیا یہ شہادت اگر عورت کے سامنے شاہدین نے دی ہو، تو اس پر عمل کرنا واجب ہے یا نہیں؟ اس کے لئے یہ حکم ہے کہ خسر کی شہادت تو بہر حال رد ہے۔ لیکن یہ بتلایا جائے کہ دوسرا شاہد نیک آدمی ہے یا فاسق ہے، اور اس نے شہادت بعد نکاح ثانی کے ادا کی، یا دیر میں؟ اور کتنی دیر میں؟۔

قال فی الدر: وجاز علی أصله، إلا إذا شهد علی أبیه لأمه، ولو بطلاق ضرتها، والأم فی نکاحه اهـ (ج ۴ ص۵۰۵)

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون

۲۸ ر محرم سنہ ۱۳۴۳ھ

**مقدمہ میں ایک مرد دو عورتیں گواہ ہوں تو قاضی عورتوں میں تفریق کرسکتا ہے یا نہیں؟**

سوال:۔ اگر ایک مقدمہ میں دو عورتیں اور ایک مرد گواہ ہوں، اور قاضی عورتوں میں تفریق کرکے ان کے بیانات سنے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

بہتر تو یہ ہے کہ قاضی عورتوں میں تفریق نہ کرے، کیونکہ دو عورتیں مل کر بمنزلہ ایک گواہ کے ہیں۔ لیکن اگر کسی ضرورت سے تفریق کردے تو جائز ہے۔ بینہ کی حجیت میں اس سے کچھ نقصان نہ لازم آئے گا۔

قال فی البدائع (ج ۷ ص۲۷۱) وإذا اتهم الشهود فلا بأس بأن یفرقهم عند أداء الشهادة، فیسألهم أین کان، ومتی کان؟ فإن اختلفوا اختلافا یوجب رد الشهادة ردها، وإلا فلا. اهـ

قلت: وهذا لعمومه یجوز التفریق بین المرأتین أیضا،

وقال فی الدر: أو رجل وامرأتان ولا یفرق بینهما، لقوله تعالی (فتذکر

إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ) اھ

وفي رد المحتار حكي أن أم بشر بن شهدت عند الحاكم فقال الحاكم فرقوا بينهما، فقالت: ليس لك ذلك، قال تعالى: أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ) فسكت الحاكم، كذا في الملتقط، بحر (ج ۳ ص ۵۴۶)

واللہ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۴ رجب ۱۳۲۱ھ

## عدد طلاق میں گواہوں کے اختلاف کی ایک صورت

سوال: ما قولہم رحمہم اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں علیم الدین

فقیر کی بیوی نے بیان کیا کہ جس وقت میرا شوہر مجھ پر غصہ ہو کر مجھ کو مارنے آیا تو اس وقت میں گھر میں نہ تھی، بعد اس کے میں گھر میں آکر مادر شوہر کو سنا کر وہ میرے شوہر کو کہہ رہی ہے کہ تو نے کیا کہا؟ پھر اس عورت نے مجھ کو کہا کہ تو گھر میں نہیں آسکے گی، تجھ کو چھوڑ دیا ہے علیم الدین فقیر کہتا ہے کہ میں نے اپنی عورت کو غصہ میں جو کچھ کہا وہ مجھ کو یاد نہیں، اس وقت میری قوت خیالی نہ تھی، بعد اس کے لوگوں نے سنا کہ میں نے طلاق طلاق کر کے کہا ہے، اس پر تین شخص جو وہاں موجود تھے گواہی دیتے ہیں، ان میں دو مرد مسمیان امجد علی و صفدر علی اور ایک عورت مسماۃ مادر شوہر مذکورہ، چنانچہ امجد علی نے بلفظ "اشہد" بیان کیا کہ علیم الدین فقیر نے طلاق طلاق کر کے کہا، مگر کسی کا نام نہیں لیا، اور صفدر علی نے بلفظ "اشہد" بیان کیا کہ علیم الدین فقیر کو سنا کہ اس نے کہا ایک طلاق، دو طلاق، بائن طلاق میں نے دی ہے مگر کسی کا نام نہیں لیا، مادر شوہر نے بلفظ "اشہد" بیان کیا کہ علیم الدین کو میں نے سنا کہ اس نے کہا کہ ایک طلاق، دو طلاق، میں نے دیا بائن طلاق، مگر کسی کا نام نہیں لیا۔

اب اس صورت میں اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ اور بر تقدیر وقوع

---

۱ قلت: هذا محمول عندنا على أدب القاضي، ومما ينبغي له: أن لا يفعله ۱۲ منه

طلاق کے کتنے طلاق واقع ہوئیں؟ اور کیا حکم ہے کہ پھر اس عورت کو بلا تحلیل رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

## الجواب

صورت مسئولہ میں جب علیم الدین مذکور اپنی بیوی پر غصہ ہوا اور اس کو مارنے چلا اور اس کے بعد طلاق طلاق کہا، تو اس میں اضافت معنوی ہے۔ گو نام نہ لیا ہو، پس مراد اپنی ہی بیوی کو طلاق دینا ہے۔

صرح بمثل ذالك فی رد المحتار (ج ۲ صفحہ ) حیث قال: لأن العادة أن من له امرأة إنما یحلف بطلاقها لا بطلاق غیرها، فقوله: إنی حلفت بالطلاق ینصرف إلیها ما لم یرد غیرها، لأنه یحتمله کلامه اھ۔

پس صورت مسئولہ میں زوجہ علیم الدین پر طلاق واقع ہوگئی، لیکن چونکہ ایک گواہ امجد علی نے لفظ طلاق صرف دو مرتبہ بیان کیا ہے، اور تین دفعہ کے بیان کرنے والے ایک مرد اور ایک عورت ہیں اس لئے اس صورت میں تین طلاق واقع نہ ہوں گی، بلکہ صرف دو طلاق رجعی واقع ہوں گی، جس سے نکاح باطل نہیں ہوا، بلکہ عدت کے اندر بدون تجدید نکاح کے رجعت ہو سکتی ہے، اور بعد عدت کے تجدید نکاح ہو سکتی ہے، اور یہ اس صورت میں ہے کہ امجد علی کا بیان سوال میں جس طرح لکھا ہے، اسی طرح واقع میں ہو، اور اگر وہ بھی دوسرے گواہوں کی طرح تین بار لفظ طلاق کا سننا بیان کرتا ہو، تو پھر یہ حکم نہ ہوگا۔ بلکہ دوبارہ سوال کیا جائے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۱۲ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ

**شہادت حسبہ میں بلا عذر شرعی تاخیر موجب فسق ہے۔**

سوال: شی وغ آپس میں حقیقی خالہ زاد بھائی ہیں، اور دونوں نے ایک دوسرے کی ماں کا دودھ پیا ہے۔ چنانچہ رضاعی بھائی بھی ہیں۔ اور ہندہ ایک عورت ہے جس کا حقیقی علاتی بھتیجہ (برادر زادہ) ش ہے جن

ہندہ مسٹس کی حقیقی علاتی پھوپی ہے۔ اس کا شئ سے عقد ہوگیا، جس کو زمانہ اٹھارہ برس کا گزر گیا، اور ہندہ سے پانچ لڑکے بھی پیدا ہوئے تین فوت ہوگئے، اور دو حی القائم ہیں، نکاح دس ہزار روپیوں پر طے ہوا تھا، لیکن اس سے قبل کسی کو مسٹس و شئ کی رضاعت کا مطلق علم نہ تھا، اور نہ آج تک دونوں کی ماؤں نے اس کا ذکر کسی سے کیا۔ اور نہ پہلے، اور نہ اب اس کی اہمیت کو کچھ خیال کیا، اور دونوں کی مائیں ہنوز زندہ تندرست و صحیح الدماغ ہیں۔ لیکن دونوں کے بیان سے اب رضاعت مسٹس و شئ کی معلوم ہوئی، دونوں کی مائیں دیندار اور پابند صوم و صلوٰۃ ہیں، رضاعت کا واقعہ بالکل سچ ہے، پس ایسی صورت میں کیا ہونا چاہئے، جبکہ دونوں لڑکے چودہ و گیارہ سال کے ہیں، تعلیم ہو رہی ہے۔ وہ اولاد جائز ہیں؟ اور وارث جائداد ہیں؟ ان کی تعلیم و تربیت و کفالت کس پر فرض ہے۔ باپ پر یا ماں پر، ہندہ ایک پردہ نشین عورت ہے، وجہ معاش کوئی نہیں، پس نان و نفقہ و مہر پانے کی مستحق ہے؟ نکاح اب تک قائم ہے؟ بصورت ترک تعلق عورت کی وجہ معاش کہاں سے ہو؟ اور کیوں کر زندگی بسر ہو؟

دوسرے بلا طلاق نکاح کر سکتا ہے۔ باوجود اس اعلان کے ایک سال تک شوہر نے کچھ توجہ نہ کی، لیکن اب وہ دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے، اس لئے کسی خانگی معمولی تکرار پر شوہر نے نان و نفقہ بند کر دیا اور ترک تعلق کیا، ہندہ سخت تکلیف و پریشانی میں ہے مہر بھی ادا کرنا نہیں چاہتا، اور کل حقوق سے محروم کر دیا ہے۔

## الجواب

صورت مسئولہ میں ہر دو مدعی رضاعت کا دعویٰ باطل اور رد ہے اور یہ دونوں مائیں جو مسٹس اور شئ کی رضاعت کو اب اٹھارہ سال کے بعد بیان کرتی ہیں شرعاً بلا وجہ تاخیر شہادت کی وجہ سے فاسق ہیں، اس لئے ان کی شہادت رد ہے۔

قال فی الدر المختار شاهد الحسبة شهادته بلا عذر فسق فترد

---

ــــہ اور اگر وہ اس تاخیر کی کوئی وجہ بیان کریں، تو وجہ لکھ کر دوبارہ سوال کریں۔

۱۲ ظ

كطلاق امرأة أى بائنا وعتق امته وتدبيرها وكذا الرضاع كما عرف بابه اھ (ج ۴ ص۲۷۰ طبع الشامی)

وفى تنقيح الفتاوى الحامدية، لا تقبل شهادتهم بعد أن أخروا خمسة أيام من غير عذر إن كانوا عالمين بأنهما يعيشان عيش الأزواج والشهادة بدون الدعوى تجوز فى هذه المسئلة من معين المفتى شهدوا بالحرمة المغلظة بعد ما أخروا شهادتهم خمسة أيام من غير عذر، لا تقبل إن كانوا عالمين بأنهما يعيشان عيش الأزواج جامع الفتاوى اھ ج ۱ ص ۳۲۸)

دوسرے اگر عورتیں شہادت میں تاخیر بھی نہ کرتیں تو صرف دو عورتوں کے قول سے ثبوت رضاعت نہیں ہو سکتا جب تک ان کے ساتھ کوئی مرد نہ ہو۔

قال فى الدر، والرضاع حجته حجة المال، وهى شهادة عدلين أو عدل وعدلتين، لكن لا تقع الفرقة الا بتفريق القاضى اھ (ج ۲ ص۶۴۵)

البتہ اگر یہ دو عورتیں عادل ہوتیں، اور احسن کے قول سے مرد یا عورت کو دل میں سچائی کا خیال پڑ جاتا، تو ان کو احتیاط کرنا بہتر ہوتا، احتیاط واجب اس وقت بھی نہ ہوتی اور اب تو یہ دونوں شرعاً تاخیر بیان سے فاسق ہو گئیں، اب ان کے قول کا اعتبار نہیں، اور ع اور ش کا نکاح بالکل درست ہے اور ان کی اولاد سب حلال ہے، اور شوہر پر زوجہ کے سب حقوق کا ادا کرنا واجب ہے، اور ان عورتوں کے قول پر اس کا خیال کرنا لغو ہے،

والله اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ

# القول الماضى فى نصب القاضى

(نصب قاضی کے متعلق چند سوالات)

علماء دین و مفتیان شرع متین سے التماس ہے کہ ذیل کے سوالوں کے جوابات لکھ کر

داخل حسنات ہوں،

(۱) کن کن معاملات میں قاضی کی ضرورت ہے؟

(۲) اور کون شخص قاضی ہو سکتا ہے؟

(۳) اگر اس وقت ہندوستان میں گورنمنٹ اپنی طرف سے کسی مسلمان عالم کو فسخ نکاح وغیرہ امور کے لئے قاضی بنا دے تو وہ قاضی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور فسخ نکاح وغیرہ کا اسے اختیار ہوگا یا نہیں ___؟

(۴) اگر کسی جگہ کے مسلمان بطور خود مل کر کسی کو ان کاموں کے لئے قاضی بنا دیں تو اُسے فسخ نکاح وغیرہ کا اختیار ہوگا یا نہیں؟

(۵) چونکہ فی زمانہ نکاح وطلاق ومہر وغیرہ کی بابت زیادہ جھگڑے ہونے لگے ہیں، اور اس کے متعلق بہت سی بے ضابطگیاں اور جعل سازیاں ہونے لگی ہیں۔ اگر گورنمنٹ اس کے انسداد کی غرض سے نکاح ومہر وطلاق وغیرہ کو درج رجسٹر کرنا قرار دے دے یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور مہر کی آیت إِذَا تَدَايَنتُم الآیہ کے تحت میں ہو کر لکھنا نص مروج کے مطابق ہوگا یا نہیں؟ اور شامی ج ۲ صـــ ۲۷ میں جو عبارت "ولما الكتابة ففي عتق المحيط يستحب أن يكتب للعتق كتاباً، ويشهد عليه صيانة عن التجاحد، كما في المداينة، بخلاف سائر التجارات للحرج لأنها مما يكثر وقوعها، وينبغي أن يكون النكاح كالعتق، لأنه لاحرج فيه" مرقوم ہے، اس سے اس کا لکھنا داخل استحباب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

محمد بشیر الدین صدیقی

## الجواب عن السوال الاول

(۱) في الدر المختار (وله) أي للولي (إذا كان عصبة) ولو غير محرم كابن عم في الأصح، خانية۔ (والاعتراض في غير الكفو) فيفسخه القاضي[1] وفي الشامي (قوله عصبة) أي بنفسه، إلى كما في الجوهرة (قوله في غير الكفو) أي في تزويجها نفسها من غير كفو، وكذا له الاعتراض في تزويجها نفسها أقل من مهر مثلها، حتى يتم مهر المثل أو يفرق القاضي كما سيذكره

[1] في الهندية عن السراج ولا تكون هذه الفرقة الا عند القاضي شامي ج ۲ صـــ ۴۲۵ ۱۲ منہ

المصنف فی باب الکفاءۃ (قولہ فیثبت القاضی) فلا یثبت ہذہ الفرقۃ إلا بالقضاء، لأنہ مجتہد فیہ، وکل من الخصمین یتشبث بدلیل، فلا ینقطع النکاح إلا بفعل القاضی (ج ۲ ص[illegible]) باب الولی۔

وفی الشامی (قولہ للفسخ) أی ہذا الشرط إنما ہو للفسخ، لا لثبوت الاختیار۔ وحاصلہ: أنہ إذا کان المزوج للصغیر والصغیرۃ غیر الأب والجد، فلہما الخیار بالبلوغ أو العلم بہ، فإن اختار الفسخ لا یثبت الفسخ إلا بشرط القضاء (ج ۲ ص[illegible]) باب الولی۔

وفی الدر، وبحرمۃ المصاہرۃ لا یرتفع النکاح حتی لا یحل لہا التزوج بآخر إلا بعد المتارکۃ وانقضاء العدۃ، وفی الشامی (قولہ بحرمۃ المصاہرۃ) قال فی الذخیرۃ: ذکر محمد فی نکاح الأصل: أن النکاح لا یرتفع بحرمۃ المصاہرۃ والرضاع، بل یفسد۔ (قولہ إلا بعد المتارکۃ) وعبارۃ الحاوی إلا بعد تفریق القاضی أو المتارکۃ ج ۲ ص[illegible] باب المحرمات۔

وإذ جن الزوج جنونا حادثا فہو کالعنین یؤجلہ القاضی سنۃ کما فی العالمگیریہ ج ۲ ص۱۵۴۔

وإذا وقع النکاح فاسدا فرق القاضی بین الزوج والمرأۃ عالمگیریۃ ج ۲ ص۱۴۰۔

والمفقود یحکم بموتہ بمضی تسعین سنۃ، والمختار أنہ یفوض إلی رأی الإمام [illegible] وینصب القاضی من یحفظ مالہ ویقوم علیہ ویقبض غلاتہ اھ عالمگیریۃ ج ۲ ص[illegible]۔

وإذا طلبت المرأۃ من القاضی أن یفرض لہا النفقۃ من الزوج، فإن کان حاضرا صاحب المائدۃ، فالقاضی لا یفرض لہا النفقۃ وإن طلبت، إلا إذا ظہر للقاضی أنہ یضربہا، ولا ینفق علیہا فح یفرض لہا النفقۃ، وإن لم یکن

---

عہ فی الہندیۃ عن السراج، ولا تکون ہذہ الفرقۃ إلا عند القاضی۔
شامی ج ۲ ص[illegible] ۱۲ منہ

صاحب المائدة فالقاضي يفرض لها النفقة في كل شهر وأمرة أن يعطيها، أه ج ۲ صـ۲۶۹ ـ

وقال في ترتيب الأولياء: ثم السلطان ثم القاضي (إذا كان ذلك في عهده ومنشوره) ومن نصبه القاضي (بهذا الشرط أيضاً) عالمگيرية، ج ۲ صـ۱۱ ـ

صرف باب نکاح ہی میں امور ذیل کے لئے قاضی کی سخت ضرورت ہے۔

(۱) کسی لڑکی کا نکاح بلوغ سے پہلے اس کے ولی (غیر اب وجد) نے کر دیا، اور بلوغ کے وقت لڑکی اس نکاح سے راضی نہیں، تو اس نکاح کو قاضی ہی فسخ کرسکتا ہے دوسرا نہیں۔

(۲) کسی بالغ عورت نے اپنا نکاح خاندانی مہر سے کم پر، یا غیر کفو سے کر لیا، تو اصل مذہب میں ورثہ قاضی کے یہاں دعوی کر کے اس نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں، یا مہر پورا ہو جائے،

(۳) کسی شخص نے اپنے بیٹے کی بیوی سے زنا کیا، یا زنا کی نیت سے ہاتھ لگایا، تو یہ عورت اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں رہی، مگر نکاح نہیں ٹوٹا، جب تک قاضی نکاح کو فسخ نہ کرے یا متارکت نہ ہو، اور آج کل بعض لوگ متارکت نہیں کرتے تو بدون قاضی کے ایسی عورتوں کو سخت تکلیفیں ہوتی ہیں۔

(۴) شوہر نامرد ہو، اور بیوی کو طلاق بھی نہ دیتا ہو تو اس نکاح کو ایک سال مہلت دینے کے بعد قاضی فسخ کرسکتا ہے۔

(۵) اسی طرح شوہر مجنون ہو جائے تو اس کے نکاح کو بھی قاضی ہی فسخ کرسکتا ہے بدون قاضی کے مسلمانان ہند کو ان مسائل میں سخت تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔

(۶) کسی عورت کا خاوند لاپتہ ہو جائے تو اس کا نکاح بھی خاص مدت کے بعد جو قاضی کی رائے پر ہے، قاضی ہی فسخ کرسکتا ہے۔

(۷) اگر کسی نابالغ لڑکی کا کوئی ولی نہ ہو، اور پرورش کے لئے جلدی نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو اس کا ولی قاضی ہے، بدون قاضی کے ایسے موقع پر بڑی دقت ہوتی ہے۔

---

عـــہ جس کی کچھ شرط نہیں ہے ۱۲

(۸) اگر شوہر نان ونفقہ میں تنگ کرتا ہو، تو قاضی اس صورت میں عورت کے لئے نفقہ مقرر کر سکتا ہے۔

(۹) اگر کوئی شخص عورت کو طلاق دے کر دعوی کرے کہ میں نے ہوش وحواس کی حالت میں طلاق نہیں دی، بلکہ میں مدہوش تھا، تو اس صورت میں قاضی کے یہاں اس کو دعوی کرنا لازم ہے اگر قاضی اس طلاق کو طلاق تسلیم نہ کرے تب تو عورت شوہر کے پاس رہ سکتی ہے ورنہ نہیں،
(کما صرح بہ فی الدر والشامیۃ، باب الطلاق والمدھوش)

(۱۰) کسی نے نکاح فاسد کر لیا تو اس کو بھی قاضی فسخ کر سکتا ہے یا شوہر چھوڑ دے، اگر وہ نہ چھوڑے تو بدون قاضی کے سخت تکلیف ہوتی ہے

یہ چند مسائل صرف باب نکاح کے بطور نمونہ کے عرض کئے گئے ہیں باقی ابواب نسب ووقف، میراث وغیرہ میں جو مسائل نصب قاضی پر موقوف ہیں وہ اس سے بھی زیادہ ہیں جن میں بدون قاضی کے مسلمانان ھند کو سخت تکلیف وپریشانی اور دقت شدیدہ کا سامنا ہوتا ہے پھر یا تو ان میں حکم شرعی کے خلاف ہوتا ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جو احکام میں سستی کرتے ہیں، یا عمر بھر عورت کو یا مرد کو مصیبت کے ساتھ گذرنا پڑتا ہے، اللہ تعالی ہمارے حال پر رحم فرمائیں، اور کوئی صورت ایسی پیدا کردیں کہ گورنمنٹ مسلمانوں کی اس تکلیف کا احساس کرکے جلد ہندوستان میں منصب قضاء کو قائم کردے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

## جواب سوال دوم

فی العالمگیریۃ: والقضاء فی الشرع قول ملزم، یصدر عن ولایۃ عامۃ کذا فی خزانۃ المفتین، ولا تصح ولایۃ القاضی حتی یجتمع فی المولی شرائط الشہادۃ، کذا فی الہدایۃ۔ من الاسلام والتکلیف والحریۃ وکونہ غیر أعمی ولا محدودا فی القذف۔ ولا أصم، ولا أخرس۔ وأما الاطرش الذی یسمع القوی من الاصوات، فالأصح جواز تولیتہ، کذا فی النہر اھ ج ۲ صـ ۱۲۰۔

وفی الدر المختار: القضاء شرعاً فصل الخصومات وقطع المنازعات وارکانہ ستۃ: حکم، ومحکوم بہ، ولہ، ومحکوم علیہ، وحاکم، وطریق و أھلہ اھل الشہادۃ والفاسق أھلہا، فیکون أھلہ۔ لکنہ لا یقلد وجوباً، ویأثم

مقلدہ، کقابل شہادتہ، بہ یفتی اھ (ج ۴ صـ۳۶۵)

اس سے معلوم ہوا کہ قاضی کے لئے صاحب حکومت ہونا رکن قضاء ہے۔ کہ جس مقام پر وہ قضا کرتا ہے وہاں پر اس کی ولایت وحکومت عام ہو۔ گو کسی خاص فرقہ ہی پر ہو اور گو خاص معاملات ہی میں ہو۔

قال فی رد المختار: ثم القاضی تتقید ولایتہ بالزمان والمکان والحوادث. اھ (ج ۴ صـ۳۲۳)۔

غیر صاحب حکومت قاضی نہ ہوگا، اور صحت قضاء کے لئے قاضی میں ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے، مسلمان ہو کافر نہ ہو، عاقل بالغ ہو، آزاد ہو غلام نہ ہو، تو انکھا ہو اندھا نہ ہو، محدود فی القذف نہ ہو، اور بہرہ گونگا نہ ہو۔ باقی دیکھا سنتا ہو تو اس کا مضائقہ نہیں۔ اور ضروری ہے کہ قاضی عالم بھی ہو، اگر مسلمان جاہل کو قاضی بنا دیا گیا، اور وہ مقدمات میں علماء سے استفتار کرکے فیصلہ کردے، یہ بھی ممکن ہے مگر بہتر نہیں، کیونکہ علماء جواب کو بخوبی سمجھتے ہیں، جاہل سے کوتاہی ہوگی، اور غلطی کرے گا، اور عالم کے ہوتے ہوتے جاہل کو قاضی بنانے سے مسلمان گنہگار ہوں گے، جبکہ حکومت کی طرف سے ان کو انتخاب کا حق دیا جائے، اور اگر فاسق کو قاضی بنا دیا جائے تو وہ قاضی ہو جائے گا مگر فاسق کو قاضی بنانا جائز نہیں، اور فاسق وہ ہے جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو اور توبہ نہ کرے یا صغیرہ پر اصرار کرتا ہو، باقی جن مسائل میں قضاء قاضی شرط ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ایسے مسائل میں حاکم کافر کا فیصلہ ہرگز کافی نہیں، حاکم کافر کے فیصلے سے نہ نکاح فسخ ہو سکتا ہے نہ طلاق واقع ہو سکتی ہے، نہ ثبوت نسب ہو سکتا ہے، نہ مفقود کو میت کہا جا سکتا ہے وغیرہ ذلک

## جواب سوال سوم

قال فی الدر: ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر، ولو کان کافرًا، ذکرہ مسکین وغیرہ، إلا إذا کان یمنعہ عن القضاء بالحق فیحرم (ج ۴ صـ۳۶۸)

وفی العالمگیریۃ. والاسلام لیس بشرط أی فی السلطان الذی یقلد کذا فی التاتارخانیۃ اھ ج ۴ صـ۱۶۹

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اگر گورنمنٹ اپنی طرف سے کسی مسلمان کو قاضی

بنادے، اور بھی مسائل میں قضاء مسلم کی ضرورت ہے۔ ان میں اس کو فیصلہ کا اختیار دیدے تو وہ شرعی قاضی ہو جائے گا، اور اس کے فیصلے فسخ نکاح وایقاع طلاق وثبوت نسب وحکم موت مفقود وغیرہا میں نافذ ہوں گے، بشرطیکہ اس کو موافق حکم شرع فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، خلاف حکم شرع فیصلہ پر مجبور نہ کیا جائے۔

## جواب سوال چہارم

قال فی العالمگیریۃ: وإذا اجتمع أهل بلدة علی رجل، وجعلوه قاضیا یقضی فیما بینهم لا یصیر قاضیا، ولو اجتمعوا علی رجل وعقدوا معه عقد السلطنة أو الخلافة یصیر خلیفة وسلطانا اھ (ج ۳ ص ۱۶۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں کسی جگہ کے مسلمان بطور خود بدون گورنمنٹ کی اجازت کے اگر کسی کو قاضی بنالیں تو وہ قاضی نہ ہوگا، کیونکہ اس کی ولایت عامہ نہ ہوگی البتہ حکم ہو جائے گا، جس کا فیصلہ اس وقت معتبر ہوگا جبکہ مدعی اور مدعی علیہ دونوں رضامندی سے اپنے معاملہ کو اس کے سپرد کردیں، اور اگر ایک نے معاملہ سپرد کیا، اور دوسرے نے سپرد نہ کیا تو اس صورت میں حکم کا فیصلہ کالعدم ہے، اور فریقین باہمی رضامندی سے اگر کسی کو حکم بنالیں، اور وہ موافق حکم شرع فیصلہ کردے، تو اسے بھی فسخ نکاح وغیرہ کا اختیار ہوگا اور اس کے فسخ سے نکاح فسخ ہو جائے گا، یعنی معاملہ سپرد کردیا گیا، اور فیصلہ تک

---

عہ قلت: فلا یرد علیه ما فی رد المحتار (ج ۴ ص ۴۲۷) وهذا حیث لا ضرورة، وإلا فلهم أی للعامة تولیة القاضی أیضا، کما یأتی بعده، وقال بعد أسطر: وأما بلاد علیها ولاة کفار فیجوز للمسلمین إقامة الجمعة والأعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین الخ فإن معناه أنه یصیر قاضیا بتراضی المسلمین إذا حصلت له ولایة عامة فی فعل قضائه لما عرفت أن الولایة أحد أرکان القضاء، وأهل الهند لو جعلوا قاضیا منهم بتراضیهم لا یکون له ولایة علی أحد أصلا، کما هو مشاهد من حالهم۔

فافهم ۱۲ منه

تحکیم سے کسی فریق نے رجوع نہ کیا تو اب حکم کا فیصلہ بھی مثل فیصلہ قاضی کے لازم و نافذ ہو جائے گا، پھر کوئی فریق اس کو توڑ نہیں سکتا، بشرطیکہ فیصلہ موافق حکم شرع ہو۔

قال الشامی: أما المحکم فشرطه اهلیة القضاء، ویقضی فیما سوی الحدود والقصاص اھ (ج ۴ ص ۳۶۳)

وفیه ایضًا: التحکیم عرفًا تولیة الخصمین حاکمًا یحکم بینهما ببینة أو اقرار، أو نکول، ورضیا بحکمه۔ (إلی أن) حکم احتراز عما لو رجع عن تحکیمه قبل الحکم أو عما لو رضی احدهما فقط (شامی) صح لو فی غیر حد وقود ودیة علی عاقلة لأن حکم المحکم بمنزلة الصلح، وهذه لا تجوز بالصلح، فلا تجوز بالتحکیم، ویتفرد احدهما بنقضه أی التحکیم بعد وقوعه، فان حکم لزمهما، ولا یبطل حکمه بعزلهما، لصدوره عن ولایة شرعیة اھ ج ۴ ص ۵۴۰۔

## جواب سوال پنجم

نکاح و طلاق و مہر وغیرہ کو درج رجسٹر کرانا شرعًا واجب نہیں ہاں احتیاطًا مستحب ہے اور اگر مصلحت کی وجہ سے انتظامًا اس کو لازم کر دیا جائے تو اس کا بھی کوئی مضائقہ نہیں مگر چند شرطیں اس کے واسطے ضروری ہیں۔

(۱) گورنمنٹ اس کو لازم نہ کرے، بلکہ گورنمنٹ اپنی طرف سے مسلمانوں کے لئے قاضی شرعی مقرر کر دے، جس کی حقیقت اور تعریف جواب سوال دوم میں گذر چکی ہے، پھر وہ قاضی اگر اس کی ضرورت سمجھیں تو کتابت کو لازمی کر دیں۔

(۲) قاضی اگر لازم کریں تو اس کے لازم کرنے کا یہ مطلب نہ ہو کر جو نکاح یا طلاق و مہر درج رجسٹر نہ ہو، تو وہ کالعدم اور غیر معتبر ہوگا، کیونکہ یہ شریعت میں دست اندازی اور صریح تحریف و تبدیل ہوگی، کیونکہ جب شرعًا مسلمانوں پر لکھنا ان معاملات کا ضروری نہیں بلکہ محض زبانی ایجاب و قبول نکاح میں، اور زبانی الفاظ طلاق میں کافی ہیں، تو پھر ان کو بغیر کتابت کے معتبر نہ کرنا شریعت کو بدلنا ہے، جس کو مسلمان ہرگز گوارا نہیں کر سکتے، اور اسی طرح رجسٹری یا اندراج کو لازم کرنے کا قاضی شرعی کو بھی کوئی حق نہیں، ہاں قاضی شرعی بایں معنی لازم کر سکتا ہے کہ اگر کوئی نکاح و طلاق و مہر کو درج رجسٹر نہ کرائے گا تو اس کو سزا دی

جائے گی وبس، باقی غیر مکتوب اور غیر مندرج نکاح وطلاق ومہر وغیرہ کو معتبر سمجھنا اور
اس کے مطابق عمل کرنا لازم وضروری ہے کیونکہ وہ نکاح وطلاق بھی شرعاً ثابت وموافق
ومتحقق ہو چکے ہیں، گو لکھے نہ گئے ہوں۔ اور اسی طرح کا لزوم بھی جس میں صرف سزا دی جائے
اور زبانی معاملہ نکاح وطلاق کو بھی معتبر رکھا جائے، گورنمنٹ خود نہیں کر سکتی، کیونکہ
ہم بتلا چکے ہیں کہ شرعاً لکھنا اور اندراج رجسٹر کرنا ان معاملات کا مسلمانوں پر ضروری
نہیں، بلکہ احتیاط کی صورت میں مستحب ہے، سو گورنمنٹ کسی ایسی دینی بات کو جو ہمارے
دین میں مستحب ہے اگر خود لازم کرے بھی تو ہمارے مذہب میں دست اندازی ہوگی اور
گورنمنٹ کے لازم کرنے سے وہ امر ہم پر لازم نہ ہوگا البتہ حکم قاضی شرعی سے بعض
مباحات ومستحبات شرعاً مسلمانوں پر لازم ہو سکتے ہیں، اور قاضی شرعی کی تعریف
اور حقیقت اوپر بیان ہو چکی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نکاح ومہر وطلاق کے اندراج رجسٹر کو گورنمنٹ ہم پر خود لازم نہیں
کر سکتی کیونکہ یہ معاملات خالص دینی معاملات ہیں، دنیوی معاملات نہیں ہیں، ان
میں گورنمنٹ کو خود دست اندازی نہ کرنا چاہیئے کہ ایک مستحب کام کو مسلمانوں پر لازم کردے
اور اگر مفاسد کی وجہ سے اس کی ضرورت ہو تو اس کی صورت یہ ہونی چاہیئے کہ اول ہندو
ستان میں قضاء شرعی کا محکمہ قائم کیا جائے پھر قاضی شرعی اس کو لازم کردے تو مضائقہ
نہیں، مگر اس لزوم کی وہ صورت نہ ہو جو آج کل عدالت سرکاری میں بیع واجارہ وغیرہ کے
ساتھ لزوم رجسٹری کا معاملہ ہے کہ بدون رجسٹری کے بیع نامہ وہبہ نامہ وغیرہ معتبر ہی
نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ صورت ہو کہ جو شخص اندراج یا رجسٹری نہ کرائے اس کو تنبیہ کے طور
پر سزا کر دی جائے، ورغیر مندرج نکاح وطلاق کو بھی جبکہ گواہی وشہادت سے ثبوت
ہو جائے معتبر سمجھا جائے، ھذا، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

یکم شعبان ۱۳۴۳ھ

اگر شوہر کہے کہ بیوی مہر معاف کر چکی ہے اور خسر اس کو تسلیم نہ کرے تو مدعی کون ہے اور مدعیٰ علیہ کون ہے؟

سوال: مخدومی ومکرمی جناب مولوی ومولانا مفتی قاری صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گذارش یہ ہے کہ کیا

حکم ہے اس مسئلہ میں، کہ نذیر احمد کی زوجہ فاطمہ مرگئی، ان کے باپ مجیر الدین نے فاطمہ کے شوہر نذیر احمد سے مہر کا دعویٰ کیا، نذیر احمد نے کہا میری بیوی نے مہر مجھ کو معاف کیا، مجیر الدین اس بات پر ایک عالم شریعت کو ساتھ لے کر معافی کا حال دریافت کرنے کو نذیر احمد کے گھر گیا، مولوی صاحب نے ان کے گھر والوں سے پوچھا، تو ایک عورت نے کہا کہ جب میں فاطمہ سے کہا کہ اپنے شوہر کو مہر معاف کردو، جواب دیا کہ اگر خدا کا حکم ہے تو معاف کیا، دوسری عورت نے دوسرے وقت کہا کہ اپنے شوہر کو مہر معاف کردو، جواب دیا، دیا ہوں اور کیا دوں، اور دو مرد نے کہا، کہ ہم فاطمہ کی زبانی نہیں سنا ان کے گھر والوں سے سنا ہے کہ مہر معاف کیا ہے اس صورت میں یہاں پر علماء کا اختلاف ہوا ہے، ایک مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں، کہ مجیر الدین مدعی ہے اور نذیر احمد مدعی علیہ پس بمطابق حدیث "البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر" جب مجیر الدین بینہ نہ دے سکا، تو نذیر احمد پر حلف عائد ہوگا۔ اگر نذیر احمد حلف کرے، تو ادائے مہر لازم نہ ہوگا، اور اگر حلف سے انکار کرے تو مہر واجب الاداء ہوگی۔

اور ایک دوسرے مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں، کہ نذیر احمد مہر کی معافی کا مدعی ہے اور مجیر الدین مدعی علیہ، جب نذیر احمد معافی کی شہادت پیش نہ کرسکا، اور جنہوں نے گواہی دی، ان کی گواہی ثبوت دعویٰ کے واسطے کافی نہیں، پس مجیر الدین چونکہ منکر ہے، اس واسطے بمطابق حدیث مرقومہ اس پر حلف عائد ہوگا، اگر مجیر الدین حلف کرے، تو اپنی بیٹی کا مہر اسے ملے گا، اور اگر حلف سے انکار کرے، تو مہر نہیں ملے گا۔ بشرطیکہ نذیر احمد حلف کرکے کہے کہ مجھ کو میری بیوی زوجہ نے اپنا مہر معاف کیا۔

اور تیسرے ایک مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں نذیر احمد مدعی ہے، اور مجیر الدین مدعی علیہ ہے، جب نذیر احمد کے پاس شہادت نہ ہو، اگرچہ ثبوت مدعا کے واسطے کفایت نہیں ہوتی ہے، مدعی علیہ یعنی مجیر الدین پر حلف نہیں ہوگی، اس واسطے کہ حلف اس وقت ہوتی ہے کہ جس وقت بینہ بالکل نہ ہو، اس صورت میں حضرت کی کیا رائے ہے؟ مدعی کون اور مدعی علیہ کون ہوگا؟ اور نذیر احمد کے گھر والے نے جو گواہی دی وہ شہادت شمار کی جائے گی یا نہیں؟ مع دلیل و حوالہ کتاب جواب تحریر فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں۔

بندہ جمال الدین محمد غفرلہ

## الجواب

صورت مسئولہ میں نذیر احمد مدعی ہے۔ اور اس کا خسر مجیر الدین مدعی علیہ ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں صرف مجیر الدین پر حلف عائد ہوتا ہے۔ جو نذیر احمد کے گھر کی عورتوں کی شہادت جو اوپر لکھی ہے معتبر نہیں۔ اگر وہ اپنے عدم علم پر قسم کھالے تو نذیر احمد کو دین مہر ادا کرنا لازم ہوگا۔

قال في الدر: والمدعي من إذا ترك الدعوى ترك، أي لا يجبر عليه والمدعى عليه بخلافه أي يجبر عليه اهـ (ج ۴ ص ۴۲۳) وفيه أيضاً (ج ۲ ص ۵۹۳) في باب المهر: وإن اختلفا في المهر ففي أصله حلف منكر التسمية، فإن نكل ثبت، وإن حلف يجب مهر المثل إلى أن قال: وإن أقاما البينة فبينتها مقدمة إن شهد مهر المثل له، وبينته مقدمة إن شهد مهر المثل لها، لأن البينات لإثبات خلاف الظاهر اهـ

وفي الخلاصة ج ۴ ص ۸۴: والأصل أن البينات للإثبات، فمن يقصد بإقامة البينة النفي لا تقبل، لأنه يريد أن يضعها في غير ما وضعت في الشرع اهـ

اور ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں نذیر احمد اور مجیر الدین دونوں اصل مہر کے مقر ہیں کوئی اصل مہر کا منکر نہیں۔ لیکن نذیر احمد بعد تسلیم ثبوت مہر فی الذمہ ایک امر زائد کا دعویٰ کرتا ہے کہ زوجہ نے مہر مجھ کو معاف کر دیا ہے اور مجیر الدین اصل ظاہر کے موافق کہتا ہے کہ مہر معاف نہیں ہوا، لأن الأصل بقاء الشيء ما لم يثبت ما يسقطه۔ پس نذیر احمد مدعی ہے۔ وہ معافی مہر کا ثبوت دے، اگر وہ ثبوت سے عاجز ہو جائے تو پھر مجیر الدین سے حلف لیا جا سکتا ہے اگر مدعی حلف لینا چاہے۔ اگر مجیر الدین نے حلف کر لیا تو پھر نذیر احمد کو مہر زوجہ میں سے حسب قاعدہ فرائض مجیر الدین کا سہم شرعی دینا لازم ہوگا، جو تخریج فرائض سے معلوم ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون
۲ صفر ۱۳۴۶ھ

**حکم سماع دعوی بعد پانزدہ سال**

سوال:- ما قولکم رحمکم اللہ اندریں مسئلہ کہ شخصے دعوی ارث بلا عذر شرعی تا مدت پانزدہ سال ترک کرد، پس تر دعویش بحسب شرع شریف مسموع تواند شد یا نہ؟ بینوا بالدلائل والبراهين توجروا عند أرحم الراحمين۔

**الجواب**

لا تسمع دعواه بعد هذه المدة، إن ترك الدعوة بلا عذر شرعي، وليس فيه اعتراف للخصم بالحق، لما في رد المحتار في كتاب القضاء، قال السيد الحموي في حاشية الأشباه، أخبرني استاذي شيخ الاسلام يحيى آفندي الشهير بالمنقاري ان سلاطين الآن يأمرون قضاتهم في جميع ولاياتهم أن لا يسمعوا دعوى بعد مضي خمس عشرة سنة سوى الوقف والإرث، ويخالفه ما في الخيرية، حيث ذكر أن المستثنى ثلثة مال اليتيم والوقف والغائب ومقتضاه أن الإرث غير مستثنى، فلا تسمع دعواه بعد هذه المدة. فقد نقل في الحامدية عن المهمنداري ايضا على سوال آخر فيمن ترك دعواه الإرث بعد بلوغه خمس عشرة سنة بلا عذر، أن الدعوى لا تسمع إلا بأمر سلطاني، ونقل ايضا مثله فتوى تركية عن المولى ابي السعود، وتعريبها "اذا تركت دعوى الإرث بلا عذر شرعي خمس عشرة سنة، فهل لا تسمع الجواب لا تسمع، إلا إذا اعترف الخصم بالحق ونقل مثله شيخ مشايخنا التركماني على آفندي مفتي الروم، وهذا الذي رأينا عليه عمل من قبلنا، فالظاهر انه ورد نهي جديد بعدم سماع دعوى الإرث وفي موضع آخر الثلث عدم سماع القاضي لها انما هو عند انكار الخصم فلو اعترف تسمع، اذ لا تزوير مع الاقرار، وايضا في التكملة قبيل فصل رفع الدعوى وليس ايضا مبنيا على المنع السلطاني، حيث منع السلطان عزه نصره قضاته من سماع الدعوى بعد خمس عشرة سنة في الاملاك وثلثين سنة في الاوقاف، بل هو حكم اجتهادي نص عليه الفقهاء كما رأيت، فاغتنم تحرير هذه المسئلة فانه من مفردات هذا الكتاب. وايضا فيه وإن القاصر إذا ادعى عقارا ارثا عن والده مثلا بعد بلوغه واثبته بالبينة الشرعية، فلا يمنع سماع الدعوى

لبقية ورثة البالغ البالغين التاركين للدعوى مدة المنع، ومثله من كان مسافراً وأيضاً فيه وانه اذا ترك شخص الدعوى عشرسنين مثلاً بلا عذر شرعي ومات وترك دعواها وارثه أيضاً البالغ عشرسنين اوخمس سنين فلا تسمع دعوى الوارث حينئذٍ، لأن مجموع المدتين مدة المنع۔

وأيضاً فيه وفي الحامدية، لوكان احد الورثة قاصراً والباقين بالغين تسمع الدعوى بالنظر الى القاصر في قدر مايخصه دون البالغين انتهى كتبت ماوجدت في الكتاب، والله اعلم بالصواب واليه المرجع والمآب۔

ازدلائل مرقومۂ الصدر صاف ظاہر شد کہ بعد مدت مزبورہ دعوئ ارث مسموع نخواہد شد، کما لا یخفیٰ۔

المستخرج

بندہ محمد یعقوب عفی عنہ

## الجواب من جامع امداد الاحکام

۱۵ رسال کے بعد دعوی میراث مسموع نہ ہونا مختلف فیہ ہے، علامہ حموی نے حاشیہ اشباہ میں سماع کو ترجیح دی ہے۔ اور متعدد فقہاء اس میں سماع ہی کو راجح فرماتے ہیں اور یہی اصل مذہب ہے۔ لیکن خشیت تزویر کی وجہ سے متاخرین نے بعد پندرہ سال املاک میں اور بعد ۳۳ سال کے اوقات میں دعاوی کو غیر مسموع قرار دیا ہے اور یہ بھی چند قیود کے ساتھ مقید ہے۔

(۱) مدعی کا حال، صلاح بخوبی معلوم نہ ہو۔ اگر وہ معروف بالصلاح ہو، اور حیلہ تزویر کا احتمال اس پر نہ ہو تو دعوی بہرحال مسموع ہے۔

(۲) تاخیر کے لئے کوئی عذر قوی نہ ہو۔ اگر عذر قوی موجود ہو، دعوی بہرحال مسموع ہوگا۔

(۳) مدعی علیہ دعوئ مدعی کا منکر ہو۔ اگر وہ مقر ہو کہ بیشک فلاں شخص مرگیا، اور مدعی اس کا وارث ہے تو دعوی میراث مدعی کا مسموع ہے۔ گو کتنی ہی مدت گذر جائے صرح بهذه القيود في الشامية (ج ۴ صفحہ ۶۹۰ و ۶۹۱)

وفي تنقيح الفتاوى الحامدية ج ۲ صفحہ ۴

پس مجیب کی یہ کوتاہی ہے کہ اس نے اگر قول عدم سماع کو اختیار کیا تھا تو اس کے شرائط

وقیود کے تحقق کی کیوں تحقیق نہ کی ؟ اور جواب کو ان قیود سے کس لئے مقید نہ کیا ؟

فقط واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون

۲۲ / صفر سنہ ۱۳۴۶ھ

قاضی نکاح خواں دعوی کرے کہ عورت نے بوقت نکاح اپنی رضامندی کا اظہار کیا تھا اور عورت انکار کرتی ہو اور مدعی اذن کے پیش کردہ گواہ مردود الشہادات ہوں تو ——— ؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

۱۔ شیر دین زوج بیان کرتا ہے کہ مسماۃ مجیدہ میرے بھائی اجیری کی بیوی تھی، اس کے مرنے کے بعد میرا اس سے نکاح ہوا، وہ اس وقت سے بطور میری بیوی کے میرے ساتھ رہتی ہے، میرے عدم موجودگی میں امام الدین وغیرہ اس کو بھگا کر لے گئے جب میں مکان پر آیا تو اپنی بیوی کو اپنے گھر نہ دیکھا، پھر بیان کیا کہ میں پہلے سے مسماۃ مجیدہ کی شرکت میں رہتا تھا، میں نے دو ڈھائی مہینے ہوئے اس سے نکاح کی درخواست کی۔

مسماۃ مجیدہ نے انکار کیا۔ مگر پھر اس کے بعد وہ خود ہی رضامند ہوئی۔ مگر جب نکاح کے وقت آدمی جمع ہوگئے تو مسماۃ مجیدہ نے پھر نکاح کرنے سے انکار کر دیا۔

(۲) مسماۃ مجیدہ زوجہ کا بیان ہے کہ میرا نکاح اجیری کے ساتھ ہوا تھا وہ دو سال ہوئے مرگیا، اس وقت سے میں علیحدہ کرایہ کے مکان میں رہتی ہوں، شیر دین اجیری کا حقیقی بھائی نہیں، وہ کبھی میری شراکت میں نہیں رہا اور نہ اس سے میرا نکاح ہوا۔ میں نے کسی کو اپنے نکاح کے متعلق اجازت اور [illegible] کی تھی، مگر میں نے انکار کر دیا، پھر چند آدمیوں نے مجھ پر زور دیا کہ تو شیر دین سے نکاح کرلے میں نے منظور نہیں کیا، اور انکار کیا، اور جبر کے خوف سے اپنا مکان چھوڑ کر امام الدین کے گھر چلی آئی۔

(۳) ثبوت شیر دین۔ علاوہ قاضی کے چھ گواہ پیش ہوئے سب نے بالاتفاق بیان کیا کہ شیر دین کا نکاح مسماۃ مجیدہ سے ہوا مگر [illegible]

کوئی کہتا ہے کہ مسماۃ نے نکاح کے وقت قطعی انکار نہیں کیا۔ کوئی کہتا ہے کہ مسماۃ نکاح کے وقت انکار کرنے کے بعد پھر رضامند ہوگئی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ منزا ول وغیرہ وکیل اور گواہ پوچھنے مسماۃ سے گئے۔ اور پھر قاضی صاحب نے جا کر پوچھا تو اس نے دونوں دفعہ رضامندی ظاہر کی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ منزاول وغیرہ سے مسماۃ مجیدہ نے انکار کیا مگر قاضی صاحب کے کہنے سے رضامند ہوگئی، بعض کہتے ہیں کہ نکاح دس بجے رات کو ہوا، بعض کہتے ہیں کہ ایک بجے رات کو ہوا۔

(۴) قاضی صاحب نے بیان کیا کہ میں نے مسماۃ مجیدہ کا نکاح شیر دین کے ساتھ پڑھا قبل نکاح مسماۃ نے میرے سامنے رضامندی کا اظہار کیا تھا، مگر فوراً ہی بعد تکمیل نکاح جب میں نے اپنی رجسٹر میں مسماۃ کا انگوٹھا لگانا چاہا تو اس نے انکار کردیا اور مجھ کو دس گیارہ بجے رات کو نکاح کرنے کے واسطے بلایا گیا تھا۔ میں نے نو بجے رات کے نکاح پڑھا تھا، رجسٹر نکاح میں نو بجے کا وقت درج ہے۔

(۵) ثبوت مسماۃ مجیدہ۔ خلاصہ بیان میر خان:

مسماۃ مجیدہ کا نکاح شیر دین سے ہوا، قصبہ کے چند قصاب زبردستی اس کا نکاح کرنا چاہتے تھے، مسماۃ مجیدہ نے نکاح نہیں کیا۔ اور جبر کے خوف سے اپنا گھر چھوڑ کر ہمارے یہاں چلی آئی۔ اور تائید میں بھی تین گواہ پیش ہوئے ہیں جو بیان کرتے ہیں کہ مسماۃ نے اپنے نکاح کی رضامندی نہیں دی، کئی دفعہ پوچھا گیا، اس نے ہر دفعہ انکار ہی کیا، اور بعد تکمیل نکاح کے جو بعض آدمی کے اصرار پر پڑھایا گیا، مسماۃ مجیدہ نے انگوٹھا لگانے سے انکار کردیا اور نکاح کو اپنے تسلیم نہیں کیا (جملہ بیانات بحلف کئے گئے ہیں) گواہان ہر دو فریق کے حالات ورع کے لحاظ سے مساوی ہیں، عادل کی حد میں کوئی نہیں آتا، اور خود قاضی بھی عادل ہیں یا نہیں ہمیں علم نہیں ہے۔ مگر اس کی ظاہر صورت مسلمانوں کی سی ہے اور اکثر نماز پڑھتے ہم نے دیکھا ہے۔

ایسی صورت میں عند الشرع تکمیل یا عدم تکمیل نکاح کا کیا حکم ہے؟ اور اگر قاضی کو غیر عادل کہا جائے تو کیا حکم ہے؟

فقط جمشید علی خان

دو ورود یا۔ مشہور ہیں کہ جو ہمارے علم میں ان شہادتوں کے علاوہ آئی ہیں:۔

(۱) مسماۃ مجیدہ نے نکاح کے وقت انکار کیا، اور نو بجے رات سے لے کر ایک بجے رات تک مسماۃ مجیدہ پر اہل قصبہ نے زور دیا کہ تو نکاح کرلے، اور بالآخر تنگ آ کر مسماۃ نے اجازت دے دی اور جوں ہی وہ دباؤ کم ہوگیا مسماۃ نے پھر انکار کردیا، اور بعد نکاح رجسٹر پر انگوٹھا نہیں لگایا کہ جبراً نکاح مجھے تسلیم نہیں ہے؛ اور جب شیر دین نے مسماۃ مجیدہ سے اس نکاح کے بعد ہمبستری کی خواہش کی تو مسماۃ نے اس کی خواہش کو پورا نہیں کیا۔

(۲) مسماۃ مجیدہ نے نکاح کی کوئی رضامندی نہیں دی، اور بنا اس کی رضامندی کے اہل قصبہ نے یہ سمجھ کر کہ یہ عورت ہے، کیا کرسکتی ہے؟ جبراً بلا مسماۃ کی رضامندی کے نکاح کردیا (بلا کسی بیان حلفی کے ہمارے علم میں لائی گئی ہے۔

## الجواب

مفصل بیانات فریقین کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مسمی شیر دین زوج مسماۃ مجیدہ بیوہ بالغہ کے ساتھ نکاح شرعی کا مدعی نہیں، صرف ظاہری نکاح کا مدعی ہے، اور اس کے بیان سے شرعی نکاح کی صاف تردید ہورہی ہے، کیونکہ وہ اقرار کرتا ہے کہ جب نکاح کے وقت آدمی جمع ہوگئے، تو مسماۃ مجیدہ نے پھر نکاح کرنے سے انکار کردیا، اور شرعاً عورت کا انکار یا اذن وقت نکاح ہی کا معتبر ہے۔ اس سے پہلے کا اقرار یا انکار محض لغو ہے، اگر وقت نکاح کے خلاف سابق ہو۔ پس شیر دین کا بیان مسماۃ مجیدہ کی تائید کرتا ہے کہ اس نے کسی کو اپنے نکاح کے متعلق اجازت اور رضامندی (نکاح کے وقت) نہیں دی۔ اس صورت میں مسمی شیر دین کو نکاح شرعی کا مدعی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ صرف قاضی عورت کے مقابلہ میں مدعی ہے، قاضی کہتا ہے کہ قبل نکاح مسماۃ نے میرے سامنے رضامندی کا اظہار کیا تھا، مگر فوراً ہی بعد تکمیل نکاح، رجسٹر پر انگوٹھا لگوانے کے وقت انکار کردیا۔ مسماۃ مجیدہ قبل نکاح کسی کو اجازت یا رضامندی دینے سے قطعاً منکر ہے اور قاضی نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں گواہ عادل پیش نہیں کئے، اور جو لوگ اس کی تائید میں گواہی دے رہے ہیں وہ عادل نہیں، اس لئے شرعاً قاضی کا قول معتبر نہیں اور گو مسماۃ مجیدہ کے گواہ بھی عادل نہیں مگر شرعاً منکر کے ذمہ گواہ پیش کرنا لازم نہیں اس کے ذمہ صرف قسم ہے۔

ــــــــــــــــــــ

[۱] یہ اولاً لکھا تھا، اسی تحریر کے آخر میں اس سے رجوع کرلیا گیا ہے ۱۲

اس لئے شرعی فیصلہ یہ ہے کہ اگر مسماۃ مجیدہ اس بات کی قسم کھائے کہ اس نے کسی کو قبل نکاح اجازت یا رضامندی نہیں دی، تو مسمی شیردین کا نکاح مسماۃ مجیدہ بیوہ بالغہ سے ثابت نہیں ہوا، اور شرعاً نہ وہ مسماۃ مذکور کا زوج ہے، نہ وہ زوجہ ہے، مسماۃ اپنی رضامندی سے جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور اگر مسماۃ قسم سے انکار کرے تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

قال فی الدر: قال الزوج للبالغة البکر بلغک النکاح فسکت، وقالت رددت النکاح، ولا بینة لهما علی ذلک ولم یکن دخل بها طوعاً، فالقول قولها بیمینها علی المفتی به۔

قال الشامی: وهو قولهما، وعنده لا یمین علیها، کما سیأتی فی الدعوی فی الاشیاء الستة (الخ) قال الشامی: ولا یقبل قول ولیها علیها بالرضا، لانه یقر علیها بثبوت الملک، واقرار علیها بالنکاح بعد بلوغها غیر صحیح، کذا فی الفتح۔

قلت: وینبغی أن لا تقبل شهادته لو شهد مع آخر بالرضا لکونه ساعیاً فی اتمام ما صدر منه فهو متهم، ولم اره منقولاً بحر۔ قلت وفی الکافی للحاکم الشهید: واذا زوج الرجل ابنته فانکرت الرضا، فشهد علیها ابوها واخوها لا یجوز اه فتامل اه (ج ۲ ص ۳۹۳)

اس عبارت فتویٰ سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں قاضی کا دعوی رضا یا شہادت رضا لغو ہے، کیونکہ وہ خود کردہ کام کی تکمیل میں ساعی ہونے کی وجہ سے متہم ہے، لہٰذا اب عورت کے ذمہ قسم بھی لازم نہیں، بلکہ بدون اس سے قسم لئے ہی یہ دعوی خارج کر دیا جائے اور دعوی نکاح کو باطل قرار دیا جائے، جیسا اوپر جو عورت کے ذمہ قسم کو لازم کیا گیا ہے۔ اب میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون
۲ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ

**حکم سکوت مدعی بر تصرفات مدعی علیہ وتاخیر در دعوی بعذر افلاس خود**

سوال :- اگر کسے بحضور قریب یا بحضور اجنبی زمینے می فروشد وآں قریب یا وآں اجنبی می بیند، ویچ نمی گوید، ومشتری دریں سالہا ازکشت وغیرہ تصرف می نماید، آنرا ہم می دید، ہیچ نمی گفت، مگر اکنوں آن قریب یا آن اجنبی برآن زمین دعوی مدعیت می نماید، ومی گوید کہ چندیں مدت مرا خرچ فیس سرکاری دستیاب نہ بود، لہٰذا پیش ازیں دعوی نکردم، اکنوں فیس سرکاری دستیاب شدہ است، و دعوی مدعیت خود کردم، بنا علیہ از جناب فیض مآب مسئول است کہ فیس سرکاری در عرصۂ دعوی، وتصرف از عذار مسموع دعوی ہست یا نہ؟

سائل: محمد شفیع، مسجد سوڈاری تعلقہ میہڑ۔

ضلع، لاڑکانہ، سندھ

## الجواب

اس امر کو قاضی شرعی یا وہ حاکم مسلم جو حکومت وقت کی طرف سے انفصال مقدمات کے لئے مقرر ہو اس کے یہاں مقدمہ کا مرفعہ کیا جائے وہی طے کرسکتا ہے کہ یہ عذر میں داخل ہے یا نہیں۔ باقی افتاء کی حیثیت سے جو ہماری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ عذر مذکور کی وجہ سے دعوی میں تاخیر کرنا عذر قابل سماعت ہے کیونکہ آج کل عدالتوں میں دعوی دائر کرنا خصوصاً جائیداد کے متعلق آسان نہیں، بلکہ اس کے لئے بڑی مقدار مال کی ضرورت ہے، پس مفلس شخص کا قاضی کو یا حاکم کو پانا بدون قدرت مال کے معتبر نہیں، پس یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ عدم وجدان قاضی کی وجہ سے تاخیر ہو۔

ثم رأیت فی رد المحتار تحت قول الدر فلا تسمع الآن بعدها الا بأمر الا فی الوقف والإرث ووجود عذر شرعی اھ ما نصہ العذر یشمل ما لو کان المدعی علیہ حاکما ظالما کما یأتی، وما لو کان ثابت الإعسار فی هذه المدة ثم أیسر بعدها، کما ذکرہ فی الحامدیة اھ (ج ۳ ص ۴۲۳)

فجعل اعسار المدعی علیہ عذرًا، وینبغی أن یکون اعسار المدعی کذلک عذرًا لعدم القدرة علی الدعوی بدون المال فی بلادنا هذه۔

واللہ اعلم

جو محل نکاح بننے کی قابلیت نہیں رکھتی بوجہ منکوحۃ الغیر ہونے کے۔ اس لئے اعمام معروسہ نے اس کا نکاح خالد سے منعقد کرنے میں شرعی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس دعوی میں اعمام معروسہ مدعی علیہم اور عمر مدعی ہے مگر چونکہ اس دعوی کا حاصل یہ ہے کہ بعد ثبوت جرم کے اعمام معروسہ کو تعزیر دی جاتی اور یہ حق قاضی وقضاء کے سوا دوسرے کو نہیں۔ اور آجکل قاضی شرعی بلاد ھند میں بجز ریاست اسلامیہ کے مفقود ہے، اس لئے اس دعوی کا کچھ حاصل نہیں۔ اب صرف دوسرا دعوی رہ گیا کہ عمر اس عورت سے اپنے نکاح کا مدعی ہے حکم کو ایسے دعوی کو سننا اور اسی کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس دعوی میں عمر مدعی ہے اس کے ذمہ بینہ ہے اگر عورت اس دعوی کی منکر ہے تو وہ مدعی علیہا ہے۔ اگر عمر بینہ عادلہ قائم نہ کرسکے تو امام صاحبؒ کے نزدیک تو عورت کے ذمہ یمین نہیں۔ بلکہ بینہ نہ ہونے کی صورت میں دعوی مدعی کا خارج ہوجائے گا۔ لأن النكاح من الأمور الستة أو السبعة التي لا يمين فيها على المنكر عند أبي حنيفة "ہاں! قول صاحبینؒ میں عورت سے قسم لی جائے گی، اور مفتی بہ قول یہی ہے۔ اس لئے بصورت انکار حکم کو عورت سے قسم لینا چاہئے، اور عورت اپنے عدم علم کی بناء پر قسم کھا سکتی ہے کہ میں اس کی زوجہ نہیں مجھے اس سے اپنا نکاح ہونے کا علم نہیں۔ اگر وہ بصورت عدم بینہ قسم کھالے جب بھی دعوی مدعی کا باطل ہوجائے گا۔ اور اگر وہ قسم کھانے سے انکار کرے تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۴ر شعبان ۱۳۳۶ھ

نکاح پر شہادت حسبہ مسموع ہے

سوال ۱۲۸: زید غائب ہے بمدت سفر، اس کی منکوحہ کا نکاح بکر سے کرتے وقت گواہوں نے کہا کہ یہ عورت فلاں شخص کی منکوحہ ہے۔ مولوی نکاح خواں نے کہا کہ نکاح حقوق العباد میں سے ہے، مدعی موجود نہیں، لہذا سمع شہود بے فائدہ ہے۔ میں تو نکاح باندھتا ہوں، جب زید واپس آئے اور دعوی کرے تو اس وقت شہادت مفید ہوگی۔ اور حوالہ "جامع الفصولین" کا دیا۔ کیا نکاح حقوق العباد سے ہے، یا حقوق اللہ سے، یا مشترک ہے؟ اور ایسے موقع پر جبکہ متعدد شہود عدول عقد نکاح کی شہادت دیتے ہیں ان کو کچھ اعتبار نہ

ہوگا، مسئلہ بعبارت کتاب تحریر فرمائیں۔؟

۲ سفید یا اطفال خورد سال کے بارہ میں جو حدیث میں وارد ہے عجز الوہ بسرہ یہ لفظ بسرہ یا کہ بسترہ ہے؟ اگر اول ہی ہے تو ثانی بھی اوزن جمع میں ہو کرن سکتا ہے یا نہیں، اور حدیث القبر روضۃ من ریاض الجنۃ او حفرۃ من حفر النار کس کتاب کے کون سی فصل میں ہے۔ دوسرا لفظ "حُفَرَۃ النیران" ہے یا کہ حُفْرَۃ النیران ہے یعنی بفتح فا ہے یا بسکون فا۔؟

امید ہے کہ جناب ذرا تفصیل سے ارشاد فرمائیں گے۔

## الجواب

۱ اس نکاح خواں نے غلط کیا ہے، فقہاء نے بے شک شہادت علی النکاح کو شہادت حسبہ میں شمار نہیں کیا، جیسا کہ تتبع کتب سے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نکاح حقوق العبد سے ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہادت حسبہ سے اس عورت کو منکوحہ غائب ثابت نہ کیا جائے۔ اور یہ مطلب نہیں کہ ایسی عورت کا نکاح دوسرے شخص سے منعقد کر دینا جائز ہے، جس کے منکوحہ غائب ہونے پر شہادت حسبہ قائم ہوچکی ہے کیونکہ یہ شہادت اثبات نکاح پر قائم نہیں، بلکہ اثبات حرمت علی الغیر پر قائم ہے کہ اس کا نکاح دوسرے سے حرام ہے، اور عورت کا محفوظ ہونا اور اسباب حرمت نکاح سے خالی ہونا حق اللہ ہے۔ لہٰذا اگر غائب کا نکاح اس عورت کے ساتھ شہرت سے ثابت نہ ہو تو بعض شہادت حسبہ سے اثبات نکاح تو نہ ہوگا، مگر شہادت عدول ثقات کے ساتھ اس عورت کا نکاح دوسرے سے منعقد کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ فان الحل والحرمۃ من حقوق اللہ تعالیٰ۔ صرح بہ الأصولیون، کما فی نور الانوار" وغیرہ۔ فکان کالشہادۃ علی الرضاع وحرمۃ المصاهرۃ، وتقبل شہادۃ الحسبۃ فیھما، ثم رأیت الأشباہ، وقد صرح فیہ بأن النکاح یثبت بدون الدعوی لأن حل الفرج والحرمۃ فیہ حق اللہ تعالیٰ اھ

---

عہ بعد کو اشباہ والنظائر سے معلوم ہوا کہ نکاح پر بھی شہادت حسبہ مسموع ہے۔ اور دلیل وہی ہے۔ جو احقر نے بیان کی ہے ۱۲ منہ

قال الحموی بعد تصویرہ، والذی تحرر لہ أن ما تقبل فیہ الشہادۃ بدون الدعوی عند الکل اربع مسائل: عتق الامۃ، والطلاق، والخلع والنکاح اھ ص ۲۲۳ ۔

ملے: یہ لفظ سیرۃ بفتح سین ورا، یا بکسر سین ہے بضم سین وتشدید را غلط ہے اور حدیث "القبر روضۃ من ریاض الجنۃ أو حفرۃ من حفر النار" ترمذی کے باب عذاب القبر میں ہے۔ اور دوسرا لفظ "حفر" بضم الحاء وفتح الفاء جمع حفرۃ کی ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

یکم ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ

ثبوت زنا کے لئے چار گواہ کیوں ضروری ہیں جبکہ قتل مومن کے لئے دو گواہوں پر اکتفا کیا جاتا ہے جو زنا سے زیادہ سخت گناہ ہے

سوال: جبکہ اور مقدمات بلکہ قتل مومن تک جو سب سے زیادہ سخت گناہ ہے، دو گواہ کافی ہیں، تو زنا کے واسطے چار گواہ کیوں ضروری قرار دیئے گئے؟ اور چار گواہ سے کم اگرچہ چشم دید ہی گواہی ہو قرآن میں اس کو فضل ربی فرمایا ہے (سورۂ نور)؟

## الجواب

اس سوال کا علماء سے کسی کو حق نہیں، کیونکہ وہ واضع قانون نہیں صرف عالم قانون ہیں، ہم سے قانون کے دریافت کرنے کا تو حق ہے قانون کی علتیں دریافت کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ جیسے ڈاکخانہ کے بابو سے کسی کو اس سوال کا حق نہیں کہ اگر لفافہ پر عدالت کا ٹکٹ آٹھ آنے والا لگا دیا جائے تو وہ کیوں بیرنگ ہو جاتا ہے، اور ڈاکخانہ کے ایک آنہ کا ٹکٹ لگا دیا جائے تو کیوں بیرنگ نہیں ہوتا؟ اور کوئی اس سے یہ سوال کرے تو وہ یہ جواب دینے کا حق رکھتا ہے کہ مجھ سے آپ کو اس سوال کا حق نہیں، کیونکہ میں واضع قانون نہیں ہوں صرف عالم قانون ہوں۔ اور اس کا یہ جواب تمام عقلاء کے نزدیک معقول ہوگا۔ اسی طرح ہم کو بھی یہی جواب دینے کا حق ہے، کہ واضع قانون اللہ تعالیٰ ہے۔ قانون کی علل پوچھنا ہیں تو ان سے پوچھئے، ہاں حکم معلوم کرنا ہو تو ہم قرآن وحدیث وفقہ سے اس کو معلوم کر کے بیان کر سکتے ہیں۔ سایہ کہ یہ سوال کفار کو جواب دینے کے لئے کیا ہے، کیونکہ وہ

ایسے شبہات نکالتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ مخالف اسلام سے اصول میں گفتگو کی جائے گی، فروع میں گفتگو نہیں کی جاسکتی، کیونکہ فروع ہر مذہب میں دو چار نہیں، بلکہ ہزاروں سینکڑوں ہیں۔ فروع میں گفتگو کرنے سے کبھی سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا، وہ جو نرے چار فروع پر اعتراض کرے گا ہم اس کے ہزار فروع پر اعتراض کر دیں گے۔ ہاں اصول ہر مذہب کے محدود ہیں اور اصول ہی پر فروع کا مدار ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اصول میں گفتگو ہونی چاہئے، اگر مخالف نے اصول میں گفتگو کر کے توحید و رسالت و قرآن کی حقانیت کو (جو دلائل عقلیہ سے ثابت ہے اور ہم ہر دم اس کے ثابت کرنے کو تیار ہیں) تسلیم کر لیا۔ تو اب اس کو فروع میں کلام کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ اگر اس کو کسی فرعی مسئلہ پر شبہ بھی ہوگا تو ہم کو یہ کہنے کا حق ہے کہ جب تم نے قرآن کا کلام الٰہی ہونا تسلیم کر لیا اور مان لیا کہ یہ احکم الحاکمین کا قانون ہے تو اب چاہے کسی حکم کی وجہ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے تم کو ماننا لازم ہے۔ کیونکہ تم دنیا میں ادنیٰ ادنیٰ حاکموں کے بہت سے احکام ایسے مانتے ہو جن کی حکمت تمہاری سمجھ میں نہیں آتی، بالخصوص حکیم اور ڈاکٹر کے، تو بہت سے احکام ایسے مانتے ہو جن کی وجہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتی، کسی وقت ڈاکٹر سردی کے موسم میں برف سے دوا کرتا ہے، اور تم چوں و چرا نہیں کرتے، اور بعض دفعہ گرمی میں سخت گرم دوا دیتا ہے، اور تم دم نہیں مارتے، کیوں؟ محض اس لئے کہ اس کی حکمت پر اعتماد ہے، پھر غضب ہے کہ خدا تعالیٰ احکم الحاکمین کی حکمت پر اعتماد نہ ہو اور اس کا ہر حکم تسلیم کرنے میں اس کا انتظار ہو کہ ہماری سمجھ میں آجائے تو مانیں گے ورنہ نہیں، یہ تو آپ کے سوال کا اصلی جواب تھا اور یہی حقیقی جواب ہے۔ اس سے زیادہ اگر میں کچھ کہوں تو وہ محض تبرع و احسان ہوگا۔

اب سنئے! سائل نے انسان کے جذبات کو بھاری نہیں، اس لئے اس نے متعہ و قتل کو متعہ و زنا سے اشد سمجھ لیا، حالانکہ جذبات انسانیہ پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ عزیز تو مذہب ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں وہ نہ عزت و آبرو کی پرواہ کرتا ہے نہ جان و مال کی، اس کے بعد آبرو عزیز ہے۔ انسان آبرو کی حفاظت میں جان جانے کی پرواہ نہیں کرتا، اگر کوئی کسی شریف کو حرامزادہ کہدے یا یوں کہدے کہ تیری ماں کو میں نے جنگل میں دیکھا تھا، تو اس وقت وہ دشمن کے ساتھ فوراً جنگ پر آمادہ ہو جاتا، اور جان جانے کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ پھر آبرو کے بعد جان عزیز ہے۔ اور جان کے بعد مال عزیز ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی، تو اب سمجھو کہ متعہ و زنا میں ایک مسلمان عورت و مرد کی آبرو پر حملہ ہے جو عورت کے

لئے تو موت سے بدتر ہے، اس لئے شریعت نے مقدمہ زنا کے احکام مقدمہ قتل سے زیادہ سخت کئے، کہ اس کے ثبوت میں صرف دو گواہوں کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ چار گواہ ضروری قرار دیئے جن لوگوں میں حیاء و غیرت اور آبرو ہے، وہ تو قرآن کے اس حکم کی دل سے قدر کریں گے لیکن جن اقوام کی یہ حالت ہے کہ وہ زنا بالتراضی کو جرم ہی نہیں سمجھتے، اور انہوں نے غیرت سے اس درجہ ہاتھ دھو لئے ہیں کہ اپنی قوم کے لئے زنا کو گوارا کرتے، اور رنڈیوں سے بھی ٹیکس وصول کرتے ہیں ان سے اس وقت خطاب نہیں۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔

واللہ اعلم

حررہ العبد المفتقر الی ربہ الصمد عبدہ المذنب
ظفر احمد وفقہ اللہ للتزود لغد
نزیل الخانقاہ الامدادیہ بتھانہ بھون
۱۱ ذیقعدہ [illegible]ھ

**بوقت فیصلہ حاکم گواہوں کا حاضر عدالت ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر عورت پردہ نشین مدعی ہو تو اس کا حاضر عدالت ہونا شرط ہے یا نہیں؟**

**سوال:** کیا قضاء قاضی کے وقت شہود کا حاضر عدالت ہونا شرط ہے کہ ان کی غیبت میں قضاء صحیح نہیں؟ یا شہود کی غیبت میں بھی قضاء صحیح ہے جبکہ ان کی شہادت قاضی کے سامنے ہو چکی ہو، اور بیان قلمبند کر لیا گیا ہو نیز اگر عورت پردہ نشین مدعی ہو، تو کیا اس کا بھی حاضر عدالت ہونا شرط ہے؟ بینوا بالدلائل

## الجواب

قال فی العالمگیریة: إذا وجد القاضی شهادة شهود فی دیوانه، أی فی خریطة مختومة بختم القاضی والشهادة مکتوبة بخطه أو بخط نائبه، إلا أنه لا یتذکر تلك الشهادة، فعلی قول أبی حنیفة لا یقضی بتلك الشهادة، وعلی قولهما یقضی وكذلك إذا وجد سجلاً فی خریطة، والخریطة مختومة بختمه، والسجل مكتوب بخطه أو بخط نائبه فالقاضی لا یمضی ذلك السجل عند أبی حنیفة رح۔ وعندهما یمضی كذا فی المحیط اھ

قلت: وأما إذا تذكر الشهادة، فلا خلاف فی جواز القضاء به كما هو مقتضی

التقیید بعدم التذکر. وفیہ أیضا، ولو أنه قاضیا عزل عن القضاء، ثم رد بعد ذلك على القضاء، فإنه لا یقضی بشیء مما کان فی دیوانه الأول من القضاء لإنسان على إنسان، إذا لم یذکر بالإجماع، وإن ذکر فکذلك عند أبی حنیفة خلافا لهما فأما إذا قامت البینة بحق عنده لإنسان على إنسان، فقیل أن یقضی بها عزل ثم أعید إلى القضاء فرفعت إلیه تلك الخصومة، فإن المدعی یکلف إعادة البینة تذکر أو لم یتذکر. کذا فی محیط السرخسی اهـ ج ۲ ص ۱۷۱ ففرق بین القضاء بالسجل قبل العزل وبعده. فتبصر.

وفی البدائع فی بیان شرائط القضاء، وأما ما یرجع إلى المقضی له فأنواع منها أن یکون حاضرا وقت القضاء، فإن کان غائبا لم یجز القضاء له إلا إذا کان عنه خصم حاضر. لأن القضاء على الغائب کما لا یجوز فالقضاء للغائب أیضا لا یجوز اهـ ج ص...

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ جب قاضی کے سامنے شہادت گذر چکی، اور شہود کے بیانات اس کے دفتر میں قلمبند ہو چکے، اور قاضی کو شہادت کا مضمون یاد ہو، تو اس صورت میں قضاء کے وقت شہود کا حاضر ہونا شرط نہیں، اور قاضی کو مضمون شہادت یاد نہ ہو تو جب بھی صاحبین کے نزدیک قلمبند شدہ بیانات پر قضاء جائز ہے۔ جبکہ ان کی تحریر پر قاضی کی عدالت کا مہر ثبت ہو، اور یہ اس وقت ہے کہ قاضی بعد شہادت سننے اور بیانات قلمبند کرنے کے معزول نہ ہوا ہو۔ ورنہ اس میں تفصیل ہے۔ اور مدعی کا حاضر ہونا وقت فیصلہ کے لازم ہے، خواہ اصالۃً حاضر ہو یا اس کا وکیل حاضر ہو۔ پس پردہ نشین عورت کی طرف سے وکیل کا حاضر عدالت ہونا کافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۹ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۶ھ

**حدیث البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر کی ایک توجیہ کی تغلیط**

**سوال:** قال علیه الصلوٰۃ والسلام البینة على المدعی والیمین على من أنکر. المراد من هذا الحدیث فیما إذا کانت الدعوى بین الصالحین، وأما إذا کانت بین الصالح والطالح، فی الیمین على الصالح وإن کان

المدعى صالحًا ولا بينة له. لأن الطالح لا يخاف من الله تعالى، ولا يعرف حرمة اليمين كالذى يشرب الخمر ويأكل الربا، او بالسرقة ممروف، ويسب فى الخاصمة. لأن اليمين متعلقة للنفس والدين، ولا يجوز للمومن أن ينتقصهما لقوله تعالى: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾، ولأنه لا يبالى من هلاك دينه بالجهل والنفس لأنه عدو لنفسه، فكيف يكون صديقًا لغيره، فلا يجوز للقاضى أن يحلف الفاسق والطالح، فان حلفه القاضى يكفر، لأنه اهان كلام الله تعالى وهو قوله تعالى: ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ﴾، والعرضة: المنشفة للوجه واليدين والرجلين والمقعد، والمراد بهذه الآية أن لا تجعلوا الكذب والطالح والفاسق لأن أكثر كلامهم الكذب. فلا يعرفون حرمة اليمين. شرح كرمانى وجامع الفوائد ص۲۲۳

یہ عبارت معمول بہا ہے یا نہیں؟ بصورت دیگر اس کے نقصانات سے، اور بصورت ثانی حدیث متواتر کی تخصیص اور مقید ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

## الجواب

یہ عبارت ہرگز معمول بہا نہیں ہے۔ اس کے غلط ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس میں قاضی کی تکفیر کی ہے، اگر وہ طالح اور فاسق سے قسم لے، بھلا اس شخص سے کوئی پوچھے کہ اگر مدعی مسلم اور مدعی علیہ کافر ہو، اور مدعی کے پاس بینہ نہ ہو، تو کیا کافر سے قسم لی جائے گی، اگر کہے نہیں لی جائے گی تو یہ اخبار مشہورہ کے بالکل خلاف ہے، حدیث قسامت میں جو کہ مشہور حدیث ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول موجود ہے "فتحلف لکم یهود، قالوا: ليسوا مسلمين، فوداه من عنده. لتخريجه الستة (جمع الفوائد ص۲۹)

اور اگر کہے لی جائے گی۔ تو تحلیف فاسق تحلیف کافر سے اہون ہے اس کا انکار غلط ہوا، اور ان تمام شبہات کا جو اس عبارت میں مذکور ہے جواب یہ ہے کہ کسی کے ذمہ کسی کا حق نہ ہو، فإن فراغ الذمة اصل، تو شخص دوسرے کے ذمہ حق کا دعویٰ کرتا ہے وہ گواہ لائے، اگر گواہ نہ لا سکا، تو مدعی علیہ کی برأت تو اسی سے ہوگی، آگے اس سے قسم لینا محض مدعی کی تسلی کے لئے ہے۔ پس مدعی علیہ سے ہر حال میں قسم لی جائے گی، خواہ صالح ہو یا طالح مسلم ہو یا کافر، اب اگر مدعی یہ کہے کہ مدعی علیہ فاسق ہے، اس کی قسم سے میری تسلی نہیں ہوتی

تو اس سے کہا جائے گا کہ پھر تم اپنی دلیل پیش نہ کرنے کی وجہ سے پہلے ہی کمزور ثابت ہو چکے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ مدعی علیہ قسم کھائے۔

وقد کان أنہ صلی اللہ علیہ وسلم، اختصموا إلیہ رجلان ولم یقیم المدعی البینۃ، فسئل المدعی علیہ الیمین، فقال المدعی إنہ لا یبالی بالحلف صادقا أو کاذبا، فقال صلی اللہ علیہ وسلم: لیس لک منہ إلا ذلک، أخرجہ مسلم کما فی المشکوۃ ص۳۲۷ نظامی دھلوی۔

عن علقمۃ بن وائل عن أبیہ قال جاء رجل من حضرموت ورجل من کندۃ إلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقال الحضرمی یا رسول اللہ إن ھذا غلبنی علی أرض لی، فقال الکندی: ھی أرضی وفی یدی، لیس لہ فیہا حق، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم للحضرمی: ألک بینۃ؟ قال، لا، قال فلک یمینہ قال یا رسول اللہ إن الرجل فاجر لا یبالی علی ما حلف علیہ، ولیس یتورع من شیء، قال لیس لک منہ إلا ذلک الخ واللہ تعالی اعلم وھذا الحدیث صریح بدماء فی المباوۃ المسئول، وتحلیف الکافر ثابت بالنص، وھو قولہ تعالی أمنوا شہادۃ بینکم إذا حضر أحدکم الموت حین الوصیۃ اثنان ذوا عدل منکم أو آخران من غیرکم، إلی قولہ۔ فیقسمان باللہ إن ارتبتم لا نشتری بہ ثمنا، الآیۃ۔

نزلت فی رجل مسلم مات فی سفر ولم یکن ھناک مسلم یسلم إلیہ متاعہ وترکتہ، فسلم إلی تمیم الداری وصاحبہ، کانا کافرین، فحلفہما النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

ص۱۱ اور اگر مدعی علیہ سے قسم نہ لی جائے، بلکہ مدعی سے لی جائے، تو ہم کو جتلایا جائے کہ اگر مدعی اور مدعی علیہ دونوں فاسق ہوں تو اس صورت میں کس سے قسم لی جائے گی۔ اگر کہو مدعی سے، تو وہی محذور لازم آئے گا کہ فاسق سے قسم لی گئی اور اگر کسی سے قسم نہ لی گئی تو فیصلہ کیونکر ہوگا، کیا بلا دلیل کے فیصلہ کر دیا جائے گا؟ وھذا لا یجوز ۱۲ منہ

وإذا جاز تحليف الكافر فتحليف الفاسق أولى فافهم،
واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون
۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ

**طلاق کے ایک واقعہ میں گواہوں کا اختلاف**

**سوال:** ما قولکم رحمکم اللہ تعالیٰ، زید کی ماں اور بھائی اور بہن آپس میں جھگڑ رہے تھے، آکر انہوں نے بہت ڈانٹا، انھوں نے نہ مانا، زید نے دفع تنازع کے لئے ان کو بولا کہ چوترانی جی، حرامزادی، ایک، دو، تین طلاق دیا میں، زید کی بیوی الگ گھر میں کھانا پکا رہی تھی، زید سے پوچھا گیا کہ تم نے کس کو طلاق دی؟ جواب دیا جھگڑا کرنے والوں کو، اور زید کو بھی معلوم تھا کہ اس کی بیوی جھگڑے میں شریک نہ تھی اور زید کی بیوی طلاق کی مدعی بھی نہیں، وہ مدعی کیسے ہوسکتی ہے اس نے لفظ طلاق کو بھی نہیں سنا آٹھ گواہ زید کے آمنے سامنے مکان کے اندر چار دیواری گھر میں موجود تھے، گھر کی دیوار بانس کی، اور سطح نیچی ہی کی۔ گھر میں دو کمرہ ہے، ایک پیچھے کی طرف، ایک آگے کی طرف، حادثہ مذکورہ آگے کے کمرہ میں ہوا، اس گھر کا دروازہ پچھم رخ ہے، زید کے آمنے سامنے جو آٹھ گواہ موجود تھے وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ زید نے باہر سے آکر جھگڑنے والوں کو بہت زجر و توبیخ کی، اس کے بعد بوجہ نہ ماننے کے ان تینوں کو یہ لفظ کہا، چوترانی، حرامزادی، ایک، دو، تین طلاق دیا میں۔ گھر مذکور کے پیچھے بمقدار چالیس ہاتھ فاصلہ پر مکان سے باہر ایک چار دیواری کچاری گھر موجود ہے، جس کا رخ پورب طرف ہے، اس کچاری گھر میں اور تین شخص موجود تھے، وہ گواہ گذرتے وقت اس آٹھ گواہ مذکور کے موافق گواہی دیتے تھے، چند روز بعد ان تین گواہ پہلو بدل کے لوگوں کے پاس کہتے ہیں کہ زید کی ماں نے کہا تھا کہ تو نے اپنی بیوی کی بات سنی ہے وہ کیا کہتی ہے؟ زید نے کہا سنی، سنی! اس بات کے متعلق زید نے کہا، چوترانی جی ایک، دو، تین طلاق دیا میں۔ لیکن زید کی ماں سراسر انکار کرتی ہے کہ میں نے زید کی بیوی کی بابت کچھ ذکر نہ کیا، اور آمنے سامنے والے آٹھ گواہ بھی کہتے ہیں کہ زید کی ماں نے زید کی بیوی کے متعلق کچھ ذکر نہ کیا۔ قسم دوم کے گواہ

طلاق بصورت متوسط شاہد ہیں۔ اور تینوں چاروں کی شور وغل میں مطلق کی آواز پہچانا، لیکن معاینہ نہیں ہے، اور زید کی ماں یوں مجبور ہے، اس کی بات پر شہادت دینا مقبول ہوگی یا نہیں؟ اب زید کی بیوی شرعاً مطلقہ ہوگی یا نہیں؟ اور قسم اول کے گواہ مقبول ہیں یا قسم دوم کے؟ اور زید مدعی کے غیر حضوری میں اگر گواہ گذارے وہ گواہ مقبول ہیں یا نہیں؟ جواب با ادلہ مع حوالہ کتب تحریر فرمائیں۔ فقط

## الجواب

دوسری قسم کے گواہ چونکہ طلاق کے وقت مطلق کے سامنے نہیں تھے، اس لئے ان کی شہادت ان گواہوں کی شہادت کے معارض نہیں ہو سکتی، جو اس گفتگو کے وقت مطلق کے سامنے موجود تھے خصوصاً جبکہ گواہ قسم دوم کی شہادت میں اختلاف واقع ہو چکا ہے کہ اول وہ شاہدان قسم اول کے موافق شہادت دے چکے ہیں، بعد میں شہادت کو بدلا ہے۔ فان الاختلاف یبطل الشہادۃ، والسامع من وراء الجدار لیس کالمعائن الشاھد، کما ھو ظاھر من کلام الفقہاء فی باب الشہادۃ۔

قال فی الھندیۃ: ولو سمع من وراء الحجاب لا یسعہ أن یشھد لاحتمال أن یکون غیرہ۔

إذ النغمۃ تشبہ النغمۃ، إلا إذا کان فی الداخل وحدہ، ودخل وعلم الشاھد أنہ لیس فیہ غیرہ، ثم جلس علی المسلک، ولیس لہ مسلک غیرہ فسمع اقرار الداخل، ولا یراہ لأنہ یحصل بہ العلم وینبغی للقاضی إذا فسر لہ أن یقبلہ، کذا فی التبیین اھ (ج ۳ صفحہ ۴۳۳)

پس صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق نہیں ہوئی اگر سوال واقع کے بالکل مطابق ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

| الجواب صحیح | حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ |
| --- | --- |
| اشرف علی | از تھانہ بھون |
| ۲۸ جمادی الثانیہ سنہ ۴۴ھ | ۲۸ جمادی الثانیہ سنہ ۴۴ھ |

### بے نمازی کی شہادت کا حکم

سوال:- نکاح طلاق وغیرہ معاملات میں جو گواہ ہوتے ہیں اکثر دیہاتی لوگ بے نمازی ہوتے ہیں ایسی

صورت میں مدعی، مدعی علیہ، شاہد سب ایک، جیسے بے نمازی ہوتے ہیں کیا ایسی حالت میں امام صاحبؒ کے قول پر عمل کر کے ظاہری اسلام دیکھ کر جو حکم ہوا ایسے شاہدوں کی شہادت قبول کر کے فیصلہ کرے تو حکم گنہگار تو نہ ہوگا؟ کیونکہ یہ عذر بھی ضروری ہے کہ جو شرائط عدالت کی ہیں اب وہ بالکل مفقود ہیں۔

اور مدعی مدعی علیہ میں سے شاہدوں پر عدالت کا جرح بھی خود کوئی نہیں کرتا، اگر شہادت سنی جائے تو تفسیخ حق ضرور ہے۔

سائل: بندہ فخرالدین گھوٹکی ضلع سکھر سندھ

## الجواب

امام صاحبؒ اور صاحبینؒ میں اس بارے میں کچھ اختلاف نہیں، اور ان کے قول کا اختلاف زمانہ کے اختلاف پر مبنی ہے۔ پس حکم پر لازم ہے کہ شاہدین کی عدالت کی تحقیق کرے، اگر عادل شرعی نہ ہو، دعوی رد کرے، اور جس دعوی پر شاہدین عدلین کی شہادت نہیں وہ دعوی ثابت ہی نہیں۔ نہ حق ثابت ہے۔ پھر تفسیخ حق کہاں ہے۔ والذی قلته ذکره فی الدر والشامی ج ۴ ص ۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۳ر شعبان سنہ ۴۷ھ

**حکم اپنے علم پر شہادت رد کر سکتا ہے**

سوال:۔ چونکہ جہل عام ہے، مدعی مدعی علیہ سے شاہدوں پر عدالت کی جرح کوئی نہیں کرتا، مگر بعض وقت شاہد حکم کا شناخت والا ہوتا ہے۔ اور حکم جانتا ہے کہ شاہد بے نمازی اور دیگر فسق میں مبتلا ہے۔ تو ایسی حالت میں جب مدعی علیہ کوئی جرح نہ کرے، تو حکم اپنے علم پر اس کی شہادت رد کرے یا نہ؟ سائل بالا.....

## الجواب

ضرور رد کرے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۳ر شعبان ۱۳۴۷ھ

حقدار کو حق ملنے کے بعد مدعی علیہ کو سزا سے بچانے کے لئے جھوٹی گواہی دینا جائز ہے یا نہیں؟

سوال :- السلام علیکم ورحمۃ اللہ، بخدمت جناب حضرت پیر کرم مرشد کریم صاحب متع فیضہ۔ بندہ کی عرض یہ ہے کہ ذیل کا استفتاء پیش خدمت ہے جواب سے سرفراز فرمائیں۔

## استفتاء

یہاں تعزیرات ہند کے بعض دفعات ایسے ہیں کہ ان میں اگر فریقین صلح کرنا چاہیں، تو صلح منظور نہیں ہوتی، جیسا سرقہ وغیرہ۔ جب فریقین صلح آپس میں کرتے ہیں تو حقدار کو حق ادا کر کے پھر جو شاہد ہوتے ہیں وہ اپنے بیانات گواہی میں کم پیش کرتے ہیں، تب وہ مقدمہ کم ثبوت پر فارغ ہو جاتا ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے موقع پر جب حقدار کو حق پہنچ جاتے، اور وہ بھی راضی ہو، تو اگر شاہد مجرم کو بچانے کے لئے جھوٹ بولے تو گنہگار ہوگا یا نہ؟ اور یہاں عدالتوں میں گواہی لینے کے وقت کلمہ شریف پڑھا کر یا یہ لفظ "خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو کہوں گا سچ کہوں گا" کہلوا کر بیانات لیتے ہیں، تو شاہد مجرم کو جبکہ حق ادا کیا ہو، اور حقدار بھی راضی ہو سزا سے بچانے کے واسطے کلمہ شریف یا "حاضر و ناظر جان کر" کے الفاظ کہہ کر جھوٹ کا اظہار کرے کہ مجرم نے یہ کام نہیں کیا، یا میرے سامنے اقرار نہیں کیا۔ تو گناہ یا کفارہ قسم کا ہوگا یا نہ؟ زیادہ طالب دعا ہوں، خاتمہ ایمان کی دعا فرمائیں۔

سائل بالا ۔۔۔۔

## الجواب

صریح جواب نظر سے نہیں گذرا، قواعد کلیہ سے جواب لکھا جاتا ہے، دوسرے علماء سے بھی مراجعت مناسب ہے۔ اول، دوم، مقدمے محفوظ کرلئے جائیں۔

(۱) حدود جب حکام تک پہنچ جائیں تو اب ان کے اسقاط میں سعی کرنا جائز نہیں۔

(۲) جن ممالک میں اجراء حدود نہ ہو وہاں جو سزا بھی مقرر ہو، وہ حدود کے قائم مقام ہے۔

ان قواعد کا مقتضاء یہ ہے کہ چوری، زنا، شراب خوری، قذف محض کے مقدمات جب حکام تک پہنچ جائیں، تو اب گواہوں کو جھوٹی گواہی نہ دینی چاہئے، بلکہ سچی گواہی دیں ورنہ گناہ کا خطرہ ہے۔ اور حدود کے سوا دیگر مقامات میں جب فریقین میں مصالحت ہو جائے،

اور حقدار کو حق پہنچ جائے، تو شاہد کو توریہ کے ساتھ اس طرح گواہی دینا کہ مدعی علیہ سزا وغیرہ سے بچ جائے، جائز بلکہ مستحب ہے۔ مگر صریح جھوٹ سے حتی الامکان احتراز کریں، بلکہ توریہ کے ساتھ گول مول اظہار کردیں، جو نہ جھوٹ صریح ہو نہ صدق صریح، فان الکذب لایجوز صریحاً الا فی مواضع مخصوصة، ولیس ذلك منها۔

واللّٰہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

۱۳ رمضان سنہ ۱۳۴۷ھ

**بازار میں چلتے پھرتے کھانے سے مطلقاً عدالت ساقط ہوجاتی ہے یا اس میں تفصیل ہے؟**

**سوال:** اور جو مسئلہ مشہور ہے کہ جو شخص بازار میں چلتا پھرتا کھائے اس کی شہادت نامقبول ہے، کیا یہ تمام اشیاء میں کلیۃً حکم ہے؟ یا بعض اس سے مستثنیٰ ہیں؟ یعنی پان اور شیرینی وغیرہ جو آجکل ہندوؤں میں کھائی جاتی ہیں مفصل تحریر فرمائیں کہ کون سی چیز مستثنیٰ ہے؟ اور چونکہ چند ملی لوگوں میں تشکیک بہت ہوچکی ہے اس لئے اگر دونوں مسئلے مع حدیث شریف اور اقوال مجتہدین ہوں تو بہتر ہے۔

از سائل عبد الرحمٰن

مدرسہ قاسم العلوم، دروازہ شیرانوالہ

مسجد لائن والی، لاہور

## الجواب

قال الشامی: إذا شرب الماء أو أکل الفواکه علی الطریق لایقدح فی عدالته، لأن الناس لایستقبحون ذلك فتح۔ اھ (ج ۴ ص ۵۹۳ ط)

اس سے معلوم ہوا کہ راستے میں ایسی چیز کے کھانے سے عدالت ساقط ہوجاتی ہے جس کا راستے میں کھانا عام طور پر عرف میں معیوب شمار ہوتا ہے، اور جس چیز کا راستے میں کھانا عرفاً معیوب نہیں، اس کے کھانے سے عدالت ساقط نہیں ہوتی، ہمارے عرف میں راستے میں پان کھانا معیوب نہیں، مٹھائی کھانا معیوب ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۲ھ

**طلاق کی ایک صورت میں تحمل شہادت کی بحث**

**سوال:-** کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین کہ میرا شوہر مسمی عبدالرشید خان ولد عبدالقادر خان اس وقت کہ میں اپنے والد مسمی حافظ عبداللطیف خان صاحب کے مکان پر تھی آیا، اور کہا کہ تم چلو! میں نے جواب دیا کہ میں ابھی نہیں چلوں گی، حافظ صاحب منع کرتے ہیں۔ اس پر میرا شوہر عبدالرشید خان برافروختہ ہوا کہ جب تو میرے کہنے کی نہیں ہے تو میں تجھ کو طلاق دیتا ہوں، اور میرے والد صاحب سے کہا کہ جاؤ! دو چار آدمیوں کو باہر سے بلا لاؤ، میں ان کے سامنے طلاق دے دوں گا، اس پر میرے والد صاحب باہر گئے: اور چار شخص محمد یعقوب صاحب، محمد یوسف صاحب، محمد اسماعیل صاحب، محمد عبدالحمید خان کو باہر سے بلا لائے۔ ان چار شخصوں کے اور میرے والد کی موجودگی میں میرے شوہر نے مجھ کو تین طلاقیں دیں۔ ان چار گواہوں میں دو محمد اسماعیل خان و عبدالحمید خان ایسے ہیں جن سے میرا پردہ نہیں ہے، اگرچہ اس وقت میں ان کے سامنے نہ تھی، بلکہ آڑ میں تھی، اور میرے شوہر کا خطاب میری ہی طرف تھا، اس لئے کہ پہلے سے مجھ ہی سے مخاطب تھا اور نہ سوائے میرے اس کی کوئی منکوحہ ہے۔ اس طلاق کی تصدیق جب محکمہ مجاز میں کرائی گئی اور حاکم نے گواہان کو طلب فرمایا، اور ان کے جو بیانات جن کی نقل مطابق اصل اور بعض سوالات جو ان سے کئے جانے تھے انہوں نے جواب دیا وہ سب منسلک استفتاء ہذا ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں طلاق ہوئی ہے یا نہیں؟ اور ہوئی تو کون سی ہوئی؟ اور ان بیانات شاہدوں پر ثبوت طلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

فقط

المستفتیہ: عائشہ بی بی بنت عبداللطیف خان

بھوپال

## الجواب

صورت مسئولہ میں دیانۃً تو تین طلاق واقع ہو چکی، اس واسطے عورت کو ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کے پاس جائے۔ البتہ حاکم کے پاس ثابت کرنے کے لئے شہادت کی ضرورت ہے، اس لئے شہادت کے معتبر ہونے یا نہ ہونے پر بحث کی ضرورت ہے اور اس واسطے سوال میں اس امر کا تنقیح ضروری ہے کہ والد لڑکی کا جب شاہدوں کو بلا کر مکان پر لے آیا۔

(۱) تب والد نے لڑکی کو دیکھا تھا، یا وہ بھی دوسرے مردوں کے ہمراہ پردہ سے باہر تھا۔

(۲) و نیز یہ بھی لکھیں کہ والد نے اس وقت بھی جب مکان میں گواہوں کو بلا کر جا چکا تھا یہ بھی کہا تھا یا نہیں کہ میری لڑکی یہاں موجود ہے، اور اس سے خطاب ہو رہا ہے۔ (باہر کے وقت مکان سے باہر جو کہا تھا اس کے متعلق سوال نہیں ہے)

(۳) اور کیا اس وقت سوائے عائشہ اور عبدالرشید کے اور کوئی عورت وغیرہ بھی مکان میں تھی۔

(۴) اور کیا اس مکان کا دروازہ باہر آمد و رفت کے لئے ایک ہی ہے یا متعدد۔

ان چاروں نمبروں کا جواب مفصل آنے پر اس شہادت کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا حکم شرعی لکھا جائے گا۔ علاوہ ازیں ایک یہ بات بھی لکھی جائے کہ وہ حاکم جس کی عدالت میں مقدمہ پیش ہے وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم۔

فقط والسلام

حقر عبدالکریم عفی عنہ از خانقاہ امدادیہ

تھانہ بھون

مورخہ ۵ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۵۱ھ

جواب سوال نمبر ۱: گواہوں کو جب بلا کر لایا۔ تو میں لڑکی کو دیکھتا تھا، وہ میرے نظر کے سامنے تھی، اگرچہ دونوں گواہوں سے لڑکی کا پردہ پہلے سے نہ تھا لیکن لڑکی اس وقت پردہ کی آڑ میں تھی۔

جواب سوال نمبر ۲: میں نے گواہوں کو اندر لا کر یہ الفاظ کہا تھا، کہ میری لڑکی کو اس کا شوہر طلاق دیتا ہے، تم سن لو، لڑکی اس جگہ کواڑ کے آڑ میں موجود تھی، اور ایک کواڑ کھلا ہوا تھا

اور ہم صورت سے بند تھا، اور اسی کواڑ کے آڑ میں لڑکی کھڑی ہوئی تھی، اور بات چیت بھی کر رہی تھی، اور میں لڑکی عائشہ کو دیکھ رہا تھا، اور گواہوں اور شوہر سے لڑکی کی موجودگی دو ڈیڑھ ہاتھ کا فاصلہ تھا، اس لئے کہ مکان مختصر ہے۔

جواب سوال نمبر ۲ — عائشہ کے پاس سوتے اس کی حقیقی ماں کے اور کوئی عورت و مرد نہ تھا۔

جواب سوال نمبر ۳ — دروازہ مکان کا ایک ہی ہے دوسرا دروازہ یا کھڑکی وغیرہ نہیں ہے، مکان کے اندر اس ایک ہی دروازہ سے باہر کا آدمی داخل ہو سکتا ہے۔ اور کوئی دوسری صورت داخل کی نہیں ہے۔

جواب سوال نمبر ۴ — حاکم عدالت مسلمان اور حال ہی میں فرماں روائے بھوپال نے جدید قانون نافذ کیا ہے، کہ شرعی مقدمات کا لافتوی مفتی صاحب ریاست و اراکین مجلس علماء کے علاوہ اپنی ذمے سے کوئی فیصلہ مسلمانوں کا نہ کرے مثل کا محکمہ افتاء میں جانا ضروری ہے مفتی صاحب حال بھوپال قاضی صاحب مرحوم کے حیات میں نائب مفتی تھے وہی مفتی مقرر ہوئے ہیں، ان مفتی صاحب نے دیانۃً فتوی دیا تھا، کہ طلاق مغلظہ واقع ہو گئی ہے، اب بھی عدالت سے مثل انہیں مفتی صاحب کے پاس جائے گی۔ فقط

خاکسار، عبداللطیف پدر

مسماۃ عائشہ۔

## الجواب

اختلف المشائخ فی تحمل الشهادة على المرأة كانت متنقبة، بعض مشائخنا قالوا: لا يصح التحمل عليها بدون رؤية وجهها، وبعض مشائخنا توسعوا فی هذا، وقالوا يصح عند التعريف، وتعريف الواحد يكفي، والمثنى أحوط، والى مال الشيخ الإمام المعروف بخواهر زاده، والى القول الاول مال الشيخ الامام الأوزجندي، والشيخ الإمام ظهير الدين وضرب من المعقول يدل على هذا الخ عالمگیریہ (ج ۳ ص ۴۵۲)

وفيه أيضاً في الصفحة الاتية، ويصح تعريف من لا يصلح شاهداً لها، سواء كان الإشهاد لها أو عليها، ومن المشائخ من قال: إن كان

الاشهاد لها، لايصح التعريف ممن لايصلح شاهدا لها، ولفظ الامام نجم الدين النسفي القول الأول. كذا في الفصول العمادية، اھ

اس سے معلوم ہوا کہ پردہ نشین عورت کے متعلق اگر ایک شخص یہ بیان کرے کہ وہ یہاں موجود ہے، اور اس سے یہ خطاب کیا جارہا ہے، یا وہ یہ بات کہہ رہی ہے جو تم سن رہے ہو، تو اس صورت میں سننے والوں کی گواہی معتبر ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے، بعض مشائخ نے اس کو معتبر رکھا ہے، اور اس واقعہ میں حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی بھی فرماتے ہیں کہ شہادت قبول کرنا چاہئے، کیونکہ جن مشائخ نے تعریف واحد کو کافی نہیں سمجھا، اس کی بناء یہ ہے کہ شاید یہ شخص غلط کہتا ہو، اور اس واقعہ میں سے الفاظ طلاق تو خود شاہدوں نے سنے ہیں، اور زوجہ کے والد نے شاہدوں سے یہ کہا ہے کہ یہ میری لڑکی کو طلاق دے رہا ہے۔ اگر خسر کا یہ قول غلط ہوتا تو داماد رد کردیتا، اس کے سکوت سے اس کی صاف تائید ہوتی ہے کہ خسر کا قول صحیح ہے، اور شہادت اس واقعہ میں معتبر رہنا چاہئے، پس حاکم کو اس صورت میں ان مشائخ کا قول لینا بہتر ہے جو تعریف واحد کو کافی کہتے ہیں۔ لہٰذا صورت مسئلہ میں حاکم کو شہادت تسلیم کرکے طلاق کا فیصلہ کردینا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۵ / رجب ۱۳۵۰ھ

طلاق میں گواہوں کا عادل ہونا شرط ہے

**سوال:** ایک شخص اقرار کرتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو اس طرح طلاق دی کہ ایک طلاق، دو طلاق مگر دو گواہ شہادت دیتے ہیں کہ اس نے یوں کہا تھا "ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق بائن دی" مگر گواہ عادل نہیں، یعنی پابند صوم وصلوٰۃ نہیں۔ اب اگر ہم ان کو غیر معتبر جان کر دو طلاق کا حکم دیتے ہیں، تو اس زمانہ میں کوئی کام شریعت کے موافق ثابت نہیں ہوسکتا، کیونکہ دنیا میں ایک طرح سب فاسق ہیں الاماشاء اللہ، پھر مدعی ماشاء اللہ گواہوں سے زیادہ فاسق ہے۔

راقم دف روی کفیل الدین
مقام اسلام آباد ضلع میرٹھ

## الجواب

صورت مسئولہ میں چونکہ گواہ عادل نہیں، اس لئے ان گواہوں کی شہادت سے تین طلاق کا حکم نہیں دیا جا سکتا، بلکہ صرف دو طلاق رجعی واقع ہوئی ہیں اور جب لوگوں نے شریعت کی پابندی چھوڑ دی تو وہ خود چاہتے ہیں کہ شریعت کے موافق ہمارا کوئی معاملہ ثابت نہ ہو۔ اور جس دن وہ شریعت کے موافق اپنے معاملات کو ثابت کرنا چاہیں گے خود بھی پابندی کریں گے، اور دوسروں سے بھی کرائیں گے۔ اور مدعی کا عادل ہونا شرط نہیں، مدعی تو کافر بھی ہوتا ہے گو یا عدالت تو شہود میں شرط ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ۔ از تھانہ بھون

۱۳ ذی الحجہ ۱۳۴۹ھ

# کتاب القصاص والدیات

**مجنون اگر اپنی بیوی کو قتل کر دے؟**

سوال:- ایک شخص مجنون حالت میں اپنی بیوی کو رات کے وقت نیند میں کوٹھالی جس سے تلوار کی چیری جاتی ہے سر پر مار کر قتل کر ڈالا، گواہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سر پر کوٹھالی مار کر پاؤں سے خوب روندا جس کی وجہ سے عورت مرگئی، ایسی حالت پر غسل دینا چاہئے یا نہ؟ اور کیوں؟ خلاصہ تحریر فرمائیں؟

## الجواب

قال فی نور الأنوار: والجنون، وتسقط به العبادات المحتملة للسقوط، لا ضمان المتلفات ونفقة الاقارب والدية، كما في الصبي بعينه. لكنه إذا يمتد لحق بالنوم الخ

وھذا فی الجنون العارضی، بأن بلغ عاقلاً ثم جن، وأما فی الجنون الأصلی، بأن بلغ مجنوناً، فعند أبی یوسفؒ ھو بمنزلة الصبی اھ ص۲۸۸

وفی الاشباہ فی أحکام الصغار ولاقصاص علیه وعمدہ خطاء اھ ص۲۲۴

وفی عالمگیریة فی تعریف الشھید، اوقتله مسلم ظلماً ولم تجب به الدیة اھ ج ا ص۱۰۸ ۔

صورت مسئولہ میں اگر زوج قاتل کا جنون ممتد ہے تو وہ نابالغ بچے کے حکم میں ہے، اور نابالغ کے قتل سے قصاص واجب نہیں ہوتا، صرف دیت واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا عورت شہید کے احکام قرار نہ پائے گی، اور اس کو غسل دیا جائے گا اور زوج اس کے میراث سے بھی محروم نہ ہوگا، جیسا کہ صبی اپنی مورث کو قتل کرکے میراث سے محروم نہیں ہوتا۔

قال فی نور الأنوار فلا یحرم عن المیراث بالقتل عندنا یعنی لو قتل الصبی مورثه عمداً أو خطاءً لا یحرم عن میراثه لأنه عقوبة وعھدة لا یستحقھا الصبی اھ ص۲۸۹

اور اگر جنون غیر ممتد ہے تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

۲؍ شوال سنہ ۱۴۲۱ھ

# کتاب الحدود والتعزیرات

**حاکم کیلئے شخص متہم کو سزا دینا جائز ہے**

سوال:- ایک آدمی نے رات کے وقت
بذریعہ نقب زنی ایک مکان سے لیمپ، کپڑے اور دیگر اشیاء چرائی علی الصبح مالک کو
مکان میں داخل ہونے پر مکان میں سوراخ معلوم ہوا اور مال معدوم ہو چکا نقب کے
پاس دو آدمی کے پاؤں تازہ معلوم ہوئے تھے دو تین آدمیوں نے پاؤں کے نشانات
کا پیچھا کیا اور ایک گھر تک نشانات گئے اوس گھر کے ملحق ایک پٹوار خانہ جو کہ
اوس گھر والے کے بھائی نے سرکار پر فروخت کیا تھا جسمیں پٹواری بوجہ خطرہ کے
نہیں رہتا۔ اوس گھر والے اپنا بھوسہ وغیرہ اس میں رکھا کرتے ہیں اس پٹوار خانہ
کی تلاشی پر بھوسہ میں مال مسروقہ سے گھی کا ایک برتن ملا۔ گواہان میں سے ایک
معتبر گواہ نے مالک گھر والے کو ڈانٹا اور کہا کہ اب تو چوری تم پر ثابت ہوگئی دیگر مال
بتاؤ جو دو تین گواہان کے سامنے اسی کوٹھے کے بھوسہ میں سے دیگر مال مسروقہ نکالدیا
اور کہا میں نے اور میرے بھائی نے یہ مال چرایا تھا مگر سرکار کو حوالہ مت کرو۔ اب ایک
بھائی تو بھاگ کر سرکاری علاقہ سے باہر چلا گیا دوسرا عدالت میں اس بیان سے منکر
ہے جو اس نے گواہان کے سامنے دیا تھا۔ گواہان اس امر میں متفق البیان ہیں کہ ملزم
نے انکے سامنے جرم سے اقبال کیا۔ بلکہ مال بھی خود نکالا۔ مگر دیگر بیانات میں
گواہان کا اکثر اختلاف ہے۔ ایک گواہ کہتا ہے کہ نقب کی جگہ سے بقدرے فاصلہ
تک نشانات قدموں کے اوپر ان کو محفوظ رکھنے کی خاطر ان پر برتن رکھے گئے
تھے تاکہ تفتیش میں دقت نہ ہو۔ دوسرا کہتا ہے کہ ملزم کے گھر تک ان نشانات پر
برتن رکھے گئے تھے۔ اس موخر الذکر بیان والے دو گواہان ہیں۔ اب بعض گواہان
تو کہتے ہیں کہ ملزم کے گھر تک تو وہی نشانات آئے ہیں مگر پٹوار خانہ کے صحن
میں بہاری کے ساتھ نشانات مٹائے گئے ہیں مگر پولیس کا سپاہی جو کہ نشانات
پاؤں کی شناخت کیلئے سرکار سے مقرر کیا ہے اور اس فن میں ماہر ہے کہتا ہے کہ پٹوار خانہ

کے صحن میں بھی نشانات پاؤں موجود تھے اور ملزم کے پاؤں کے مشابہ پاؤں ہے اور بہاری سے وہ نشانات بالکل نہیں مٹائے گئے سرکار کا قانون تو کہتا ہے کہ اگر ایک گواہ کے بیان پر بھی عدالت کو تسلی آجاوے تو سزا دیجائے اور اگر بیان متضاد ہوں تو بھی ملزمان کو چھوڑنا نہ چاہیئے۔ اب شرع ایسے ملزم کیلئے کیا حکم دیگی۔

## الجواب

صورت مذکورہ میں اگر حاکم کے نزدیک مدعی علیہ متہم معلوم ہو تو اس کو سزائے قید دینا اور زدوکوب کرنا جائز ہے جتنی مدت کی قید بھی اسکے نزدیک مناسب ہو۔ قال فی الدر للقاضی تعزیر المتہم وفی رد المحتار: و فی ھذا التصریح بان ضرب المتہم بسرقۃ من السیاسۃ وفی الدر ناقلاً عن العینی عن ابی یوسف ومن یتہم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس احبسہ واخلدہ فی السجن الخ صفحہ ج ۳۔ اور متہم ہونیکی صورت ایک تو یہ ہے کہ وہ شخص ارتکاب جرائم میں مشہور ہو، دوسری یہ کہ ایک نیک شخص یا دو مجہول الحال آدمی گواہی دیں جنکی گواہی سے حاکم کو مدعی علیہ کا متہم ہونا معلوم ہوجائے لیکن اس صورت میں مدعی علیہ کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ دعوے قتل میں دو عادل مسلمانوں کی شہادت قاتل مسلم میں شرط ہے اور قاتل کافر میں دو کافر گواہ بھی کافی ہیں اور نہ اس پر جرمانہ مالی کیا جاسکتا ہے لیکن اگر قانوناً جرمانہ کرنا ضروری ہو تو جرمانہ بھی کرسکتے ہیں کیونکہ بعض آئمہ نے جرمانہ کو جائز کہا ہے

**جرمانہ مدارس بر طلبۂ غیر حاضر** سوال: یہاں کے مدرسہ کا ایک قانون یہ ہے کہ طلبہ کی غیر حاضری پر فی روز دو پیسہ جرمانہ لیا جاتا ہے نیز اُن پر جو فیس مقرر ہے اسکی ادائیگی کی تاریخ معینہ سے دیر ہونے سے فی روز دو پیسہ جرمانہ ہے یہ جرمانہ لینا جائز ہے یا نہیں اور اگر انہیں پیسوں کو کسی مدرس کی تنخواہ میں دیا جاوے تو اس مدرس کو لینا جائز ہے یا نہیں۔

## الجواب

حنفیہ کے نزدیک غرامۂ مالیہ جائز نہیں، پس اگر مدرسہ مسلمانوں کا ہے تو ایسے جرمانہ سے مدرس کو تنخواہ لینا درست نہیں اور گورنمنٹ کا ہے تو وجہ

استبداد کے درست ہے واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

۵ / محرم ۴۸ھ

این شخص پر تعزیر کا حکم جس پر عورت نے شخصے بارے منکوحہ زنا کردہ بوجہ اذیت زنا کی تہمت لگائی ہو اور مرد منکر ہو) زن میگوید کہ فلان بامن زنا کردہ است لیکن آن شخص انکار میکند دریں صورت او را سیاستہً ہیچ سزا دادن شرعاً چہ حکم دارد۔

## الجواب

محض عورت کے کہنے سے مرد پر سیاستہً تعزیر نہیں ہو سکتی بلکہ اگر قاضی کی رائے میں قرائن اُخر سے وہ متہم کے درجہ میں ہو جائے تو تعزیراً کچھ سزا دی جا سکتی ہے مگر قاضی آجکل کہاں۔ البتہ بعض قوموں میں پنچایت کا زور ہوتا ہے تو پنچایت اس بارہ میں بمنزلہ قاضی کے ہے اگر وہ مسائل شرعیہ سے باخبر ہوں یا کسی عالم سے پوچھکر عمل کرتے ہوں واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون

البتہ صورت مسئولہ میں عورت اگر دعوے اکراہ کا نہ کرے تو عورت یقیناً مستحق عقوبت ہے۔ اگر حاکم اسلام کے روبرو ہو تو وہ عقوبت حد زنا ہے بشرائطہا اور اگر غیر حاکم کے روبرو ہو تو حدود شرعیہ کے اندر جس قدر تعزیر اسکے قدرت میں ہو۔

اشرف علی

حکم تعزیر بالمال | چہ میفرمایند علماء دین و مفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ جرمانہ مالی شرعاً جائز است یا نہ مثلاً سرداران بستی گر کسی را قسمے خطا و قصور می بینند چنانچہ شخصے کسے را سب و شتم یا دیگر ہیچ حرکت ناشائستہ کند پس او را باتفاق سرداران محلہ سیاستہً چند روپیہ جرمانہ میکنند یا اگر شخصے مال یا چیز کسے نقصان کند درآن نیز بصورت اولی جرمانہ می سازند آیا این چنین جرمانہ از قرآن

وحدیث ونیز ائمہ اربعہ ثابت است یا نہ، و آں رقم ورد پیہ با ہم باید کرد و آں را مستحق کدام کس اند اگر آں رقم ها بنزد یکے از سرداران اوشان جمع داشتہ باموری متفقہ بہبودی مسلمانان بوقتِ ضرورت صرف نمایند آنرا چہ حکم است آیا جائز است یا نہ بحوالہ کتب تفصیل وار بہ حکم را جواب تحریر فرمایند۔

## الجواب

جرمانہ مالی مذہب حنفی میں جائز نہیں ہے، قال فی الدر فی باب التعزیر لا باخذ مال فی المذھب اھ و قال الشامی وشرح معانی الاثار للطحاوی التعزیر بالمال کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ اھ (ملخص ج ۳) باقی دیگر ائمہ کا مذہب بیان کرنا ہمارے ذمہ لازم نہیں۔ نہ دلائل حدیث قرآن بیان کرنا لازم ہے، کیونکہ یہ وظیفہ مجتہد ہے اور ہم مقلد ہیں۔ فقط واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
از تھانہ بھون

**مرتد اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے احکام**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسائل مفصلہ ذیل میں۔ زید پیدائشی ہندو تھا بالغ ہو کر علی الاعلان مسلمان ہو گیا مگر بال بچے اسکے ہندو رہے، اب چار پانچ سال ہوتے کہ زید نے علانیہ بودھ مذہب اختیار کر لیا ہے اور اپنے دروازے پر بودھ کی مورت بھی نصب کر لی ہے اپنے آپ کو بدھ مذہبی مشہور بھی کرتا ہے مگر ہر سال مولود شریف اور مسلمانوں کی دعوت بھی کرتا ہے اس طور پر کہ ایک مسلمان مثلاً بکر کو نقد روپیہ دیتا ہے اور بکر محفل میلاد اور دعوت کا انتظام کرتا ہے، بعض مسلمان اسکو مرتد سمجھتے ہیں اور اسکے کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں اور بعض مسلمان کہتے ہیں کہ وہ مصلحتاً اپنے تئیں بودھ کہتا ہے درحقیقت وہ مسلمان ہے۔ نماز پڑھتا ہے روزے رکھتا ہے، مولود شریف کرتا ہے، مسلمانوں کی دعوت علانیہ کرتا ہے، جسکا جی چاہے خلوت میں پوچھ لے زید اپنے مسلمان ہونیکا اقرار کریگا ہاں اپنے برادری کے لوگوں میں اپنے تئیں بودھ بھی کہتا ہے، لہذا علماء دین و حاملان شریعت غراء محمدی صلی اللہ علیہ وسلم (۱) زید کے حق میں کیا فرماتے ہیں (۲) بکر کے حق میں کیا فرماتے ہیں

(۳) ان مسلمانوں کے حق میں کیا فرماتے ہیں جو زید کو ایسی صورت میں مسلمان سمجھتے و کہتے ہیں (۴) ان مسلمانوں کے حق میں جو زید کو مہمان کر اسکی دعوت میں شرکت نہیں کرتے (۵) ان مسلمانوں کے حق میں جو کہتے ہیں کہ زید اگر مسلمان نہ ہوتا تو سو روپے کی رقم مولود شریف اور دعوت کیلئے کیوں دیتا (۶) ان لوگوں کے حق میں جو کہتے ہیں کہ زید ہے تو درحقیقت مسلمان مگر چند مصلحتوں سے یہ کچھ پردہ رکھتا ہے زید کے ساتھ مسلمانوں کو اخلاق برتنا چاہئے ممکن ہے کہ وہ اخلاق و ارتباط و اختلاط باہمی کی وجہ سے پھر مسلمان ہو جائے اگر اخلاق نہ برتا گیا اور نفرت کا اظہار کیا گیا تو اسکا رہا سہا اعتقاد بھی جاتا رہیگا وہ بالکل کافر ہو جائیگا اور جو رقم وہ مولود شریف میں صرف کرتا ہے کفر کے کاموں میں صرف کریگا جو مسلمانوں کو کھلاتا ہے وہ کفار کو کھلائیگا اسلام کی طرف سے ان سوالات کا کیا جواب دیا جاتا ہے (۷) ان لوگوں کے حق میں جو دعوت میں شرکت کریں (۸) ان لوگوں کے حق میں جو زید کی دعوت کا انتظام زید کی خوشنودی کیلئے بلا اجرت یا اجرت لیکر کریں (۹) ان لوگوں کے حق میں جو بکر کی رعایت اور خوشنودی کیلئے زید کی محفل کا انتظام کریں (۱۱) ان حضرات کے حق میں جو زید کی محفل میں وعظ کہیں یا مولود شریف پڑھیں (۱۰) ان حضرات کے حق میں جو محفل وعظ اور محفل مولود میں زید یا بکر کے ہاں شریک ہوں (۱۲) ان لوگوں کے حق میں جو شرکت نہ کرنیوالوں کو برا بھلا کہیں اور طعن کریں (۱۳) اس شخص کے حق میں جو مسلمانوں کو دھوکہ دیکر زید کا کھانا کھلائے اور دعوت کا انتظام اپنی طرف سے کرے (۱۴) ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے زید کی جوتی کی ناحق کی متابعت کی اس کو اپنی نجات دیکھا (۱۵) اس شخص کے حق میں جو علانیہ اپنے تئیں کافر کہے اور پوشیدہ مسلمان ہو (۱۶) اس شخص کے حق میں جو اسلام کو حق کہے مگر دوسرے مذہب مثلاً بودھ مذہب کو بھی حق کہے (۱۷) کافر اور مرتد کے احکام میں کیا فرق ہے۔ بینوا توجروا عند اللہ العلی العظیم۔

بصد احترام التماس ہے کہ جوابات مسکت و مدلل ہوں تاکہ پھر کسی شبہ و سوال کی گنجائش نہ رہے

## الجواب

(۱) زید مرتد ہے اگر اسلامی حکومت ہوتی تو اسکو تبلیغ اسلام کی جاتی اگر بعد تبلیغ

اپنے کو مسلمان نہ کہتا تو قتل کر دیا جاتا (۲) اگر بکر کو زید کی خفیہ حالت سے اس کا مسلمان ہونا اور اپنے کو مسلمان کہنا اور نماز پڑھنا وغیرہ معلوم ہے تو اسکو زید کے ساتھ اس نیت سے کہ شاید پھر مسلمان علانیہ ہو جائے اخلاق برتاؤ جائز ہوگا کما فی التاریخ عن بعض الصحابۃ انهم تلاقوا بالخبلۃ بعد ردتہ ونصحوہ ووعظوہ وقبلوا اکرامہ وجوائزہ (۳) جن مسلمانوں کو زید کی خفیہ حالت سے یہ تحقیق ہو گئی ہو کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے ان کو اس کے ساتھ اخلاقی برتاؤ تو جائز ہے مگر مسلمان سمجھنا جائز نہیں جب تک کہ وہ اسلام کا اعلان اس طرح نہ کرے جس طرح اس نے اپنے ردت کا اعلان کیا ہے (۴) زید حقیقت میں بحکم شرع مرتد ہی ہے لہٰذا جن لوگوں کو اس سے اختلاط کرنے میں امید اصلاح نہ ہو ان کو اس سے کنارہ کشی کر لینا اور میل جول ترک کر دینا ضروری ہے (۵) محض مولود شریف کرانا اور دعوت مسلمین کرنا اسلام کی دلیل نہیں بعض ہندو بھی اپنے مسلمان دوستوں کی خاطر مولود کرا لیتے ہیں (۶) جن لوگوں کو زید کی اندرونی حالت معلوم ہو انکو اسکی اصلاح کی غرض سے اس سے اختلاط وغیرہ جائز ہے اور اگر محض طمع دنیا اس کا سبب ہے تو ناجائز ہے (۷) اگر دعوت کا انتظام کوئی مسلمان کرتا ہو اور وہ مسلمان ہی داعی ہو تو قبول دعوت کا مضائقہ نہیں گو اسمیں روپیہ مرتد ہی کا لگتا ہو اور اگر وہ مرتد خود داعی ہو تو عام مسلمانوں کو اسکی دعوت قبول نہ کرنا چاہیئے ہاں جن کو اسکی اندرونی حالت سے اسلام کی طرف میلان ظاہر ہوتا ہو اور ان کے اختلاط سے اسکی اصلاح متوقع ہو ان کو گنجائش ہے (۸) اسکا جواب بھی مثل ۷ کے ہے (۹) اگر اس محفل کے انتظام سے زید کی اصلاح کی امید ہو تو مضائقہ نہیں (۱۰) اسکا جواب بھی مثل ۸ کے ہے (۱۱) جن کو زید کا میلان الی الاسلام معلوم ہو ان کو شرکت جائز ہے اور جن کو معلوم نہ ہو ان کو مناسب نہیں (۱۲) انکو بلا وجہ شرعی کی وجہ سے گناہ ہوگا کیونکہ جس شخص کو مرتد کا میلان الی الاسلام معلوم نہ ہو اس کے ذمہ اس کے ساتھ مرتدین کا سا برتاؤ لازم ہے (۱۳) اگر یہ شخص محض طمع نفس سے ایسا کرتا ہے گنہگار ہے اور اگر اس سے اس فعل کو مرتد کے اسلام کی طرف آجانیکی امید ہے تو جائز ہے باقی دھوکہ دینا کسی حال میں جائز نہیں حقیقت حال سے لوگوں کو مطلع کرکے انتظام کرے جو آئیگا آجائیگا جو

پہنچ جائے گا ⑭ جنازہ کافر کی مشایعت ناجائز ہے یہ لوگ گنہگار ہوئے توبہ
کریں ⑮ احکام ظاہرہ میں وہ کافر شمار کیا جائیگا اور باطن کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد
کیا جائیگا ⑯ ایسا شخص جو مذہب اسلام کے سوا کسی اور مذہب کو بھی حق کہتا ہو کافر ہے
⑰ مرد مرتد کو دار الاسلام میں تین دن سے زیادہ تک زندہ نہیں رکھا جا سکتا اگر
ارتداد کے بعد وہ اسلام کی طرف نہ آئے تو حکم قتل کا ہے مگر یہ وہاں ہے جہاں اسلامی
حکومت ہو۔ ہندوستان جیسے ملک میں یہاں مرتد اور دوسرے کافر ایک حکم میں ہیں البتہ
مرتد کے ساتھ دوسرے کافروں سے زیادہ اظہار نفرت وکراہت کرنا چاہئے مگر یہ کہ اس کے
اسلام کی امید ہو تو اس نیت سے مدارات کا مضائقہ نہیں۔ قال فی العالمگیریۃ
مرتد لحق بدار الحرب ثم ظہر علی ذلک المال فہو فیئ ولا سبیل
لورثتہ علیہ اھ (ص ۱۵۸ ج ۳) دل علی ان المرتد بدار الحرب قبل الظہور
علیہ فی حکم الحربی الا انہ لا یسترق بعد الظہور علیہ قال فی العالمگیریۃ
وان کان لحق بدار الحرب ثم رجع وذہب بمالہ وادخلہ دار الحرب ثم
ظہر علی ذلک المال فانہ یرد علی ورثتہ الا انہ بغیر شیئ قبل القسمۃ
وبالقیمۃ بعد القسمۃ کذا فی الکافی اھ (ص ۱۵۸ ج ۲) قلت فلما جرت
القسمۃ فی مالہ الذی تعلق بہ حق الورثۃ ففیما لم یتعلق بہ حقہم
(وہی الصورۃ السابقۃ) اولی وفیہا ایضا ذکر الامام رکن الاسلام السغدی
اذا کان حربیا فی دار الحرب وکان الحال حال صلح ومسالمۃ فلا بأس
بان یصلہ کذا فی التاتارخانیۃ ہذا ہو الکلام فی صلۃ المسلم المشرک
وجئنا الی صلۃ المشرک المسلم فقد روی محمد فی السیر الکبیر
اخبارا متعارضۃ اھ وفیہا ایضا لا بأس بالذہاب الی ضیافۃ اہل الذمۃ
اھ وفیہا اذا دخل ذمی علی مسلم فقام لہ ان قام طمعا فی اسلامہ فلا
بأس بہ وان قام تعظیما لہ من غیر ان ینوی ما ذکرناہ او قام طمعا لغناہ
کرہ لہ ذلک اھ (ص ۲۲۳ ج ۴) قلت والمرتد بدار الحرب کالحربی
السالم ظاہرا واللہ اعلم۔ قال فی البحر: ویزول ملک المرتد
عن مالہ زوالا موقوفا فان اسلم عاد ملکہ، قالوا وہذا عند ابی

حنیفة وعندهما لا یزول ملکه لانه مکلف محتاج فالی ان یقتل یبقی ملکه کالمحکوم علیه بالرجم والقصاص وله أنه حربی مقهور تحت ایدینا حتی یقتل ولا یقتل الا بالحراب وهذا یوجب زوال ملکه اھ قلت ومفاد ذلك امران الاول کون المرتد فی حکم الحربی والثانی زوال ملکه عن ماله للحراب ولا یخفی ان الحراب انما یوجب زوال الملك فی دار الاسلام واما فی دار الحرب فلا فالمرتد بدار الحرب فی حکم سائر الحربیین؛ قال فی البحر: وقید بالمرتد لان المرتدة لا یزول ملکها عن مالها بلا خلاف فیجوز تصرفاتها بالاجماع لأنها لا تقتل فلم تکن ردتها سببا لزوال ملکها کذا فی البدائع، وینبغی أن یلحق بها المرتد اذا لم یقتل وهو من کان فی إسلامه شبهة کما قدمناه بجامع عدم القتل ولو اره صبیا اھ (ص۱۳۲-ج۵). قلت واللاحق بدار الحرب ومن ارتد فیها اولی بهذا الحکم لما فی البحر ایضا (ص۱۳۳-ج۵) لانه بالحاق صار من اهل الحرب اھ قلت فیجوز قبول ضیافته اذا کان یرجی إسلامه کما یجوز اجابة ضیافة الذمی والحربی المسالم وکذا یجوز مبایعته ومعاملته معه کما جاز مع اهل الحرب سائرهم-

حرره الاحقر ظفر احمد عفی اللہ عنه

**حکم تعزیر بضرب متعلم و صبیان و تنبیہ بر کوتاہی در تعلیم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل کے بارے میں کہ طالب علم چاہے قرآن مجید پڑھتا ہو چاہے دیگر کتب علم دین کی پڑھتا ہو۔ اگر وہ پڑھنے میں محنت کرکے یاد نہ کرے تو شرعاً کس حد تک مارنے کی اجازت ہے جس میں عند اللہ مواخذہ نہ ہوئے۔ اور اگر وہ اپنی طرف سے محنت تو خوب کرتا ہے لیکن بوجہ کم ذہن ہونے کے سبق یاد نہیں ہوتا۔ تو شرعاً کس حد تک مارنے کی اجازت ہے جس میں کہ عند اللہ مواخذہ نہ ہوئے۔ چاہے طالب علم لڑکا ہو یا لڑکی ہر ایک کا حکم ایک ہی ہے یا جداگانہ بالتفصیل تحریر فرمائیے جس سے استاذ کو پوری نصیحت ہوجائے اور عند اللہ مواخذہ نہ ہووے۔ آجکل کم علم استاذ بہت ہی مارتے ہیں، جواب تسلی بخش تحریر فرمائیں۔

۔ ایک شخص کی زوجہ ہے۔ وہ اپنی زوجہ کو خود ہی پڑھاتا ہے۔ اگر اسکی زوجہ پڑھنے میں محنت نہ کرے تو کس حد تک اپنی زوجہ کو مارپیٹ کی اجازت ہے اور اگر وہ محنت تو خوب کرتی ہے لیکن بوجہ کم ذہن ہونے کے سبق یاد نہیں رہتا تو اس صورت میں کس حد تک مار سکتی ہے قرآن مجید پڑھنے میں ایسا کرتی ہے۔ اگر وہ دیگر احکام خداوندی و فرائض (مثل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ) میں ایسی کوتاہی کرے تو کتنی حد تک مارنے کی اجازت ہے۔ ۔ کیا حدیث شریف میں اپنی زوجہ کو مسواک سے مارنے کی بھی ممانعت آئی ہے یا کہ نہیں۔ خلاصہ یہ ہے اگر زوجہ قرآن مجید پڑھنے میں ایسا کرے تو کس حد تک مارنے کی اجازت ہے (قرآن مجید پورا پڑھانا ضروری ہے یا نہ، یا کہ اتنا جس سے نماز پڑھ سکے اور اگر زوجہ فرائض و احکام خداوندی میں ایسی کوتاہی کرے تو شرعاً کیا حکم ہے، مار پیٹ کے بارے ہیں۔ مارپیٹ کرے یا طلاق دیکر چھوڑ دیوے اسکے بارے میں نیز جواب شافی و کافی تحریر فرمایئے کہ جس سے خاوند حقوق العباد کے گناہ میں نہ پکڑا جاوے اور عند اللہ مواخذہ نہ ہووے بر صورت زوجہ کے معاف نہ کرنے پر۔ فقط والسلام

## الجواب

طالب علم اگر بالغ ہے، لڑکا ہو یا لڑکی تو اس کو تعلیم میں کوتاہی کرنے پر سزا دینا جائز ہے بشرطیکہ والدین کی طرف سے سزا دینے کی اجازت ہو اور اسکی حد یہ ہے کہ کماً و کیفاً و محلاً ضرب معتاد سے زیادہ نہ ہو مگر آجکل عوام کو علم دین کی طرف زمانہ سابق کی طرح رغبت نہیں رہی اسلئے اکثر والدین کو معلم کی سزا ناگوار ہوتی ہے، نیز معلم بھی آجکل زیادہ تر مسائل سے جاہل اور اخلاق سے کورے ہیں۔ وہ حدود کی رعایت نہیں کرتے اس لئے زمانہ میں ایسے سوالات کا یہی جواب دیا جائیگا کہ معلم خود سزا نہ دے بلکہ جو لڑکا تعلیم میں کوتاہی کرے، اسی دن والدین کو اطلاع کردی جائے کہ یہ لڑکا محنت نہیں کرتا۔ اب والدین خواہ سزا دیں یا نہ دیں اختیار ہے اور جو لڑکا محنت کرتا ہو مگر قدرتی طور پر کند ذہن ہے اس کو سزا نہ دی جائے نہ والدین سے سزا دلوائی جائے بلکہ اس کو بقدر ضرورت قرآن اور کچھ نماز روزے کے مسائل پڑھا کر والدین سے کہدیا جائے کہ اس کو کسی کام میں لگادو یہ پڑھنے کے لائق نہیں۔ اور نابالغ بچے کو لکڑی یا کوڑے سے مارنا جائز نہیں۔ صرف ہاتھ سے مارنا جائز ہے۔ بشرطیکہ چہرہ پر اور

نازک موقعہ پر نہ مارا جائے اور تین بار سے زیادہ نہ مارا جائے۔ اور بیوی کو تعلیمی کوتاہی پر مارنا جائز نہیں یہ حق باپ کا ہے، شوہر کا نہیں۔ اور ترک صلوٰۃ پر مارنے میں اختلاف ہے والمسألۃ فی رد المحتار ج ۳ ص ۱۹۶ تا ص ۲۰۰ و ص ۲۶۲ و ص ۲۶۶ و ص ۲۶۸ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۴ محرم سنہ ۴۶ھ

**حکم تعزیر نابالغ بوطئی بہیمہ** عرض اینکہ ایک لڑکے صغیر دس گیارہ برس عمر والے نے بھیڑ مادہ چاموں کے ساتھ بدفعلی کی ہے، اب اسکی نسبت جو شرعی احکام ہوں تلقین فرمادیں اور بھیڑ چاموں نسبت نیز۔

## الجواب

اس بچہ کے والدین سے یا جو اسکا ولی سرپرست ہو کہا جاوے کہ اس بچہ کو بطور تادیب کے کچھ سزا دیدے۔ مگر لکڑی سے نہ مارے بلکہ ہاتھ یا جوتے سے سزا دے اور نازک موقع اور چہرہ پر نہ مارے اور بہت زیادہ نہ مارے کیونکہ بچہ نابالغ ہے۔ اور مادہ چاموں کے متعلق کچھ حکم نہیں وہ جسکی ملک ہے اس کو اس سے انتفاع جائز ہے۔ قلت: وحکم الذبح والتحریق الذی صرح بہما فقہاء نا مختص عندی بوطأ البالغ لان المطلق اذا اطلق یراد بہ الکامل۔ وھو ھذا لا وطأ الصبی۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفی اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۹ صفر سنہ ۴۶ھ

**احکام تعزیر** کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص ایسا ہے جو بے باکانہ دوسرے پر جھوٹی تہمت زنا کی لگاتا ہے نوجوانوں کو بہکا کر مختلف شرارتوں سے گاؤں میں بدامنی پھیلاتا ہے، مثلاً گھروں میں ڈھیلے پھینکواتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے بہکا کر پٹوا دیتا ہے، گالی دلواتا ہے نماز جماعت بغرض فساد و اشتعال الگ کرتا ہے۔ جماعت میں خلل ڈلواتا ہے، الگ چبوترہ نماز کا قائم کرتا ہے پھر طرفہ یہ کہ مسجد سے روکنے کا الزام دوسرے پر لگا دیتا ہے، اور اس الزام کے اثبات کیلئے چبوترہ قائم کرتا ہے۔ دوسرے کو مالی نقصان پہونچاتا ہے اور اس فکر میں رہتا

گاؤں میں دو جھگڑنے والے اگر صلح کرنا چاہیں تو اشتعال آمیز باتیں کہکر صلح نہیں کرنے دیتا۔ غرضیکہ ایسے امور میں جس سے دوسروں کو ایذا پہونچے اور گاؤں میں بدامنی پھیلے اس کو خاص دلچسپی رہتی ہے حرام حلال سے جائز ناجائز سے اسے کوئی بحث نہیں ایسا شخص شرعاً کس تعزیر کا اور کتنی تعزیر کا مستحق ہے۔ کیا حاکم کے علاوہ کوئی رئیس زمیندار ذی اثر گاؤں میں امن پھیلانے کے خیال سے کچھ تعزیر کرسکتا ہے ایسے تعزیر کیلئے ایسے زمیندار کیلئے حد شرعی کیا ہے۔

## الجواب

قال فی الشامیة عن بعض المتاخرین إن الحد مختص بالامام و التعزیر یفعله الزوج و المولیٰ وکل من رأی احدا یباشر المعصیة ص۲۴۴ ۔ وفیہا ایضاً عن المجتبی: الاصل أن کل شخص رأی مسلما یزنی ان یحل له قتله و انما یمتنع خوفاً ان لا یصدق انه زنی ص۲۴۴ ۔ وعلله ابن وهبان بأنه لیس من الحد بل من الامر بالمعروف والنهی عن المنکر وهو حسن۔ وفی الدر و عزر کل مرتکب منکراً ومؤذی مسلم بغیر حق بقول او بفعل اھ ۔ والتعزیر تادیب دون الحد اکثره تسعة و ثلاثون سوطاً و اقله ثلثة لو بالضرب وجعله فی الدر مختار اربع مراتب اھ ملخصاً۔

صورت مسئولہ میں یہ شخص مستحق تعزیر یقیناً ہے پھر جو شخص اس کو خود برا کام کرتے ہوئے دیکھے اس کو اقامت تعزیر کا حق ہے اگر سمجھانے سے باز نہ آوے۔ اور جو خود نہ دیکھے بلکہ غائبانہ اسکی حرکتوں کو سنے اس کو تعزیر کا حق اس وقت ہے جبکہ ولایت تادیب حاصل ہو مثلاً زوج، مولیٰ اور باپ اور معلم کو تعزیر کا حق ہے اسی طرح رئیس دیہہ کو ان لوگوں کی تعزیر کا حق ہے جو اسکی رعیت ہوں۔ اور جو اسکی رعیت نہ ہوں انکی تعزیر کا حق نہیں مگر جبکہ اسکے سامنے معصیت کر رہا ہو تو ہر مسلمان کو حق تعزیر ہے۔ البتہ اگر رئیس کو حکومت کی طرف سے اختیار تعزیر حاصل ہو جاوے تو اس کو تعزیر عام کا حق ہے اور تعزیر کے درجات ہیں کسی کو محض دھمکانا کافی ہو جاتا کسی کو مارنے کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ضرب سے تعزیر کیجاوے تو انتالیس کوڑوں سے تجاوز نہ کیا جاوے۔ واللہ اعلم بالصواب

ظفر احمد عفی عنہ

الجواب صحیح
اشرف علی

# کتاب الاقرار والصلح

**صلح فاسد کی ایک صورت کا حکم** **سوال:** زید و عمرو و بکر و خالد ایک موضع کے زمیندار تھے جب موضع ان کے قبضہ سے بوجہ بیع نکل گیا تو مبلغ ایک صد روپیہ سالانہ حق نانکار پاتے رہے اور زید کے سوا دوسروں کو اس موضع میں کچھ زمین بحق ساقط الملکیت بھی حاصل ہے اب زمیندار نے موضع مذکور کو فروخت کر ڈالا اور مشتری جدید نے مبلغ مذکور دینے سے انکار کیا۔ عمرو و بکر و خالد نے دعویٰ کا ارادہ کیا اور زید نے دعویٰ سے انکار کیا اور کہا تم خرچ کر کے دعویٰ کرو اگر تم جیت گئے تو مجھے اپنے حصے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ عمرو و بکر و خالد دعویٰ میں کامیاب ہو گئے اب زید ان سے اپنے حصہ حق کا طالب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حق نانکار و ساقط الملکیت لینا جائز ہے یا نہیں اور زید کو اپنے حصہ کا مطالبہ درست ہے یا نہیں اگر درست ہے تو جو اس کو حق نہ دے کیا وہ گنہگار رہے گا۔ فقط

## الجواب

(بصورت تنقیح) بیع کے بعد تو بائع کا مبیع سے کوئی تعلق نہیں رہتا پھر حق نانکار کیسے ملتا ہے۔ شرعاً اس حق نانکار کا لینا کسی کو بھی جائز نہیں ہے نہ زید کو نہ عمرو و بکر کو اور اگر اس معاملہ کی حقیقت کچھ اور ہے تو اس حق نانکار کی پوری حقیقت لکھی جاوے کہ یہ کیا ہوتا ہے اور کس وجہ سے ملتا ہے اور کس صورت میں بائع اس کا مستحق ہوتا ہے و نیز اراضی ساقط الملکیت کی بھی مفصل حقیقت تحریر کی جاوے تب مفصل جواب دیا جا سکتا ہے۔

احقر عبد الکریم عفی عنہ
خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ

## تفصیل سوال بالا

قبل اسکے کہ نانکار اور اراضی کو واضح طور پر ظاہر کیا جاوے پہلے اس موضع کا حال جس میں یہ دونوں حقوق واقع ہیں جو زید و عمرو و بکر و خالد وغیرہ کو ملتے ہیں تحریر

کی جاوے۔ کیفیت موضع یہ ہے کہ سنہ ۱۲۳۱ فصلی مطابق سنہ ۱۸۲۴ء میں منجانب زید
و عمرو و بکر و خالد و مورثان ان کے بیع فرضی بلکہ جبراً و قہراً کیا گیا زر ثمن کچھ بھی وصول
نہیں۔ سنہ ۱۲۳۱ فصلی سے سنہ ۱۲۴۹ فصلی تک مشتری فرضی کا قبضہ رہا سنہ ۱۲۴۹ فصلی میں
مشتری کو نکالدیا گیا۔ زید و عمرو و بکر و خالد اور ان کے مورثان نے موضع پر قبضہ کر لیا
ان لوگوں کا قبضہ سنہ ۱۲۵۹ فصلی تک رہا سنہ ۱۲۵۹ فصلی سے سنہ ۱۲۶۳ فصلی تک ایک
اور تیسرے شخص نے بوجہ چند دستاویزات قدیمہ کے قبضہ رکھا اس شخص ثالث کے
قبضہ اٹھا دینے کی غرض سے زید و عمرو و بکر و خالد وغیرہم و ورثان کے مورثان نے بھر
مشتری فرضی کو بوجہ اسکے کہ وہ غلبہ رکھتا تھا اور شاہ اودھ کے دربار میں رسوخ حاصل
تھا بلایا گیا۔ اب ان سب لوگوں نے ملکر اس شخص ثالث کو موضع سے نکالدیا اسی
اثنا میں عملداری انگریزی شروع ہوگئی۔ بالیہ یک بات اور خیال میں رکھنے کی
ہے کہ بیعنامہ کو بر سب شرکاء کے دستخط بھی نہیں ہوئے تھے۔ [illegible] کے دستخط
نہیں اور حسب ضابطہ شاہی قاضی کی عدالت میں بھی نہیں پیش ہوا۔ قاضی وقت کی دستخط
و مہر بیعنامہ پر ثبت نہیں ہے۔ اب وہ تیسرا شخص موضع سے نکالدیا گیا ہے۔ موضع مذکور
مالک و زمینداری سے خالی ہے اور عملداری انگریزی شروع ہے۔ بندوبست ہونیوالا ہے
اس وقت مشتری فرضی اس فکر میں ہے کہ موضع پر میں قابض ہوں اور زید و عمرو و بکر و خالد
اپنی فکر میں ہیں کہ ہم قابض ہیں۔ یہ بعید غیر و مفلس اور کمزور ہیں اور مشتری صاحب زر
و زور دار ہیں اس نے مبلغ ایک صد روپیہ زید وغیرہ کو موضع سے دینا منظور کرلیا اور ایک
کاغذ بھی لکھ دیا اور زید وغیرہ کو اس طریق سے دعویداری موضع سے باز رکھا یہ لوگ دعویدار
نہیں ہوئے۔ مشتری کے نام بندوبست ہوگیا اس روپیہ کا نام نہ نشان ہے یہ حقیقت
ہے۔ ناکجا ملنے کی اس کے بعد جب مشتری کا قبضہ و تسلط ہوگیا تب اس نے اس روپیہ کو
روک دیا نہیں دیا۔ نالش کرنے پر زید و عمرو و بکر اور ان کے مورثوں کے نام ڈگری ہوگئی۔
کیفیت اراضی ساقط الملکیت کی یہ ہے کہ جب موضع زید و عمرو و بکر و خالد وغیرہم کے پاس
تھا اس وقت وہ لوگ کچھ اراضی میں کاشت کرتے تھے وہ انکی کاشت میں اب بھی تھے یعنی
جب مشتری کا قبضہ ہوا اسکو بھی مشتری نے ان کو دینا نہیں چاہا اور بیدخلی باثنا بلا کر دی
ان کو عذر دار ہوئے بر حسب قانون گورنمنٹی ڈگری ساقط الملکیت کی ملگئی جسکی اصلیت

یہ ہے کہ اسکا لگان بمقابلہ عام کاشتکاران فیصدی پچیس روپیہ کم ہوگا اور ہر سال مثل عام
کاشتکاران کے بے دخلی نہ ہوسکیگی اس طرح پر یہ دونوں حق موضع میں زید عمرو و بکر و خالد وغیرہم کو
موضع بلا قیمت عطا کر دیتے ہیں جسکی بابت مسئلہ جسکو دریافت طلب ہے کیا یہ دونوں حق شرعاً
ایسی صورت میں ناجائز ہیں۔ بیّنوا توجروا۔

## الجواب

صورت مسئولہ میں زید و عمرو و بکر وغیرہ نے جو مشتری فرضی کے ساتھ سو روپیہ سالانہ عام
موضع سے لینے پر دعویٰ ملکیت سے دستبرداری کی ہے اس عقد کی حقیقت صلح ہے اور جو صورت
صلح کی اختیار کی گئی ہے وہ فاسد ہے۔ لان الصلح کالبیع ان وقع عن مال بمال وکالاجارۃ
ان وقع عن مال بمنفعۃ کما فی الدر (صفحہ ۴۲۲ ج ۴) ویفسدہ جہالۃ المبدل
المصالح علیہ کما فیہ ایضاً (ص مذکور) والبدل مجہول ھناک فیفسد الصلح۔ اور
جب صلح فاسد ہوگئی تو شرعاً یہ موضع زید و عمرو و بکر وغیرہ اصل مالکان موضع کی ملک ہے۔
مشتری فرضی یا اسکے وارثان کی ملک نہیں زید و عمرو و بکر وغیرہ اس موضع کی پوری آمدنی
کے شرعاً مستحق ہیں اور اگر کوئی شخص ظلماً ان کو پوری آمدنی نہ دے تو جتنی بھی ان کو
قانوناً مل سکے وہ ان کے اور انکے ورثاء کیلئے حلال ہے اور حق ساقط الملکیت بھی
جو ان کو اس موضع میں حاصل ہے وہ ان کیلئے حلال ہے اور زید نے جو بندوبست
سابق کے وقت دعویٰ سے انکار کیا تھا اور عمرو و بکر و خالد سے کہا کہ جس کا جی چاہے خرچ
کرکے دعویٰ کرے اس سے زید کی ملکیت اس موضع سے زائل نہیں ہوئی بلکہ اس کا حق
بدستور قائم رہا اور اس کے بعد عمرو و بکر و خالد کو اس موضع سے جو کچھ بھی ملا یا آئندہ ملے
اس میں زید اور اسکے ورثاء کا بھی حق ہے سب کو سہام شرعیہ کے موافق تقسیم کرنا چاہئیے
البتہ عمرو و بکر کا دعویٰ میں جو ضروری صرف ہوا ہو اسمیں سے جس قدر زید کے حصہ پر پڑتا ہو وہ
خرچ عمرو و بکر و خالد یا ان کے ورثاء زید سے یا اسکے ورثاء سے لے سکتے ہیں ھذا ما ظہر لی
واللہ اعلم بالصواب۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ۔ از تھانہ بھون

| | |
|---|---|
| سوال: ایک شخص کے پاس زمین ہے جسمیں بعض ورثاء کا حق ہے جو ان کو دیا نہیں گیا۔ | ایک وارث کا دوسرے ورثاء کو کچھ نقد دیکر انکے حصے سے صلح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ |

اب یہ شخص دوسرے ورثاء کے سامنے مثلاً دو سو روپے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا جو حق اس جائیداد میں ہے اسکے عوض تم مجھ سے اتنے روپے لے لو۔ باقی کو چھوڑ دو۔ یا باقی سے مجھ کو بری کردو یہ صورت جائز ہے یا نہیں۔ فقط

السائل: مولوی عبدالمجید صاحب بچھرایونی

## الجواب

قال فی الهداية: واذا كانت التركة بين ورثة فاخرجوا احدهم منها بمال اعطوه اياه والتركة عقار او عروض جاز قليلا كان ما اعطوه اياه او كثيرا لانه امكن تصحيحه بيعا وان كانت التركة فضة فاعطوه ذهبا او ذهبا فاعطوه فضة فكذا لك لانه بيع الجنس بخلاف الجنس ويعتبر التقابض فی المجلس لانه صرف وان كانت التركة ذهبا وفضة فصالحوه على فضة او ذهب فلا بد ان يكون ما اعطوه اكثر من نصيبه من ذلك الجنس ولو كان فی التركة الدراهم والدنانير وبدل الصلح دراهم ودنانير ايضا جاز الصلح كيف ما كان صرفا للجنس الى خلاف الجنس لكن يشترط التقابض للصرف اھ (ص ۲۴۰ ج ۳)۔

صورت مسئولہ میں یہ طریقہ جائز ہے کہ ایک وارث سے دوسرا وارث یوں کہے کہ تمہارا جو حق ترکہ میں ہے اسکے عوض تم مجھ سے اتنی رقم لے لو یا یوں کہے کہ میں تم کو یہ رقم اس شرط پر دیتا ہوں کہ تم اپنے باقی حق ترکہ سے خارج اور لادعویٰ ہو جاؤ یا باقی ترکہ سے صلح کے طور پر یہ رقم لے لو یا باقی مجھکو چھوڑ دو کیونکہ ان سب صورتوں میں کلام کو صلح پر محمول کرنا ممکن ہے اور صلح بحکم بیع ہے لیکن جائیداد اور سامان غیر نقد میں تو اس طرح معاملہ کرنا مطلقاً درست ہے خواہ اس وارث کو جسے حق ترکہ سے نکالا جاتا ہے قلیل رقم دی جائے یا زیادہ اور اگر ترکہ میں اس وارث کا حق نقدین میں بھی ہو اور اس سے بھی صلح کرنا مقصود ہو تو اس میں بعض قیود کی رعایت ضروری ہے جو عبارت عربیہ میں مذکور ہیں۔ فقط حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ

تنبیہ ضروری: آجکل ہمشیرگان کو عام طور سے میراث نہیں دیتے اور محض رسم کی وجہ سے ہمشیرہ بھی انکار کر دیتی ہیں، اور ایسے مواقع پر اس قسم جیسے تبرع ظاہری طور پر کئے جاتے ہیں۔ دل سے ہمشیرہ رضامند نہیں ہوتی سو ایسے حیلہ سے مال طیب نہ ہوگا۔ بلکہ جہاں دلی رضامندی سے ہمشیرہ صلح کرنا چاہے اس صورت پر وہاں عمل کیا جاوے اس کا لحاظ نہایت ضروری ہے فقط

احقر عبد الکریم عفی عنہ

**صلح اور تعزیرات سے متعلق چند سوالوں پر مشتمل ایک استفتاء**

دریں شہر درمیان طلبہ مدرسہ و ہندوان تنازعہ شدہ آخر الامر نوبت بایں رسید کہ بتعداد تخمیناً صدہا ہندو جمع شدہ بر مدرسہ حملہ آوردند القصہ بحجہ چندے زد و کوب کلوخہا و چوبہا چہار دندانہا طالب‌علمے شکست بضرب ہندوان، مقدمہ بر وقت در پولیس بود کہ ۱۹ عدد ہندو در حبس گرفتند اکنون مقدمہ بعدالت رفتہ است و مجسٹریٹ آنرا بر ضامن رہا کردہ است مگر ہندوان و خود آن مجسٹریٹ کہ ہندو است ملتجی برائے صلح شدہ اند۔ بموجب التجائے اوشان کارکنان مدرسہ این مصلحت دیدہ کہ اگر استغاثہ شود بسا اوقات ہیچ کلام کذب گفتن پیش آید کہ خاصہ در عدالت کفار است رہائی شود۔ دیگر معلوم نیست کہ چہ شود آن ہم بغیر چندے سزائے حبس مجرمان ہیچ نیست و دریں کار ضرورت خرچ زیادہ است و در صلح امید غالب حصول دیت دندانہاست بر تقدیر در استغاثہ کامیابی نہ شود و بعدہٗ ہیچ حاصل نہ شود۔ و بر این مصلحت کارکنان مدرسہ و ہندوان خود آن مجسٹریٹ را ایں قبول کردہ نوشتہ دادہ است کہ آنچہ حکم بر ہندوان دیت و سزائے خواہد کرد منظور طرفین باشد اکنون ع۱ دریں صلح عزت مسلم و تذلیل کفار است یا نہ و صلح باید کرد یا نہ بہتر و عزت برائے مسلمانان در صلح است یا در استغاثہ ع۲ چونکہ تعیین اشخاص جانے کہ دندانہائے طالب شکستہ اند بسبب کثرت ہندوان متعذر است دریں صورت دیت بر جمیع است یا چہ حکم است۔ ولوجہ تعذر تعیین دیت ساقط گردد یا نہ ع۳ و دریں جرم ہا کہ یکے از آن است کہ بتعداد کثیر حملہ آوردن دوم دندانہا شکستن۔ سوم ایذا رسانیدن، چہارم در حد غیرہ نیست ایذاء رسانیدن داخل شدن ع۴ بغیر دیت دندانہا سیاسۃً سزائے حبس وغیرہ برائے ہر واحد جدا جدا شرعاً

چہ قدر است۔ ۵ دیت وسزائے حبس وغیرہ ہر دو جمع کردن شرعاً جائز است یا نہ

## الجواب وھو الموفق للصواب

۱ اس صورت میں صلح تو بہر حال جائز ہے کیونکہ اس صورت میں حد واجب نہیں جسمیں صلح وغیرہ کا حق نہو بلکہ حق العبد ہے جسمیں مجروح کو اختیار ہے کما فی الدر المختار ص ج ۲ (و ان جرح فقط) ولو بقتل ولم یاخذ نفسا بالی ان قال فلاحد و للولی القود الخ وقال الشامی المراد بالولی من له ولایة المطالبة فیشمل صاحب المال والمجروح ایضاً الخ مگر حکم یعنی امین کسی ساہن کو بنایا جاوے یا خود براہ راست مجرموں سے گفتگو کیجاوے لان الشرط من جهة المحکم بالفتح صلاحیته للقضاء کما لا یخفی۔ ۲ فی الدر المختار ص ج ۵ باب القسامة (وان التقی قوم بالسیوف فاجلوا) ای تفرقوا (عن قتیل فعلی اهل المحلة) لان حفظها علیهم (الا ان یدعی الولی علی اولئك) ای یدعی (علی) بعض (معین منهم) الخ اس معلوم ہوا کہ بلا تعین بھی کل جماعت پر دعوی ہوسکتا ہے جب تمہ آوروں کا گروہ معلوم ہے تو ہر شخص کی تعیین ضروری نہیں۔ ور اس صورت میں ایک دیت سب مجرموں سے لیجاویگی ۳ اول وچہارم موجب تعزیر است ودوم یعنی دندان شکستن موجب قصاص (بشرطیکہ مجرم واحد متعین بود ورنہ موجب دیت) ودر سوم یعنی زد و کوب تفصیل است در بعضے جروح قصاص واجب شود ودر بعضے ارش تفصیل درکتب فقہ باید دید۔ ۴ دیت وقصاص وارش حق مظلوم است حاکم را معاف کردن نرسد وتعزیر مقدر نیست بلکہ مفوض برائے حاکم است۔ ۵ سزائے تعزیری در ہر جرم جائز است کما فی الدر المختار ص ج ۳ (ولا جمع بین جلد ورجم ولا بین جلد ونفی الا سیاسة) والتعزیر مفوض للامام وکذا فی کل جنایة نهر۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

تکملہ میں رجوع عن الصلح کی ایک صورت سوال :- ایک عورت مردہ کے زوج اور

اما اور اب اور دو ابن وارث ہیں تقسیم ترکہ کے وقت زوج نے کہا کہ میں نے سب مال سے یہ چیزیں معینہ لے لی ہیں اور باقی سب مال تم کو چھوڑ دیا ہے۔ تم یعنی ام اور اب اور دو ابن باہم تقسیم کرلو ام اور اب اس پر راضی ہو گئے اور دونوں ابن اس زوج کے صغیر ہیں اسکے بعد ان کو یہ فکر ہوئی کہ اب زوج تو نکل گیا اور ماں باپ اور دو لڑکوں کے درمیان تقسیم کس طرح ہوگی۔ مسئلہ ان کو معلوم نہ تھا۔ زوج نے کہا کہ میں اس صلح سے رجوع کرتا ہوں اور تقسیم میں پھر شریک ہوتا ہوں اور سہام بنا کر پورا پورا حصہ لینے میں زوج نے رجوع کرلیا اور کل مال کا ربع لے لیا اور سدس ماں اور سدس باپ نے لے لیا اور باقی مال دونوں لڑکوں کو دیدیا تو کیا زوج کا یہ رجوع صحیح ہے، اگر زوج رجوع نہ کرتا تو بقایا ورثاء کو مال زیادہ آتا اس لئے کہ زوج نے تھوڑی چیزیں لے کر صلح کی تھی۔

# الجواب

قال فی الدر الصلح ان کان بمعنی المعاوضة بان کان دین بعین ینتقض بنقضهما ای بفسخ المتصالحین وان کان لا بمعناها ای المعاوضة بل بمعنی استیفاء البعض واسقاط البعض فلا تصح اقالته ولا نقضه لان الساقط لا یعود اھ ملخصا۔

صورت مسئولہ میں نقض صلح جائز نہیں کیونکہ ورثاء میں نابالغ بھی ہیں اور نابالغ کے حق میں صلح مفید تھی۔ اور نقض صلح مضر ہے اور نقض صلح بدون تراضی ورثاء درست نہیں اور نابالغ کی رضا معتبر نہیں۔ دوسری اس صلح میں استیفاء بعض واسقاط بعض ہے۔ معاوضہ کی صورت نہیں اس لئے بتراضی ورثاء بالغین کے حق میں بھی یہ صلح منتقض نہیں ہو سکتی پس زوج نے جو اشیاء اول لے لی ہیں وہی اسکا حق ہے۔ باقی کے چھ سہام کرکے ایک سہم ماں کا ایک سہم باپ کا حق ہے اور چار سہام لڑکوں کے ہیں دو ایک کے دو ایک کے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

# کتاب الوکالۃ والکفالۃ

**وکیل اگر سہواً مبیع کی قیمت زیادہ ادا کردے تو زیادتی کا ضمان کس پر ہے؟**

ایک شخص نے جو کہ رانڈیر میں ہے اپنے بھائی کو جو کہ رنگون میں ہے اس کو اختیار دیا تھا کہ تو میری جائیداد کو بیع کر سکتا ہے نیز میرے لئے جو چیز مناسب ہو خرید کر سکتے ہو۔ رنگونی نے ایک مکان شرکت میں دس ہزار کی قیمت کا خرید کیا اور عقد کے وقت ایک ہزار روپیہ پیشگی دیئے۔ اب مدت کے دس ہزار روپے ادا کئے۔ لیکن دس ہزار روپے کی ادائیگی کے وقت وہ پیشگی والے ایک ہزار روپیہ بالکل ہی بھول گیا اب یہ ایک ہزار روپیہ دونوں کے متعلق ہونگے یا صرف رنگونی کے؟

## الجواب

ایک ہزار روپیہ جو رنگونی نے بھول کر زیادہ دیدیا ہے، وہ صرف اس رنگونی کے ذمہ ہے رانڈیری کے ذمہ اس ایک ہزار میں سے کچھ نہیں ہوگا نہ کل نہ آدھا۔

**وکیل کو مؤکل کے مال سے اسکی اجازت کے بغیر نفع اٹھانا جائز نہیں۔**

تجارتی کمپنی کا قاعدہ ہے کہ مثلاً فی صد پانچ روپیہ کمیشن دیجاتی ہے۔ زید کو چار شخصوں نے پچیس پچیس روپیہ کے مال کے خرید کرنے کی اجازت دی، زید نے سو روپے کا مال کمپنی سے منگوایا۔ زید بائع و مشتری میں محض واسطہ ہے اور قبل از فریقین ان چار شخصوں کو کمیشن کا علم بھی نہ تھا۔ اب وہ کمیشن کا روپیہ ان چاروں پر تقسیم ہونگے یا تنہا زید لے سکتا ہے؟

## الجواب

زید وکیل ہے اور وکیل کو یہ جائز نہیں کہ مؤکل کے روپیہ سے بدون انکی اجازت کے نفع حاصل کرے لہٰذا وہ کمیشن کا روپیہ چاروں مؤکلوں میں تقسیم ہوگا۔

**مدعی کا خصم کی مرضی کے خلاف کسی کو وکیل بالخصومۃ بنانا**

چہ قول است علماء در ایں صورت کہ شخصے عالی مرتبہ است و دعوی او شخصے است کہ ادنیٰ مرتبہ دارد

میخواہد کہ وکیل نماید وخصم باین راضی نمیشود دمی ترسد کہ وکلاء بحیل ودغا وی
حق تلفی خواہند کرد آیا دریں صورت توکیل شرعاً جائز است یا نہ بینوا توجروا۔

## الجواب

دریں صورت توکیل شرعاً جائز نیست: فی مختار الفتاوی وفی الفضلی
رجل من الاشراف له خصومة مع من دانه فأراد أن یوکل ولا یحضر
بنفسه قال الفقیه ابو اللیث نحن لا نری ان لا یقبل الوکالة
منه علیه إلا ان یحضر بنفسه والشریف وغیر الشریف فی الدعوی
سواء فلا یصح الوکالة انتهی۔ وایضاً قال المخدوم محمد هاشم
التتوی ناقلاً عن فصول العمادی رجل من الأشراف له خصومة
مع من دانه فأراد ان یوکل ولا یحضر بنفسه قال الفقیه
ابو اللیث نحن لا نری أن یقبل الوکالة منه وعلیه ان یحضر
بنفسه والشریف وغیر الشریف فی الدعوی سواء انتهی و
تفویض الخیار بقضاة زماننا نسیت قال فی البحر: ناقلاً عن البزازیة
ومن المعلوم المقرر ان تفویض الخیار الی قضاة عهد الفساد
فساد کما هو المقرر من ان علمهم لیس بحجة قال شمس الائمة
الصحیح انه اذا علم عن الآبی فی اباء الوکیل یفتی بالقبول
وان علم منه بالحیل کما هو صنیع وکلاء المحکمة لا یقبل
وغرض عن فوض الخیار الی القاضی عن القدماء کان هذا عملوا
عن احوال قضاتهم الدین والصلاح انتهی وفی تکملة رد المحتار
تحت قوله والمختار للفتوی تفویضه للحاکم ای القاضی بحیث انه
إذا علم عن الخصم التعنت فی الاباء عن قبول التوکیل لا یمکنه عن
ذلك وان علم عن الموکل قصد الاضرار لخصمه بالحیل کما هو
صنیع وکلاء المحکمة لا یقبل منه التوکیل الا برضاه وهو اختیار
شمس الائمة السرخسی کذا فی الکافی ونحوه فی الزیلعی وزاد
فی معراج الدرایة وبه واخذ الصفار فی الخلاصة قال شمس الائمة

الحلوانی فی آداب القاضی المفتی مخیر فی هذه المسئلة إن شاء افتی بقول أبی حنیفة وان شاء أفتی بقولهما ونحن نفتی بأن الرای إلی القاضی اھ وهذا فی قضاتهم لما علموا من أحوالهم من الصلاح والدین واما قضاة زماننا فلا یلاحظون ما قالوه بیقین بل قصدهم حصول المحصول ولو علموا من الوکیل التزویر والاضرار فی الدعوی انتهی مختصرا وایضاً فیها قال فی البزازیة وأصله أن التوکیل بلا رضاء الخصم اذا لم یکن المؤکل حاضرا فی مجلس الحکم لا یصح عند الامام ولا یجبر خصمه علی قبول الوکالة . اقول بقول الحنفیة افتی الرملی قائلا وعلیه المتون واختاره غیر واحد والمحبوبی والنسفی وصدر الشریعة وابو الفضل الموصلی ورجح دلیله فی کل مصنف فلزم العمل به ولا سیما فی هذا الزمان الفاسد انتهی ملتقطا وفی الخیریة صرح علماؤنا قاطبة متونا وشروحا بان الوکالة فی الخصومة لا تکون الا برضاء الخصم إلا ان یکون المؤکل مریضاً او غائباً مدة السفر او مخدرة ووجه ذلک ان الجواب مستحق علی الخصم ولهذا یستحضره والناس متفاوتون فی الخصومة ولو قلنا باللزوم یتضرر به فیتوقف علی رضائه والتهذیب الخفه واختار المحبوبی والنسفی وصدر الشریعة وابو الفضل الموصلی ورجح دلیله فی کل مصنف وغالب المتون علیه فلزم العمل به لرفع الضرر لا سیما فی هذا الزمان الفاسد والله أعلم انتهی. قال فی رد المحتار حاشیة الدر المختار تحت قوله وعلیه فتوی ابی اللیث افتی الرملی بقول الامام الذی علیه المتون واختاره غیر واحد وایضاً قال تحت قوله وتفویضه للحاکم بحث فیه فی البزازیة فانظر ما فی البحر انتهی پس ازیں روایات صحیح معلوم شد که درصورت مستفاة توکیل بلا رضاء خصم جائز نیست فقط۔ والله أعلم وعلمه أتم واحکم۔

حرره الفقیر غلام محمد بگهوی

## الکلام علی الجواب من جامع امداد الاحکام

مفتی مذکور نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے یہ امام صاحب کا مذہب ہے اور صاحبین کے مذہب میں توکیل بالخصومۃ بلا رضاء خصم بھی جائز ہے بلکہ جائز تو امام صاحب کے نزدیک بھی ہے ہاں اور ویسے نزدیک لزوم بدون رضاء خصم کے نہیں ہوتا اور صاحبین کے نزدیک لزوم بھی ہو جاتا ہے۔

التوکیل بالخصومۃ بغیر رضاء الخصم لا یلزم وقالا یلزم ثم اختلف المشائخ علی قولہ بعضہم قالوا رضاء الخصم لیس بشرط لصحۃ التوکیل بل ھو شرط لزومہ وھو الصحیح کذا فی خزانۃ المفتین والفقیہ ابو اللیث اختار قولہما کذا فی خزانۃ المفتین وقال العتابی وھو المختار وبہ اخذ الصفار کذا فی البحر الرائق رجل من الاشراف وقعت خصومتہ مع رجل وضیع فاراد أن یؤکل وکیلا ولا یخاصم بنفسہ اختلف فیہا قال الفقیہ ابو اللیث نحن نری أن تقبل الوکالۃ کان المؤکل شریفا او وضیعا کذا فی جواہر الاخلاطی اھ عالمگیریہ ج ۳، ص ۳۱۵

پس صورت مسئولہ میں صاحبین کے قول مفتی بہ پر توکیل درست ہے اور اگر خصم کے اضرار کا قصد نہ ہو صرف حاضری عدالت سے بچنا مقصود ہو تو گناہ بھی نہ ہوگا اور اگر توکیل سے خصم کو ضرر پہنچانے کا قصد ہو تو گناہ ہوگا۔ اور اگر محض اپنے نفع کا قصد ہو اور خصم کو ضرر دینے کا ارادہ نہ ہو گو خصم کا ضرر آجائے تب بھی گناہ نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۹ رمضان ۱۳۴۲ھ

| | |
|---|---|
| **السوال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدرسین و ملازمین مدرسہ کو مدرسہ کی جانب | ملازمین مدرسہ جو تحصیل چندہ کی غرض سے باہر بھیجے جاتے ہیں بلا اجازت مہتمم چندہ میں تصرف جائز ہے یا نہیں؟ |

سے تحصیل چندہ کی غرض سے باہر بھیجا جاتے تو ان کو بلا اجازت مہتمم کے از چندہ اپنی تنخواہ

میں لے لینا درست ہے یا نہیں اور اگر اس چندہ میں زکوٰۃ کی رقم بھی ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں بینوا توجروا۔

السائل: ضیاء النبی محرر مدرسہ عالیہ اسلامیہ محلہ چلہ امروہہ

## الجواب

جن لوگوں کو (خواہ مدرس ہوں یا ملازم مدرسہ) مدرسہ کی جانب سے تحصیل چندہ کیلئے بھیجا جاتا ہے وہ مدرسہ کی طرف سے صرف وکیل بالقبض ہیں وکیل بالتصرف نہیں اور وہ چندہ دینے والے بھی ان کو وکیل بالقبض ہی سمجھ کر چندہ دیتے ہیں۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاوے کہ چندہ وصول کرنے والے چندہ میں تصرف بالا نفاق بھی کرتے تو وہ ہرگز ایسے لوگوں کو چندہ نہ دیں اس لئے بدون مہتمم کی اجازت کے چندہ کے روپیہ میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا کریں گے گناہ گار ہوں گے۔ اور تنخواہ میں زکوٰۃ کی رقم لینے میں معطی کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

فان تملک الفقیر بلا عوض شرط فی الزکوٰۃ۔ المسئلۃ ذکرھا العلامۃ الشامی فی رد المحتار (ج ۲ ص ۱۴)۔

واللہ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۷ رشوال ۱۳۴۲ھ

الجواب صحیح

اشرف علی

۲۷ رشوال ۱۳۴۲ھ

# کتاب الشفعة

حق شفعہ ثابت کرنے کیلئے کسی کو وکیل بنانا جائز ہے

**السوال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت نے شریک فی المبیع ہونے کی وجہ سے شفعہ کا دعویٰ کیا ہے مگر رسم طلب مواثبت وطلب اشہاد خود نہیں کیا بلکہ بذریعہ اپنے شوہر کے اس رسم کو ادا کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں حق شفعہ کا ثبوت از روئے شرع

اس عورت کو ہوسکتی ہے یا نہیں۔ یا طلب مواثبت واشہاد ثبوت حق شفعہ کیواسطے خود شفیع کو کرنا ضروری ہے۔ اگر شوہر یا کسی اور کے ذریعہ شفعہ کرائے تو کیا جائز نہ ہوگا جو بھی حکم ہو بہت ہی جلد ارقام فرمایا جاوے کیونکہ مقدمہ کچہری میں درپیش ہے۔ بینوا توجروا۔

المستفتی: فضل الرحمٰن
محلہ پکنا پہاڑی ڈاکخانہ مرادپور
مکان نواب امیر حسن صاحب

## الجواب

حق شفعہ ثابت کرنے کیلئے کسی کو وکیل کردینا جائز ہے۔
قال فی العالمگیریۃ: واذا وکل رجل رجلاً بأخذ دار له بالشفعۃ ولم یعلم الثمن صح التوکیل واذا اخذها الوکیل بما اشتراها المشتری لزم الموکل الخ۔ ج ۶، ص ۱۲۹۔
پس صورت مذکورہ میں عورت کا اپنے شوہر کے ذریعے طلب مواثبت و طلب اشہاد کرانا صحیح ہے۔ شوہر اس کا وکیل ہوگا۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۱۸ رجب المرجب سنہ ۱۳۴۰ھ

**شفعہ کی ایک خاص صورت کا حکم**

السوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک صحرائی زمین مثلاً ایک سو بیگہ عمرو کے ہاتھ فروخت کی پھر اسی جلسہ میں عمرو نے اس جائیداد میں سے مثلاً پانچ بیگہ بکر کے ہاتھ فروخت کی اس پانچ بیگہ زمین میں خالد شفیع تھا جب اس فروخت کی اطلاع خالد کو ہوئی تو فوراً شفعہ کرنے کیلئے گواہان کے سامنے اقرار کیا اور ان گواہوں کو ساتھ لے کر بکر کے پاس گیا اور واپسی کے واسطے کہا۔ اور عدالت میں دعویٰ شفعہ کا بنام زید وبکر دائر کردیا اور عمرو کو درمیان سے نکال دیا اب سوال یہ ہے کہ شفعہ کا دعویٰ عمرو اور بکر پر ہوسکتا ہے یا زید وبکر پر یا تینوں پر۔ بینوا توجروا۔

الجواب: قال فی الہدایۃ، ویشہد علی البائع ان کان المبیع فی

يده معناه لو يسلم الى المشترى او على المبتاع او عند العقار فاذا فعل ذلك استحقت شفعته وهذا لأن كل واحد منهما خصم فيه لأن للأول اليد و للثانى الملك وكذا يصح الاشهاد عند المبيع لأن الحق متعلق به فان سلم البائع المبيع لم يصح الاشهاد عليه لخروجه من ان يكون خصما اذ لا يد له ولا ملك فصار كالاجنبى اھ

قال المحشى ولم يقيد بكون الدار فى يد المشترى لأن هذا لا يتفاوت فان الطلب عند المشترى صحيح سواء كانت الدار فى يده اوفى يد البائع هذا كله من الذخيرة اھ ج ۴، ص ۲۷۰

وفى العالمگيرية: ولو كان المشترى الأول اجنبياً اشتراها بالف فباعها من اجنبى بالفين فحضر الشفيع فالشفيع بالخيار إن شاء اخذ بالبيع الأول وإن شاء اخذ بالبيع الثانى لوجود سبب الاستحقاق و شرطه عند كل واحد من البيعين فان اخذ بالبيع الأول سلم الثمن الى المشترى الأول والعهدة عليه وينفسخ البيع الثانى ويسترد المشترى الثانى الثمن من الأول، وإن اخذ بالبيع الثانى تم البيعان جميعا والعهدة على الثانى غير انه إن وجد المشترى الثانى والدار فى يده فله أن يأخذه بالبيع الثانى سواء كان المشترى الأول حاضراً أو غائباً وإن اراد أن يأخذ بالبيع الأول فليس له ذلك حتى يحضر المشترى الثانى هكذا ذكره القاضى الإسبيجابى فى شرحه لمختصر الطحاوى ولم يحك خلافا وذكر الكرخى ان هذا قول ابى حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى (ج ۴، ص ۱۲۱)

و قال فيه ايضا: وفى قول ابى يوسف لا تشترط حضرته اى حضرة المشترى الثانى وان كان الدار فى يده فافهم (ج ۴، ص ۱۲۰).

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں شفیع کو اختیار ہے خواہ بیع اول کی وجہ سے شفعہ کا دعوی کرے یا بیع ثانی کی وجہ سے اور بہر صورت بائع اول یا بائع ثانی پر طلب ہو سکتی ہے جبکہ جائیداد ان میں سے کسی کا قبضہ ہو۔ پس اگر

بائع اول نے بائع ثانی کو قبضہ دلا دیا اور بائع ثانی نے مشتری ثانی کو قبضہ دلا دیا تو
اب صرف دعویٰ مشتری ثانی پر ہوسکتا ہے۔ خواہ بیع اول کی وجہ سے شفعہ طلب
کرے یا بیع ثانی کی وجہ سے۔ اور اگر بائع اول نے بائع ثانی کو قبضہ نہیں دلایا تو اب
شفیع کو دو اختیار ہیں اگر بیع اول کی وجہ سے شفعہ لینا چاہے تو بائع اول یا بائع ثانی پر
دعویٰ کرے اس صورت میں مشتری ثانی پر دعویٰ نہیں کرسکتا اور اگر بیع ثانی کی وجہ
سے دعویٰ کرے تو بائع ثانی اور مشتری ثانی پر دعویٰ کرے اس صورت میں بائع اول
پر دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اور اگر بائع اول نے بائع ثانی کو قبضہ دلا دیا لیکن بائع ثانی
نے مشتری ثانی کو قبضہ نہیں دلایا تو اس صورت میں بائع اول پر دعویٰ نہیں ہوسکتا
صرف بائع ثانی یا مشتری ثانی پر ہوسکتا ہے خواہ طلب شفعہ بیع اول کی وجہ سے کرے یا
بیع ثانی کی وجہ سے اگر بیع اول کی وجہ سے شفعہ لے تو قیمت مشتری اول کو دے اور
وہی تمام حقوق عقد کا ذمہ دار ہوگا اور بیع ثانی باطل ہوجائے گی۔ اور اگر بیع ثانی
کی وجہ سے شفعہ لے تو دونوں بیع تام ہوجائیں گی اور اس صورت میں مشتری ثانی کو
قیمت دے اور اب مشتری ثانی جملہ حقوق عقد کا ذمہ دار ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۹ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۴ھ

**حق شفعہ بوقت طلب تاخیر ثمن سے باطل نہیں ہوتا**

السوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین
ومفتیان شرع متین معاملہ ھذا میں کہ احمد، محمود، مسماۃ صفیہ نصفی کے اور زید ایک
حصہ و مسماۃ زینب دو حصہ نصفی کے ایک مکان میں مشترکا قابض ہیں۔
احمد اور مسماۃ صفیہ نے اپنا حصہ فروخت کرنا چاہا، زید کو اطلاع کی اس نے اس کی
خریداری پر اپنی آمادگی کا فوراً اظہار کردیا پھر روپیہ کے انتظام میں کچھ دیر ہوئی تو
احمد اور مسماۃ صفیہ نے اپنا حصہ خالد کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ کرلیا زید نے خالد
پر ظاہر کیا کہ میں اس کا خریدار ہوں خالد نے کہا کہ مجھے اس کی خریداری کی ضرورت نہیں ہے
میں تو یا نعمان کی ضرورت پورا کرنے کی غرض سے خریدتا ہوں تم لینا چاہو تو میں ہٹ
جاتا ہوں اور میرا زر بیعانہ دے دیا جاوے۔
زید نے کہا کہ پندرہ روز میں روپیہ کے انتظام ہونے نہ ہونے کا حال معلوم

ہوتے گا اس قدر مہلت دیدی جائے اس پر خالد نے کہا کہ جلدی بائعان کو ہے مجھے نہیں وہ مہلت دیں تو مجھے اعتراض نہیں زید نے زبانی اور تحریری احمد سے مہلت طلب کی مگر احمد اور مسماۃ صفیہ نے فوراً حصہ خالد کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بیعنامہ دستخطوں کے لئے زید کے پاس بھیجا تو زید نے اِن لفظوں سے انکار کیا کہ دستخط کر کے میں اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر چھری کیا پھیر لوں۔ یہ میرا حق ہے میں خرید لوں گا۔ دستخطوں سے یہ انکار دو آدمیوں کے سامنے تھا جن میں سے ایک بائع دوسرا بجانب مشتری تھا زید کو اس بیع کی اطلاع اُسی وقت ہوئی جبکہ بیعنامہ دستخطوں کے واسطے اس کے سامنے آیا۔ اب خالد کو یہ خبر پہنچ گئی مگر اس نے کچھ پرواہ نہ کی اور بیعنامہ رجسٹری کرا لیا زید نے تحریر بیعنامہ سے پہلے باحتمال اس کے شاید روپیہ کا فوراً انتظام نہ ہو سکے خالد کو یہ بھی لکھا کہ اگر مکان بیعنامہ آپ کے نام ہو گیا اور آئندہ ہم میں سے کسی نے کسی وقت لینا چاہا تو آپ موجودہ زر ثمن اور خرچ لیکر واپس دیدیں گے مگر اس پر خالد نے کوئی وعدہ نہیں کیا اس کے بعد بیعنامہ لکھا گیا زید نے بالتوقف اپنی آمادگی خریداری کا اعلان کر دیا زینب کو زید اور دیگر ذرائع سے اطلاع ہوئی کیونکہ وہ اس کے باپ کا مکان تھا اس لئے وہ ہر وقت اپنی خرید کا مضطربانہ اعلان کرتی رہی زینب کے پاس آنے جانے والی عورتوں کے ذریعہ جب اُسے خلاف منشا بیع کا علم ہوا تو وہ گریہ وزاری میں مبتلا ہو گئی اور ظاہر کیا کہ میں اُسے خریدنا چاہتی تھی میرے باپ کی چیز ہے میں اس کی خرید کیلئے حق مقدم رکھتی ہوں میں خرید لوں گی زینب نے مکان کی خرید کیلئے اتنا بڑا اہتمام کیا کہ اس نے اپنی آمدنی کی صورت جائیداد فروخت کر دینے کا پختہ ارادہ ظاہر کیا چنانچہ دوسری جگہ اس کا معاملہ طے کر لیا زید اور زینب ایک ماہ کے اندر روپیہ لیکر خالد کے پاس گئے مگر خالد نے شفعہ کی قانونی میعاد یعنی سال بھر تک اس کے متعلق ہر قسم کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ زید یا زینب دونوں میں سے کسی کا شرعی حق شفعہ باقی ہے یا ساقط ہو گیا۔

عـــہ: زید و زینب شفیع و خلیط ہیں اور خالد کو ان کی خریداری پر آمادگی اچھی طرح معلوم تھی ایسی حالت میں خالد کا یہ فعل خرید اور شفیع کا محروم کرنا جائز ہے یا ناجائز۔

گئے، تکمیل بیعنامہ پر ہوجاتی ہے یا بوقت رجسٹری ہوتی ہے۔ بینوا توجروا۔
المستفتی: عبداللہ

## الجواب

قال فی الدر المختار: ویطلبھا الشفیع فی مجلس علمہ من مشتر او رسولہ او عدل او عدد بالبیع وان امتد المجلس کالمخیرۃ بلفظ یفھم طلبھا کطلبت الشفعۃ او اطلبھا وھو یسمی طلب المواثبۃ ای المبادرۃ والاشھاد فیہ لیس بلازم بل لمخافۃ الجحود ثم یشھد علی البائع لو العقار فی یدہ او علی المشتری وان لم یکن ذا ید لانہ مالک او عند العقار فیقول اشتری من فلان ھذہ الدار وانا شفیعھا وقد کنت طلبت الشفعۃ واطلبھا الآن فاشھدوا علیہ وھو طلب الاشھاد ویسمی طلب التقریر وھذا الطلب لا بد منہ حتی لو تمکن ولو بکتاب او رسول ولم یشھد بطلت شفعتہ (قال الشامی لکن رأیت فی الخانیۃ انما سمی الثانی طلب الاشھاد لا لان الاشھاد شرط فیہ بل لیمکنہ اثبات الطلب عند جحود الخصم اھ تأمل ثم بعد ھذین الطلبین یطلب عند قاض ویسمی طلب تملیک و خصومۃ وبتاخیرہ مطلقا بعذر وبغیرہ شھرا او اکثر لا تبطل الشفعۃ حتی یسقطھا بلسانہ وبہ یفتی وھو ظاھر المذھب وقیل یفتی بقول محمد ان اخرہ شھرا بلا عذر بطلت یعنی دفعا للضرر اھ ورجح الشامی قول محمد وصاحب الدر ظاھر الروایۃ فلیتأمل اھ

ج ۵ ص ۲۲۱۔

صورت مسئولہ میں چونکہ شفیع نے خبر بیع سنتے ہی طلب مواثبت کی اور عدد آدمیوں کے سامنے جن میں سے ایک بائع تھا ایک مشتری کا رسول تھا طلب کو ظاہر کیا اس لیے قاضی خان کے قول صحیح پر شفیع کو طلب شفعہ کا حق ہوگیا۔

(اما علی قول المتون فلا لانہ لم یوجد طلب فکان یلزم ان یکون رجلان سوی البائع) ثم رأیت ابن عابدین قد استظھر قول

الخانیة فی تنقیح الفتاوی الحامدیة و قواہ (ج ۲، صلا)۔ اور اب تاخیر دعویٰ سے شفعہ باطل نہ ہوگا علی ظاہر الروایۃ واللہ اعلم۔

قال فی الھدایۃ: و تجوز المنازعة فی الشفعة و إن لم یحضر الشفیع الثمن إلی مجلس القاضی فإذا قضی القاضی بالشفعة لزمه احضار الثمن و ھذا ظاھر الروایة۔ و عن محمد أنه لا یقضی حتی یحضر الشفیع الثمن و ھو روایة الحسن عن ابی حنیفة لان الشفیع عساہ ان یکون مفلسا فیتوقف القضاء علی احضارہ الثمن حتی لا یتوی مال المشتری وجه الظاھر انه لا ثمن علیه قبل القضاء و لھذا لا یشترط تسلیمه فکذا لا یشترط احضارہ و اذا قضی له بالدار فللمشتری ان یحبسھا حتی یستوفی الثمن و ینفذ القضاء عند محمد أیضاً لانه مجتھد فیه و وجب علیه الثمن فیحبس فیه فلو اخر اداء الثمن بعد ما قال له (القاضی) ادفع الثمن الیه لا تبطل شفعته لانھا تأکدت بالخصومة عند القاضی اھ ج ۳/ ص ۳۶۹۔

قلت و بھذا علم أن الشفعة لا تبطل بتاخیر الشفیع الثمن عند طلب المواثبة بالاولیٰ لانه لا ثمن علیه عند الطلب بل عند قبض المشفوع فیه۔

عا: چونکہ زید اور زینب نے روپیہ مہیا کرنے میں دیر کی اس لئے خالد کو اس مکان کے خریدنے میں گناہ نہیں ہوا مگر زید اور زینب کی اس تاخیر سے ان کا حق شفعہ ساقط نہیں ہوا۔

عا: شرعاً تکمیل بیع ایجاب وقبول پر ہو جاتی ہے خواہ زبانی ہو یا تحریری۔ رجسٹری کو اس میں دخل نہیں وہ تو محض پختگی معاملہ کیلئے ہے فقط واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۸ر جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ

مکرر سوال از جانب مشتری متعلق سوال مذکورہ از دیوبند و جواب القادہ مداوریہ

السوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید و عمر ایک مکان میں شریک ہیں عمر اپنی ضرورت کی وجہ سے اپنا حصہ فروخت کرتا ہے کچھ
عرصہ تک اول زید سے جو کہ شفیع ہوتا ہے بیع و فروخت کی گفتگو ہوتی رہی جب حسب
منشاء عمر زید شفیع سے کوئی معاملہ طے نہ ہوا تو چند دوسرے غیر شخص کو خریدنے پر متوجہ
کیا۔ ۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایجاب و قبول ہو کر زبانی طور پر مبیع غیر شخص کو سپرد کر دی گئی
اور کچھ زر ثمن بطور بیعانہ رسید لکھ کر لے لیا گیا اور بقیہ کا وعدہ بوقت تکمیل کاغذ ٹھہرا۔

؏۱ اول رسید بیعانہ ملاحظہ ہو نقل حاضر ہے مشتری نے بعد تکمیل رسید بیعانہ
بائع سے کہا کہ تم نے شفیع سے زبانی حجت تو قطع کر لی مگر اس میں ہے کہ بذریعہ نوٹس بھی حجت
قطع کر لوں تاکہ قانونی حجت بھی قطع ہو۔ بائع نے ۹ نومبر ۲۷ء کو بذریعہ نوٹس شفیع کو
مطلع کیا مگر شفیع کو نوٹس ۱۲ نومبر ۲۷ء کو ملا جس کو شفیع نے نوٹس کے جواب میں
نوٹس ہی کے ذریعہ سے بائع کو مطلع کرتا ہے ۱۶ نومبر کو۔

؏۲ : ملاحظہ ہو کہ شفیع اس میں لکھتا ہے کہ اس معاملہ میں صحیح علم مجھے ابھی
ہوا ہے قیمت وغیرہ کا۔ پھر شفیع نے ۱۶ نومبر ۲۷ء کو مشتری کے نام ایک تحریر بھیجی
جس میں طلب وعدہ واپس مبیع و طلب رہائش بحالت اشتراک دریافت کرتا ہے۔

؏۳ : پھر ۱۶ نومبر ۲۷ء کو شفیع نے ایک نوٹس بنام بائع لکھا جس میں شفیع نے
شکایات بیان کر کے طلب حق و طلب و طلب مہلت کی مکرر ؏۴ کو ملاحظہ فرما دیں
۱۲، ۱۳ تاریخوں کے درمیان شفیع نے کسی قسم کی گفتگو کسی سے نہیں کی نہ بائع
سے نہ مشتری سے نہ مبیع سے۔ پھر غالباً ۱۸ نومبر کو وثیقہ لکھا گیا، مشتری نے وثیقہ
شفیع کے پاس بھیجا کہ اس پر دستخط کر دو مگر شفیع نے دستخطوں سے انکار کر دیا۔ اب
سوال یہ ہے شرعاً صورت مسئولہ میں بیع کی تکمیل کب ہوگی آیا بوقت ایجاب و قبول
و سپردگی مبیع یا بوقت تکمیل کاغذ یا بوقت رجسٹری اور شفیع کو کب تک حق شفعہ
صورت مسئولہ میں باقی رہے گا یا ہے؟ بینوا توجروا۔

## الجواب اللّٰهم انت الموفق للصواب (من مفتی دیوبند)

بیع کا انعقاد صرف ایجاب و قبول سے ہو جاتا ہے دستاویز کی تحریر یا اس کی
تکمیل پر موقوف نہیں اور ایجاب و قبول کے بعد ہی بیع کا انتقال من ملک
البائع الی ملک المشتری ہو جاتا ہے لیکن اس سے قبل کہ مشتری مبیع پر قابض ہو

بیع میں احتمال انفساخ عقد بہلاک مبیع باقی رہتا ہے اور جب مشتری نے مبیع پر قبضہ کرلیا تو یہ احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح انعقاد بیع یا انتقال مبیع من ملک البائع الی ملک المشتری اداء ثمن الی البائع پر موقوف نہیں ہے بناء علیہ صورت مسئول عنہا میں بیع کا انعقاد ۶ رنومبر ۱۹۲۶ء ہی کو ہوچکا رہی بقاء حق شفعہ کی بحث سو موجودہ صورت میں یہ حق باقی نہیں کیونکہ اگرچہ شفیع سے معاملہ طے نہ ہونے کے بعد دوسرے شخص سے معاملہ کیا گیا تاہم قبل وجود بیع بین البائع والمشتری اگر شفیع اپنے حق شفعہ کو ساقط کردے تو حق شفعہ ساقط نہیں ہوتا جب بائع اور مشتری کے مابین بیع کا انعقاد ہوجائے گا تب اس کے بعد شفیع کو حق شفعہ حاصل ہوگا اور اسی وقت تسلیم شفعہ معتبر ہے۔

فتاوی الغرویہ میں ہے: ولو سلم الشفعۃ قبل الشراء وکان ذلک باطلا اھ (ج ۲، ص ۳۶۸)

وفی زیلعی شرح الکنز: وقیل البیع ھو السبب بدلیل ان الشفیع لو اسقط الشفعۃ قبل الشراء لا یصح لکونہ اسقاطا قبل وجود سببہ وھو البیع ولو کان السبب ھو الاتصال لصح لکونہ بعد وجود السبب (وجوابہ) انہ انما لم یصح الاسقاط قبلہ لفقد شرطہ وھو البیع لان السبب لا یکون سببا الا عند وجود الشرط کما فی طلاق المعلق۔ (ج ۲ صفحہ ۲۴۲)

لیکن کاغذات مسلکہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد انعقاد بیع شفیع تسلیم حق شفعہ کرچکا ہے کیونکہ نوٹس بائع بنام شفیع ۱۳ رنومبر ۲۶ء کو شفیع کے پاس پہنچا اور شفیع نے اس کا جواب ۱۲ رنومبر ۲۶ء کو لکھا ہے اس قدر مدت کے بعد جواب دینا مسقط حق شفعہ ہے مجلہ کی دفعہ (۱۰۳۳) میں ہے۔

لو أخر الشفیع طلب التقریر والاشھاد مدۃ یمکن اجراءھا فیھا ولو بارسال مکتوب یسقط حق الشفیع۔

اور شفیع کی تحریر کہ اس معاملہ میں صحیح علم مجھے ابھی ہوا اگر حقیقی معنی کے اعتبار سے لیا جاوے تو چونکہ نوٹس اس کے پاس ۱۳ رنومبر ۱۹۲۶ء کو پہنچ چکا ہے اس لئے

یہ کذب ہے اور اگر مجازاً مراد یہ ہے کہ وصول نوٹس منجانب بائع بنام شفیع کیوقت علم ہو تو طوالت مدت مسقط حق شفعہ ہے علاوہ ازیں نوٹس شفیع بنام مشتری مرسلہ ۱۰ر نومبر ۱۹۲۶ء ہی میں شفیع مشتری سے کیفیت سوالش دریافت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آئندہ ہمارے ہاتھ اس مکان کو فروخت کردو گے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت موجودہ بیع کو فسخ کرنا نہیں چاہتا بلکہ آئندہ کیلئے مشتری سے وعدہ بیع لینا چاہتا ہے تو اس لئے بھی حق شفعہ ساقط ہے مجلہ کی دفعہ (۱۰۲۴) میں ہے۔

بشرط ان لایکون الشفیع رضی فی عقد البیع الواقع صراحۃ او دلالۃ مثلاً اذا سمع عقد البیع وقال ھو مناسب یسقط حق شفعہ ولیس لہ طلب الشفعۃ بعد ذلک وکذا اذا اراد ان یشتری او یستاجر العقار المشفوع من المشتری بعد سماعہ بعقد البیع یسقط حق شفعتہ الخ

۱ نقل رسید بیعانہ ٹکٹ مع دستخط

بندہ مقصود الحسن پسر حکیم نور الحسن پیرزادہ
قصبہ گنگوہ محلہ کوٹلہ

جو کہ مبلغ چھ سو روپیہ نصف جس کے تین سو روپیہ ہوتے ہیں پاس سے حکیم مسعود احمد صاحب پیشگی بطور بیعانہ منجملہ بارہ سو روپیہ بابت حصہ خود مکان و بیٹھک و پلٹ ۂ مولوی محمد شفیع صاحب واقع محلہ الٰہی بخش جس پر بذریعہ بیعنامہ ۱۳ر اگست ۱۹۲۶ء مالک و قابض و متصرف ہوں وصول پاکر رسید لکھ دی بقیہ روپیہ بوقت رجسٹری لونگا۔ مورخہ ۲۰ر نومبر ۱۹۲۶ء

گواہ     گواہ     گواہ     دستخط

مقصود الحسن

۲ نقل نوٹس منجانب شفیع بنام بائع۔

عزیزم مقصود الحسن

تمہارا نوٹس ملا تاریخ میعادی ۲۴ر نومبر ۱۹۲۶ء مجھے ۱۳ر نومبر ۱۹۲۶ء کو بوقت شام وصول ہوا جس پر میں بغیر افسوس کیئے ہوئے نہیں رہ سکتا اس معاملہ

میں صحیح علم مجھے ابھی ہوا نصف حصہ مکان کی قیمت سہ ہزار وہ بھی ابھی تم سے اور دیگر
صاحبان کی زبانی معلوم ہوئی ۔ مجھے اور والدہ صاحبہ کو مکان کی سخت ضرورت ہے
اس لئے مذکورہ قیمت پر نصف حصہ مکان حضرت نانا مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم
کا خریدار ہوں مگر اس کام کیلئے میعاد کم ہے ۔ ایک ماہ ہونی چاہئے تھی ۱۳ ر نومبر
۱۹۲۴ء کی شام کو مجھے نوٹس ملا میری ضرورت اور حقوق خریداری پر نظر کرتے ہوئے ۱۴ ر
نومبر ۱۹۲۴ء سے ۲۸ ر نومبر ۱۹۲۴ء تک ۱۵ ر یوم کی مہلت تو مجھے ملنی چاہئے ۔ ہارون سلمہٗ
نابالغ ہے اس کا حصہ تا حصول اجازت ضابطہ بیع نہ ہو سکے گا اس تمہارا اور تمہاری
بہن کا حصہ اس وقت معرض بیع میں ہوگا اگر میں ۲۹ ر نومبر ۱۹۲۴ء تک تمہاری اور
تمہاری بہن کے حصہ کا بیعنامہ نہ کرا سکا تو پھر جو تم نے چاہا وہ ہی کرو گے میرے لکھنے
کی ضرورت نہیں ۔

دستخط

عزیز الحسن غفرلہٗ

عـــ۳ نقل مکتوب بنام مشتری منجانب شفیع

حضرت مخدوم حکیم مسعود احمد صاحب بعد سلام مسنون نیازمندانہ عرض
آنکہ اگر حصہ مکان حضرت نانا صاحب مرحوم جناب کے نام بیع ہو گیا اور آئندہ کسی
وقت ہم میں سے کسی نے کبھی اپنی ضرورت کیوجہ سے لینا چاہا تو از راہ کرم و نوازش
موجودہ خرچ و زر ثمن لیکر ہم کو عنایت فرما دیا جاوے گا ۔
بصورت مذکورہ رہائش کی کیا صورت ہوگی ۔ حضرت والدہ صاحبہ مکہ مدینہ
خود اس مکان میں آنے اور رہنے کی متمنی ہیں ان کے پاس رہنے کا کسی عورت کا انتظام
نہیں اگر ہو گیا اور وہ آنا اور رہنا چاہیں تو کیا صورت ہوگی وہی جواب تک رہی یا
کچھ اور براہ کرم جواب باصواب سے ممنون فرما دیں ۔ نیازمند

عزیز حسن عفی عنہ

۱۶ ر نومبر ۱۹۲۴ء

## استفتاء از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید و عمر ایک

مکان میں شریک ہیں عمر اپنا حصہ فروخت کرتا ہے۔ ۷ر نومبر ۱۹۲۷ء کو بائع نے ایک غیر شخص مشتری سے گفتگو بیع و فروخت کی کرکے ایجاب و قبول کیا اور زبانی سپرد مبیع کرکے تکمیل وثیقہ کو مؤخر قرار دیا۔ جیسا کہ مضمون رسید بیعانہ مسلک ھذا ۱ ملاحظہ ہو جو کہ حسب ضابطہ قانون بائع نے تحریر کی مشتری نے بائع سے کہا کہ تم نے جو سب حجتیں شفیع سے قطع کرلیں یہ ٹھیک نہیں بذریعہ نوٹس بھی قانونی حجت قطع کرلو چونکہ بائع اور شفیع میں قرابت قریبہ ہے اس لحاظ سے نوٹس دینا معیوب سمجھا مگر مشتری کی تاکید پر بائع نے بجائے ۷ر نومبر ۱۹۲۷ء کے ۹ر نومبر ۱۹۲۷ء کو نوٹس دیا جو کہ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۷ء کو شفیع کو ملا جیسا کہ شفیع نے اپنے مکتوب نوٹس محررہ ۱۶ر میں ظاہر کیا کہ مجھے صحیح علم ابھی ہوا۔

نقل مضمون نوٹس بنام بائع ۲ ملاحظہ ہو۔

پھر شفیع نے ۳ر یوم گزار کر اول ایک تحریر مشتری کے پاس بھیجی جس میں مضمون وعدۂ واپسی مبیع و بحالت اشتراک صورت رہائش دریافت کی ۳ مسلک ھذا ملاحظہ ہو۔ پھر ۱۶ر نومبر کو شفیع نے بذریعہ نوٹس بائع سے طلب حق و مہلت کی درخواست کی وہ بھی مضامین کثیرہ کے بعد ۲ مسلک ھذا کو مکرر ملاحظہ فرمایئے ۱۸ یا ۱۹ کو وثیقہ لکھا گیا ۲۳ر ایام کو رجسٹری ہوا ہر سہ کاغذات منسلکہ ھذا کو ملاحظہ فرما کر حکم شرعی سے مطلع فرمادیں کہ شفیع کو حق شفعہ باقی ہے یا نہ اور تکمیل ایجاب و قبول کے وقت تمام ہوئی یا سپرد مبیع پر یا تحریر وثیقہ یا رجسٹری پر جیسا تو جرا

اس سوال پر حسب ذیل تنقیح کی گئی۔

۱: بائع نے اپنے نوٹس میں کیا لکھا تھا۔ آیا یہ کہ میں نے مکان فلاں مشتری کے ہاتھ بیع کردیا یا کہ بیع کا ارادہ ہے۔

۲: کیا سائل کو اس بات کا علم ہے کہ شفیع نے نوٹس کو پڑھکر یا پڑھتے ہوئے زبانی کسی کے سامنے طلب مواثبت ظاہر کی تھی یا نہیں۔

۳: شفیع کا خط بنام مشتری ۱۰ر نومبر ۱۹۲۷ء جس میں مضمون وعدہ واپسی مبیع و بحالت اشتراک صورت رہائش دریافت کی ہے۔ اس میں یہ لفظ ہے کہ اگر حصہ مکان حضرت نانا صاحب مرحوم جناب کے نام بیع ہوگیا الخ اس سے بظاہر مفہوم

ہوتا ہے کہ اس وقت تک شفیع کے نزدیک بیع نہ ہوئی تھی۔ اس لیئے بائع کے نوٹس کے مضمون کی نقل بھیجنا ضروری ہے۔ جس کا جواب حسب ذیل آیا

## جواب تنقیح

۱ : نقل مضمون نوٹس بائع بنام مشتری اس وجہ سے شامل نہیں کیا تھا کہ شفیع نے بائع کو اغوا کر لیا ہے اس کے حصول میں شک واقع ہو گیا تھا اور اس وقت بائع سے یہی کہا گیا تھا کہ تم اطلاع کردو کہ فلاں مکان فلاں شخص کے ہاتھ اتنی قیمت میں بیع کر دیا ہے۔ ۲ نومبر ۱۹۲۶ء کو ایجاب و قبول کے بعد شہرت عام ہو گئی تھی کہ فلاں مکان فلاں شخص کے ہاتھ اتنی قیمت میں بیع ہو گیا اسی مضمون کو شفیع اپنے ۱۲ نومبر کے نوٹس میں ظاہر کرتا ہے کہ (اس معاملہ میں صحیح علم مجھے ابھی ہوا ہے الخ)

۲ : اس کا جواب کچھ نہیں دیا گیا، (البتہ جو استفتاء دیوبند بھیجا گیا اس کی نقل جواب تنقیح کے ساتھ بھیجی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں) ۱۳، ۱۶ کے درمیان تو اربیع میں شفیع نے کسی قسم کی گفتگو کسی سے نہیں کی نہ بائع سے نہ مشتری سے نہ مبیع سے الخ۔

۳ : چونکہ بیع و فروخت میں شریعت مقدسہ کا پڑھے لکھے کو بھی پورا خیال نہیں الا ماشاء اللہ ہر شخص بنی جہالت تکمیل بیع تحریر وثیقہ و رجسٹری کو قطعی سمجھتے ہیں اس لیئے شفیع نے اپنے مکتوب ۱۶ نومبر ۱۹۲۶ء میں مشتری سے اگر کر کے سوال کیا جس کی وجہ سے تنقیح کی نوبت آئی اور قبل از بیع مفہوم ہوا اور زبانی اطلاع ہوئی اور زبانی اطلاع تو خود مشتری نے ۱۳ کے بعد اور ۱۲ سے قبل صاف لفظوں میں شفیع سے بوقت ملاقات کہہ دیا تھا کہ شرعی بیع قطعی ہو چکی محض تحریر وثیقہ باقی ہے اس پر بھی طلب مواثبت نہیں کی خاموش ہو کر چلے گئے پھر اگلے روز ۱۶ نومبر ۱۹۲۶ء کو مکتوب طلب رہائش وغیرہ لکھا۔

عبد المجید تھانوی مقیم تجرہ شریفہ قدو سیہ رشیدیہ

۴ شعبان یوم جمعہ

## الجواب (من جامع امداد الاحکام بتھانہ بھون)

سائل نے جواب تنقیح کے ساتھ جو استفتاء مع جواب کے بھیجا ہے اس کے

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجیب نے سقوط شفعہ کی بنا ر امور ذیل پر رکھی ہے۔

۱ : کاغذات منسلکہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد انعقاد بیع شفیع تسلیم حق شفعہ کر چکا ہے کیونکہ نوٹس بائع بنام شفیع ۱۳ ر نومبر ۱۹۲۶ء کو شفیع کے پاس پہنچا ہے اور شفیع نے اس کا جواب ۱۶ ر نومبر کو دیا ہے۔ اس قدر مدت کے بعد جواب دینا مسقط حق شفعہ ہے۔

۲ : اور شفیع کی تحریر کہ اس معاملہ میں صحیح علم مجھ کو ابھی ہوا اگر حقیقی معنی کے اعتبار سے لیا جاوے تو چونکہ نوٹس اس کے پاس ۱۳ ر نومبر کو پہنچ چکا ہے۔ اس لئے یہ کذب ہے۔ اور اگر مجازاً مراد یہ ہے کہ وصول نوٹس من جانب بائع شفیع کے وقت علم ہوا تو طوالت مدت مسقط حق شفعہ ہے۔

۳ : علاوہ ازیں نوٹس شفیع بنام مشتری مرسلہ ۱۶ ر نومبر ۱۹۲۶ء ہی میں شفیع مشتری سے کیفیت رہائش دریافت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آئندہ ہمارے ہاتھ ہی مکان کو فروخت کرو گے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت موجودہ بیع کو فسخ کرانا نہیں چاہتا ہے آئندہ کیلئے مشتری سے وعدہ بیع لینا چاہتا ہے تو اس لئے بھی حق شفعہ ساقط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجیب مذکور نے جواب میں نہایت درجہ مسامحت کی ہے اور جتنی بنائیں سقوط شفعہ کی اس نے بیان کی ہیں سب ناکافی ہیں۔ اول تو اس لئے کہ مجیب کو کاغذات منسلکہ سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ بائع نے شفیع کو اپنے نوٹس میں یہ اطلاع دی تھی کہ میں نے مکان کی بیع کر دی ہے کیونکہ بائع کے نوٹس کا مضمون کاغذات منسلکہ میں نہیں ہے نہ سوال میں اس کی طرف اشارہ نہ حوالہ۔ بلکہ کاغذات میں جواب شفیع (جس کو نقل نوٹس منجانب شفیع بنام بائع ۲ ظاہر کیا گیا ہے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بائع نے شفیع کو میعادی نوٹس دیا تھا اور وہ میعادی ۲۴ نومبر تھا اور شفیع اخیر میں لکھتا ہے کہ اگر میں ۲۹ ر نومبر ۱۹۲۶ء تک تمہارے اور تمہاری بہن کے حصہ کا بیعانہ نہ کرا سکا تو پھر جو تم نے چاہا وہ کرو گے میرے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ۲۰ ر نومبر ۱۹۲۶ء۔ اور شروع میں لکھتا ہے کہ نصف حصہ مکان کی قیمت سہ ہزار روپے بھی ابھی تم سے اور دیگر صاحبان کی زبانی معلوم ہوئی اس عبارت سے متبادر یہ ہے کہ بائع نے شفیع کو بیع کی اطلاع نہیں دی بلکہ ارادۂ بیع کی اطلاع

دی تھی اور نوٹس میں قیمت کا ذکر نہ تھا بلکہ شفیع کو اس کا علم زبانی ہوا۔ پس بدون دریافت مضمون نوٹس بائع کے مفتی کا فتویٰ دینا جائے حیرت ہے۔ اور قبل اس تنقیح کے شفیع کی تاخیر کو مسقطِ شفعہ کہہ دینا صریح مسامحت ہے کیونکہ تاخیرِ طلب بعد علمِ بیع کے مسقطِ شفعہ ہے نہ قبل از علمِ بیع کما حررہ مفتی ایضاً۔ اور ثانی اس لئے کہ بلاوجہ شرعی مسلمان کے کلام کو کذب پر محمول کرنے کی کیا وجہ ہے۔ ممکن ہے کہ ۱۲ر نومبر ۱۹۲۶ء کو شفیع کو صحیح علم ہوا ہو مگر قابلِ تنقیح تو یہ امر ہے کہ اس کو صحیح علم کس امر کا ہوا بیع کا یا ارادۂ بیع کا۔ شفیع کے نوٹس کی اخیر عبارت مدلولِ ثانی کو بتلا رہی ہے اس لئے طوالتِ مدت مسقطِ شفعہ نہیں ہو سکتی تھی مجیب کو یہ عبارت لکھتے ہوئے شفیع کی پوری عبارت کو پڑھ کر اس کا مدلول متعین کر کے لکھنا چاہیے تھا اور اس وقت اس کو اس تنقیح کی ضرورت خود محسوس ہو جاتی کہ بائع کے نوٹس کا کیا مضمون تھا۔

اور ثالث اس لئے کہ شفیع نے مشتری کو جو نوٹس دیا ہے اس نوٹس کو شفیع نے اس لفظ سے شروع کیا ہے کہ "اگر حصہ مکان حضرت نانا صاحب مرحوم جناب کے نام بیع ہو گیا الخ"۔ اس کلام مشروط سے متبادر یہ ہے کہ اس نوٹس کے لکھنے کے وقت تک شفیع کے نزدیک اس مکان کی بیع نہیں ہوئی ورنہ اگر بیع ہو چکی ہوتی تو وہ سوال نہ کرتا۔ اور جب شفیع کی یہ تحریر اپنے مدلول کے موافق قبل از بیع ہے تو اس کو مسقطِ شفعہ کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ مجیب نے اس پر جواب کے شروع میں خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ قبل از بیع اسقاطِ شفعہ سے شفعہ ساقط نہیں ہوتا۔

بہر حال جو کاغذات منسلکہ سائل نے مجیب اول کے پاس بھیجے اور جو اولاً ہمارے پاس بھیجے گئے ان کی بنا پر سقوطِ شفعہ کا حکم اور فتویٰ دینا ہرگز صحیح نہیں جب تک بائع کے نوٹس کا مضمون معلوم نہ ہو جاتے کیونکہ شفیع کا نوٹس بنام بائع اور بنام مشتری اس امر کو ظاہر کر رہا ہے کہ اس کو ۱۲ر نومبر تک اس مکان کے بیع ہو جانے کا علم نہیں ہوا۔

اب میں جوابات تنقیح کی طرف توجہ کرتا ہوں اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ بائع کو یہی کہا گیا تھا کہ تم (شفیع کو) اطلاع کر دو کہ فلاں مکان فلاں شخص کے ہاتھ اتنی قیمت میں بیع کر دیا۔ سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بائع نے اس کی تعمیل بھی کی جب تک اس کی تحریر سامنے نہ ہو کیونکہ شفیع کا نوٹس بنام بائع یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس

نوٹس سے نہ بیع کا علم ہوا نہ قیمت کا بلکہ ارادہ بیع کا صحیح علم ہوا اور قیمت کا علم زبانی ہوا
کما ذکرناہ مفصلا ان ذالک عدل او بہ ظاہرا۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ ۱۶
نومبر ۱۹۲۶ء کو ایجاب وقبول کے بعد شہرت عام ہوگئی تھی الخ مگر اس سے یہ لازم نہیں
آتا کہ شفیع کو بھی مفصل علم بذریعہ عدل کے ہوگیا ہو ممکن ہے اس کو افواہا غیر عدل
سے خبر ملی ہو۔ ولا یسقط حقہ بالسکوت علی اخبار غیر العدل یا عدل نے
خبر دی ہو مگر کل بیع اور کل ثمن کی مفصل اطلاع نہ دی ہو۔ ولا یسقط حق الشفعۃ
بالسکوت علی مثل ھذا الخ

اس کے بعد لکھا ہے کہ ہر شخص بوجہ جہالت تکمیل بیع تحریر وثیقہ ورجسٹری کو
سمجھتا ہے اسی لئے شفیع نے اپنے مکتوب ۱۶ نومبر ۱۹۲۶ء میں مشتری سے اگر کرکے سوال
کیا الخ مگر اس میں یہ خدشہ ہے کہ اس جہالت کا احتمال جیسا شفیع کی جانب ہے۔
بائع کی جانب بھی ہے۔ ممکن ہے اس نے تحریر وثیقہ اور رجسٹری نہ ہونے کی وجہ سے
۹ نومبر کے نوٹس بنام شفیع میں یہ نہ لکھا ہو کہ مکان کی بیع ہوچکی بلکہ یہ لکھا ہو کہ
فلاں تاریخ کے بعد بیع ہوجاوے گی۔

ولا یسقط الشفعۃ بالسکوت علی علم ارادۃ البیع او التاخیر
فی الطلب عنہ۔

دوسرے یہ ایک محض احتمال ہے کہ شفیع نے محض جہالت سے ایسا سمجھا اس کی
تحقیق درجہ جزم میں بدون مضمون نوٹس بائع کے دیکھے نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ زبانی اطلاع میں تو صرف مشتری نے ۱۳ نومبر کے بعد
اور ۱۹ نومبر سے قبل صاف لفظوں میں شفیع سے کہہ دیا تھا کہ شرائی قطعی ہوچکی ہے
محض تحریر وثیقہ باقی ہے اس پر بھی طلب مواثبت نہیں کی الخ یہ سب جزو البتہ قابل توجہ
مگر حیرت یہ ہے کہ اس جزو کو نہ بیان اولاً ظاہر کیا گیا نہ استفتاء دیوبند میں ظاہر
کیا گیا بلکہ ہماری تنقیح کے بعد ظاہر کیا گیا۔

دوسرا اس میں بھی پوری بات ظاہر نہیں کی گئی کہ مشتری نے اس مجلس میں شفیع کو
کل مبیع اور کل ثمن کی بھی مفصل اطلاع کردی تھی۔ اور یہ کہ یہ مجلس شفیع کے حق میں اول
مجلس علم تھی اور یہ کہ اس نے اس سے پہلے بائع کے یا مبیع کے سامنے طلب مواثبت نہیں

کی تھی۔ اس واسطے اس جزو کی وجہ سے بھی قطعی فتویٰ نہیں دیا جاسکتا صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس مجلس میں مشتری نے شفیع کو قطعی بیع ہو چکنے کی خبر کے ساتھ کل مبیع اور کل ثمن کی بھی اطلاع کردی تھی اور یہ مجلس شفیع کے حق میں پہلی مجلس علم تھی یا اس سے پہلے اس نے بائع یا مشتری کے سامنے طلب مواثبت نہ کی تھی تو اس مجلس میں ترکِ مواثبت سے اس کا حقِ شفعہ ساقط ہوگیا۔ اور اگر ان شرائط میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو حقِ شفعہ ساقط نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۷ شعبان ۱۳۴۶ھ

**دعویٰ شفعہ سے بچنے کی خاطر مبیع کی قیمت زیادہ لکھوانا**

السوال:۔ ایک شخص زمین خریدنا چاہتا ہے مگر رقم تو صرف دو سو روپے دیتا ہے اور چار سو لکھواتا ہے۔ اور مالک بھی اس بات پر راضی ہے بلکہ مالک چار سو روپیہ اس لئے لکھواتا ہے تاکہ کوئی حقِ شفعہ نہ کرے۔ اور اگر کوئی حقِ شفعہ کرے تو پورے چار سو روپیہ ادا کرے تو حضور والا اس مسئلہ کے بابت عرض ہے کیا دو سو روپیہ دیکر چار سو روپیہ لکھوانا پھر جو حقِ شفعہ کرے اس سے بھی چار سو روپیہ وصول کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ اُمید ہے کہ جواب سے نوازیں گے۔

## الجواب

اس طرح کرنا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ رجب المرجب ۱۳۴۶ھ

**شفعہ کی ایک صورت کا حکم**

السوال:۔ ایک عورت نے اپنا مکان بعوض چار سو روپیہ اپنی ساس کے نام بیع قطعی کرایا جس کو عرصہ نو ماہ کے قریب ہوا ہے اور بعد انتقال بیع مسماۃ بائعہ کا انتقال ہوگیا مجھے اس ماہ کے اندر پتہ چلا کہ ایسا معاملہ ہوا ہے فوراً اپنے بھائی صاحب کو اطلاع دی کہ آپ شفیع ہیں میرے بھائی نے یہ خط پڑھنے کے بعد ایک گواہ کے سامنے شرائط حقِ شفعہ ادا کیں اور مجھے لکھا

کہ میں شفیع ہوں اور مطالبہ شفعہ کا کروں گا خریدار مکان یہاں پر موجود نہیں ہے ابھی تک اسی کے مقابل پر شرائط شفعہ وادا نہیں ہوئیں اور جب مجھے علم ہوا تھا اس وقت بھی خریدار مکان یعنی مسماۃ بائعہ کی ساس یہاں موجود نہ تھی ایسی صورت میں کیا ہونا چاہئے سنا ہے کہ دہلی میں ہے لیکن مفصل پتہ معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔

دوسرا امر قابل دریافت یہ ہے کہ زرثمن مکان مذکور کا چار سو روپیہ قرار دیا گیا ہے اور نفس الامر میں قیمت زیادہ ہے اب میرے بھائی کو چار سو روپیہ زرثمن پر مطالبہ شفعہ کرنا چاہیئے یا کمی بیشی پر۔ بینوا توجروا۔

احقر العباد عابد حسین

محلہ مومہ دربار کلاں

## تنقیح

جس خط کے ذریعہ اطلاع بیع مکان مذکور کی دی گئی تھی اس میں اس اطلاع کے ساتھ اور کوئی مضمون بھی تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو بیع کی اطلاع خط کے آخر میں تھی یا شروع میں یا درمیان میں اور طلب شفعہ کا گواہ پورے خط کو پڑھنے کے بعد بنایا یا درمیان میں ہی فقط بیع کی خبر پڑھ کر۔ اس کا جواب مع اس پرچہ کے دیا جاوے۔

احقر عبد الکریم

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

## جواب تنقیح

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جس خط میں بیع کی خبر دی گئی تھی وہ خط بجنسہ ارسال ہے پورا خط پڑھنے کے بعد طلب شفعہ کا گواہ بنایا تھا۔

احقر زاہد حسین

شفیع مکان مبیعہ

## مرسلہ خط

دیگر احوال آنکہ آپ کے قریب میں سید علی والا مکان ہے وہ سید علی

نے اپنی بہو کے نام بیع کر دیا تھا جب اس کی بہو کا انتقال ہونے کے قریب ہوا تو اس نے مکان اپنی بیوی کے نام منتقل کرا دیا یعنی بہو نے اپنی ساس کے نام لکھ دیا اور مبلغ چار سو روپیہ کا بیعانہ بھی لکھ دیا ہے اور سبط علی کی بہو کا تپ دق میں انتقال ہو گیا ہے۔ اب وکیلوں نے یہ رائے دی ہے کہ تمہارے بھائی کا شفعہ ہے وہ لینا چاہیں تو شرائط شفعہ فوراً ایک ایسے شخص کے سامنے ادا کردیں جو تاریخ پر عدالت میں بیان کر دے کہ میرے سامنے انہوں نے شرائط شفعہ ادا کیں تھیں اور آپ کو یہاں آنے کی ضرورت فوراً ہوگی۔ تاکہ یہاں دو شخصوں کے سامنے کہا جاوے کہ میرا حق تھا میں شفیع ہوں اور شفعہ طلب کروں گا ایک شخص کے سامنے بیان کرنا کافی ہے جو آکر یہاں بیان کر دے اور قیمت چار سو روپیہ اس نے قرار دی ہے۔ چار سو روپیہ ہی قیمت مانی جائے گی۔

## الجواب

۲۸۶

حق شفعہ کے واسطے ابھی یہ امر قابل غور ہے کہ بیع مکان کی بابت جو اطلاعی خط آپکو ملا ہے اس میں اگرچہ قرار دی ہے، تک عبارت پڑھ کر فوراً اپنی زبان سے کہہ دیا تھا کہ حق شفعہ لوں گا تب تو حق باقی ہے گو اس وقت کوئی گواہ موجود نہ ہو اور اگر یہ قرار دی ہے، تک خط پڑھ کر شفعہ لینے کو زبان سے نہیں کہا بلکہ تمام خط پڑھ کر ہی گواہ کے سامنے ظاہر کیا تو حق شفعہ باطل ہوگیا۔ بلکہ اگر خط کے حاشیہ کی عبارت پہلے پڑھی ہو تو "بیع کر دیا ہے" تک پڑھ کر زبان سے کہنا ضروری تھا۔ اگر نہ کہا ہو تو حق باطل ہوگیا۔ اس حق کے باطل ہونے کی صورت میں مطالبۂ شفعہ سے عاصی ہوگا کہ غیر کے حق کو غصب اور اس پر ظلم کرنا ہے۔ اور حق شفعہ باقی ہو تو اس اس صورت اسی قیمت میں مکان لینا جائز ہے۔ جو بیع کے وقت قرار دی گئی ہے خواہ وہ رعایت سے رکھی گئی ہو یا پوری قیمت ہو۔

فی الدر: فی جواهر الفتاوی انه (ای طلب المواثبة) علی الفور وعلیه الفتوی وقال الشامی (فروع) اخبر بکتاب والشفعة فی اوله او وسطه وقرأه الی آخره بطلت هدایة۔ ج ۵، ص ۲۱۹۔

وفی الدر ایضاً: (ویقضی) القاضی (بالشفعة والعهدة) الضمان

الثمن عند الاستحقاق (على البائع قبل تسليم المبيع الى المشتري) والعهدة (على المشتري لو بعده) لما مر اھ ج ۵، ص ۱۴۳۔

وفيه ايضاً: (فتملك البقعة جبراً على المشتري بما قام عليه) بمثله لو مثليا والا فبقيمة وفي الشامي تتمة والمراد ما لزم المشتري من امؤن بالشراء اھ ج ۵، ص ۲۱۱۔

وفيه ايضاً: قلت ما قام عليه عام في القليل والكثير والثمن ما تراضيا به سواء كان مساويا للقيمة او زائداً عليه او ناقصاً عنه وايضاً في الدر (وحط البعض يظهر في حق الشفيع) فيأخذ بالباقي الخ ص ۲۲۴۔

وعدم الفرق بين الحط بعد البيع والمحاباة قبل البيع ظاهر۔ واللہ اعلم

| الجواب صحیح | کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ |
| --- | --- |
| ظفر احمد عفا اللہ عنہ | از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون |
| ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ | ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ |

## متعلق سوال بالا

اور سوال میں اور خط میں ایک شاہد بنا نا حق شفعہ طلب کرنے کے واسطے لکھا ہے اس کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص گواہی کے واسطے کافی نہیں، دو گواہوں کی ضرورت ہے اور چونکہ اس امر پہ گواہ بنانا کہ ہم نے فوراً حق شفعہ کا مطالبہ زبان سے کہدیا تھا شفعہ کی شرط نہیں ہے اس لیے ایک گواہ کی کمی سے حق شفعہ تو باطل نہیں ہوا لیکن اگر مشتری کہے کہ تم نے فوراً طلب ظاہر نہیں کی تھی تو اس کے مقابلہ میں ایک گواہ ناکافی ہے۔

في الدر المختار: (و) نصابها (لغيرها من الحقوق سواء كان الحق مالا او غيره رجلان) اھ ملخصاً وقال الشامي (قوله لغيرها) اي لغير الحدود والقصاص وما لا يطلع عليها الرجال الخ اھ ج ۴، ص ۵۲۶۔

وفي العالمگيرية ج ۳ ص ۴۳۵: ومنها الشهادة بغير الحدود والقصاص وما لا يطلع عليه الرجال وشرط فيها شهادة رجلين او رجل

او رجل وامرأتین سواء کان الحق مالا او غیر مال الخ

وفی الدر: والاشهاد فیه لیس بلازم بل لمخافة الجحود و

قال زشامی کذا فی الهدایة وغیرها لان طلب المواثبة لیس لاثبات

الحق بل لیعلم انه غیر معرض من الشفع معراج ونهایة۔ ج۵، ص ۲۱۹

وفی الهندیة: واما طلب الاشهاد فهو ان یشهد علی طلب

المواثبة حتی یتأکد الوجوب بالطلب علی الفور ولیس الاشهاد

شرطا لصحة الطلب لکن یتوثق حق الشفعة اذا انکر المشتری طلب۔

الشفعة الخ ج ۶، ص ۱۱۲۔

اب رہی یہ بات کہ خریدار موجود نہ ہونے کے باعث اس کے سامنے مطالبہ نہیں کیا گیا سو اس حالت میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب بیع کی شفیع کو اطلاع ہو اس کو خود یا اپنے کسی وکیل کے ذریعے اس مکان کے پاس جا کر دو گواہوں کے سامنے یہ کہے کہ یہ مکان فلاں نے خریدا ہے اور میں نے اطلاع ہوتے ہی شفعہ طلب کیا ہے اور اب بھی طلب کرتا ہوں تم گواہ رہو اگر ایسا نہیں کیا یعنی اس مکان پر جا کر مطالبہ نہیں کیا تو شفعہ باطل ہو گیا اور اس اشہاد میں اطلاع بیع کے بعد اتنی تو تاخیر ہو سکتی تھی کہ جتنی دیر سفر سے مکان پہنچنے میں درکار ہے اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں زیادہ تاخیر سے شفعہ باطل ہو جاتا ہے۔ یہ تو جب ہے کہ مطالبہ کیلئے شفیع خود آوے اور اگر شفیع کسی کو وطن میں وکیل بنا دے تو اس وکیل تک خط پہنچے میں جو وقت صرف ہو اتنی تاخیر معاف ہے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ سو اگر وکیل نے خط ملنے کے بعد طلب میں تاخیر کی تب بھی شفعہ باطل ہو گیا۔

فی الدر المختار: (ثم یشهد علی البائع لو) العقار (فی یده او علی المشتری) وان لم یکن ذاید لانه مالک (او عند العقار فیقول اشتری فلان هذه الدار وانا شفیعها وقد کنت طلبت الشفعة و اطلبها الآن فاشهدوا علیه) (وهذا) الطلب (لا بد منه حتی لو تمکن ولو بکتاب او رسول ولم یشهد بطلت شفعته وفی الشامی (قوله حتی لو تمکن) لو فتح التطوع بعد طلب المواثبة قبل طلب

الاشہاد بطلت خانیۃ اھ ج ۵، ص ۲۲۰۔

وفی العالمگیریۃ: واذا کان الشفیع غائبًا یؤجل بعد العلم قدر مسیرۃ الطلب للاشہاد فان حضر ھو او وکیلہ و الا بطلت شفعتہ و بعد سطر۔ فان ظھر المشتری فی بلد لیس فیہ الدار لم یمکن علی الشفیع الطلب ھناک وانہ یطلب حیث الدار کذا فی محیط السرخسی (ص ۱۷۱)۔

اور اگر اس طلب میں یعنی بائع یا مشتری یا جائداد کے پاس جا کر جو شفعہ کی طلب ظاہر کی جاتی ہے اس میں دو گواہوں کے سامنے مطالبہ نہیں ہوا بلکہ شفیع نے بائع یا مشتری سے تنہا مطالبہ کیا یا مکان کے پاس جا کر الفاظ طلب بزدیکے تو دیانۃً تو شفعہ باطل نہیں ہوا لیکن حاکم تسلیم نہ کرے گا جبکہ مشتری شفیع کی تصدیق نہ کرتا ہو کما فی الشامی ج ۵، ص ۲۲۰۔

قولہ: (وھو طلب الاشہاد) ویسمی طلب التقریر اقول ظاھر عبارا تھم علی لزوم الاشہاد فیہ لکن رایت فی الخانیۃ انما سمی الثانی طلب الاشہاد لا لان الاشہاد شرط بل لیمکنہ اثبات الطلب عند جحود الخصم اھ وتأمل۔ الشامی (ج ۵، ص ۲۲۰)۔

## نوٹ

اگر بائع کو تپ دق بیع کے وقت ایسا تھا کہ جسکو مرض موت شمار کیا جاوے تو بہ تحقیق کرکے دوبارہ سوال کریں کہ اس نے جو کی زوجہ میں کی ہے وہ ثلث ترکہ سے تو زائد نہیں، اگر زائد ہے تو ورثہ اس کو نافذ کرتا ہے یا نہیں؟

الجواب مع التفصیل صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ
۱۴ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون
۱۹ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ

| | |
|---|---|
| حکم دعویٰ شفعہ از جانب مسجد وا وقاف دیگر | السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس |

مسئلہ میں کہ بازار میں ایک مسجد کے متعلق چند دوکانیں ہیں۔ اور ان دوکانوں کے

متصل ایک دوکان ایک مسلمان شخص کی تھی اس دوکان کو ایک اور مسلمان نے خرید لیا ہے اور مہتمم مسجد نے شفع کر دیا ہے اس مسئلہ میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ شفعہ من جانب مسجد جائز ہے یا نہیں۔ اور تاریخ شفعہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں مقرر ہے جواب سے بہت جلدی مطلع فرمائیے گا۔ المستفتی

نیاز محمد خیاط

ضلع میر بازار ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۶ء

## الجواب

فی الدر المختار: (ولا شفعة فی الوقف) ولا له نوازل (ولا بجواره) شرح مجمع وخلافاً للخلاصة والبزازیة ولعل لا ساقطة۔

قال المصنف: قلت وحمل شیخنا الرملی الأول علی الأخذ به والثانی علی أخذه بنفسه اذا بیع۔ ففی الفیض حق الشفعة یبنی علی صحة البیع اھ، فمفاده ان لا یملك من الوقف بحال لا شفعة فیه وما یملك بحال ففیه الشفعة وأما اذا بیع بجواره او کان بعض المبیع ملکا وبعضه وقفا وبیع الملك فلا شفعة للوقف والله اعلم۔

وفی الشامیة: (قوله وخانیة) عبارتها کذا فی المنح ولا شفعة فی الوقف لا للقیم ولا للموقوف علیه (قوله خلافا للخلاصة والبزازیة) حیث قالا: وکذا تثبت الشفعة بجوار دار الوقف اھ

اقول: وفی نسخة البزازیة لا تثبت، نعم رأیت فی نسخة الخلاصة کما قال (قوله ولعل لا ساقطة) یؤیده انه ذکر فی کل من الخلاصة والبزازیة قبله باقل من سطر ما لا یجوز بیعه من العقار لا شفعة فیه الخ فالتشبیه یقتضیه فافهم (ج ۵، ص ۲۲۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں حق شفعہ نہیں ہے اور خلاصہ

وبذا ظہر سے در المختار نے جو اختلاف نقل کیا ہے اول تو بوجہ اختلاف نسخ اس کا اعتبار نہ کیا جاوے گا دوسرے خود در مختار نے اس کا محمل بیان کر دیا۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ
۱۸ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

**تبادلہ جائیداد میں بھی حق شفعہ ثابت ہو جاتا ہے**

السوال: مہربانی فرما کر اس مسئلہ کے متعلق شرعی نقطۂ خیال سے روشنی ڈالئے۔ زید و بکر نے ایک دوسرے سے اپنی جائیداد کا تبادلہ کیا بکر کے رشتہ دار عمرو و خالد نے شفعہ شرعی زید و بکر پر داخل کیا آیا تبادلہ پر بھی حق شفعہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور کن کن حالتوں میں شفعہ ہو سکتا ہے۔

الجواب

تبادلہ میں بھی حق شفعہ ثابت ہوتا ہے۔ لان فیہ تملک بعوض المال۔ وفی الدر المختار: (لا تثبت قصدا الا فی عقار ملک بعوض) خرج الهبة (هو مال) خرج المهر (وان لم) یکن (یقسم) اھ واللہ أعلم

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ
۲۴ جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ

---

# کتاب المزارعۃ والمساقاۃ

**کچھ روپے لیکر کاشتکار کو موروثی کر دینا جائز نہیں**

السوال: اگر کچھ روپیہ لیکر زمیندار کاشتکار کو موروثی کر دیا جائے تو کیا یہ جائز ہے اور یہ روپیہ رشوت تو نہیں ہے۔ بینوا توجروا۔

محمد الیاس طالب العلم

## الجواب

جائز نہیں کیونکہ یہ حق استحقاق کا معاوضہ ہے اور حقوق متقوم نہیں ہیں۔

قال في الدر وفي الاشباہ: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ۔ اھ (ج ۴ ص ۲۰) واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون
۲ ربیع الثانی سنہ ھ

زمین کی موروثی کاشتکاری میں وراثت جاری نہیں ہوتی

السوال: اگر زمیندار کاشتکار کے نام اپنی کسی کھیت کی بخوشی کاشتکاری لگوادے تو آیا زمیندار اور کاشتکار دونوں کے مرجانے کے بعد یا ایک کے مرجانے کے بعد پھر کاشتکار کے لڑکے کو اس کاشتکاری منتفع یہ ہونا جائز ہوگا یا نہیں۔ ونیز اگر کسی زمیندار نے اپنا کھیت بطور کاشتکاری کے کسی کاشتکار کے نام نسلاً بعد نسل کرکے لکھ دیا تو یہ لکھنا جائز ہوگا یا نہیں بعض زمیندار کچھ روپیہ لیکر لکھ دیتے ہیں۔

## الجواب

کاشتکار کے نام اگر زمیندار کھیت کی کاشتکاری لکھ دے تو ایک یا دونوں کے مرنے کے بعد کاشتکار کی اولاد کو حق کاشتکاری نہ پہنچے گا کیونکہ وراثت مملوک میں ہوتی ہے اور حقوق مجردہ مملوک نہیں ہوتے اور اگر زمیندار کچھ روپیہ لیکر زمین کو موروثی کردے تو جب بھی زمین شرعاً موروثی نہ ہوگی اور زمیندار نے جو رقم لی ہے وہ رشوت ہے اس کا تصرف میں لانا حرام ہے کاشتکار اپنی وہ رقم واپس لے سکتا ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۰ھ

زمین موروثی کا حکم اور زمین کو موروثی کرنے کے عوض مال لینے کا حکم

السوال: جو کھیت کاشتکار بلارضامندی زمیندار کے بارہ سال قبضہ ہوجانے کے بعد اپنی کاشتکاری لگوالیتا ہے یا زمیندار اپنی رضامندی سے اس کے نام اپنے کسی کھیت

کی کاشتکاری لکھوا دے تو فریقین کے مرنے کے بعد یہ کاشتکاری بالتراضی کاشتکار کے لڑکے کو جائز ہوگی یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو غاصبانہ قبضہ یا اس طرح سے کہ زمیندار نے خود لکھوایا اور اس کے بعد مر گیا پھر تجدید معاملہ نہ ہوا تو آیا کاشتکار کو حرام خور یا فاسق و فاجر کہا جا سکتا ہے اور سلام وغیرہ اس سے ترک کرنا واجب ہے یا نہیں۔ زید کہتا ہے کہ جب کاشتکاری ناجائز ہے اور کاشتکار حرام خور بدکار ٹھہرا تو سلام و کلام ایسوں سے ترک کرنا واجب و لازم ہے۔ مولانا صاحب ذرا اس مسئلہ کو صراحۃً بحوالہ کتب فقہ و حدیث سے فرمائیے اور کاشتکاری کے بارے میں جو اصل صورت جائز کی ہو اور وہ متفق بہ ہو اس سے مطلع فرمائیے۔

السائل:

محمد شمس الدین عفی عنہ

## الجواب

بارہ سال کے بعد کاشتکار کا موروثی بن جانا حرام ہے اور جو زمیندار اپنی مرضی سے کاشتکار کو موروثی کرتے ہیں وہ اس کے معاوضہ میں کچھ رقم لیتے ہیں اور حق کاشتکاری شئ متقوم نہیں اس لیئے وہ معاوضہ لینا اور دینا بھی حرام ہے پس بعد موت زمیندار یا کاشتکار کے کاشتکار کی اولاد کو اس زمین میں کچھ حق نہیں وہ قبضۂ حرام کا مرتکب ہے۔ جس شخص کے پاس موروثی زمین ہو اول اس کو مسئلہ شرعی سے خبردار کر دینا چاہیئے اگر پھر بھی باز نہ آئے تو اس سے سلام و کلام قطع کر دینا چاہیئے بشرطیکہ اس سے نفع کی امید ہو اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ وہ اس برتاؤ سے اور زیادہ حرام کا ارتکاب کریگا تو ایسا نہ کیا جاوے۔ البتہ اس کے یہاں کا کھانا کسی حال میں نہ کھایا جاوے۔ کاشتکاری کی بہت سی صورتیں جائز بھی ہیں اور بعض ناجائز ہیں آپ کو جس صورت کا حکم دریافت کرنا ہو صاف لکھکر سوال کریں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۷ شوال سنہ ۱۳۴۰ھ

اضافہ لگان کرکے زمین کو موروثی پر لینا | السوال:۔ دو صورتیں حسب ذیل بہت ضروری ہیں بایں وجہ جناب کو تکلیف دیتا ہوں۔

صورت اول :- زید عمر شریک کاشت موروثی ہیں زید نے چھوڑ دیا بوجہ شریک کاشت ہونے کے عمر حسب حصہ پر قابض ہوگیا ہے زید نے مالگذاری میں کچھ اضافہ کردیا زمیندار نے اس کے حوالہ کردیا یہ بایں وجہ کہ عمر سے سوائے مقررہ لگان کے کچھ اور نہیں مل سکتا اور اگر دونوں استعفیٰ دیدیں تو زمیندار کو مرچند یا اس سے بھی زیادہ لگان مل سکتی ہے لیکن عمر استعفیٰ نہیں دیتا تو ایسی حالت میں اگر زید زیادہ کردے اور زمیندار بوجہ مجبوری مذکورہ بالا قناعت کرجائے اور زید کے حوالہ کردے میعاد مقررہ دو یا چار برس تک یا اپنی زندگی تک تو زید کیلئے جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

از جانب حاجی منیر

## الجواب

صورت مسئولہ میں اگر زید اضافہ لگان کرکے بطور موروثی ہی اس زمین کو لیتا ہے تو اضافہ لگان کے بعد بھی زید کو اس زمین کی کاشت کرنا جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں بھی زمیندار مجبور ہے البتہ اگر زید موروثیت سے باقاعدہ استعفیٰ دیدے گو عمر استعفیٰ نہ دے تو پھر زید کو اس کی کاشت جائز ہے مگر اس صورت میں شریک عمر شرکت نہ کرنا چاہئے بلکہ علیحدہ ہوکر کاشت کرے۔ واللہ اعلم

کتبہ احمد عفا اللہ عنہ

۲۸ رجمادی الثانی ۱۳۴۳ھ

حکم خرص در مزارعت السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے یہاں کنکوت صرف شافعی کی ہوتی ہے، طبیعت میں نہایت خلجان ہے اور تحقیق ہے کہ کوئی صورت جواز کی نہیں نکلتی مصالحت میں بھی صورت جواز نہیں اسامیوں کے حلف پر اگر چھوڑا جائے تو ان کے حلف کا کچھ اعتبار نہیں۔ ایک وقت میں کل کھیت کی کٹائی نہیں ہوتی بلکہ تھوڑا تھوڑا موافق ضرورت مویشی کاٹ لیتے ہیں۔ اگر تھوڑا تھوڑا ہی روزانہ آتا جاوے اور تقسیم ہو جاوے تو ایک ماہ سوا ماہ تک اس کام کی خاطر میرا قیام ناممکن ہے اور نوکروں کا اعتبار نہیں۔ کیا کیا جاوے؟

## الجواب

کنکوت یعنی خرص مزارعت میں ائمہ اربعہ میں سے جس کسی کے نزدیک

بھی جائز نہیں ہے۔ شرح بہ العینی فی شرح البخاری ج ۴ ۔ مثلث اور علت عدم جواز خرص کی لزوم ربوا ہے اسلیئے حنفیہ نے احادیث خرص ثمار کو قبل تحریم ربوا پر محمول کیا ہے عینی ج ۴، ص ۱۹۹ ۔ اور جب یہ علت ہے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ خرص مسلمانوں کے ساتھ جائز نہ ہو لیکن کفار، اھل حرب کے ساتھ برضاء طرفین جائز ہو۔ لجواز الربوا بین المسلم والحربی بدار الحرب عندھم و قال ابن العربی لم یثبت عنہ صلی اللہ علیہ وسلم خرص النخل الا علی الیھود لانھم کانوا شرکاء و کانوا غیر امناء واما المسلمون فلم یخرص علیھم۔ اھ (ج ۴، ص ۲۰۰)۔

پس مزارعین کفار کیساتھ خرص جائز ہے جبکہ وہ اس پر راضی ہوں کہ خرص سے معاملہ کر لیا جاوے۔

لم اُرہ صریحاً لکنہ مقتضی القواعد۔ واللہ اعلم۔

کتبہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون، خانقاہ امدادیہ
۱۰ ر صفر ۱۳۴۳ھ

| دخیلکار اور موروثی زمین کی پیداوار کا حکم |
|---|

السوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ آج کل جو تمام ہندوستان میں سرکار نے قانون قبضہ اراضی نافذ کر کے کاشتکاروں کو قبضہ دلایا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص دخیلکار اور موروثی کاشتکار ہو گیا ہے پیشتر دخیلکاروں کی تعداد کم تھی مگر اب ہر کاشتکار دخیلکار ہو گیا ہے زمیندار جس طریقہ سے پیشتر کے دخیلکاروں سے ناخوش اور ناراض تھے اسی طریقہ سے ان کاشتکاروں سے بھی ناخوش اور ناراض ہیں چونکہ زمینداروں کا منشاء تو یہ ہے کہ ہر سال نئے نئے کاشتکاروں کو زمین دیدیا کرے اور اس لگان سے کچھ زر لگان خفیہ کر لیا جایا کرے۔ بغیر پٹواری کے کاغذات میں بجائے للعرفی بیگہ کے درج کرا کر مالگذاری ہین کی رکھی جائے سرکار نے اس وجہ سے کل کو دخیلکار بنایا تاکہ زمیندار یہ غبن نہ کریں اور مالگذاری بمقدار وصولیت زر لگان از کاشتکار لے جایا کرے

اس کے بعد سرکار نے یہ حق زمیندار کو دیا ہے کہ جو روپیہ تم اپنی جائیداد سے وصول کرو اس میں سے ملث فی صدد کھکر باقی تحصیل میں داخل کر دو۔ اور احناف کا مذہب ہے کہ استیلار کافر علی مال مسلم سبب ملک کا ہے سرکار کا جس وقت آنا ہندوستان میں معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے بھی پتہ چلتا ہے کہ ملک پر قبضہ پورے طریقہ سے ان کو حاصل ہوا۔ لہذا یہ استیلا رکل ملک پر ظاہر ہے اس کے بعد قدرے قدرے قطعہ اراضی لوگوں کو دے گئے جن کو زمینداروں کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے مشہور تو ہے کہ زمیندار مالک اراضی نہیں لیکن بعض قانون والوں نے نیز بعض زمینداروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زمیندار مالک اراضی نہیں بلکہ ایک مقدار معینہ کے معاہدہ سے ٹھیکیدار ہیں۔ معاہدہ یہ ہے کہ فیصد آمدنی اراضی سے مثلاً مبلغ ملث روپیہ ادا کریگا۔ چنانچہ اگر ایک سال میں اس معاہدہ کے خلاف کرے تو اس کو اراضی سے سرکار علیحدہ کردے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ ٹھیکیدار ہے اور اگر اس کو مالک ہی کہا وے تو اس قانون کے نفاذ کی وجہ کیا سرکار کا استیلا ر اراضی پر نہیں ہے جو موجب ملک ہے اور خود سرکار یہ مقولہ ہے کہ زمیندار کوئی چیز نہیں کاشتکار یا ہم ثالث کون ہے۔ تو ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ارشاد عالیہ سے سرفراز فرمایا جاوے کہ ان کاشتکاروں کا قبضہ اراضی پر جو باجازت سرکار ہے جائز ہے یا ناجائز اور ان کاشتکاروں کی آمدنی حلال ہے یا حرام۔ درصورت حرمت ان لوگوں کا مساجد و مدارس وغیرہ میں چندہ دینا اور اعانت کرنا درست ہے یا نہیں۔ و نیز جو لوگ محتاط ہیں ان کو ان کاشتکاروں سے غلہ خریدنا جو ان اراضی میں پیدا ہوتا ہے درست ہے یا نہیں۔ حلت و حرمت ذخیلکار امسال اور گذشتہ زمانے کے جو دخیلکار ہیں مساوی ہیں یا کچھ فرق ہے۔ ہر دو غاصب ہیں یا نہیں اگر احدہما غاصب ہے تو مابہ الامتیاز کیا ہے جبکہ رضامندی زمیندار ہر دو کاشتکار کے متعلق نہیں ہے۔ بینوا توجروا۔

## الجواب

حکومت کے قبضہ سلطنت کو استیلا ر علی الاراضی سمجھنا ہمارے فہم میں نہیں آیا کیونکہ استیلا ر قبضہ مالکانہ کا نام ہے اور گورنمنٹ نے جو ہندوستان

پر تسلط کیا ہے وہ مالکانہ ہے اور قبضہ مالکانہ سے زمین ملک کے بادشاہ کی ملک نہیں ہوتی۔ وہ صرف منتظم و مدبر ہے گذشتہ حالات کی ہم کو خبر نہیں اور نہ صحیح طور پر خبر ہو سکتی ہے لیکن حالاتِ موجودہ اس پر شاہد ہیں کہ گورنمنٹ نے اراضی ہند پر قبضہ مالکانہ نہیں کیا۔ مثلاً۔ گورنمنٹ اپنی ضرورت کیلئے بعض دفعہ اگر کسی کی زمین لیتی ہے تو اس کا معاوضہ دیتی ہے۔

عدالتوں میں شب و روز جائیداد کے بیعنامے اور ہبہ نامے اور وقفنامے اور وراثت کے دعوے دائر ہوتے ہیں اور گورنمنٹ اِن سب کو معتبر سمجھتی اور اس کے موافق عمل کرتی ہے۔ اگر زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ محض ٹھیکہ دار ہے تو اس کی بیع و ہبہ و وراثت و وقف سب باطل ہونے چاہئیں اور اس پر جس فسادِ عظیم کا مرتکب ہوگا وہ مخفی نہیں ہے۔ اس لئے اِن حالات کے ہوتے ہوئے یہ ہرگز تسلیم نہیں ہو سکتا کہ اراضی ہند گورنمنٹ کی ملک ہیں۔ اور زمیندار محض ٹھیکہ دار ہے اور اگر ایسا ہوتا تو گورنمنٹ کو زمینداروں کا یک قلم ناک کر دینا کیا مشکل تھا وہ اپنے استقلال کو دلیل بنا کر یہ سہولت کہہ سکتی تھی کہ زمیندار صرف ٹھیکہ دار ہے اب ہم اس کو ٹھیکہ دینا نہیں چاہتے۔ پھر ٹھیکہ اجارہ کی قبیل سے ہے جس کیلئے شرائط اجارہ کا تحقق ضروری ہے۔ اور یہاں ان کا بالکل وجود نہیں۔ نہ اس ٹھیکہ کی مدت مقرر ہے نہ زمیندار کی موت سے وہ اجارہ باطل ہوتا ہے بلکہ اس میں میراث جاری ہوتی ہے پھر کیونکر اس کو اجارہ مان لیا جاوے بلکہ یقیناً زمیندار اپنی زمین کا مالک ہے جو کاشتکار کو اجارہ پر زمین دیتا ہے۔ اور کاشتکار مستاجر ہے لیکن اس قانونِ جدید کی وجہ سے اب جو کاشتکار کسی زمیندار کی زمین اجارہ پر لیتا ہے تو وہ گویا اجارہ میں یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ زندگی بھر میں اس کی زراعت کرونگا جو ایک شرطِ فاسد ہے۔ نیز اس میں مدتِ اجارہ بھی مجہول ہے پس اس کا حکم اجارۂ فاسدہ کا حکم ہوگا جس کا حاصل یہ ہے کہ موجر کیلئے اجر حلال ہے اور مستاجر جو کچھ زراعت کرتا ہے پیداوار سب اس کی ملک ہے لیکن مستاجر بوجہ اس شرطِ فاسد کے گنہگار ہے اور زمیندار تو قانون کی وجہ سے اس شرط کے ماننے پر مجبور ہے لیکن مستاجر مجبور نہیں ہے اس لئے اس شرط کی وجہ سے وہی گناہگار ہوگا رہا یہ کہ اس گناہ کا اثر طرفی کاشتکار کے

زمین تک ہے یا زراعت و پیداوار میں بھی اس کا خبث سرایت کرے گا، تو اس میں تفصیل ہے، جو روایات ذیل سے واضح ہوگی۔

قال فی الھندیۃ: ولو کان اشتریٰ استأجر الأرض الی ان یدرک ولم یذکر مدۃ معلومۃ فالاجارۃ فاسدۃ لجہالۃ المدۃ فان ترکہ فی الارض حتی أدرک لزمہ أجر المثل بخلاف ما حتی لا یجب ھناک الأجر اصلاً۔ قال ویطیب لہ من الزرع بقدر الثمن وما غرم من الأجر ویتصدق بالفضل ھذا الذی ذکرنا قیاس قول ابی حنیفۃ ومحمد واما علیٰ قول ابی یوسف یطیب لہ الزیادۃ فی الوجوہ کلہا کذا فی الذخیرۃ اھ ج ۵: ص ۲۴۲۔

قلت ووجہ قول ابی یوسف کونہا من الاجارۃ الناس کما یظہر من کلامہ حق واللہ أعلم۔

قال فی الدر: فی الاجارۃ الفاسدۃ وحکم الاول وھو الفاسد وجوب اجر المثل بالاستعمال لو المسمی معلوما الخ کما اھ

وفیہ ایضاً: الفاسد من العقود ما کان مشروعاً باصلہ دون وصفہ والباطل ما لیس مشروعاً اصلاً لا باصلہ ولا بوصفہ۔

وقال الشامی تحت قولہ: وجوب أجر المثل والاجر طیب وان کان السبب حراما کما فی المنیۃ۔ ونقل فی المنح أن شمس الأئمۃ الحلوانی قال تطیب الأجرۃ فی الاجارۃ الفاسدۃ اذا کان اجر المثل اھ ج ۵، ص ۴۲

وفی الدر: ولا تملک المنافع بالاجارۃ الفاسدۃ بالقبض بخلاف بیع الفاسد فان البیع یملک فیہ بالقبض بخلاف فاسد الاجارۃ حتی لو قبضہا المستاجر لیس لہ أن یوجرہا ولو اجرہا وجب المثل ولا یکون غاصباً اھ

وفیہ ایضاً: وفی الاشباہ: المستاجر فاسداً لو آجر صحیحاً جاز ولو بعد قبضہ فی الأصح منیۃ اھ ج ۵: ص ۴۳

قلت وھذا حکم المنافع واما الاعیان المتولدۃ من المأخوذ

اجارة فاسدة فحكمه ما فى العمادية : وفى الخلاصة رجل دفع الى خياط ثوبا ليخيطه له قباء أو جبة ولم يشا الاجرة فلما فرغ منه اعطاه صاحب الثوب زيادة على اجر مثله فى قياس قول ابى حنيفة يطيب له وقال فقيه ابو الليث الزيادة جائزة فى قولهم جميعا اھ

ج ٣ ص ١٩٤

قلت واذا طاب للخياط الزيادة على اجر مثله فالظاهر جواز لبس القباء المالك ايضا ولعل وجه ذلك عندهما كونهن اجارات الناس والله اعلم.

ونصها لو زرع ارض الغير بغير اذنه يعتبر العرف فان اقتسموا الغلة انصافا او ارباعا اعتبر والا فالخارج للزارع وعليه اجر المثل للارض اھ ثم نقل عن جامع الفصولين ومن زرع ارض غيره بلا امره يجب الثلث او الربع على ما هو عرف القرية ثم رمز الفتاوى القاضى ظهير الدين زرع الا كارستين بعد مضى مدة الزراعة جواب الكتاب انه لا يكون مزارعة فالزرع كله للاكار وعليه تصدق بما فضل من بذره واجر المثل عمله وهكذا كانوا يفتون بخارى وقيل تكون مزارعة وقيل لو كانت الارض معدة للزراعة بان كان ربها ممن لا يزرع بنفسه ويدفعه مزارعة فلرب الارض حصة على ما هو عرف تلك القرية لكن انما يحمل على على هذا لو لم يعلم وقت الزراعة انه زرعها على وجه الغصب صريحا او دلالة او على تاويل فان من آجر ارض غيره بلا اذنه ولم يجز ربها وقد زرعها المستاجر فالزرع كله للمستاجر لا على الزراعة بل على وجه الاجارة لانه زرعها بتاويل (الاجارة) والحاصل ان فى المسئلة قولين او ثلاثة الاول انه اذا زرع ارض غيره بلا امره لا يكون غصبا بل يحمل على الزراعة وحصة رب الارض ما جرى عليه عرف القرية من ثلث او ربع والقول الثانى جواب الكتاب انه يكون غاصبا

والزرع كله له لكن يتصدق بما فضل عن بذره واجر مثل عمله وبه من
حمل هذا على ما اذا لم يكن عرف في اخذها على وجه المزارعة فلا
يخالف ما قبله والقول الثالث انه يكون مزارعة اذا كان صاحبها
اعدها للاستغلال بان كان يدفعها مزارعة لغيره ولا يزرعها بنفسه
لانه يكون قرينة على ان الزارع انما اخذها على وجه المزارعة على
عرف تلك القرية اما لو كان صاحبها يزرعها بنفسه يكون الزارع
غاصبا فالزرع كله له اه فتاوى حامدية ج ۲، ص۱۵۷، ۱۵۸ ۔

قلت ويظهر من مجموع الكلام ان الزارع انما يجب عليه التصدق
بما فضل عن بذره واجر مثل عمله اذا كان غاصبا ولا يكون غاصبا
اذا لم تكن الارض معدة للاستغلال او كان صاحبها يزرعها بنفسه و
هذا كله فيما اذا زرع ارض الغير بدون اذنه واما في صورة المسئولة
فلا يمكن القول بكون الزارع غاصبا لانه يزرعها على تاويل الاجارة
ويزرعها باذن المالك لا بلا اذنه فيكون مستاجرا لا غاصبا فيكون الزرع
كله له ولا يجب عليه التصدق بما فضل عن بذره واجر مثل عمله عند
ابي يوسف خلافا لهما وللمالك اجر مثل ارضه بالغا ما بلغ ولا ينقص
من المسمى لانهم قالوا كيف يجب اجر المثل بالغا ما بلغ والاجرة ليست مجهولة
بل مسماة وحينئذ لا يزاد على المسمى كما في الدر قلت علل فيه عدم
الزيادة على المسمى برضاها به ج ۵، ص ۴۳
وفي الصورة المسئولة لا يكون المالك راضيا بالاجر الذي
يؤديه الا كار المدعى لنفسه حق القرار كما هو مشاهد والله اعلم

خلاصۂ روایات یہ ہوا کہ جو شخص غاصب ہو کر دوسرے کی زمین میں زراعت
کرے اس کی زراعت کی پیداوار میں سے زائد سب خبیث ہے جس کا تصدق واجب
اور جو شخص اجارہ فاسد کیسا تھ دوسرے کی زمین میں زراعت کرتا ہے اسکی
پیداوار بھی طرفین (امام ابوحنیفہ و محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک مطلقاً خبیث ہے ۔
الا بقدر بذرہ و اجر مثل عملہ ۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک

بعض صورتوں میں تو محض اجرت المثل ہی جائز ہے ۔

پس صورت مسئولہ میں جبکہ مالک ارض جانتا ہے کہ مستاجر تاحیات تک زمین پر قابض رہے گا اور اس بات کو جانتے ہوئے زمین کو اجارہ پر دے رہا ہے تو مستاجر اس صورت میں غاصب نہیں البتہ یہ اجارہ فاسدہ جس میں مدت پر ایک شرط فاسد کر رہا ہے اور مدت اجارہ بھی مجہول ہے اس لئے اس کا حکم یہ ہے کہ خود مستاجر کے حق میں تو اس کی پیداوار کا وہ حصہ جو قدر تخم اور اجرت مثل عمل سے زائد ہو حلال نہیں ہے ۔ علی قول الطرفین ۔ اور دوسروں کے حق میں قول ابویوسف پر اس کی کل پیداوار کو دفع حرج کیلئے جائز کہا جائے گا کیونکہ اب اس میں ابتلاء عام ہو گیا ہے جس سے دوسروں کو احتراز دشوار ہے ان کیلئے ایسے مستاجر کی دعوت وہدیہ وچندہ کی رقم لینے کو جائز کہا جائے گا ۔ اور خود اس مستاجر کے حق میں چونکہ حرج کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ اس اجارہ فاسد کا اپنے فعل سے مرتکب ہوا ہے تو اس کے حق میں پیداوار زائد علی القدر المذکور کو حرام کہا جائے گا ۔ اور دوسروں کیلئے بھی یہ توسع صرف اس صورت میں ہے جبکہ مالک ارض ابتداء ہی سے کسی مستاجر کو حیاتی کاشتکار مان کر زمین اجارہ پر دے اور اگر مالک ارض نے ابتداء میں حیاتی کاشتکار مان کر زمین نہ دی تھی بلکہ ایک مدت معینہ کیلئے اجارہ پر دی تھی پھر مستاجر اس قانون جدید کی وجہ سے حیاتی کاشتکار و دخیلکار بن گیا تو یہ شخص مدت معینہ کے تمام ہونے کے بعد غاصب شمار ہوگا ۔ اور اس کی پیداوار زائد علی القدر المذکور سب کیلئے حرام ہے ۔ اس کے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی مگر یہ کہ وہ مدت معینہ اجارہ اولیٰ کے ختم ہونے پر اجارہ فسخ کر دے اور دوبارہ قانون جدید پر اجارہ کرے یا مالک ارض کو قانونا اس کاشتکار کو الگ کرنے کا مدت معینہ تک حق حاصل تھا اور مالک ارض نے عمدا اس کو الگ نہیں کیا تو اب یہ کاشتکار بھی صورت اولیٰ کے کاشتکاروں جیسا ہو گیا وحکمہ حکمہم ۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اس سال کے دخیلکاروں اور گذشتہ زمانہ کے دخیلکاروں میں فرق ہے ۔ کیونکہ گذشتہ زمانہ کے دخیلکاروں سے مالکان ارض مدت معینہ تک کیلئے اجارہ کرتے تھے پھر وہ بدون رضا مالک کے بارہ سال کے بعد

محض قانون کی وجہ سے قابض و دخیلکار بن جاتے تھے پس وہ بحکم غاصب تھے اور اس وقت جو کاشتکار کسی سے زمین لیتا ہے تو مالک ارض اس کو دائمی کاشتکار مان کر زمین دیتا ہے تو وہ اس کے قبضۂ حیاتی میں ابتدا ہی سے ہے۔ رہا یہ کہ وہ دل سے کہاں راضی ہے محض قانون کی وجہ سے مجبور ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ قانوناً زمین کاشت کیلئے دینے پر مجبور نہیں اگر وہ خود کاشت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اور جب وہ خود کاشت نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو زمین دے رہا ہے اور جانتا ہے کہ یہ کاشتکار بنتے ہی دخیلکار ہو جائے گا تو اس کا اس حالت میں زمین دینا کاشتکار کی دخیلکاری پر رضا ہے۔ نیز قانون نے مالک ارض کی زبان تو بند نہیں کی وہ اس قانون کے بعد بھی زبان سے اتنا کہہ سکتا ہے کہ میں یہ زمین مدت معینہ کیلئے (مثلاً سال دو سال کیلئے) اجارہ پر دیتا ہوں اور اس سے زائد کے لئے میں راضی نہیں ہوں اگر وہ زبان سے ایسا کہہ دے تو اس کاشتکار کا اب بھی مدت معینہ کے بعد وہی حکم ہوگا جو گذشتہ دخیلکاروں کا حکم تھا لیکن جب وہ زبان سے کوئی مدت معین نہیں کرتا اور قانون حال سے واقف ہے تو دلالۃ وہ مستاجر کی شرط فاسد پر راضی ہے پس اس صورت میں مستاجر کو غاصب مثل گذشتہ دخیلکاروں کے نہ کہا جائے گا ہاں اس قانون سے نفع لینے میں وہ گناہ گار ضرور ہے اور اس کے حق میں اس کی پیداوار حرام ہی ہے باستثناء بامر لیکن غاصب نہ ہونے کا اثر دوسروں کے حق میں بصورت توسع ظاہر ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ امدادیہ

۱۰ر شعبان سنہ ۴۲ھ

موروثی کاشتکاری کی ایک خاص صورت کا حکم

السوال:- زید ایک زمین پر انگریزی قانون کی رُو سے قابض و دخیل ہے (جس کو عرفاً قدیم قانونِ انگریزی کے اعتبار سے موروثی کاشتکار و جدید قانون کے لحاظ سے حین حیاتی دخیلکار کہا جاتا ہے) اس نے ایسی زمین خالد کے یہاں رھن رکھی خالد نے بکر سے جو اس زمین کا زمیندار و مالک ہے زبانی خود جوتنے بونے کا معاملہ کر لیا اب راھن جب مرتھن کو زر رہن

ادا کریگا اس وقت وہ زمین راہن کو ملیگی ورنہ اس مدت تک مرتہن اس زمین سے انتفاع حاصل کرتا رہیگا پس صورت مسئولہ میں شرعاً کوئی حرج بھی ہے یا نہیں ہے

## الجواب

جب مرتہن نے اصل مالک زمین سے اس زمین کی کاشت کی اجازت لے لی ہے اور اس کو اسکی رضا کے موافق لگان ادا کرتا ہے تو مرتہن کو اس زمین کی کاشت جائز ہے اور پیداوار حلال ہے اور اس کو انتفاع بالمرہون میں داخل نہ کہا جاوے گا کیونکہ دخیلکار کا اس کو رہن کرنا صحیح نہ تھا لکونہ قابضاً علی ارض المالک قبضاً حراماً اھ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۸ محرم الحرام سنہ ۴۷ھ

دلیل حرمت موروثی ودخیلکاری | السوال: ۔ علیٰ ن وماواٰ حضرت حکیم الامت دامت برکاتہم بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے معروض ہے کہ مکمل ومدلل بہشتی گوہر ص۱۳۵ میں مسئلہ ۱۴ اجارہ یا مزارعت میں بارہ سال یا کم و بیش مدت تک زمین سے منتفع ہوکر موروثیت کا دعویٰ کرنا جیسا اس وقت رواج ہے محض باطل اور حرام اور ظلم و غصب ہے بدون طیب خاطر مالک کے ہرگز اس سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے اگر ایسا کیا تو اس کی پیداوار بھی خبیث ہے اور کھانا اس کا حرام ہے ص۵۸ ج ۳ شامی اھ ۔ ہم لوگ جب سے یہ مسئلہ حضور والا کے تصانیف مثلاً صفائی معاملات و امداد الفتاویٰ و بہشتی گوہر میں پاتے ہیں اس وقت سے بحمد اللہ تعالیٰ خود اس میں عمل کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں کیونکہ ہم تو حضور کو اپنا رہنما جانتے ہوئے ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ قواعد شرعیہ سے بھی یہ مسئلہ بخوبی سمجھ میں آتا ہے اور اب تو نور علی نور مدلل بہشتی گوہر میں حوالہ بھی مندرج ہوگیا ہے ان وجوہ سے قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مسئلہ پر عمل کرنے میں ہم لوگوں کو ذرا بھی خلجان نہیں لیکن ہمارے ادھر کے لوگ حتیٰ کہ اکثر مدعیان علم بھی اس مسئلہ سے واقف نہیں اور اس مسئلہ کے خلاف پر عامل ہیں اور گناہ تک نہیں جانتے اور فقط بہشتی گوہر کے دیکھنے پر قانع ہوتے نہیں لہذا اس مسئلہ کے بارے میں زمینداروں کو عموماً اور ہم لوگوں

کو خصوصاً یہ خیال ہوا ہے کہ مزید حوالجات کیساتھ بنگلہ زبان میں بطور فتاویٰ یہ مسئلہ چھاپ کر شائع کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ اجر عظیم ہوگا۔ اس غرض سے یہ مسئلہ شامی کی عبارت سے خود بھی سمجھنے کی کوشش کی اب حضور کا ہدایت نامہ پاکر شامی کی کتاب الاجارۃ کے جہاں پر لفظ کدک اور اس کے بعد عصر المسکہ لکھا ہے نکال کر خوب غور سے مطالعہ کیا لیکن کون سی عبارت سے یہ مسئلہ نکلتا ہے ہمارے فہم ناقص میں نہیں آیا لہذا مجبوراً نہایت عاجزی کے ساتھ حضور والا کو دوبارہ تکلیف دیتے ہوئے عرض کرتا ہے از روئے ہدایت پروری بعینہا وہ عبارت مسئلہ تحریر فرما کر ممنون و مشکور فرمادیں ان اجرک الا علی اللہ۔

اعلاوہ دوسری گزارش یہ ہے کہ ہماری شامی کتاب کی جلد خامس میں کتاب الاجارہ ہے اور بہشتی گوہر میں مسئلہ مذکور کیلئے جلد رابع سے حوالہ دیا گیا ہے۔ اگر لکھنے میں کوئی خطا و قصور واقع ہوگئی ہو تو بلند معاف فرمادیں اور ہم لوگوں کیلئے علم نافع اور عمل صالح کی دعا فرمادیں۔ والسلام مع الکرام

نیاز مند فدوی سید واحد علی عفا اللہ عنہ
ساکن اسلام آباد۔ ڈاکخانہ کبوائی ضلع بنگال

## الجواب

جس شامی سے بہشتی گوہر میں حوالجات لکھے گئے ہیں وہ مطبوعہ قدیم ۱۲۸۶ھ ہے اس لیے جدید مطبوعہ شامی کے صفحات اس سے موافق نہیں ہوتے یہ مسئلہ شامی میں کتاب البیوع جلد ۴ کے شروع میں بایں الفاظ موجود ہے

قال فی البدائع: الحقوق المفردة لا تحتمل التمليك ولا يجوز الصلح عنها اقول وكذا لا تضمن بالاتلاف قال السرخسي واتلاف مجرد الحق لا يوجب الضمان لان الاعتياض عن مجرد الحق باطل اھ ۴/۴

اس کے بعد شامی نے خلو اور مشد مسکہ اور کردار و کدک وغیرہ سے بحث کی ہے جس میں وجہ تفسیر معلوم نہ ہونے سے دیکھنے والوں کو دھوکہ جواز موروثی کا ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ موروثی اور مشد مسکہ و کردار وغیرہ کو متحد سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے ان سب کی تفسیر علامہ شامی نے فتاویٰ حامدیہ میں تفصیل سے کی ہے۔ جس سے موروثی

کا نا جائز ہونا بخوبی واضح ہے: قال فی تفسیر الفلاح والمسکۃ لاشک انہما لفظان متغایران معناً وحکماً. اما المسکۃ فہی عبارۃ عن استحقاق الحراثۃ فی ارض الغیر من المسکۃ وہی لغۃ ما یتمسک بہ فکان المتسلم للارض المأذون لہ من صاحبہا فی الحرث صار لہ مسکۃ یتمسک بہا فی الحرث فیہا وحکمہا انہا لا تقوم فلا تملک ولا تباع ولا تورث. واما الفلاحۃ فمعناہا عمل الحراثۃ نفسہا وحکمہا انہا تقوم فتملک وتباع وتورث قال ابن عابدین وفی القاموس: الفلاحۃ الحراثۃ فان کان المراد بہا الکراب کما ہو المتبادر فلا یصح قولہ انہا متقومۃ لان الکراب کما فی القاموس اثارۃ الارض لزرعہا ای شقہا وتہیئتہا لہ فہی وصف غیر متقوم فی نفسہ کما مر غیر مرۃ فلا یباع ولا یورث. وان کان المراد بہا الکردار یصح ذلک وان کان بعید أو الکردار کما فی المغرب والقاموس بکسر الکاف مثل البناء والاشجار والکبس اذا کبسہ من تراب نقلہ من مکان کان یملکہ ومنہ قول الفقہاء یجوز بیع الکردار ولا شفعۃ فیہ لانہ نقلی اھ واما فی القنیۃ ونقلہ المؤلف عن الحاوی بقولہ یثبت حق قرار فی ثلاثین سنۃ فی الارض السلطانیۃ والملک وفی الوقف فی ثلاث سنین ولو باع حق قرارہ فیہا جاز وفی الہبۃ اختلاف ولو ترکہا بالاختیار تسقط قدمیتہ فالمراد بہ ایضا ما ذکرنا من الاعیان المتقومۃ لا مجرد الامر المعنوی لما علمت من عدم صحۃ بیعہ اھ ص ۱۹۶ ج ۴

اس میں صاف تصریح ہے کہ محض زمین کے بونے جوتنے سے کسی مدت کے بعد حق قرار بطور ملک کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ امر معنوی مجرد قابل تملیک نہیں اور جو حق قابل ملک ہے وہ محض زراعت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ بناء غراس باذن مالک ارض سے حق قرار حاصل ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۴ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

حکم زمین موروثی | السوال :۔ بعض لوگ حرام آمدنیوں میں زمین موروثی زمین زمینوں کی آمدنی میں جھگڑے ہوتے ہیں اس کے سوا ان کی روزی کی بظاہر کوئی سبیل نہیں زمینداروں کے سوا اور کوئی صورت نہیں اس صورت میں اگر ان کو چھوڑنے پر مجبور کیا جائے تو سائل کو خود ایسی صورت میں ان لوگوں کو تنگی عظیم میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں کیا چاہئیے۔

## الجواب

اس صورت میں ان لوگوں کو چند امور کی فہمائش کی جاوے۔

الف : پہلے آپ کو گناہ گار سمجھیں اور روزانہ اس گناہ سے استغفار کریں کہ اور اللہ سے توبہ کریں کہ اس بلا سے نجات کی توفیق دے۔

ب : مالکان زمین کو اگر باقاعدہ قبضہ دینے کی ہمت نہیں تو کم از کم ان کو راضی رکھنے کی تو کوشش کرتے رہیں مثلاً لگان مقررہ سے کچھ زائد لگان ان کو دیدیا جائے اور خوشامدیں کر کے ان کو ایسا خوش کریں کہ وہ آپ کی کاشتکاری خوشی سے منظور کر لیں۔

ج : اس تدبیر میں برابر لگے رہیں کہ جب کوئی صورت ہوگی فوراً موروثی کو چھوڑ دیں گے۔

د : اگر اس حالت میں کسی وقت موت کے اثرات ظاہر ہوں تو مرنے سے پہلے ضرور موروثی سے استعفاء دیدیں۔ اولاد کیلئے موروثی چھوڑ کر نہ جائیں۔ کیونکہ مرنے کے بعد اولاد کا م نہ آئے گی واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الثانی ۔۔۔۔ھ

مزارعت فاسدہ کی ایک صورت کا حکم | السوال :۔ ذیل کے مسئلہ کی ضرورت درپیش ہے۔ دیگر علماء کرام کے فتوی سے تسکین نہیں ہوئی اس لئے مستدعی ہوتے تاکہ بعد حصول فتوی اس پر عمل کیا جائے۔ چند سال سے ہمارے ملک میں خشک سالی کی وجہ سے سیلاب کا پانی کم آتا ہے اس لئے زراعت کے واسطے زمیندار لوگ زمین پر مشین لگواتے ہیں۔ بعض مشینیں نالوں پر اور بعض فقط زمین پر کوئی زمین

سے پانی نکالتی ہیں زمیندار اور مالک مشین آپس میں اسطرح معاملہ کرتے ہیں کہ مشین مالک مشین کی خریدی ہوگی اور زمین تک مشین کو پہنچانے اور لگانے کا جو خرچ ہوگا وہ مالک مشین کا ہوگا۔ جب مشین چالو ہوگی تو ڈرائیور اور مزدوروں کی مزدوری اور تیل لکڑی وغیرہ کا خرچ زمیندار اور مالک مشین پر مشترک ہوگا۔ اور محصول سرکاری بھی دونوں پر شرک ہوگا۔ جب پیداوار ہوگی تو اول جو حصہ مزارعت سے مقرر شدہ ہوگا وہ مزارع حضرات کو دیا جاوے گا اور خرچ مذکور جو مشترک طے شدہ ہے وہ بھی نکالا جاوے گا اس کے بعد ما بقی پیداوار مثلاً نصف نصف حصہ ہر ایک یعنی زمیندار اور مالک مشین لے لے گا اس معاملہ کی مدت بھی مقرر کرتے ہیں مثلاً دس سال وغیرہ۔ اگر معاملہ کو وہ لوگ شراکت کہتے ہیں اور قانوناً بھی ایسی دستاویز شراکت نامہ کا رجسٹری کراتے ہیں۔

چند سال سے ہماری زمین بھی خشک پڑی ہے میرا ارادہ بھی مشین لگوانے کا ہوا ہے میرے ناقص فہم میں تو یہ صورت فاسد معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ معاملہ شرکت ہے یا مزارعت اگر مزارعت کہا جائے اور مشین کو آلات شمار کیا جائے چونکہ آلات کا خرچ مزارعت میں مشترک یا خاص کرنا بھی حسب تحریر رسالہ مولوی نعیم محمد صاحب لکھنوی کے جائز معلوم ہوتا ہے۔ مگر چونکہ مزارع تو اور ہیں اور مالک مشین تو فقط مشین کھلوا کر فقط پانی دینے کے عوض حصہ لیتا ہے اس لئے مزارعت فاسد معلوم ہوتی ہے۔ اور شرکت تو کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوتی۔

حضور اس کو کیا فرماتے ہیں اور مزارعت میں آلات کا خرچ مزارع اور زمیندار پر برضا مشترک کریں تو جائز ہے یا نہ۔ اور مالک مشین کو بھی اگر مزارعین کے ساتھ مزارع کہا جائے کہ مشین سے پانی دینا اس کے ذمہ ہے۔ دیگر کام ہل جوتنا وغیرہ دیگر مزارعوں کے سپرد ہو گو یا زمیندار سے ان سب مزارعوں نے مزارعت پر زمین لی ہے یہ کام آپس میں تقسیم کر رکھا ہو۔ اس کے جواز کی کوئی صورت ہو سکتی ہے یا نہیں۔

دوسری یہ صورت بھی ذہن میں آتی ہے کہ اگر مالک مشین سے مشین مقررہ تعداد ——— اور مقررہ مدت تک کرایہ پر لی جاوے جس کے چلانے لگانے وغیرہ

کا خرچ مالک مشین پر ہو اس بات کی مالک مشین سے دستاویز لکھا لی جاوے اور عقد کر لیا جاوے اس کے بعد اس کرایہ والے روپوں میں جو کہ زمیندار کو واجب الادا ہوں گے اس کے عوض زمین کا حصہ مقرر کر کے مقررہ مدت تک مالک مشین کو زمیندار ٹھیکہ پر دے دے اور ایسا عقد ٹھیکہ اور دستاویز جدا کر کے زمیندار اس کو پھر دے تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں یہ حضور کی خدمت میں عرض ہے کہ جو صورت جواز کی ہو اور سہل ہو یا اور کوئی تاویل یا حیلہ شرعی ہو تو تحریر فرما دیں کہ اس کے موافق سرکاری قانون پر ہی دستاویز لکھ دیا جاوے کہ فریقین کو حجت ہو کہ یہ بڑا کام ہے۔

## الجواب

یہ معاملہ شرکت ہے نہ مزارعت ہے بلکہ مزارعت فاسدہ ہے۔

قال فی الدر: ومتی دخل ثالث فاکثر بحصته فسدت. قال الشامی عن الخانیة لو اشترك ثلاثة او اربعة ومن البعض البقر وحده او الارض وحده فسدت وكذا لو من احدهم البذر فقط او البقر فقط وعد فی جامع الفصولین من الفاسدة ما لو كان البذر لواحد والارض لثان والبقر لثالث والعمل لرابع لان الاستیجار البقر ببعض الخارج لم یرد به اثر فاذا فسدت فی حصة البقر فسدت فی الباقی وعندهما فساد البعض لا یشیع فی الکل اھ ج ۵ ص ۱۷۱ ـ

قلت فشرکة غیر صاحب البقر مما لا شیء له سوی آلة العمل فاسدة بالاولی۔

پس صورت جواز یہ ہے کہ مشین والے سے مشین کو کرایہ پر لیا جاوے اور کرایہ شرائط اجارہ کے ساتھ منعقد کیا جاوے۔ اجرت روپوں سے منعقد کی جاوے یا غلہ کی مقدار معین یعنی مقرر کی جاوے اور تصریح کر دی جاوے کہ اسی زمین کی پیداوار سے دینا لازم نہیں۔ لئلا یکون شبیهة قفیز الطحان۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵؍ ذی الحجہ ۴۲ھ

**زمیندار پر سرکاری پابندی ہے کہ کاشتکار کو اتنی معافی ضرور دیں اور اس کی ایک خاص صورت کا بیان۔**

**السوال:** کیا فرماتے ہیں علماء اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک تعلقہ ارضی سو بیگہ مبلغ آٹھ ہزار روپے میں خرید کیا جس کی مالگذاری سرکاری پچاس روپے و ابواب پانچ روپے جملہ مبلغ ۵۵ داخل خزانہ کرتے ہوئے اور اس کا لگان جو کاشتکار سے وصول کیا جاتا ہے مبلغ ساڑھے تین سو پچاس روپے ہے سرکار نے بقدر ۱/۴ مالگذاری میں سے یعنی مبلغ [illegible] زمیندار کو معاف کیئے اور ابواب بدستور بذمہ زمیندار مبلغ پانچ روپے قائم رکھا اور حکم دیا کہ زمیندار بھی کاشتکار پر مع ابواب بقدر ۱/۴ معاف کرے جس کی تعداد مبلغ [illegible] کم کرنا چاہیے یا [illegible] بارہ روپیہ جس قدر کہ زمیندار پر معاف ہوا یا کل لگان پر عشر فیصدی ابواب یعنی [illegible] کم کر کے ما [illegible] پر معافی دینی چاہئے۔

## الجواب

شرعاً زمیندار کے ذمہ کسی مقدار کا معاف کرنا بھی کاشتکار سے واجب نہیں بلکہ اس کو اختیار ہے کہ کچھ معاف کرے یا نہ کرے البتہ اگر حکومت کی معافی مشروط ہو تو اس کے عفو کے ساتھ یا تو گورنمنٹ کی معافی کو واپس کر دے یا جتنی معافی بدرجہ اقل تعمیل حکم کیلئے ضروری ہو اسی قدر معاف کر دے۔ واللہ اعلم۔

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۲۴ رمضان ۱۳۴۹ھ

# کتاب الصید والذبائح والاضحیۃ والعقیقۃ والختان

**خصی دنبے کی قربانی کا حکم**

السؤال: اگر کسی دنبہ کا ایک خصیہ نکلا ہوا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

خصی دنبہ کی قربانی جائز ہے اور بظاہر ایک خصیہ نکل جانے کے بعد بھی وہ مثل خصی کے ہو جاوے گا کہ شہوت باقی نہ رہے گی لہذا یہ بھی مثل خصی کے ہے، قربانی میں کچھ حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

**قربانی کے جانور کو پہلے سے خرید کر موٹا تازہ کرنا مستحب ہے۔**

السؤال: قربانی کا جانور اگر قربانی کی نیت سے ایک ماہ پہلے خرید لیا ہو تو کیا دسویں ذی الحجہ کو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

قربانی کا جانور پہلے سے خریدنا اور اس کو موٹا تازہ کرنا مستحب ہے، چاہے ایک ماہ پہلے یا زیادہ۔ بہرحال قربانی جائز ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

**عقیقہ ساتویں دن کرنا مستحب ہے**

السؤال: عقیقہ میں رعایت ساتویں دن یا چودہ یا اکیس دن وغیرہ نہ کرے جب جی چاہے تو عقیقہ کر دوں تو عقیقہ ہو گا یا نہ۔ حدیث و فقہ میں جو سات دن وغیرہ کی تصریح ہے یہ اس وقت کے واسطے ہے یا افضل ہونے کے واسطے بیان کی گئی ہے، بادلیل مع حوالہ کتاب معتبرہ تحریر فرماویں۔

## الجواب

سات کے عدد کی رعایت محض افضل ہے ورنہ عقیقہ بہرصورت ادا ہو جاوے گا۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیة فی احکام العقیقة ج ۲ رسالہ ، صـ۲۲۲

ولو قدمہ یوم الذبح قبل یوم السابع أو أخرہ جاز الا ان یوم السابع افضل (الی أن قال) ووقتہا بعد تمام الولادة الی البلوغ فلا یجزی قبلہا وذبحہا فی الیوم السابع یسن والاولی فعلہا صدر النہار عند طلوع الشمس بعد وقت الکراہة للتبرک بالبکور ولیس من السبعة یوم الولادة خلافا للشافعیین ولو ولد لیلا حسبت السبعة من الصبیحة ولیس أن یعق نفسہ من بلغ ولم یعق عنہ اھ

اس سے معلوم ہوا کہ سات کے عدد کی رعایت کرنا صرف مسنون ہے ورنہ اولاً عقیقہ میں بغیر اس کے بھی خلل نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲ صفر سنہ ۱۳۴۲ھ

گائے کا ذبیحہ ہندوستان میں اسلامی شعار ہے۔

**السوال** : کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ذبیحہ گائے ہندوستان میں اسلامی شعار ہے یا نہیں جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوب ہشتاد و دوم جلد اول صـ۸۹ میں تحریر فرمایا ہے: "ذبح بقرہ در ہندوستان از اعظم شعائر اسلام است"

ع۲ اور اگر کسی جگہ ہندو مسلمانوں کو اس سے روکنے لگیں مگر مسلمان اس کے ذبح پر قادر بھی ہوں تو مسلمانوں کے لئے اس وقت کیا حکم ہے؟

ع۳ اور ایسے وقت میں جو مسلمان بکری وغیرہ کی قربانی چھوڑ کر اکثر صرف گائے ہی کی ذبح کو اختیار کریں یا روزمرہ بجائے بکری کے گائے کا گوشت کھایا کریں تو وہ مسلمان ثواب کے مستحق ہوں گے یا نہیں؟

## الجواب

ع۱ ذبیحہ گائے ہندوستان میں یقیناً اسلامی شعار ہے۔ چند وجوہ سے:

ا ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے گائے کی ہندو بہت عظمت کرتے اور اس کو اپنا دیوتا سمجھتے تھے۔ جیسا کہ اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے۔ اس مشرکانہ اعتقاد کے ساتھ جب تک ہندوؤں کی سلطنت ہندوستان پر رہی کسی کی یہ طاقت نہ تھی کہ یہاں کوئی شخص گائے کو ذبح کر سکے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی سلطنت جب اپنے

میں ملی تو جیسا کہ انہوں نے دیگر عقائد شرک کو پامال کیا اسی طرح گائے کی اس عظمت کو بھی پامال کیا اور اس کو ذبح کر کے اس کا دیوتا نہ ہونا اور محض عاجز ولاچار ہونا ظاہر کر دیا۔ پس ذبیحہ گائے چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے شروع ہوا اور اس کا ذبح ہونا اسلامی اثر کا نتیجہ تھا اس لئے یہ ذبیحہ اسلامی شعار ہے۔

۲۔ کلمۂ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بالاتفاق شعار اسلام ہے لیکن ہندو کسی خوف یا تقیہ کی وجہ سے اس کلمہ کو زبان سے کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس وقت ہندو مسلم کی اتحادی تحریک میں سنا گیا ہے کہ بعض ہندوؤں نے اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کے نعرے لگائے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ہندو ہی سمجھتے ہیں مسلمان نہیں سمجھتے لیکن گائے کا ذبح کرنا یا اس کا گوشت اعلانیہ طور پر کھانا یہ کوئی ہندو اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے کو مسلمان ظاہر نہ کر دے۔ یہ صاف اس بات کی علامت ہے کہ ذبیحہ گائے اور اس کا گوشت کھانا ہندوستان میں اسلام کا بڑا شعار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ہندو مسلمان ہوتا ہے تو اہل اسلام اس کو پہلے گائے کا گوشت کھلاتے ہیں۔ اگر اس نے اس سے نفرت نہ کی تو اس وقت اس کے سچے مسلمان ہونے کا یقین ہو جاتا۔

۳۔ کفار سے جزیہ یقیناً اسلام کی بڑی علامت ہے لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سلطنت کے زمانہ میں ہندو جزیہ دینے کی ذلت کو گوارہ کرتے تھے مگر گائے کے ذبح ہونے کو گوارہ نہ کرتے تھے بلکہ اس پر ہمیشہ کشت و خون کی نوبت آتی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی بہت سی قیمتی جانوں کا خون کر کے ذبیحہ گائے کو بھی ہندوستان میں جاری کیا۔ پس ذبیحہ گائے ہندوستان میں غلبۂ اسلام کی اتنی بڑی علامت ہے کہ جزیہ لینا بھی علامت میں اس سے کمتر ہے۔ اس لئے اس میں کچھ شک نہیں کہ ذبیحہ وقربانی گائے ہندوستان میں اسلام کا بہت بڑا شعار ہے۔

۴۔ قرآن شریف میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ اور بدنہ کو ہم نے تمہارے لئے خداوندی شعار بنایا ہے۔

بُدن جمع ہے بدنہ کی جس کا اطلاق لغۃً اونٹ اور گائے پر ہوتا ہے قال فی القاموس

والبدنة محركة من الابل والبقر كالاضحية من الغنم تهدى الى مكة للذكر والانثى اھ ج ۲ ص ۸۶۲

پس جس طرح اونٹ کی قربانی شعار اسلام ہے، اسی طرح گائے کی قربانی بھی شعار اسلام ہے۔ لہ

۵۔ صحیح بخاری میں ہے:

عن انس قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ فلا تخفروا اللہ فی ذمتہ۔ رواہ البخاری (مشکوٰۃ)

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہماری نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرنے لگے اور ہمارا ذبیحہ کھائے پس وہی وہ مسلمان ہے جس کے لئے خدا اور مسلمانوں کی پناہ ہے پس خدا تعالیٰ کی پناہ کو مت توڑو۔

اس حدیث میں جس طرح نماز اور استقبال قبلہ کو آپ نے شعار اسلام فرمایا ہے، اسی طرح اسلامی ذبیحہ کھانے کو بھی شعار اسلام میں داخل فرمایا ہے۔ اور اسلامی ذبیحہ وہی ہوگا جو ذبیحہ کفار سے پوری طرح ممتاز ہو اور ایسا ذبیحہ گائے کے سوا ہندوستان میں کوئی نہیں۔ کیونکہ اس کے ذبح اور تناول پر کوئی ہندو بھی پیش قدمی نہیں کرتا۔ پس ہندوستان میں گائے کا ذبیحہ اور اس کا گوشت کھانا بہت بڑا اسلامی شعار ہے۔

## جواب سوال دوم

جب یہ ثابت ہو گیا کہ گائے کا ذبیحہ اسلامی شعار ہے تو اگر ہندو اس سے روکنے لگیں خواہ جبراً یا کسی تدبیر کے ساتھ مثلاً خوشامد اور چاپلوسی کر کے اس وقت مسلمانوں پر بقدر استطاعت اس شعار اسلامی کے بقاء میں کوشش کرنا واجب ہے اور ایسی حالت میں جو کوئی ہندوستان کا ساتھ دے گا اس کے ایمان کا اندیشہ ہے جس طرح ہندوؤں کے جبر یا خوشامد سے اذان کا چھوڑنا یا کم کرنا جائز نہیں اسی طرح ان کی خوشامد یا جبر سے

---

لہ اور گو اس آیت کا نزول کے متعلق مورد خاص ہے لیکن اور ہو لفظ عام ہے جو دوسرے جو لوگ اس کے شعار ہونے کے منافی ہیں لفظ احوال میں شعائر ہونا بھی ان کے قربانی کی توقع کے لئے کافی ہے اور وجوہ بالا میں جو جو جانور بھی شعار ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے وہ باعتبار حالت خاصہ ہند کے ہے، فلا تعارض۔

وذبیحہ گائے بند کرنا یا کم کرنا جائز نہیں بقدر استطاعت اس کا جاری رکھنا لازم ہے۔

## جواب سوال سوئم

قربانی میں سب سے افضل اونٹ پھر بکری ہے۔

الهدي أدناه شاة لما روي أنه صلى الله عليه وسلم سئل عن الهدي فقال أدناه شاة وهو من ثلاثة أنواع الإبل والبقر والغنم لأنه صلى الله عليه وسلم لما جعل الشاة أدنى فلا بد أن يكون له أعلى وهو البقر والجزور اھ

اس میں صاف تصریح ہے کہ گائے کی قربانی بکری کی قربانی سے اعلیٰ ہے اور بکری کی قربانی ادنیٰ ہے۔ فتح القدیر میں بھی اس کی تصریح ہے۔ امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

فمذهب الشافعي وأبي حنيفة والجمهور أن الإبل أفضل ثم البقر ثم الغنم اھ

یعنی امام شافعی اور امام ابو حنیفہ اور جمہور علماء امت کا مذہب یہ ہے کہ اونٹ کی قربانی افضل ہے۔ اس کے بعد گائے کی، اس کے بعد بکری کی۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ لغت عربی میں غنم بکری اور بھیڑ اور دنبہ سب کو عام ہے

فی القاموس: الغنم محركة الشاء لا واحد لها من لفظها والواحدة شاة اھ

وفيه أيضا الشاة الواحدة من الغنم للذكر والأنثى ويكون من الضأن والمعز اھ

پس حدیث و فقہ کی تصریح کے موافق گائے کی قربانی بکری اور دنبہ اور بھیڑ سب سے افضل ہے۔ بعض لوگوں نے ترمذی کی حدیث خیر الأضحية الكبش سے استدلال کیا ہے کہ دنبہ کی قربانی گائے کی قربانی سے بہتر ہے۔ مگر وہ حدیث کا مطلب صحیح نہیں سمجھے۔

حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ بہتر اضحیہ دنبہ ہے اور اضحیہ کے معنی ان لوگوں نے مطلق قربانی کے سمجھے ہیں جس سے حاصل یہ ہے کہ بہترین قربانی دنبہ کی قربانی ہے۔ حالانکہ لفظ اضحیہ لغت میں جنس شاۃ کے لئے مخصوص ہے چنانچہ قاموس کی ایک عبارت تو گزر چکی ہے۔

والبدنة محركة من الإبل والبقر كالأضحية من الغنم اھ

اور دوسری جگہ قاموس میں ہے:

والاضحیۃ شاۃ یضحی بہا ت اضاحی کالضحیۃ جمع ضحایا اھ

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اضحیہ خاص قربانی بست کو کہتے ہیں۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ بکری، بھیڑ اور دُنبہ کی قربانی اوروں سے بہتر ہے سو اس کا کسی کو بھی انکار نہیں۔ مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ وہ گائے سے بھی افضل ہے۔ چنانچہ فقہاء کے کلام سے بھی حدیث کا یہی مطلب معلوم ہوتا ہے۔

شامی میں ہے : قال فی البدائع : افضل الشاۃ ان یکون کبشا املح اقرن موجوا والاقرن العظیم القرن والاملح الابیض۔ اھ

یعنی بکریوں میں افضل قربانی یہ ہے کہ دنبہ سفید بڑی سینگوں والا خصی ہو۔ اور جب فقہاء اور اہل لغت کے کلام سے اس حدیث کا مطلب متعین ہو گیا کہ بکریوں کی قسم میں افضل دُنبہ ہے تو پھر اس سے یہ استدلال کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ دنبہ کی قربانی گائے سے بھی افضل ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ یہ حدیث ضعیف بھی ہے، ترمذی نے اس حدیث کو روایت کر کے کہا ہے ھٰذا حدیث غریب وعفیر بن معدان یضعف فی الحدیث۔ یہ حدیث غریب ہے اور عفیر بن معدان حدیث میں ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔

وفی میزان الاعتدال : وقال ابو حاتم یکثر عن سلیم عن ابی امامۃ بما لا اصل لہ اھ ج ۲ ۔ ص ۲۰۳

وہ یعنی عفیر بن معدان ابو امامہ سے بواسطہ سلیم کے بے اصل روایتیں نقل کرتے ہیں۔ (اور یہ حدیث خیر الضحیۃ الکبش ابو امامہ سے بواسطہ سلیم ہی کے روایت کی گئی ہے) لہٰذا بقاعدۂ اصول یہ حدیث احتجاج کے قابل نہیں ہے تاکہ اس سے جمہور امت کے خلاف یہ مسئلہ مستنبط کیا جائے کہ دنبہ کی قربانی گائے سے افضل ہے۔ بعض لوگوں کو درِ مختار کی عبارت الشاۃ افضل من سبع البقرۃ (بکری گائے کے ساتویں حصہ سے افضل ہے) غلط انداز ے کا موقع مل گیا ہے کہ گائے کی قربانی سے بکری کی قربانی افضل ہے حالانکہ اس کے بعد اس میں یہ قید بھی مذکور ہے اذا استویا فی القیمۃ واللحم اھ یعنی جب گائے کا ساتواں حصہ اور بکری قیمت اور گوشت میں برابر ہوں اس وقت بکری کی قربانی گائے کے ساتویں حصہ سے افضل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ گائے بہت دبلی ہوگی جس کا ساتواں حصہ گوشت میں بکری کے برابر ہو۔ اور قربانی میں افضل یہ ہے کہ

جانور عمدہ ہو۔

فی الدر : فان کان سبع البقرۃ اکثر لحما فھو افضل اھ ج ۵ ص ۲۱۵

پس اگر گائے کا ساتواں حصہ گوشت میں زیادہ ہو تو وہی افضل ہے اھ

اور ظاہر ہے کہ جیسی گائے قربانی میں عموماً ذبح کی جاتی ہے اس کا ساتواں حصہ بکری سے گوشت میں زیادہ ہوتا ہے پس گائے کا ساتواں حصہ بھی بکری سے عموماً افضل ہے۔ ہاں جس دبلی گائے کا ساتواں حصہ بکری کے گوشت کے برابر ہو اس سے بکری اس لحاظ سے افضل ہے کہ اس کا گوشت عمدہ ہوگا۔ پھر یہ ساری گفتگو تو گوشت اور قیمت کے اعتبار سے افضل ہونے میں ہے لیکن جب اس لحاظ سے نظر کی جائے کہ گائے کے ذبح کرنے میں ہندوؤں کے عقیدۂ شرک کا ابطال اور غلبۂ اسلام کا اظہار ہے اس لحاظ سے ہر حال میں گائے کی قربانی بکری کی قربانی سے افضل ہوگی بشرطیکہ وہ گائے بقاعدۂ شریعت قربانی کے قابل ہو اور اسی لحاظ سے روزمرہ بھی گائے کا کھانا بکری کے گوشت کے کھانے سے بہتر ہے۔ خصوصاً جس جگہ ہندو مزاحمت کرتے ہوں۔ مگر مسلمان گائے ذبح کرنے پر قادر ہوں وہاں تو ضرور گائے کے گوشت کو بکری کے گوشت سے ترجیح دینی چاہئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آجکل ہندوؤں سے ہمارا اتحاد ہے اور اس اتحاد کی ہم کو ضرورت بھی ہے اس لئے گائے کی قربانی بند کردینی چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوؤں سے ایسا اتحاد کرنا خود ہی ناجائز ہے، جس میں ہم کو ان کی عقیدۂ شرک کی کچھ بھی رعایت کرنی پڑے۔ گئو رکشا ہندوؤں کا مذہبی اہم عقیدہ ہے، اس میں مسلمانوں کو کچھ بھی حصہ لینا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ اور جس مقصد میں مسلمان ہندوؤں سے ایسا اتحاد کئے بغیر کامیاب نہ ہوسکیں وہ کام ہر مسلمان کے ذمہ لازم نہ ہوگا اگر ہندو بدون مذہبی امور میں مداخلت کئے مسلمانوں سے اتحاد نہیں کرسکتے تو ایسے اتحاد کا اختیار کرنا ہی جائز نہیں ہے۔ اور بعض لوگوں نے جو ایسی مراعات کی نظیریں شریعت میں ثابت کی ہیں انہوں نے مخلوقِ خدا کو سراسر دھوکہ دیا ہے جس کی حقیقت رسالہ " الخیر النامی " میں ظاہر کردی گئی ہے مسلمانوں کو ایسی باتوں سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے۔ شریعت اسلامیہ میں ایسی کوئی نظیر نہیں ہے جس میں کفار کے مشرکانہ عقیدہ کی کچھ بھی رعایت کی گئی ہو یا کفار کی خاطر کسی اسلامی شعار کو مٹایا گیا ہو نعوذ

بالرشد - وانالله المسئول لان یثبتنا علی الصراط المستقیم والحمد لله
وعلی خیر البریة افضل الصلوٰة والتسلیم -

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۹/ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۰ھ

# تأیید الجواب وھو الھادی الی الصواب

فی بیان القرآن تفسیر قولہ تعالیٰ: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً الآیۃ

ما قصہ او پر آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ الخ مخلص کی مدح تھی بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہو جاتا ہے یعنی نفس تو ہوتا ہے زیادہ اطاعت کا مگر وہ اطاعت بنظر غائر میں شریعت و سنت سے متجاوز ہوتی ہے اس کو بدعت کہتے ہیں چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہود سے تھے اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا اور اونٹ کا گوشت حرام تھا ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی اور شریعت محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں اسی طرح شریعت موسوی میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کردیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جاوے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوا اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے -

فی مضیات من لباب النقول: اخرج ابن جریر عن عکرمۃ قال قال عبداللہ بن سلام وثعلبۃ وابن یامین واسد واسید ابنا کعب وسعید بن عمرو وقیس بن زید کلھم من الیھود یا رسول اللہ یوم السبت یوم کنا نعظمہ فدعنا فلنسبت فیہ فنزلت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً

وفی روح المعانی: وکرھوا لحمان الابل اھ

وفی التفسیر المظھری: عن البغوی: وکانوا یکرھون لحوم الابل والبانھا

بعد ما اسلموا فنزلت الآیۃ ۔

اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں کسی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جاوے اور ایسے امر کو دین سمجھنا یہ ایک شیطانی لغزش ہے اور حیثیت ظاہری معاصی کے اس کے اشد ہونے کے سبب یہ عذاب کا زیادہ منتظر ہے

اصلاح مبتدع یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۔ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۔

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ (یہ نہیں کہ کچھ کچھ یہودیت کی رعایت کیا کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف) پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں (احکام و شرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں (پھر بھی صراط مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالے بڑے زبردست ہیں (سخت سزا دیں گے گو چندے سزا نہ دیں تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت اور مصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ) یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر (معلوم ہوتے) ہیں کہ حق تعالےٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزا و سزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے ۔

و۲) (بعد حذف فائدتین) آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمانے سے معلوم ہوا ہوگا کہ بدعت پر کس درجہ ملامت ومذمت ورد وانکار فرمایا گیا ہے اور حدیثوں میں اس سے زیادہ صاف الفاظ میں سخت سخت وعیدیں آئی ہیں اور واقع میں اگر غور سے کام لیا جاوے تو بدعت ایسی ہی مذموم چیز ہونی چاہیے کیونکہ خلاصہ حقیقت بدعت کا غیر شریعت کو شریعت بنانا ہے اور شریعت کا من اللہ ہونا ضرور اور لازم ہے تو یہ شخص ایسے امر کو جو من اللہ نہیں ہے اپنے اعتقاد میں من اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے جس کا حاصل اور مرجع افترا علی اللہ اور ایک گونہ دعویٰ نبوت ہے سو اس کے عظیم وثقیل ہونے میں کیا شبہ ہے۔ یہ تو شناعت ہے اس کی حقیقت کے اعتبار سے اور آثار کے اعتبار سے ایک بڑی شناعت یہ ہے کہ اس سے توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ جب وہ اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے تو توبہ کیونکر کرے گا۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس جہل ہی سے نجات بخش دیں کہ اس کی نظر میں وہ استحسان مبدل بہ استہجان ہو جاوے تو یہ اور بات ہے۔ اور پھر توبہ سہل ہے۔ اھ

## تفریع علی ما فی التفسیر

مقام غور ہے کہ جب ایسے امر کی رعایت کو جو کہ فی نفسہ مباح ہو اور ایک وقت میں الٰہیہ شریعت کا جزو ہونے سے عبادت بھی رہ چکا ہو اور بعد نسخ کے بھی مباح ہی رہا ہو اور نیت بھی اس کی دنیوی غرض یا کسی کافر کے خوش کرنے کی نہ ہو صرف عارض نسخ کے سبب وہ بدعت ہو گیا ہو جب ایسے امر کی رعایت کو اسلام کامل کے خلاف اور یہودیت کا شعبہ اور اتباع شیطان اور محل وعید شدید قرار دیا گیا ہو تو جو امر کہ شعار کفر اور مبنی علی الشرک ہونے کے سبب فی نفسہ بھی مباح نہ ہو اور مقصود اس سے رضا مشرکین ہو اور پھر اس کو معتقد تقویت دین بتا کر دین بنا دیا جاوے اور اس کے سبب نصوص شرعیہ میں تحریف وتغییر کی جاوے اس کی رعایت کس درجہ اسلام سے بعید اور محل اشد وعید ہوگی وھو ظاھر جدًا ولا یتخلص من الذنب بعذر کون الامتناع عملیًا محضًا لا اعتقادیًا لما فی التفسیر الکبیر لقولہ تعالیٰ: لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ المراد من ھذا التحریم ھو الامتناع عن الانتفاع بالازواج لا اعتقاد کونہ حرامًا الخ۔ واللہ اعلم

کتبہ اشرف علی عفی عنہ

۲۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۳۰ھ

**قربانی کی کھال خیرات نہ کرکے مٹی میں دفن کرنے کا حکم**

السوال : قربانی کے چمڑے نہ بیچ کر اور خیرات نہ کرکے اس کو مٹی میں دفن کرنا جائز ہے یا نہیں ؟
بینوا توجروا

## الجواب

قربانی میں تو نقص نہ آئے گا مگر ضاعت مال کا گناہ ہوگا ۔ واللہ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۹ صفر ۱۳۴۳ھ

۹ - کہ ۵۵

---

**اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم اور حکمت جواز**

السوال : کتابیہ کے ہاتھ کا ذبیحہ یا ان کے یہاں شادی بیاہ کرنا درست ہے یا نہیں اگر ان کے ہاتھ کا ذبیحہ جائز ہے تو کس طرح سے، کیونکہ جو شخص مسلمان نہیں رسول اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور خدا کی وحدانیت کا قائل نہ ہو اس کے یہاں شادی بیاہ یا اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ ذبیحہ میں مسلمان ہونا ضروری ہے ۔ جب یہود و نصاریٰ اسلام کے سراسر خلاف : ورمنکر رسالت یا توحید کے ہیں تو پھر ان کے ہاتھ کی کوئی چیز کیسے درست

ہو سکتی ہے۔ جو چیز ضروریات دین اور شعائر اسلام سے عبادات کے اندر باقی رہ گئی ہو
رہا معاملہ اس میں تو ہنود یعنی اہل کتاب وغیر اہل کتاب سب مساوی ہیں۔ کوئی فرق نہیں۔
میں نے مالا بد منہ، مؤلفہ جناب مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی جب سے یہ عبارت دیکھی ہے
کہ کتابیہ کے ہاتھ کا ذبیحہ جائز ہے اور اس کے علاوہ غالباً کوئی آیت قرآن کی بھی اس کے
جواز کا فتویٰ دے رہی ہے، سخت حیرت ہے مجھے فرصت نہیں ورنہ مدلل لکھتا۔ بہرکیف تردد یہ
ہے کہ باوجود کہ اہل کتاب اپنی اصل شریعت پر قائم ہوں پھر بھی یہ دین محمدی
بلا اختیار کیے اور آپ کی رسالت کے معترف ہوئے بغیر ان کی کوئی چیز کیسے جائز ہوگی۔ اس
آیت سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۔ ما سوا اسلام کے
اور کسی مذہب اور دین کے قبول کرنے کی رد میں یہ آیت کافی معلوم ہوتی ہے کہ وَمَن يَبْتَغِ
غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ

خلاصہ ان سب مضامین کا مطلع فرمائیے۔ مجھ کو غلطی معلوم ہوتی ہے اور اس کا کہنا
اور لکھنا عجب ہے۔ بینوا توجروا

السائل:
محمد شمس الدین غفرلہ
۳ رجب سنہ ۱۳۳۴ھ

## الجواب

کتابی کے ہاتھ کا ذبیحہ اور اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا خود نص قرآنی سے جائز کیا
گیا ہے۔ الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ
وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۔

پھر سائل کا اس پر چون و چرا کرنا سخت حیرت ہے۔ کیا احکام شرعیہ کی اگر حکمت
سائل کی سمجھ میں اگر نہ آئے گی تو وہ اس حکم کو تسلیم ہی نہ کرے گا۔ سائل نے اس سوال میں
بہت سخت اور بیجا طور پر چون و چرا کی ہے۔ گویا وہ حکم خداوندی پر اعتراض کرنا چاہتا ہے
کہ ایسا کیوں جائز کیا گیا۔ حرام کیوں نہ کیا گیا۔ سائل کو اگر حکمت دریافت کرنا مقصود تھی تو
ادب کے ساتھ حکمت دریافت کرتا۔ حکم شرعی پر اعتراض اور چون و چرا کرنا اپنی عاقبت

کو یاد کرنا ہے چونکہ ہم مسلمان ہیں اس لیے سائل کے جواب میں قرآن کی آیت کا لکھ دینا
کافی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں خود کتابی کے ذبیحہ کو اور کتابی عورتوں کو حلال کیا ہے
ہمارے واسطے یہ دلیل سب سے بڑی دلیل ہے۔ مدارِ احکام کی حکمت کا بیان کرنا ہمارے ذمہ
نہیں کیونکہ ہم واضع احکام نہیں ہیں بلکہ عالم احکام فی الجملہ ہیں۔ احکام کا بتلانا اور جواب لکھ دینا
ہمارا کام ہے۔ دلائل عقلیہ اور حکمتوں کے بتلانے کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہاں اگر مخاطب میں
اہلیت ہو۔ بروجہ نیازی دریافت کرنا چاہے تو اس سے بھی انکار نہیں۔ سائل کے بیہودہ
طرزِ سوال کو دیکھ کر حکمت بتلانے کو جی نہ چاہتا تھا مگر پھر طبیعت پر جبر کر کے تبرعاً لکھتا ہوں

میری سمجھ میں حکمت جو اس مسئلہ کی آتی ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب اگرچہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے اور خدا پر بھی مسلمانوں کی طرح صحیح ایمان نہیں رکھتے لیکن
وہ دوسرے کافروں سے اس بات میں ممتاز ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے دین کا متبع بتلاتے
ہیں جو کسی وقت میں دین الٰہی تھا جس کا اتباع اس وقت فرض تھا۔ نیز وہ اپنے آپ کو
ایسے پیغمبروں کا متبع بتلاتے ہیں جو درحقیقت خدا کے سچے رسول اور محبوب ہیں اور اس وقت
ان کی رسالت کا دور ختم ہو گیا ہے پس یہ لوگ دوسرے کافروں کے برابر تو نہیں۔ نیز
توراۃ وانجیل پر ادھورا ایمان رکھنے کی وجہ سے یہ لوگ قیامت اور ملائکہ اور دیگر انبیاء
پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جنت دوزخ کے بھی قائل ہیں (یہ گفتگو ان عیسائیوں اور
یہودیوں کی بابت ہے جو حقیقت میں عیسائی اور یہودی ہیں اور جو برائے نام عیسائی یہودی
اور حقیقت میں ملحد ہوں جیسے اکثر انگریز ایسے ہی ہیں تو وہ اس گفتگو سے خارج ہیں، نہ ان کا
ذبیحہ جائز ہے نہ ان کی عورتیں حلال ہیں) اس لیے شریعت نے فی الجملہ دوسرے کافروں سے
اہل کتاب کا یہ امتیاز عطا کر دیا کہ ان کے ہاتھ کے ذبیحہ کو حلال کیا بشرطیکہ وہ خدا کے
نام پر ذبح کریں، مسیح وغیرہ کے نام ذبح نہ کریں اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز کر دیا
واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

۶ شوال سنہ ۱۳۳۲ھ

**سینگ ٹوٹے ہوئے جانور کی قربانی کا حکم اور اس کی تحقیق**

**السؤال:** معروض آنکہ جناب ملک بنگالہ میں مکسور القرن کے مسئلہ میں عالموں میں دو فریق
میں تنازع ہو رہا ہے ایک فریق اوپر کے خول اور اندر کے استخوان کو قرن، اور دوسرا

فریق ثانی اوپر کے خول کو قرن اور اندر کے استخوان کو مشاش مخ و دماغ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور فریق اول قرن کی جڑ یعنی اصل قرن کو مشاش مخ و دماغ کو مغز سر کہتے ہیں اور دلیل ہر دو کی شامی و عالمگیری اور بزازی ہے۔ تینوں کتابوں کی دلیل سمجھنے میں تنازع ہوا ہے۔ اب امید ہر دو فریق کی یہ ہے کہ آپ بطور فیصلہ کے ایک جواب دیجئے گا اور آپ نے جو بہشتی زیور میں قربانی کے جانور مکسور القرن کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ البتہ اگر بالکل جڑ سے ٹوٹ گئے ہوں تو درست نہیں اس کے کیا معنی ہیں کہ اوپر کے غلاف کا جڑ سے ٹوٹنا مطلب ہے یا کہ غلاف (یعنی خول اور اندر کا استخوان سمیتا) اور مغلوف ہر دو کا ٹوٹنا مراد ہے۔ فریق اول اپنے مدعا کا استدلال اسی دلیل سے کرتے ہیں۔

السائل:

محمد دلاور حسین عفی عنہ

پوسٹ دولت خان حاجی پور مدرسہ اسلامیہ بنگال

# الجواب

قال الشامی: ویضحی بالجماء وھی التی لاقرن لھا خلقۃ وکذا العظماء التی ذھب بعض قرنھا بالکسر أو غیرہ فان بلغ الکسر الی المخ لم یجز۔ قہستانی۔

وفی البدائع: ان بلغ الکسر المشاش لایجزئ والمشاش رؤس العظام مثل الرکبتین والمرفقین اھ ج ۵۔ ص ۲۱۵

قرن کا اطلاق لغۃً اس ہڈی پر ہوتا ہے جو حیوانات کے سر پر بلند ہوتی ہے صرف اس کے خول کو قرن نہیں کہتے اور شامی تصریح کرتے ہیں کہ مکسور بعض القرن کی قربانی جائز ہے جس سے متبادر یہی ہے کہ اگر قرن مع غلاف و عظم باطن کے نصف سے کم ٹوٹ جائے تو قربانی جائز ہے اور مخ سے مراد دماغ ہے جو سینگ کی جڑ سے متعلق (متصل) ہے اس سے مراد باطن غلاف قرن نہیں ورنہ عبارت اس طرح ہوتی فان بلغ الکسر مخہ ای مخ القرن۔ لغت میں مخ کے معنی نقی العظم کے بھی ہیں اور دماغ کے بھی ہیں۔ لیکن جب لفظ المخ کا اطلاق بلا اضافت الی العظم کے ہو تو ظاہر یہی ہے کہ دماغ مراد ہے۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ بدائع میں بجائے نخ کے لفظ مشاش اختیار کیا ہے اور مشاش کا اطلاق باطن غلاف قرن پر ہرگز نہیں ہو سکتا پس بہشتی زیور کی عبارت میں جڑ سے مراد صرف غلاف کی جڑ نہیں بلکہ اندر کی ہڈی اور غلاف دونوں کی جڑ مراد ہے غلاف تو اگر سارا بھی اتر جائے مگر اندر کی ہڈی باقی رہے تو صحیح درست ہے فافہم

السوال : بعض عوام سمجھتے ہیں کہ اگر ذبح کی اعانت کرنے والا مثلاً جانور پکڑنے والا اگر کافر ہو تو ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے براہ کرم یہ جزئیہ جہاں ہو مع حوالہ کتاب و باب و جلد و صفحہ نمبر تحریر فرماویں۔

| ذبح کی مدد کرنے والا اگر کافر ہو تو ذبیحہ حلال ہے |
| --- |

السائل :

مولوی عبدالحی عفی اللہ عنہ

ترپ بازار شفاخانہ رحمانی حیدرآباد

# الجواب

قال العلامة عبد الحی فی فتاواہ : گر بندہ مذبوح را بچو رسن وغیرہ قصد باید ساخت معین ذابح آنست کہ دست خود بر آلۂ ذبح نہد۔

فی کتاب الاضحیۃ من العالمگیریۃ : رجل اراد أن یضحی فوضع صاحب الشاۃ یدہ علی السکین مع ید القصاب حتی تعاونا علی الذبح قال الشیخ الامام یجب علی کل واحد منہما التسمیۃ الخ

وفی کتاب الصید : مسلم عجز عن مد قوسہ بنفسہ فاعانہ علی مدہ مجوسی لا یحل اکلہ لاجتماع المحرم والمحلل فیحرم کما لو أخذ مجوسی بید المسلم فذبح والسکین فی یدہ المسلم لا یحل اکذا اھ ج ۶ ص ۲۸۰

برجندی در شرح نقایہ آوردہ کما یشترط تسمیۃ الذابح یشترط تسمیۃ من اعان الذابح بحیث وضع یدہ علی المذبح کما وضع الذابح۔

وقال قاضی خان فی فتاواہ : رجل أراد أن یضحی فوضع صاحب الشاۃ یدہ مع ید القصاب علی المذبح واعانہ علی الذبح حتی صار

وانجامع القصاب الخ ج ۳ - ص ۳۰۵

فتاوی عبد الحی : قلت والقیود الفقہیۃ احترازیۃ فعلم ان الآخذ برجل الذبیحۃ ویدھا لیس بذابح ولا بمعین علی الذبح وقال فی الدر ویشترط کون الذابح مسلما الخ فاسلام غیر الذابح لیس بشرط - واللہ اعلم -

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۳ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ

**قربانی کے جانور کی کھال اور اس کے گوشت کا حکم**

**السوال** : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ قربانی کی کھال کا ڈول بنواکر مسجد میں دینا یا کھال ہی کھال کی قیمت کو مسجد میں یا دیگر اوقات میں لگا دینا، تعمیر میں ان کے ملازموں کو تنخواہ میں دیدینا جائز ہے یا نہیں۔

۲ : غریب سید کو یا کسی غنی کو کھال قربانی یا کھال کی قیمت دینا کیسا ہے اور کھال یا قیمت کے ان ہر دو طرح سے دینے میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

۳ : قربانی کا گوشت پختہ یا کچا غیر مسلم ہندو کو دینا کیسا ہے؟ بینوا توجروا

السائل :
جمعیت علی ارکانہ ضلع انبالہ ریگو مسیر کرنال

## الجواب

قال فی الھدایۃ : واللحم بمنزلۃ الجلد فی الصحیح (تتمہ جلد ثانی فتاوی امدادیہ ص ۱۳۵)

وفی الدر : فان بیع اللحم او الجلد بہ او بدراھم تصدق بثمنہ اھ (تتمہ مذکورہ ص ۱۳۶)

وفی عالمگیریۃ : ویھب منھا (ای من الاضحیۃ) ما شاء للغنی والفقیر والمسلم والذمی اھ ج ۶ - ص ۳۰۱

وفیھا ایضا : ولا ان یعطی (ای لا یجوز) اجر الجزار والذبح منھا اھ (ج ۶ - ص ۳۰۲)

قربانی کی کھال کا بعینہٖ مسجد میں دینا (بشرطیکہ اس کو بعینہٖ مسجد کے کام میں لایا جاوے یعنی فروخت نہ کیا جاوے) اسی طرح اس کا ڈول بنا کر مسجد میں دینا جائز ہے۔ کیونکہ کھال کا بعینہٖ تصدق صدقہ نافلہ ہے اور صدقہ نافلہ کا مسجد میں دیدینا جائز ہے۔ باقی کھال کو بیچ کر اس کی قیمت مسجد میں دینا جائز نہیں ہے کیوں کہ قیمت کا تصدق واجب ہے اور صدقہ واجبہ کے لئے تملیک شرط ہے اور مسجد محل تملیک نہیں۔ اسی طرح کھال کی قیمت کو ملازمین مسجد و دیگر اوقات کی تنخواہ میں دینا بھی جائز نہیں ہے اسی طرح بعینہٖ کھال یا اس کی قیمت مسجد کے مؤذن یا امام کو اس کی خدمت کے معاوضہ میں بھی دینا جائز نہیں ہے البتہ اگر مؤذن وامام کو مقرر کرتے وقت صاف کہہ دیا گیا ہو کہ قربانی کی کھالوں میں تمہارا کچھ حق نہ ہوگا اس کے بعد اس کو بعینہٖ کھال یا اس کی قیمت دیدی جاوے تو جائز ہے اور صورت ثانیہ میں اس کا فقیر ہونا شرط ہے۔ اسی طرح اس کی قیمت کو مسجد کی مرمت میں بھی صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں بعینہٖ کھال اگر مسجد یا اوقات کے کاموں میں لگادی جائے تو جائز ہے مثلاً مسجد یا مدرسہ کے لئے ڈول بنا دیئے جاویں۔

۲: بنو ہاشم کو بعینہٖ کھال دیدینا درست ہے پھر وہ خواہ اس کو بعینہٖ کام میں لاوے یا فروخت کرکے قیمت کام میں لاوے کیونکہ کھال کا بعینہٖ تصدق صدقہ نافلہ ہے، اور صدقہ نافلہ بنو ہاشم کو دینا جائز ہے۔ مگر کھال بیچ کر اس کی قیمت بنو ہاشم کو دینا جائز نہیں کیونکہ قیمت کا تصدق واجب ہے اور وہ صدقات واجبہ کے مصرف سے نہیں۔

۳: قربانی کا گوشت کچا یا پختہ ہندو غیر مسلم کو دینا جائز ہے کیونکہ گوشت کا تصدق واجب نہیں پس وہ یا ہدیہ ہے یا صدقہ نافلہ اور یہ دونوں کافر ذمی کو دینا درست ہیں۔

قلت والمستامن فی حکم الذمی فی ذلک والحربی المسالم فی حکم الذمی فافهم۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۲ ذی الحجۃ ۱۳۵۲ھ

**عقیقہ کی نیت سے خریدے ہوئے جانور کا حکم**

(السوال): احقر کے یہاں بال بچہ پیدا ہونے والا تھا، اس واسطے ایک بھیڑو خرید لیا تھا اس نیت سے کہ اگر لڑکا ہوگا تو ایک اور خرید لیا جاویگا، ورنہ یعنی لڑکی کی صورت میں تو یہی عقیقہ میں ذبح کر لیا جاویگا۔ اب

ایک لڑکا ہوا جو ایک ہفتہ زندہ رہنے کے بعد مر گیا مگر اس کی طرف سے عقیقہ نہ کر سکا
اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس جانور کا کیا کیا جاوے آیا اور کام میں لایا جا سکتا ہے
یا عقیقہ ہی کی نیت سے ذبح کرنا ضروری ہے کیونکہ خریدتے وقت عقیقہ ہی کی نیت تھی
گو کہ عقیقہ فرض نہیں مگر نیت کر لینے سے تو اس کا ذبح کرنا فرض ہو جاتا ہے یا نہیں۔ اور مولوی
محمد الیاس صاحب سے اس کی بابت تحقیق کی مگر ان کے پاس نہ وقت تھا اور نہ کتابیں تھیں جو
تحقیق فرماتے۔ آپ فرماویں کہ اب کیا کروں آیا اسے ذبح کروں یا قربانی کی نیت سے
پال لوں۔

السائل:
حافظ محمد عثمان۔ تاجر کتب دریبہ کلاں دہلی

## الجواب

عقیقہ کی نیت سے جو جانور خریدا گیا ہے اس کا ذبح کرنا واجب نہیں۔ جس کام میں
چاہیں لے آویں۔

لان الشراء بنية العقيقة وان كان بمعنى النذر ولكن يشترط
لانعقاد النذر أن يكون المنذور عبادة مقصودة

قال في الدر: وكان من جنسه واجب اى فرض كما سيصرح به تبعًا
للبحر والدرر - وهو عبادة مقصودة اهـ

قال الشامي: الضمير راجع للنذر بمعنى المنذور إلى أن قال فهذا
صريح في أن الشرط كون المنذور نفسه عبادة مقصودة لا ما كان من جنسه اهـ

(ج ۳ - ص ۱۰۲)

وفي تنقيح الفتاوى الحامدية: ثم إذا أراد أن يعق عن الولد فانه
يذبح عن الغلام شاتين وعن الجارية شاة لانه إنما شرع للسرور بالمولود
وهو بالغلام أكثر اهـ ج ۲ ص ۲۱۲ وهذا يدل على كونها عبادة غير
مقصودة فافهم۔ والله سبحانه وتعالى أعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۷ محرم سنہ ۱۳۴۱ھ

سینگ ٹوٹی ہوئی گائے کی قربانی کا حکم

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے قربانی کی نیت سے ایک گائے خریدی ہے۔ مگر اس کا ایک سینگ ٹوٹا ہوا ہے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ آیا سینگ ٹوٹے ہوئے جانور (گائے) کی قربانی جائز ہو جاتی ہے یا نہیں۔
بینوا توجروا۔

# الجواب

بطور مقدمہ کے چند باتیں اول معروض ہیں:

۱: کتب حنفیہ میں اکثر فقہاء نے مکسور القرن کو مطلقاً جائز لکھا ہے۔ ھدایہ وغیرہ میں قرن کے لئے نصف یا اقل من النصف کی کوئی قید مذکور نہیں ہے۔

۲: علامہ شامی نے قہستانی سے ایک عبارت نقل کی ہے جس میں بعض قرن کی قید مذکور ہے۔ جس سے شبہ ہوتا ہے کہ جمیع قرن کا انکسار مضر ہے۔

قال: وکذا العظماء التی ذهب بعض قرنها بالکسر او غیره فان بلغ الکسر الی المخ لم یجز قہستانی

اور ظاہر ہے کہ قہستانی کا قول تنہا حجت نہیں ہو سکتا لکونه من المجاھیل

۳: بدائع وعالمگیری وغیرہ میں بلوغ الکسر الی المخ او الی المشاش کو مطلقاً مانع جواز اضحیہ قرار دیا ہے۔ بلوغ الکسر الی المخ او الی المشاش کے بعد کسی نے نصف یا ما دون النصف کی قید نہیں بڑھائی

۴: فقہاء حنفیہ نے مکسور القرن کو جماء پر قیاس کیا ہے اور علت جواز مکسور القرن یہ بتلائی کہ کونه لا یتعلق به المقصود یہ علت جس طرح غلاف قرن میں متحقق ہے داخل غلاف قرن میں بھی متحقق ہے بلکہ بدرجۂ اولیٰ۔ کیونکہ غلاف اتر جانے کے بعد داخل غلاف قرن جو کہ ایک نازک ہڈی ہے دفع اذی کے لئے کسی درجہ میں مفید نہیں اور غلاف قرن دفع اذی کو مفید ہے پس اگر غلاف قرن کو لا یتعلق به المقصود کا مصداق مانا جاتا ہے تو داخل غلاف قرن کو بدرجۂ اولیٰ اس کا مصداق ماننا پڑے گا۔

۵: لفظ مخ کے معنی لغت میں دماغ کے بھی ہیں اور ہمارے نزدیک یہی معنی فقہاء کے کلام میں مراد ہیں۔ اور مشاش کے معنی متعدد ہیں۔ اور لفظ مشترک کی تفسیر دہی

معتبر ہوگی جو فقہاء نے بیان کی ہے۔ فقہاء نے مشاش کی تفسیر رؤس العظام مثل الرکبتین والمرفقین سے کی ہے۔ اس کا مصداق داخلِ غلافِ قرن ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کو رأس العظم نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کا مصداق قرن کی جڑ ہے۔ رأس الشئی کا اطلاق اصل الشئی پر بکثرت شائع ہے

ف: داخلِ قرن کو ہمارے نزدیک نقی العظم کہنا بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ نقی العظم سے وہ گودا مراد ہوتا ہے جو بحالتِ لاغری خشک ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے ولا العجفاء التی لا تنقی اور داخلِ قرن ایسا گودا نہیں جو بحالتِ لاغری خشک ہو جاتا ہو بلکہ وہ بھی خود عظم ہے مگر بنسبت غلافِ قرن کے نازک ہے۔

## الدلیل علی المقدمات

أما علی الأول فبالاستقراء التام لکتب القوم، قال فی الهدایة: ویجوز ان یضحی بالجماء وهی التی لا قرن لها لان القرن لا یتعلق به مقصود، وکذا مکسورة القرن لما قلنا (من ان القرن لا یتعلق به المقصود - المحشی)

وفی العنایة: الا تری ان الاضحیة بالابل جائزة ولا قرن له.

ج ۸ ص ۴۳۳ هدایه مع الفتح

وفی البحر: ویضحی بالجماء التی لا قرن لها یعنی خلقة لأن القرن لا یتعلق به المقصود وکذا مکسورة القرن بل اولی انتهی۔ ج ۸ ص ۱۷۶۔

وفی العالمگیریة: ویجوز بالجماء التی لا قرن لها وکذا مکسورة القرن کذا فی الکافی۔ وان بلغ الکسر المشاش لا تجزیه والمشاش رؤس العظام مثل الرکبتین والمرفقین۔ کذا فی البدائع۔ اهـ ج ۵ ص ۲۰۰

وفی مجمع الانهر: وتجوز الجماء بتشدید المیم وهی التی لا قرن لها بالخلقة اذ لا یتعلق به المقصود وکذا مکسور القرن بل اولی۔ ج ۲ ص ۵۰۰

قلت: وفی هذه العبارات دلیل علی المقدمة الرابعة أیضاً۔ فقیاسهم المکسور القرن علی الجماء یفید أن القرن لا یضر انکساره مطلقاً، ولو لم یبق منه شئ فغایته أن یصیر کالجماء والتضحیة بها جائزة، فکذا بالمکسور القرن الذی لم یبق من قرنه شئ للعلة الجامعة التی هی

كون القرن لا يتعلق به مقصود والغلاف داخل فيه سواء

وأما على الثاني: فما في رد المحتار: انه لا يجوز الآن من الكتب المعتمدة إلى أن قال: أو لعدم الاطلاع على حال مؤلفيها كشرح الكنز لملا مسكين وشرح النقاية للقهستاني. ج ١ ص ٤٢

وأما على الثالث: فبالاستقراء التام لكتب القوم الموجودة عندنا فلم نجد أحدا صرح بأنه يجوز الأضحية إذا بلغ الكسر المشاش أو المخ بما دون النصف ولا يجوز إذا زاد عليه بل كلامهم يفيد أن بلوغ الكسر إلى المخ أو المشاش يمنع الجواز مطلقا. هذا يدل على أن المراد بالمخ والمشاش ليس بشيء من جزء القرن، فإن كسر بعضه لا يضر اتفاقا. وكله أيضا على ما هو مقتضى إطلاق الفقهاء المعول عليهم بل المراد به إنما هو أصل القرن الذي يتصل بالمخ أي الدماغ فإن بلوغ الكسر إليه عيب فاحش يضر بصحة الحيوان. فقول المجيب أطال الله بقاءه في آخر جوابه: اور مکسور المشاش اور اعضب نقرن و دبانوز ہیں جن کی سینگ کا اندر کا حصہ نصف یا مافوق النصف شکستہ ہو، اس کی قربانی جائز نہیں الخ. لا دليل عليه ولا أدري من أين أخذ التقييد بالنصف وبما فوقه بعد بلوغ الكسر إلى المشاش والحال أن الفقهاء يمنعون عن التضحية إذا بلغ الكسر المشاش من غير تقييد. وأما ما نقل من قول سعيد بن المسيب في جواب قتادة العضب ما بلغ النصف فما فوق ذلك فلا حجة فيه ما لم تكن في المذهب رواية توافقه.

وأما على الرابع: فقد مر.

وأما على الخامس: فما في القاموس المخ نقي العظم والدماغ وشحمة العين الخ ج ١ ص ١٦٤

وفي الحديث: فجاء يسوق عنزا عجافا مخاخهن قليل هو جمع مخ.

(مجمع البحار - ج ١ - ص ٨٥)

وهو يدل على أن مخ العظم يراد به ما يقل حال العجف ويزيد في السمن وليس داخل غلاف القرن هكذا. وفي القاموس أيضا المشاشة

لضم رأس العظم الممكن المضغ جمع مشاش - ج ا - ص ۲۵۴ -

وفی المجمع : فی صفتہ صلی اللہ علیہ وسلم جلیل المشاش أی عظیم رؤس العظام کالمرفقین والکتفین والرکبتین وقیل ھو رؤس عظام لینۃ ، یمکن مضغہا اھ ج ۴ - ص ۳۰۲

قلت ، وعلیہ یحمل مافی المغرب من قولہ فان بلغ الکسر الی المشاش لایجزیہ یراد بہ عظم داخل القرن اھ فداخل القرن محمول علی أصلہ فانہ یسع اطلاق الداخل علیہ أیضا وھو المراد بالمشاش فافھم علی أن تفسیر الفقہاء أولی من تفسیر المغرب -

وأما علی السادس ، فظاھر غیر خفی

## تائید الکلام السابق

قال العلامۃ النووی فی شرحہ علی صحیح مسلم ، مانصہ : واجمع العلماء علی جواز التضحیۃ بالاجم الذی لم یخلق لہ قرنان واختلفوا فی مکسور القرن فجوزہ الشافعی وابو حنیفۃ والجمھور سواء کان یدمی ام لا وکرھہ مالک اذا کان یدمی وجعلہ عیبا اھ ج ۲ ص ۱۵۵

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ اور جمہور علماء کے نزدیک مکسور القرن کی قربانی مطلقاً جائز ہے خواہ اس کسر کی وجہ سے خون بھی بہتا ہو یا نہ بہتا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جواز اضحیہ میں غلاف قرن و داخل غلاف کا ایک برابر ہے ۔ داخل غلاف بھی کے ٹوٹنے سے خون بہتا ہے اور امام ابو حنیفہ و جمہور علماء اس کو بھی مضر نہیں کہتے صرف امام مالکؒ نے اس کو مکروہ کہا ہے جبکہ خون بہتا ہو پس مشاش و مخ کی جو تفسیر مجیب علام نے کی ہے وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر منطبق ہو سکتی ہے مگر حنفیہ کے مذہب پر، لیکن وہ بھی صرف کراہت کے قائل ہیں عدم جواز کے وہ بھی قائل نہیں - رہا یہ کہ حدیث میں اعضب القرن سے نہی وارد ہے اور عضباء کے معنی الشاۃ المکسورۃ القرن الداخل ہیں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عضب کے معنی قطع کے ہیں پس اعضب القرن بمعنی مقطوع القرن ہوا جو اس کو بھی شامل ہے جس کا سینگ جڑ سے ٹوٹ گیا ہو گو عضباء کا استعمال بمعنی خاص بھی ہوتا ہے ، ہمارے نزدیک اعضب القرن

بمعنی مقطوع الاصل ہے۔ قاموس میں ہے کبش اعضب بین العضب ج ۱۔ ص ۶۵
پس ہمارے نزدیک اعضب القرن سے مراد وہی ہے جس کے سینگ کی جڑ ظاہر ہوگئی ہو یا سینگ جڑ سے ٹوٹ کر لٹک گیا ہو، بین العضب اسی کو بولیں گے۔ ھذا والله اعلم وعلمه اتم واحکم وبعد الحق لا یتجاوز عن ھذا بعد الفحص الکثیر من کلام الفقہاء السادات الحنفاء۔ فقط۔

حررہ المفتقر الی مرتبه الصمد
عبدہ المذنب ظفراحمد عفا اللہ عنہ بعتہ وکرمه المؤبد
۲ر صفر المظفر سنہ ۳۹ھ

تتمہ قال فی المرقاۃ فی تفسیر اعضب القرن والاذن ای مکسور القرن مقطوع الاذن الی أن قال وقیل مقطوع القرن والاذن والعضب القطع وفی المھذب انه تجوز الجماء التی لا قرن لھا او کان مکسورًا أو ذھب غلاف قرنھا فیکون النھی تنزیھا اھ
ج ۲۔ ص ۲۶۶
اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جواز حنفیہ میں جماء اور مکسور القرن اور ذاھب الغلاف سب برابر ہیں۔ اگر حنفیہ کا مذہب اس میں خلاف قول مہذب ہوتا تو علامہ علی قاری ضرور اس پر تنبیہ فرماتے حالانکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ حدیث کا کراہۃ تنزیہ پر محمول ہونا ظاہر کر دیا جس کی دلیل حضرت علی کی دوسری حدیث ہے جو ترمذی نے اس سے پہلے نقل کی ہے۔
عن حجیة بن عدی عن علی قال البقرة عن سبعة قلت فان ولدت قال: اذبح ولدھا معھا، قلت: فالعرجاء قال: اذا بلغت المنسك قلت: فمکسورة القرن فقال: لا بأس أمرنا أو امرنا رسول الله صلی اللہ علیه سلم امرنا بذلك ولم یأمرنا بذلك ولم یأمرنا باستشراف القرن فلا بأس بالمکسورة القرن ترمذی ج ۱۔ ص ۱۸۱
دوسری بات عبارت مرقات سے یہ معلوم ہوئی کہ مکسور القرن اسی کو بولتے ہیں جس کا سینگ مع غلاف وداخل غلاف کے ٹوٹ گیا ہو کیونکہ اس میں مکسور کے بعد او ذھب غلاف قرنھا مقابلہ میں مذکور ہے اور یہی میرا خیال ہے کہ جس کا سینگ

اندر سے نہ ٹوٹا ہو صرف غلاف اتر گیا ہو اس کو مکسور القرن نہیں کہتے بلکہ اس کو ذاهب الغلاف کہنا چاہئے۔

پس کلامِ فقہاء میں جہاں کہیں مکسور القرن کی اجازت مذکور ہے اس سے وہی مراد ہے جس کا غلاف و داخلِ غلاف دونوں ٹوٹ گئے ہوں بشرطیکہ دماغ و مشاش تک اثر نہ پہنچا ہو اور عبارتِ جوہرہ میں قصماء کی اضحیہ کا جواز مذکور ہے اس سے مکسور القرن ظاہراً و باطناً کا عدمِ جواز ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ عبارت اس سے ساکت ہے، اور علامہ علی قاری کی عبارت اور فقہاء کا اطلاق اور اشتراکِ علت اور علامہ نووی کا کلام جواز کو مقتضی ہے اور ظاہر ہے کہ تصریحاتِ فقہاء کو سکوت پر ترجیح ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

ذابح کی اعانت کرنے کا معنی | السوال: جو شخص بوقت ذبح بکری کے پیر وغیرہ پکڑے رکھے وہ معینِ ذابح ہے یا نہیں اور اس کا بوقتِ ذبح، تکبیر یعنی بسم اللہ اللہ اکبر کہنا لازم ہے یا نہیں اور اگر بوقتِ ذبح کچھ بھی نہ پڑھے تو ذبح درست ہو جاوے گا یا نہیں؟

السائل:

محمد اسماعیل ناظم انجمن اسلامیہ گورکھپور

## الجواب

پیر وغیرہ پکڑنے والا معینِ ذابح نہیں بلکہ معینِ ذابح وہ ہے جو ذبح کرنے والے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔

قال فی الخلاصۃ: وفی الاصل التسمیۃ عند الذبح شرط عند القطع آھ۔ ج ۴ ص ۳۰۳

قلت: مقتضاہ ان یشترط علی القاطع لا غیر قال فی الاشباہ: مجوسی اخذ بید مسلم فذبح والسکین فی ید المسلم لا یحل اکلہ الوجیز مسلم عن مد قوسہ بنفسہ فاعانہ علی یدہ مجوسی لا یحل اکلہ اھ ص ۱۱

قلت: وقیود الفقہ احترازیۃ فلو لم یاخذ بید الذابح لا یعد معینا اھ۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۹ رجب ۱۳۴۴ھ

ذابح نے غلط تلفظ کے ساتھ بسم اللہ اللہ اکبر کہا تو ذبیحہ درست ہے یا نہیں

(السوال): اگر کوئی جاہل غیر حافظ جو نماز کی بھی پابندی نہیں کرتا، غلط تلفظ کے ساتھ بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ درست ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

السائل:
محمد اسماعیل گورکھپوری

## الجواب

جب بسم اللہ لیدیا تو ذبیحہ حلال ہوگیا۔

قال فی الخلاصة: ولو قال مكان التسمية الحمد لله او سبحان الله يريد التسمية اجزاه اھ ج ۴ ص ۳۰۸

بس بسم اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرنے سے حلت میں کچھ شبہ نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۹ رجب سنہ ۱۳۵۲ھ

بعد فوت اضحیہ کے ذبح کافی نہیں بلکہ تصدق ہی واجب ہے

(السوال): کسی شخص پر قربانی واجب تھی لیکن قربانی کے تین دن گزر گئے اس نے قربانی نہیں کی تو اس کا حکم یہ ہے کہ ایک بکری یا بھیڑ کی قیمت خیرات کر دے اگر اس نے قیمت تو نہیں خیرات کی بلکہ اس نے یہ کیا کہ پچھلے سال کا بھی ایک اور حصہ اب کے سال گائے میں لے لیا تو اس سال گذشتہ کی قضاء قربانی صحیح ہو جاوے گی یا نہیں؟ اس مسئلہ کا جواب مع حوالہ کتب ضرور تحریر فرمائیں نہایت احسان ہوگا۔

السائل:
محمد عمران مدرس مدرسہ ارشاد العلوم
گڑھی پختہ ضلع مظفر نگر

## الجواب

بعد فوت ایام اضحیہ کے تصدق قیمت شاۃ ہی واجب ہے سال موجودہ میں حصہ لینے یا بکری ذبح کرنے سے سال گذشتہ کی قضاء نہیں ہو سکتی۔

قال قاضی خان: ولو لم یفعل شیئاً من ذلک حتی جاء ایام النحر من السنۃ القابلۃ وضحی بھا عن العام الاول لا یجوز لان اراقۃ الدم عرفت قربۃ اداءً لا قضاءً اھ ج ۳ ص ۳۳۰ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۳ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۲ھ

**مالکِ تالاب کا لوگوں کو مچھلیاں شکار کرنے سے روکنے کا حکم**

**السوال:** جس تالاب کے چاروں طرف مٹی اسقدر بلند ہو کہ کبھی باہر کا پانی اندر اور اندر کا پانی و مچھلی باہر نہیں آجا سکتے اور اس کا مدخل مالک تالاب کے اختیار میں ہے۔ ایسے تالاب میں دو قسم کی مچھلی ہوتی ہے۔ ایک وہ کہ جسے مالک خود خرید کر اس تالاب میں چھوڑتا ہے جس کو ہمارے ملک میں روہی کتال وغیرہ کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے کہ جو مدخل یا کسی اور طرح سے اس میں آجاتی ہے۔ اس بارے میں سوال یہ ہے کہ مالک تالاب ان دونوں قسم کی مچھلی کے شکار کرنے سے غیر کو روک سکتا ہے یا نہیں؟ یا اس میں ایک صورت میں منع کر سکتا ہے اور دوسری صورت میں منع نہیں کر سکتا۔ فقط والسلام

**تنقیح سوال:** اس عبارت یعنی خط کشیدہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

**جواب تنقیح:** اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ تالاب پانی نکلنے یا اندر لانے کیلئے جو راستہ رکھا جاتا ہے اس کو جب کھول دیتے ہیں تو باہر سے قسم قسم کے مچھلی آجاتی ہیں اور کبھی تالاب کے بند رہتے ہوئے بھی بعض مچھلیاں کان سے چل کر اندر چلی جاتی ہیں جس کو کٹے مچھلے کہتے ہیں۔

## الجواب

اگر تالاب مچھلی ہی کے جمع کرنے اور پرورش کرنے کے لئے بنایا گیا ہے تو اس میں جس قدر مچھلیاں ہوں خواہ خرید کر چھوڑی ہوں یا خود آگئی ہوں سب مالک تالاب کی مملوک ہیں۔ دوسروں کو ان کا شکار جائز نہیں ہے۔ اس لیے دوسروں کے روکنے کا بھی حق ہے اور اگر اس غرض کے لئے نہیں بنایا گیا تو جو مچھلیاں خرید کر یا پکڑ کر اس میں چھوڑی جائیں وہ اور ان کی نسل مملوک ہیں، خواہ مدخل کو بند کرے یا نہ کرے اور جو از خود داخل ہوں وہ مملوک نہیں ہیں مگر جبکہ داخل ہونے کے بعد مدخل کو بند کر دیا جائے

تو وہ بھی مملوک ہو جائیں گی۔ اور شکار سے روکنے کا حق مملوک ہیں۔ بے ذکر فیہ مملوک میں فافہم۔ ھذا ما فہمتہ من عبارۃ الشامیۃ ج ۴ ص۲۱۴ و ص۲۱۵
اور یہ مسئلہ تتمہ جلد ثالث فتاوی امدادیہ میں بھی ہے ص۱۱۸ مگر اس میں اعداد للسماک کی صرف ایک ہی صورت مذکور ہے سد مدخل ونحوہ۔ اس سے یہ بھی مفہوم نہیں ہوتا کہ پورا تالاب بھی معد للسمک ہو سکتا ہے مگر حضرت مولانا نے مشافہۃً مجھ سے فرمایا کہ تالاب پورا بھی معد للسمک ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ سرا جیا امدادیہ
۵ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

**گونگے آدمی کے ذبیحہ کا حکم**

السوال: جو شخص گونگا آدمی جانور کو ذبح کرے تو وہ حلال ہوگا یا حرام اور اس کو تکبیر پڑھنا کس طرح سکھایا جاوے اور اس کے نکاح خوانی میں قبول کس طرح کر دیا جاوے۔

# الجواب

قال فی العالمگیریہ: وتؤکل ذبیحۃ الاخرس مسلماً کان او کتابیاً کذا فی قاضیخان اھ ج ۶ ص ۱۹۲
اس سے معلوم ہوا کہ گونگے مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے اشارہ سے اس کو تکبیر سکھا دی جاوے اور نکاح میں اس کا اشارہ سر وغیرہ سے قبول کر لینا کافی ہے واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۱۲ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

**قربانی کے جانور کو تبدیل کرنے کا حکم**

السوال: زید نے قربانی کے لئے ایک گائے ۲۷ روپے میں خریدی اور عمر نے ایک گائے ساڑھے ستائیس ۲۷½ روپیہ میں خریدی اور عمر نے کاشتکاری کی غرض سے خریدی۔ مگر عمر کی گائے دیکھنے

میں زید کی گائے سے زیادہ موٹی تازہ نظر آتی ہے اور کچھ بڑی بھی ہے مگر بیل جوتنے میں بالکل ناکارہ ہے اور زید کی گائے بیل جوتنے میں خوب چست و چالاک ہے اس لئے عمر سے کہتا ہے کہ تم اپنی گائے مجھے دیدو اور میری گائے لے لو۔ وہ قربانی کرلو۔ جانب میں اس کو تبدیل کرکے قربانی کرنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں۔ اگر یہ صورت جائز نہ ہو پھر یہ کس طرح جائز ہوگی۔

الجواب جائز ہے۔ اگر زید صاحب نصاب ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

المقیم بالخانقاہ الامدادیہ، تھانہ بھون

۲۴ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

جو جانور قربانی کے واسطے متعین کر دیا ہو اس کا گوشت کھانے کا حکم اور اس صورت میں نذر ہونے کا اشکال اور اس کا جواب

السؤال: معروض حضور فیض گنجور اینکہ از قدیم الایام بہ رسم این دیار چنیں افتادہ است کہ شیخ و فقراء جانور برای اضحیہ دو چہار روز پیشتر از ایام آخر کردہ می شود و مردمان جانور آں خریدہ برای اضحیہ نام زد کردہ متعین می سازند و ہمچنیں اگر جانورے بملک کسے باشد نیز قبل ایام نحر برای قربانی متعین کردہ میسازند و روز نحر آنرا ذبح کردہ غنی و فقیر ہمہ می خورند، فی الحال مارا دریں باب شکے افتادہ است بزعمے از الہ آں سب کتابہا دیدہ ایم، جواب شافی میسر نیامد۔ سیدا ست کہ آنجناب جواب شافی دادہ ممنون و مشکور فرمایند، فتوائے کہ دریں باب نوشتہ شدہ است بعینہ نقل کردہ میشود اگر آنرا صحیح پندارند بہ بودستخط مزین نمایند و اگر روایتے قابل تردید باشد آنرا رد کنند۔

## نقل مطابق اصل

ما قولکم رحمکم اللہ تعالیٰ اندرینکہ اضحیہ کدام وقت واجب میگردد و اگر کسے حیوانے جہت اضحیہ قبل ایام النحر خریدہ بزبان ہم نگوید کہ این برای اضحیہ خریدہ ام یا بدیں قربانی خواہم کرد۔ و ہمچنیں اگر جانورے بملک کسے باشد و آنرا دراں ایام برای قربانی نام زد کردہ متعین ساز دآیا دریں ہر دو صورت آں حیوان منذور باشد یا نہ و بتقدیر اول غنی از ذبح آں از ادائے واجب کافی باشد یا نہ و

خوردنِ آن نادار وغنی را روا باشد یا نہ؟ بینوا توجروا۔

# الجواب وباللہ التوفیق

وقت وجوب اضحیہ فجر یوم النحر است تا آخر آن ایام لما فی الدر المختار۔ فتجب التضحیۃ علی حر مسلم مقیم موسر عن نفسہ لا عن طفلہ، شاۃ او سبع بدنۃ فجر یوم النحر الی آخر ایامہ اھ

پس اگر کسے جانورے را بجہت آن قبل آن خریدہ نام زد کند آن منذور باشد لما فی الدر المختار۔

(قولہ لوجوبہا علیہ بذلک) ای بالشراء وھذا ظاھر الروایۃ لان شراءہ لہا یجری مجری الایجاب وھو النذر بالتضحیۃ عرفا کما فی البدائع انتھی۔

وفی فتاوی قاضی خان: رجل اشتری شاۃ للاضحیۃ واوجبہا بلسانہ ثم اشتری اخری جاز لہ بیع الاولی فی قول ابی حنیفۃ ومحمد رحمہما اللہ فان کانت الثانیۃ شرا من الاولی وذبح الثانیۃ فانہ یتصدق بفضل ما بین القیمتین لانہ لما اوجب الاولی بلسانہ فقد جعل مقدار مالیۃ للہ[1] فلا یکون لہ ان یستفضل لنفسہ شیئا فلہذا یلزمہ التصدق بالفضل انتھی[2]

می گویم کہ اگر آن مستحب بود نیز درے تصدق لازم شدے۔

وفی الصورۃ الثانیۃ: فلا یجاب باللسان وما یوجب باللسان یکون واجبا کما علم مما سبق ویعلم مما فی الہدایۃ وشرحہا۔ ففی الہدایۃ: ولو لم یضح حتی مضت ایام النحر ان کان اوجب علی نفسہ الفقیر وفی الکفایۃ قولہ: ان کان اوجب علی نفسہ ای شاۃ بعینہا بان یکون فی ملکہ شاۃ فیقول اضحی بہذہ او

---

[1] الکلام علیہ۔ قلت ھذا راجع الی الفقیر فقط دون الغنی کما سیاتی فی حاشیۃ الصفحۃ الآتیۃ وھو محمول علی ما اذا نوی بہ الایجاب اما لو نوی بہ الاخبار فلا نذرا صفحہ ۳ ۱۲ ظ

[2] الکلام علیہ: اقول جواز البیع یدل علی عدم کون شراءہ منذورا فان المنذور لا یجوز بیعہ کما سیاتی ان الفقیر اذا اشتری شاۃ للاضحیۃ تعینت لہا ویمتنع علیہ بیعہا واما ــــــــ

وقد استفيد منه ان الجعل المذكور نذر وان النذر بالواجب صحيح
انتهى. فلو لم يوجب باللسان لم يجب بمجرد النية لما في رد المحتار نقلا عن البدائع
فلو كانت في ملكه فنوى ان يضحي بها لا يجب انتهى ملخصا
ہم گاہ این منذور باشد غنی را ذبح آن از ادای واجب کفایت نکند لما یأتی ایضا
واعلم انه قال في البدائع ولو نذر أن يضحي شاة وذلك في أيام النحر
وهو موسر فعليه أن يضحي بشاتين عندنا شاة بالنذر وشاة بإيجاب الشرع
ابتداء الا اذا عنى به الاخبار عن الواجب عليه فلا يلزمه الا واحدة ولو قبل
أيام النحر لزمه شاتان بلا خلاف لأن الصيغة لا تحتمل الاخبار عن الواجب اذ لا
وجوب قبل الوقت وكذا لو كان معسرا ثم أيسر في أيام النحر لزمه شاتان. انتهى
ومقتضى هذا ان الموسر إذا نذر في أيام النحر وقصد الاخبار عن الواجب
لم يكن ذلك منه نذرا حقيقة وان لزوم الشاة عليه بإيجاب الشرع أما اذا
لم يقصد الاخبار او كان قبل أيام النحر أو كان معسرا فأيسر فيها فانه وان
لزمه شاة أخرى بالنذر ولكنها لم تكن واجبة قبل بل واجبة غيرها فهو نذر
حقيقة. انتهى.
وخوردن منذور را فقیر وغنی را روا نباشد لما فيه أيضا ( قوله ويأكل من لحم

---

اضحية راجعا إلى الغني والفقير كليهما والظاهر أنه راجع إلى الفقير فقط دون الغني لأن الجعل المذكور
ليس أقوى من الشراء بنية الاضحية ولم يكن الشراء كذلك نذرا في حق الغني كما صرحوا فكذلك
جعله نعم هو نذر في حق الفقير مثل الشراء في حقه فلا حاجة إلى الجواب الذي ذكرناه. والله أعلم
١٢ ظ

ولا يذهب عليك ان قوله جعلت هذه الشاة اضحية أو جعلته أضحي بها ليس من صيغ النذر
حقيقة وانما هو محتمل للانشاء والاخبار معا فلو أراد به الانشاء ابتداء صار نذرا والغني والفقير
فيه سواء ولو أراد الاخبار عن الحال او المستقبل لم يكن نذرا في حق الغني اصلا سواء كان قبل ايام
النحر او فيها لان الاخبار عن المستقبل مثله أيضا كالاخبار عن الحال والماضي وبالجملة فالتعيين
والجعل المتعارفان في بلادنا لا يدخلان في النذر لكونهما صادرين على طريقة الاخبار عرفا دون الانشاء
ولا نذر بنية الاخبار كما صرحوا. فافهم حق الفهم كذا قاله سيدي حكيم الامة دامت بركاتهم ١٢
ظ

الاضحية الخ) هذا فى الاضحية الواجبة والسنة سواء اذا لم تكن واجبة بالنذر وإن وجبت به فلا يأكل منها شيئا ولا يطعم غنيا سواء كان الناذر غنيا أو فقيرا لأن سبيلها التصدق وليس للمتصدق ذلك. ولو أكل فعليه قيمة ما أكل. زيلعى. انتهى. والله أعلم

كتبہ محمد عبد الحميد الفتحى عفى عنہ

## الكلام على الجواب المذكور

اقول هذا الجواب كله بناء الفاسد على الفاسد ومنشأوه اتحاد حكم الفقير والغنى فى وجوب تصدق شاة اشتريا ها للاضحية أو عيّنها لها من دون الشراء وفات وقت الاضحية بمضى ايام النحر وعدم جواز اكلهما منها لو ذبحاها بعد الوقت ففهم المجيب باتحادهما فى هذا الحكم كون شراء كل منهما نذرًا وكذا تعيينهما لها والحال ان وجوب تصدق الشاة المشتراة أو المعينة للاضحية على الغنى بعد مضى الوقت انما هو لسبب آخر لا لكون شراء او تعيينه لها فى حكم النذر. وما ذكره فى الشامية تحت قول الدر: ويكره الانتفاع بلبنها قبله كما فى الصوف ومنهم من اجازها للغنى لوجوبها فى الذمة فلا تتعين اه بما نصه. والجواب ان المشتراة للاضحية متعينة للقربة اى ان يقام غيرها مقامه فلا يحل له الانتفاع بها مادامت متعينة ولهذا لا يحل

---

عـه قلت ولما كان المشتراة للاضحية متعينة للقربة ثبت ان الشراء بنية الاضحية وقوله جعلت هذه اضحية وقوله أضحى بهذه كلها سواء فان الاخيرين ايضا لا يفيدا الزيادة على معنى التعيين فمن كان الشراء نذرا فى حقه وهو الفقير كان الاخيران ايضا نذرا فى حقه ومن لا فلو والايجاب باللسان فى حق الغنى لا يتحقق الا بصيغة تفيد الالزام لا بما يفيد التعيين فقط ۱۲ ظ

واما فى ايام النحر فشراء الغنى شاة للاضحية او تعيينه لها من دون الايجاب ابتداءً ليس بنذر ما لم يأت بصيغة النذر صريحا كقوله " لله على ان أضحى بهذه الشاة " ونحوها وهذا ايضا اذا لم يقصد الاخبار من الوجوب الشرعى عليه فلي—

حاشیہ :

بالشراء بنية الاضحية باتفاق الروايات. وان كان معسرًا فني ظاهر الرواية عن اصحابنا رحمهم الله تجب. وروى الزعفراني عن اصحابنا لا تجب وهو رواية النوادر. اھ

(هدايه مع فتح القدير ج ۸ ص ۴۳۵)

قلت فلو كان شراء الغني نذرًا كشراء الفقير لم اعتادهما في جواب المسئلة ووجوب الاثنين عليهما. وقد نص في الهداية على خلافه وصرح في العناية عن شيخ الاسلام بعدم الوجوب على الغني بالشراء بنية الاضحية وهذا صريح في انه كون شراءه نذرًا وهذا باتفاق الروايات فافهم - وفي الدر: وفقير شراها لها لوجوبها عليه بذلك - حتى يمتنع عليه بيعها. قال الشامي: وهذا ظاهر الرواية لان شراءه لها يجري مجرى الايجاب وهو النذر بالتضحية عرفا كما في البدائع

ووقع في التتارخانية: التعبير بقوله شراها لها ايام النحر وظاهره انه لو شراها قبلها لا تجب ولم اره صريحًا فليراجع اھ (ج ۵ ص ۲۲۳) قلت: وقد اختلف المشائخ في جواز اكل الفقير من شاة شراها للاضحية وعدم جوازه. قال الشامي: فعرفنا من كلامه ان الواجبة على الفقير بالشراء لا اكل منها وذكر ابو السعود ان شراءه لها بمنزلة النذر فعليه التصدق بها اھ

اقول: التعليل بانها بمنزلة النذر مصرح به في كلامهم ومفاده ما ذكر - وفي التتارخانية: سئل القاضي بديع الدين عن الفقير اذا اشترى شاة لها هل يحل له الاكل قال نعم. وقال القاضي برهان الدين: لا يحل اھ

ثم اعلم ان هذا كله فيما اذا ذبحها في ايام النحر بدليل ما قدمناه من البدائع انه اذا اوجب شاة بعينها او اشتراها ليضحي بها فمضت ايام النحر تصدق بها حية ولا يأكل منها لانتقال الواجب من الاراقة الى التصدق وان لم يوجب ولم يشتر وهو موسر تصدق بالقيمة اھ وقدمنا ان مفاد كلامهم ان الغني له الاكل من المنذورة

---

حسه قال الشيخ العلامة سيدي حكيم الامة ان الراجح في شراء الفقير بنية الاضحية رواية النوادر عندي لانهم عللوا ظاهر الرواية لما سبق ان شراءه لها يجري مجرى الايجاب وهو النذر بالتضحية عرفًا فظهر ان بناءه على العرف فيمكن ان يكون الايجاب متعارفا في عصرهم واما في زماننا فليس الايجاب متعارفا في شراء الفقير اصلا بل المتعارف نية التطوع ولا يخطر معنى النذر بشراءه في بال احد هذا والله اعلم - قلت ومقتضى ذلك جواز اكل الفقير من اضحيته ۱۲ ظ

حاشيه:

إذا قصد بنذره الإخبار عن الواجب. والمراد بالنذر في كلام الزيلعي هنا النذر ابتداء اهـ (ج ٥ - ص ٣٢٠)

قلت: وكما جاز ذلك في المنذورة بقصد الإخبار عن الواجب عليه فلأن يجوز به في ذلك في المشتراة بنية الأضحية الواجبة عليه أولى. فالقول بعدم جواز الأكل منها من المشتراة بنية الواجب وجعل ذلك نذرا وإيجاب الآخر عليه باطل لا أصل له.

قال الشامي: والحاصل أن التي لا يؤكل منها هي المنذورة ابتداء والتي وجب التصدق بعينها بعد أيام النحر والتي ضحى بها عن الميت بأمره على المختار كما قدمناه عن البزازية. والواجبة على الفقير بالشراء على أحد القولين المارين والتي ولدته الأضحية كما قدمناه عن الخانية. والمشتركة بين سبعة نوى بعضهم بحصته القضاء عن الماضي كما قدمناه آنفا عن التترخانية أيضا. فهذه كلها سبيلها التصدق على الفقير. فاغتنم هذا التحرير. ج ٥ - ص ٣٢٠

قلت: فهذه كما ترى لم يذكر فيها ما اشتراه الغني لأضحية أو عينه لها بل صرح بقيد الفقير في الواجبة بالشراء وبقيد الابتداء في المنذورة فاتضح الحق بلا امتراء واعتلى الفرق علو ذكاء في كبد السماء - هذا والله سبحانه وتعالى أعلم.

حرره العبد الفقير إلى لطف ربه الصمد عبده
المذنب ظفر أحمد المقيم بالخانقاه الامدادية
بتهانه بهون - ٢٣ ذي الحجة سنة ١٣٤٢ هـ

---

عــه قلت: ذكره بحث الهد ولو كان شريك الستة نصرانيا أو مريد اللحم لم يجز عن واحد اهـ بما تعمه ويشمل ما لو كان أحدهم مريد الأضحية عن عامه وأصحابه عن الماضي تجوز الأضحية عنه ونية أصحابه باطلة وصاروا متطوعين وعليهم التصدق بلحمها وعلى الواحد أيضا لأن نصيبه شائع كما في الخانية وظاهره عدم جواز الأكل منها اهـ (ج ٥ - ص ٣١٩)

قلت: وفهم منه أن الأضحية إذا فاتت لا يمكن قضاؤها بذبح شاة أو أخذ حصته من البدنة في العام القابل وهذا ما أفتيته لعتوبل. وقد سئلت عنه فأجبت بأن قضاء الأضحية لا يمكن إلا بتصدق القيمة دون إراقة الدم - ولله الحمد على ما علم وفهم. ١٢ ظ

مرغی یا کسی بڑے جانور کا سر بندوق یا ریل وغیرہ سے کٹ جائے اور محل ذبح باقی ہو اور جانور میں آثار حیات بھی ہوں تو اس کو ذبح کر کے کھانا حلال ہے یا نہیں؟

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مرغی کی فقط سری بلی نے کاٹ لی تھی یا کسی تیشہ وغیرہ پر تدو کی فقط گلا بندوق یا تیر سے جدا ہوگئی یا کسی بڑے جانور مثلاً گائے، بکری وغیرہ کی سری ریل کے نیچے آکر کٹ کر جدا ہوگئی یا فقط ہر چار رگیں جو کہ ذبح میں کاٹنی ضروری ہیں، کٹ گئیں لیکن سری جدا نہیں ہوئی اور ان ہر صورتوں میں گردن بہت سی بچی ہوئی موجود ہے اور جانور تڑپ رہا ہے تو چونکہ ذبح کا محل عقدہ سے تحر تک لکھتے ہیں پس تحر پر سے ذبح کر کے کھایا جاوے تو جائز ہے یا نہیں بعض کتب میں یہ منقول ہے کہ چونکہ سری جدا ہوگئی اور رگیں کٹ گئیں تو اب محل ذبح نہیں رہا اس لئے ذبح کر کے کھانا جائز نہیں ہے اور یہ بھی محل ذبح کے نہ رہنے کی علت لکھتے ہیں کہ چونکہ اب ان رگوں کے کٹ جانے سے یقین ہے کہ زندہ نہیں رہ سکتا اس لیے جائز نہیں ہے۔ فقط

## الجواب

نصف راس یا اکثر راس کے قطع ہو جانے کے بعد جانور محل ذبح نہیں رہا۔ اور کل راس منقطع ہو جانے تو بدرجۂ اولیٰ محل ذبح نہیں رہے گا۔

قال فی الدر المختار فی تفسیر قوله صلی اللہ علیہ وسلم ما ابین من الحی فهو میت وبه یعلم انه لو ابان الرأس کلا لانه لیس منفصلاً من حی حقیقة وحکماً بل حقیقة فقط لانه عند الانفصال میت حکماً (ج ۵ ص ۳۰۲)

او قطع نصف رأسه أو اکثره أو قدر نصفین اکل کله لأن فی هذه الصور لا یمکن حیاته فوق حیاة مذبوح اهـ

قال الشامی: وهذا فی صورة الاکل إذ لا یتوهم بقاء الحیاة بعد هذا الجرح اهـ

ان عبارات سے مستفاد ہوتا ہے کہ جس جانور کا سر جدا ہو جائے وہ حکماً میت ہے اسی سے قابل ذبح نہیں رہا۔

نعم: یشکل علیه قول الدر المختار وسیجئ انه یکفی من الحیاة قدر ما

بیعی فی المذبوح اھ (ج ۵ ص ۲۰۸)

وقولہ والمعتبر فی المتردیۃ واخواتہا کالنطیحۃ والموقوذۃ وما اکل السبع والمریضۃ مطلق الحیاۃ کما اشرنا الیہ وعلیہ الفتوی اھ (ص ۲۶۶)

مع قولھم ان ذکاۃ الاختیار ذبح بین الحلق واللبۃ وذکاۃ الضرورۃ جرح فی ای موضع وقع کذا فی الدر (ج ۵ ص ۲۸۰)

ان عبارات اخیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ المتردیہ والنطیحہ واشباہہا میں مطلق حیات صحت ذبح کے لیے کافی ہے۔ اور صورت مسئولہ میں اضطراب وحرکت یا مطلق حیات کی علامت موجود ہے۔ اور محل ذبح ما بین الحلق واللبہ ہے تو اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ اگر موضع ما بین اللبہ والحلق میں سے دو تین انگل باقی ہو جو ذبح کے قابل ہو اور جانور تڑپ بھی رہا ہو تو اس کو ذبح کر کے کھا سکتے ہیں گو سر علیحدہ ہو گیا ہو۔ اور عبارات سابقہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انفصال سر کے بعد جانور بحکم میت ہے۔ اسی لیے مجھ کو اس مسئلہ میں شرح صدر نہیں ہے۔ واللہ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۵ ر صفر ۱۳۴۲ھ

## التنقید علی الجواب المذکور من علماء مدرسۃ سہارنپور

حامدا ومصلیا ومسلما - پہلی روایت جو جواب اول میں نقل کی گئی ہے وہ مذبوح کے بارے میں ہے اس لیے کہ حدیث ما ابین من الحی فھو میت میں اطلاق حی اس امر کو مقتضی ہے کہ منفصل من الحی الحقیقی والحکمی میت ہوتا ہے۔ پس جو منفصل من الحقیقی ہو اور منفصل من الحی الحکمی نہ ہوگا۔ جیسا کہ ذبح کرتے وقت اگر سر جدا ہو جائے تو جانور اس وقت اگرچہ حقیقۃً زندہ ہوتا ہے مگر ذبح کی وجہ سے حکماً وہ زندہ شمار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ میت یعنی مذبوح شمار ہوتا ہے۔ اس لیے اس سر کا کھانا شرعاً جائز ہوتا ہے جیسا کہ روایت وبہ یعلم انہ لو ابان الرأس اکل لانہ لیس منفصلا من حی حقیقۃ وحکما الخ سے واضح ہوتا ہے۔

تحریر مندرجہ بالا سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عبارت مذکورہ خاص مذبوح کے بارہ میں

ہے، عام نہیں۔ یعنی ہر جانور جس کا سر جدا ہو جائے خواہ وہ کسی وجہ سے ہو اس جانور کو حکماً میت کہا جاوے کہ جس کی وجہ سے اس کا ذبح کرنا ناجائز ہو یہ صحیح نہ ہوگا۔ اور دوسری روایت یعنی اذا قطع نصف رأسہ أو اکثرہ اور قدرہ نصفین اکل کلہ الخ یہ ذکوٰۃ اضطراری کے بیان میں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تیر پھینکنے والے نے تیر کے ذریعہ نصف سر یا اکثر سر کاٹ دیا تو اس کے بعد ان دونوں حصوں کا کھانا جائز ہوگا بغیر ذبح کے اس لیے کہ تیر سے زخم کر دینا ہی صید کے لیے شرعاً ذکوٰۃ قرار دی گئی ہے۔ پس جیسا کہ ذبح میں سر کے الگ ہو جانے کے بعد وہ جانور حکماً میت ہو جاتا ہے ایسا ہی یہاں پر بھی قطع نصف رأس یا اکثر رأس کے بعد وہ جانور حکماً میت شمار ہوگا۔ تو یہاں پر سر منفصل من الحی الحکمی نہ ہوا۔ اگرچہ منفصل من الحی الحقیقی ہوگا۔ اور جب تک وہ منفصل من الحی الحقیقی والحکمی نہ ہو اس وقت تک بمقتضی حدیث ما ابین من الحی الخ حرام نہ ہوگا۔ بلکہ حلال ہی رہے گا۔ تو ان دونوں عبارتوں میں میت سے مراد مطلقاً حی کا مقابل نہیں بلکہ حی حکمی کا مقابل مراد ہے تو اس وقت صید میں ذبح کی ضرورت نہ رہے گی اور بغیر ذبح کے اس کا کھانا جائز ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ ذبح جائز ہی نہیں، کیونکہ ذبح کی تو ان دونوں صورتوں میں ضرورت ہی نہیں بلکہ ذبح متحقق ہو گئی اور وہ مردار ہو گیا اس کا کھانا اب جائز نہیں ہوگا۔ پس صورت مسئولہ میں اگر محل کسی جانور کا باقی ہو خواہ سر اس کا بندوق کے ذریعہ الگ ہو گیا ہو یا ریل کے نیچے آکر یا بلی وغیرہ نے توڑ لیا ہو تو اس کو حلال کر کے کھانا جائز ہے۔ البتہ جو حصہ سر کا الگ ہو گیا ہے وہ حصہ حرام ہوگا کیونکہ منفصل من الحی الحقیقی ہے۔

فی الدر المختار: وان علمت حیاتھا وان قلت وقت الذبح اکلت مطلقاً لکل حال۔ انتھی۔

وفی الشامی: تحت قولہ: وان کانت حیاتھا خفیۃ۔ عن البزازیۃ: شاۃ قطع الذئب اوداجھا وھی حیۃ لا تذکی لفوات المحل ولو انتزع رأسھا وھی حیۃ تحل بالذبح بین اللبۃ واللحیین انتھی۔

راقم ضیاء احمد عفی عنہ
۱۵ ربیع الاول [illegible]ھ

الجواب صحیح۔ عبد اللطیف عفا اللہ عنہ۔
مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

الجواب صحیح۔ خلیل احمد عفی عنہ
مدرس مدرسہ مظاہر العلوم

عقیقہ کے جانور میں چند بچوں کا عقیقہ ایک ساتھ ہوسکتا ہے یا نہیں

السؤال: عقیقہ میں بیل، بکری وغیرہ ما یکفی نوا حد چند بچوں کے لیے بھی کافی ہوسکتا ہے؟

الف: خواہ بچے ایک ہی دن میں سب پیدا ہوئے ہوں یا آگے پیچھے مگر سنیچر یا اتوار مثلاً روز کے حساب سے سب برابر ہوں۔

ب: یہ بچے ایک ہی شخص کے ہوں یا دو، تین اشخاص کے

## الجواب

بکری میں تو ایک بچہ سے زائد کا عقیقہ نہیں ہوسکتا اور گائے بیل میں سات بچوں تک کا ہوسکتا ہے خواہ سب ایک ہی شخص کے ہوں یا مختلف لوگوں کے اور ساتھ پیدا ہوئے ہوں یا آگے پیچھے۔ کیونکہ تاریخ کا لحاظ مستحب ہے ضروری نہیں۔

والدلیل ما فی الحامدیۃ: ولا یکون فیہ دون الجذع من الضأن والثنی من المعز ولا یکون فیہ الا السلیمۃ من العیوب لانہ اراقۃ دم شرعا کالاضحیۃ الی أن قال واحکامہا احکام الاضحیۃ اھ ج ۲ ص ۲۱۲ - ۲۱۳

وقال الشامی: فی مسئلۃ الاشتراک فی الاضحیۃ عند اختلاف الجہۃ وشمل ما لو کانت القربۃ واجبۃ علی الکل او البعض اتفقت جہاتہا اولا کالاضحیۃ واحصار وجزاء صید وحلق ومتعۃ وقران لان المقصود من الکل القربۃ وکذا لو اراد بعضہم العقیقۃ عن ولدہ قد ولد لہ قبل ذلک لان جہۃ التقرب بالشکر علی نعمۃ الولد ذکرہ محمد - ج ۵ ص ۳۱۹

قلت ولما جاز الاشتراک بالعقیقۃ فی بقرۃ الاضحیۃ فجواز اشتراک السبعۃ فی بقرۃ العقیقۃ أولی لاتحاد الجہۃ - واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون
۲۷ صفر ۱۳۴۵ھ

تخفیف ایذا کے لیے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بے ہوش کرنا

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ غیر قوموں کو مسلمانوں پر ایک

پر اعتراض کا دُکش ہی نیز دیگر حلال جانوروں کے متعلق ہے کہ اس کے ذبح میں بلاوجہ
ایک جاندار کی ایذاء اور تکلیف ہوتی ہے، جو انسانی اخلاق کے خلاف ہے تو کیا اگر اس
کے دفعیہ کے لیے اگر کوئی صورت نکالیں۔ در جانوروں کو کسی دوا وغیرہ سے بیہوش کر کے
ذبح کریں تو آیا جانور کو کسی بے ہوشی لانے والی دوا سے بیہوش کرنا اور بیہوشی کی حالت
میں ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے یا نہیں۔ مدلل جواب با صواب تحریر کریں فقط والسلام

احقر ابراہیم بن یوسف سورتی بس نمبر ۱۲۱
رنگون

## الجواب

غیر قوموں کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔ تجربہ اور اقوال اطباء اس پر شاہد ہیں کہ ذبح
میں جانور کو بنسبت جان کنی بدون ذبح کے بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ غیر قوم
ذرا ذرا سی بات پر انسانوں کے قتل سے تو رکتے نہیں اور جانور پر اتنا رحم! یہ کونسا قاعدہ
ہے۔ پس مخالفین کے اعتراض سے متاثر ہونا اور اس سے متاثر ہو کر جانور کو ذبح سے
پہلے بیہوش کرنا جائز نہیں۔ یہ جواب تو اس صورت میں ہے جبکہ جانور کو دوا سونگھا کر
بیہوش کیا جائے اور اگر کھانے پینے کی دوا دے کر بیہوش کیا جاوے تو اس میں دو گناہ
ہیں۔ ایک تاثر من اعتراض المخالفین کا گناہ۔ دوسرے جانور کو مسکر و مضر کے کھلانے
پلانے کا گناہ۔

قال فی الدر: وحرم الانتفاع بها ولو لسقی دواب الی ان قال
ویحرم اکل البنج والحشیشة والافیون اھ ای القدر المسکر منها۔
(ج ۵ - ص ۴۵۳)

اور اگر بیہوش کر کے کسی نے ذبح کر دیا تو ذبیحہ حلال ہوگا جبکہ شرائط ذبح تمام
موجود ہوں مگر کراہت سے خالی نہیں اور اس کا گوشت کھانا جائز ہوگا۔ لیکن ایسے بیہوش
کردہ گائے یا بکری وغیرہ ذبح کرنے سے قربانی کے ادا اور صحیح ہونے میں تامل ہے۔

قال فی الدر: ویضحی بالجماء والخصی والثولاء ای المجنونة اذا لم یمنعها
من السوم والرعی وان منعها لا اھ

قال الشامی: الثول بالتحریک استرخاء فی اعضاء الشاة خاصة او کالجنون

یصیبہا فلا تتبع النفس وتستدیر فی مرتعہا اھ (ج ۵ ص ۳۰۵)
ولا شک ان الحیوان اذا عتی علیہ یمتنع من السوم والرعی وایضا ینتقص
ثمنہ فی ہذہ الحالۃ حتما لا یقال ان ہذا العیب بمقدمات الذبح لانا
نقول بل ھو تعییب تکان کما اذا فقأ عینہ اوکسر رجلہ قبل الذبح کذا
قال فی الدر: ولا یضر تعیبہا من اضطرابہا عند الذبح اھ
قال الشامی: وکذا لو تعیبت فی ہذہ الحالۃ وانفلتت ثم اخذت من
فورہا وکذا بعد فورہا عند محمد خلافا لابی یوسف لانہ حصل بمقدمات
الذبح زیلعی (ج ۵ - ص ۳۱۸)
قلت: واما لو عیبہا احد عمدا من دون اضطرابہا او انفلاتہا فالظاہر
عدم الاجزاء عندہما حینئذ نعم یبقی ان جعلہا مغشیا علیہا عیب کالقول ام ھو
دونہ اولیس بعیب اصلا۔ فلیتأمل،
قلت: ولعل فی ذلک ایذاء الحیوان بازید مما یحتاج الیہ فی الذبح
فکان کجرہ برجلہ الی المذبح ونحوہ فان التغشیۃ تورث انضغاطا و
انقباضا فی الروح شبیہا بالذبح کما شاھدہ کثیر من الناس وقد کرہ الشارع
ایذاء الحیوان قبل الذبح بازید مما یحتاج الیہ فیہ۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔
حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون، خانقاہ امدادیہ
۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ

**قربانی کی نیت سے بکری چھوڑ رکھی تھی وہ حاملہ ہوگئی تو اس کی قربانی میں کوئی قباحت نہیں**

السوال: عرض یہ ہے کہ ایک بکری اپنی خوشی سے اس نیت سے چھوڑ رکھی تھی کہ عیسیٰ الضحیٰ علیہ السلام کے نام قربان کروں گا وہ گابھن ہوگئی اور غالبا
بقر عید سے ایک دو روز پہلے یا اسی روز بیا جائے گی اس کی قربانی میں بوجہ بچہ کے قباحت تو
نہیں اور بچہ بھی قربانی کر دیا جائے یا نہیں۔ جو شرعا حکم ہو جلد جواب سے مشرف
فرماویں چونکہ بقر عید آگئی ہے۔ فقط

## الجواب

اگر یہ شخص غنی صاحب نصاب ہے تو اس بکری کی جگہ دوسری کر سکتا ہے۔ اگر صاحب نصاب نہیں تو اس کی قربانی واجب نہیں اور حاملہ کی قربانی میں کچھ حرج نہیں۔ اگر ساتھ بچہ زندہ نکل آئے تو اس کو بھی ساتھ ہی قربانی کر دینا چاہئے غنی اور فقیر میں یہ فرق جب ہے کہ بکری اسی نیت سے خرید کر چھوڑی ہو اور اگر خریدی نہیں بلکہ گھر میں پیدا ہوئی تھی یا کسی اور طرح مل گئی تھی، یا خریدی ہے مگر نیت بعد میں ہوئی ہے تو پھر فقیر کا بھی وہی حکم ہے جو غنی کا مذکور ہوا ہے۔

قال الشامی تحت قوله (شراؤها لها) فلو كانت في ملكه فنوى ان يضحي بها او اشتراها ولم ينو الاضحية وقت الشراء ثم نوى بعد ذلك لا يجب لان النية لم تقارن الشراء فلا تعتبر (بدائع)

وقال الشامي: تحت قوله (قبل الذبح) فان خرج من بطنها حيا فالعامة على انه يفعل به ما يفعل بالام الخ (ج ۵ ص ۲۲۲ و ص ۲۳۳) والله اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۳ھ

**دوسرے کی طرف سے بغیر اجازت قربانی کرنے کا حکم**

**السوال:** قربانی میری طرف سے ہمیشہ بھتیجے ہی کر دیتے ہیں اور بعد دریافت کرنے کے معلوم ہوتا ہے کہ میری طرف سے بھی کر دی ہے۔ مگر قربانی کرنے سے پہلے مجھ سے نہیں کہتے کہ میں تمہاری طرف سے قربانی کروں گا اور مجھ سے عیدگاہ سے واپس آنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ میں اگر موجود ہوں تو شاید وہ مجھ سے دریافت بھی کریں۔ تو آیا یہ قربانی میری طرف سے ان کا کر دینا درست ہو جاتا ہے یا نہیں اور شبہ کی وجہ سے کبھی کبھی میں از خود بھی کر دیتا ہوں۔ مگر ان کا کرنا میری طرف سے کفایت نہ کرے گا تو میں خود ہی اپنی طرف سے قربانی کروں گا۔ اس میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ مگر اب میں اس شبہ کو رفع کرنا چاہتا ہوں کہ صاف طور پر معلوم ہو جاوے تاکہ اس کے موافق عمل کروں اور اگر ادا نہیں ہوا تو پھر کس طرح ادا کیا جاوے کیا صورت ادائیگی کی اب ممکن ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ در صورت عدم ادائیگی

کل سالوں کا حساب لگا کر اکٹھے ادا کردوں تاکہ مؤاخذۂ اخروی سے سبکدوش ہوجاؤں
اَللّٰھُمَّ سَتِّمِل عَلَینَا۔ میری اہلیہ کیطرف سے بھی کبھی کبھی میرے بھتیجے ہی قربانی کردیتے ہیں
لہٰذا ان کی جانب سے میرے بھتیجے کو قربانی کرنا درست ہوجاتا ہے یا نہیں؟

خادم عبدالرحمٰن

# الجواب

فی العالمگیریۃ: ج ۵ ص ۳۰۲ - اذا ضحی بشاۃ من غیرہ بامر ذلک الغیر او بغیر امرہ لا تجوز لانہ لا یمکن تجویز التضحیۃ عن الغیر الا باثبات الملک بذلک الغیر فی الشاۃ ولن یثبت الملک لہ فی الشاۃ الا بالقبض ولم یوجد قبض الامر ھٰھنا لا بنفسہ ولا بنائبہ کذا فی الذخیرۃ وفیہ ایضاً بعد اسطر ولو ضحی ببدنۃ عن نفسہ وعرسہ واولادہ لیس ھذا فی ظاھر الروایۃ - وقال الحسن بن زیاد فی کتاب الاضحیۃ ان کان اولادہ صغاراً جاز عنہ وعنھم جمیعاً فی قول ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمھما اللہ تعالیٰ وان کانوا کبارا ان فعل بامرھم جاز عن الکل فی قول ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمھما اللہ تعالیٰ وان فعل بغیر امرھم او بغیر امر بعضھم لا تجوز عنہ ولا عنھم فی قولھم جمیعاً لان نصیب من لم یأمر صار لحماً۔

ان روایات سے معلوم ہوگیا کہ بھتیجوں نے چچا کی طرف سے جو قربانی کی ہے وہ اکثر ائمہ کے نزدیک درست نہیں ہوئی ان کو چچا سے اجازت لینا ضروری تھا۔ پس اگر چچا کی طرف سے بکری وغیرہ کی قربانی کی گئی تھی تو وہ ادا نہیں ہوئی اور چچا کے ذمہ قضا ہے۔ اور اگر گائے وغیرہ میں چچا کا حصہ شامل کرکے قربانی کی تھی تو اس پوری گائے وغیرہ کی قربانی صحیح نہیں ہوئی۔ چچا کے ذمہ قربانی کی قضا واجب ہے۔ جو اس گائے وغیرہ میں شریک تھے ان پر بھی قضا واجب ہے مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے استحساناً مروی ہے کہ اہل قرابت کی طرف سے بدون امر کے بھی قربانی درست ہے چونکہ صورت مذکورہ میں اکثر ائمہ کے قول پر فتویٰ دینے میں حرج شدید ہے کہ چچا کے ساتھ دوسروں کی قربانی بھی باطل ہوجاتی ہے اس لئے ابو یوسف رحمہ اللہ کی روایت پر فتویٰ دیا جاتا ہے کہ گذشتہ قربانی تو سب کی طرف سے ادا ہوگئی مگر آئندہ ایسا نہ کرنا چاہئے۔

بلکہ بچا کو وقتِ اضحیہ سے پہلے ان کو اجازت دینا یا ان کو اجازت حاصل کر لینا چاہیئے۔

اور قضا کی صورت یہ ہے کہ ایک ایسی بکری کی قیمت خیرات کر دی جاوے جس کی قربانی جائز ہو۔

کما فی الدر: او تصدق بقیمتھا غنی شراھا اولا لتعلقھا بذمتہ شراھا اولا فالمراد بالقیمۃ قیمۃ شاۃ تجزی فیھا اھ (ج ۵ - ص ۲۱۲)

احقر عبد الکریم عفی عنہ
۱۳ ربیع الاول [illegible]ھ

**میت کی طرف سے قربانی کرنے کا طریقہ**

السوال: پانچ آدمی بقیدِ حیات ایک گائے کی قربانی میں شریک ہوتے ہیں اور دو شخص اپنے باپ، دادا کی طرف سے شرکت حاصل کرتے ہیں تو کیا یہ طریقہ درست ہے یا نہیں یعنی زندہ مردہ میں شریک ہو کر قربانی کر سکتا ہے یا نہیں؟

## الجواب

اگر قربانی میں کوئی حصہ دار اپنا حصہ مردہ کی طرف سے کرنا چاہے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ نیت تو اپنی طرف سے قربانی کی کرے اور ثواب مردہ کو بخش دے، اس صورت کے سوا دوسری صورتوں کی رعایت عوام سے دشوار ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۰ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ

**عقیقہ میں بکروں کی بجائے گائے میں حصہ لے لینے سے سنتِ عقیقہ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟**

السوال: عقیقہ میں دو بکریوں کے بدلہ میں اگر گائے دیدی جاوے تو عقیقہ سنت طریقہ پر ادا ہو جاویگا یا نہیں؟

## الجواب

عقیقہ میں بجائے بکریوں یا بکروں کے گائے کرنے یا گائے میں حصہ لینے سے بھی

سنتِ عقیقہ ادا ہو جاوے گی۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۸ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

**عقیقہ سے متعلق چند سوالات**

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت کے دو لڑکے، چار لڑکیاں قضا کر گئیں اور وہ عورت عقیقہ کے مسئلہ سے واقف نہ تھی ناواقفیت کی وجہ سے آج تک عقیقہ نہیں کیا اور اب وہ چاہتی ہے کہ ان سب مُردوں کے نام یک ایک گائے عقیقہ کرے کیا اس طرح عقیقہ ادا ہو جاویگا یا نہیں اگر نہیں تو وہ کس طرح کرے؟

## الجواب

مُردوں کی طرف سے عقیقہ کی دلیل نہیں ملی ہاں ہر ایک کی طرف سے بہ نیت قربانی اگر ایک بکری یا گائے کا ایک حصہ کر دے تو جائز ہے اور جس کا عقیقہ نہ ہوا ہو اس کی طرف سے اضحیہ قائم مقام عقیقہ کے ہو جاتا ہے

السؤال ۲: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی کے چار پانچ لڑکے لڑکیاں زندہ ہیں اور سب کا عقیقہ باقی ہے وہ بھی ایک ہی گائے کر سکتا ہے یا نہیں یا کس طرح کرے؟

الجواب: ایک گائے میں سات بچوں تک کا عقیقہ ہو سکتا ہے۔

السؤال ۳: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کے چند لڑکے اور لڑکیاں زندہ بھی اور مُردہ بھی ہیں۔ ایک ہی ساتھ سب کا اگر عقیقہ کرنا چاہے یا ایک گائے میں سب کا عقیقہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ فقط

الجواب: زندہ کا ہو سکتا ہے مگر مردہ کی طرف سے اضحیہ کی نیت سے کرے

قال فی رد المحتار فی باب الاضحیۃ وقد علم ان الشرط قصد القربة من الكل وشمل مالو كان احدهم مريدا للاضحية عن عامه واصحابه عن الماضی تجوز الاضحیۃ عنه ونية اصحابه باطلة وصاروا متطوعين وعليهم

التصدق بلحمها وعلى الواحد أيضا لأن نصيبه شائع كما فى الخانية وشمل ما لو كانت القربة واجبة على الكل او البعض اتفقت جهاتها أولا وكذا لو اراد بعضهم العقيقة عن ولد قد ولد من قبل لان ذلك جهة التقرب بالشكر كان كالاضحية وقد جازت الاضحية عن الميت فكذا العقيقة لان الفقهاء قاسوها عليها فى اكثر الاحكام. قال الحافظ[عـه] فى الفتح واستدل باطلاق الشاة والشاتين على انه لا يشترط فى العقيقة ما يشترط فى الاضحية وفيه وجهان للشافعية واصحهما يشترط وهو بالقياس لا بالخبر الخ اهـ

ثم اختلفوا فى انه هل يجوز فى العقيقة البقر والابل ام لا فذهب ابو الشيخ إلى تعيين الشاة لها وقال البندنيجي من الشافعية لا نص للشافعى فى ذلك وعندى انه لا يجزى غيرها.

قال الحافظ: والجمهور على اجزاء الابل والبقر ايضا وفيه حديث عند الطبرانى وابى الشيخ عن انس رفعه، يعق عنه من الابل والبقر والغنم ونص احمد على اشتراط كاملة وذكر الرافعى بحثا انها تتادى بالسبع كما فى الاضحية والله اعلم اهـ من الفتح (ج - ۹ - ص ۵۱۲)

قلت: وبه قال اصحابنا كما ترى فى كلام الشامى من جواز اشتراك ذ العقيقة مع اصحاب الاضحية فى بقرة واحدة فقاسوها على الاضحية وقد صحت الاضحية عن الميت فكذا العقيقة ولكن الاحوط ان ينوى عن الصغير الميت الاضحية فانها تقوم مقام العقيقة ايضا. قال الحافظ فى الفتح وعند عبد الرزاق عن معمر عن قتادة من لم يعق عنه اجزاته اضحية وعند ابن ابى شيبة عن محمد بن سيرين والحسن يجزى عن الغلام الاضحية من العقيقة اهـ (ج ۹ - ص ۵۱۳)

وقال فى رد المحتار: تحت قول الدر وان مات احد السبعة وقال الورثة اذبحوا عنه وعنكم صح عن الكل ما تحته لان الموت لا يمنع التقرب

---

عـه اى الحافظ ابن حجر فى فتح البارى ۱۲ منه

عن الميت بدليل انه يجوز ان يتصدق عنه ويحج عنه وعلى هذا اذا كان احدهم ام ولد ضحى عنها مولاها او صغيرا ضحى عنه ابوه اهـ

(ج ۵ - ص ۳۱۸)

قلت: جواز الاضحية من الصغير الميت يستدعي جواز العقيقة عنه بالاولى لعدم ورود الامر بالاضحية عنه وقد ورد بالعقيقة وانه مرتهن بعقيقته واخرج ابن حزم عن بريدة الاسلمي (الصحابي) قال ان الناس يعرضون يوم القيامة على العقيقة كما يعرضون على الصلوات الخمس ذكره الحافظ في الفتح اهـ (ج ۹ - ص ۵۱۳) والله تعالى اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۳ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ

**میت کی طرف سے قربانی کرنا**

السوال: وقت قربانی گائے ایک حصہ رسول خدا، ایک حصہ کسی عزیز متوفی، بقیہ حصہ اشخاص موجودہ کے ہوں تو یہ سب گوشت ہر حصہ کا مثل قربانی تقسیم ہوگا یا کیا۔

## الجواب

اگر متوفی نے وصیت کی تھی تو قربانی میں اس کا حصہ فقراء کو دیا جائے۔ اس میں سے خود کھانا جائز نہیں ہے۔ اور اگر متوفی نے وصیت نہیں کی تھی تو اپنی قربانی کی طرح اختیار ہے کما فی الشامی (ج ۵ ص ۲۲۸) لو ضحی عن المیت وارثہ بامرہ الزمہ بالتصدق بھا وعدم الاکل وان تبرع بھا عنہ لہ الاکل لانہ یقع علی ملک الذابح والثواب للمیت اهـ واللہ اعلم

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲ ذی قعدہ ۱۳۴۳ھ

**امنية الحالك في أضحية مالك**

السوال: قربانی گاؤ پر ہندوستان میں جو فسادات ہوتے ہیں ان پر نظر کرکے ایک ندوی مولوی نے اخبارات میں

فرض دوسروں کی نادانیاں اور غلط راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے یہ نہیں ہو جاتا کہ ہم بھی ان کی طرح نادانیوں کا ایک ڈھیر جمع کر دیں بلکہ ہے تو کم ہمیں اپنی نادانیاں کم ضرور کرنی چاہئیں تو گر دین بھی کم ہو جاتے۔

ہماری ذمہ داری جس قدر کم ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ قربانی کے بارے میں یہ مسئلہ بالکل صاف ہے کہ اسلامی شریعت میں گائے کی قربانی روا رکھی ہے کوئی شخص اس کے خلاف حکم شرعی صادر نہیں کر سکتا اور نہ اس اجازت کو باطل ٹھہرا سکتا ہے لیکن شرعی تقاضا کی رو سے ہم گائے، بکری، اونٹ میں سے کسی ایک کو اپنے مناسب حال انتخاب کر سکتے ہیں فقہ کی تمام کتابوں میں تصریح کے ساتھ بکری کی قربانی کو گائے اور بھینس کی قربانی پر افضل بتایا گیا ہے۔ سو اگر ہمیں استطاعت ہے تو پھر ہم افضل کو کیوں چھوڑیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اقتصادی حیثیت سے گائے کی قربانی میں زیادہ آسانیاں ہیں تو اس کے متعلق کم از کم ایک سہولت کو جو حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے بیان میں پائی جاتی ہے اسے کیوں نہ اختیار کیا جائے کہ عموماً ایک ہی گھر میں کئی زندہ اور مردہ اشخاص کی طرف سے قربانیاں کی جاتی ہیں اور اس کے لئے ایک ہی گائے میں مختلف شرکاء کا حصہ لگاتے ہیں یہ صورت بکری میں بھی ممکن ہے اور اس شرکت کے لئے سات کی کوئی قید نہیں بلکہ ایک گھر کے تمام آدمیوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی ممکن ہے۔ امام ابو حنیفہ کے مسلک کی پیروی کرنے والے بھی اگر اقتصادی اسباب کی بنیاد پر اس شکل کو اختیار کریں تو ان پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی۔ بیسیوں مسائل میں حالات کی نزاکت اور موقع کی ضرورت کے لحاظ سے دوسرے ائمہ کے اقوال پر بھی عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ امام مالک کے قول کے علاوہ متعدد صحابہ کے فعل سے بھی ایسا کرنا ثابت ہے۔

**مزید تصریح** یہ وہ تحریر تھی جو مولوی عبدالرحمٰن ندوی مرحوم نے پچھلے سال بقرعید کے موقع پر شائع کی تھی۔ آج اس مسئلہ کے سمجھانے اور بتلانے کی ضرورت پچھلے سال سے کچھ زیادہ ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے جو لکھا ہے وہ بالکل درست ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ سارے گھر کی طرف سے ایک بکری کی قربانی جائز ہونے کا فتویٰ صرف امام مالک ہی کا نہیں بلکہ احادیث صحیحہ اور آثار صحیحہ کی بناء پر عہد رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا عام طرز عمل بھی یہی تھا کہ ایک بکری میں پورا گھر شریک ہو جاتا تھا۔ حضرت ابو ایوب

انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت خفیف لفظی تغیر کے ساتھ سنن ابن ماجہ، جامع ترمذی، موطا وغیرہ متعدد کتب احادیث میں آئی ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے:

کان الرجل یضحی بالشاة عنه وعن اهل بیته فیاکلون ویطعمون حتی تباهی الناس فصارت کما تری ۔ الحدیث، ترمذی ابواب الاضحیة و سنن ابن ماجه ابواب الضحایا۔
کنا نضحی بالشاة الواحدة، یذبحها الرجل عنه وعن اهل بیته ثم تباهی الناس بعد ذلك فصارت مباهات موطا امام محمد
قال محمد کان الرجل یکون محتاجا فیذبح الشاة الواحدة یضحی بها عن نفسه فیاکل ویطعم اهله فاما شاة واحدة یذبح عن اثنین او ثلاثة اضحیة فهذه لا یجزی ولا یجوز شاة الا عن الواحد وهو قول ابی حنیفة رحمه اللہ والعامة من فقهائنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص ایک بکری خود اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ذبح کرتا تھا اس میں سے لوگ کھاتے اور کھلاتے رفتہ رفتہ قربانی میں فخر اور نمائش کی چیز بن گئی۔
امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر کے اس کو حسن اور صحیح لکھا ہے۔ عام فقہاء حنفیہ جو بکری کی قربانی میں شرکت کے قائل نہیں ہیں وہ بھی اس حدیث کی صحت کا انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ خود امام محمدؒ اس حدیث کو اپنی کتاب موطا میں نقل فرماتے ہیں۔ البتہ ان کا فرمانا یہ ہے کہ اس وقت لوگ محتاج تھے اس لیے ایک شخص ایک بکری اپنی طرف سے ذبح کرتا تھا اور اس کو خود کھاتا اور گھر والوں کو کھلاتا تھا لیکن کسی شخص کا ایک بکری، دو یا تین شخصوں کی طرف سے ذبح کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ایک بکری صرف ایک ہی شخص کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ اور یہی قول امام ابوحنیفہ اور دوسرے فقہاء حنفیہ کا ہے۔ لیکن جیسا کہ خود موطا کے ہی بعض شارحین نے لکھ دیا ہے کہ حدیث میں فقر اور محتاجی کا کہیں ذکر نہیں اور حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں حدیث ترمذی کی بناء پر ایک بکری میں گھر بھر کی شرکت کو جائز لکھا ہے

المستفتی: شیخ عبدالعزیز زمیندار
ضلع بارہ بنکی۔

## الجواب من جامع امداد الاحکام

اقول وباللہ التوفیق، قال فی رحمۃ الامۃ: والابل افضل فی الاضحیۃ ثم البقر ثم الغنم وقال مالک الافضل الغنم ثم الابل ثم البقر والبدنۃ تجزی عن السبعۃ وکذلک البقرۃ والشاۃ عن واحدۃ بالاتفاق

وقال اسحق بن راھویہ، والبقرۃ عن العشرۃ اھ (ص ۵۱)

وقال ابن رشد المالکی فی مقدمات المدونۃ: والضحیۃ واجبۃ علی المقیم والمسافر والذکر والانثی والصغیر والکبیر۔ وقد قال مالک یضحی الوصی عن الیتیم من مالہ ویلزم الاب أن یضحی عن بنیہ الذکور والاناث ما کانت نفقتھم لہ لازمۃ۔ الذکور حتی یحتلموا والاناث حتی یتزوجن ویدخل بھن ازواجھن والاختیار عند مالک ان یضحی عن کل نفس بشاۃ واحدۃ عن جمیع اھل بیتہ اجزاھم اھ (ج ۲- ص ۸)

ان عبارات سے چند امور معلوم ہوئے (۱) رحمۃ الامۃ کی عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاۃ بالاتفاق ایک ہی شخص کی طرف سے کافی ہے زائد کی طرف سے کافی نہیں۔ (۲) اور مقدمہ مدونہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک جمیع اہل بیت کی طرف سے ایک ہی شاۃ کافی ہو سکتی ہے۔ مگر افضل ان کے نزدیک بھی یہی ہے کہ ہر شخص کی طرف سے بکری الگ الگ ذبح کی جاوے۔ (۳) پس امام مالک کے نزدیک بکری کا جملہ اہل بیت کی طرف سے کافی ہونا صحیح طور پر جیسا ثابت نہ تھا بلکہ ان سے دو روایتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک روایت میں ائمہ ثلاثہ کے ساتھ متفق ہیں کہ ایک شاۃ ایک ہی شخص کی طرف سے کافی ہو سکتی ہے۔ اور دوسری روایت میں وہ ان سے الگ ہیں پس ایسی صورت میں امام مالکؒ کے اس قول پر کیونکر عمل ہو سکتا ہے۔ (۴) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جمہور امت کے نزدیک اضحیہ میں افضل ابل ہے پھر بقر پھر غنم اور اس میں صرف امام مالکؒ اختلاف کرتے ہیں کہ غنم کو افضل کہتے ہیں مگر حدیث صحیح جو صحیحین میں مذکور ہے:۔ من راح الی الجمعۃ فی الساعۃ الاولیٰ فکانما قرب بدنۃ ومن راح فی الساعۃ الثانیۃ فکانما قرب بقرۃ ومن راح فی الساعۃ الثالثۃ فکانما قرب شاۃ الخ جمہور کی مؤید ہے۔ اور امام مالکؒ کے

پاس افضلیت غنم کی دلیل صرف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبش اقرن کی قربانی کی ہے اور یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے فدیہ میں جنت سے کبش آیا تھا۔ مگر طحاوی نے بطریق عبداللہ بن نافع عن ابیہ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کی ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یضحی بالجزور وبالکبش اذا لم یجد جزورا اھ

(ج ۲ ص ۳۰۳)

وھو سند حسن وعبد اللہ بن نافع فیہ مقال وقال ابن عدی ھو ممن یکتب حدیثہ وقال ابن ابی مریم عن ابن معین یکتب حدیثہ وقال ابن المدینی کان عندی احفظھم یعنی ولد نافع۔ کذا فی التھذیب (ج ۶ ص ۵۳)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبش کو صرف اس وقت اختیار فرماتے تھے جب جزور نہ ملتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جزور افضل ہے اور بقرہ مثل جزور کے ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ بقرہ مثل جزور کے سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہے۔ نیز بدنہ کا اطلاق مثل ابل کے بقرہ پر بھی ہوتا ہے۔ شاۃ وکبش پر بدنہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

قال الشوکانی فی النیل عن النھایة لابن الاثیر: البدنة تقع علی الجمل والناقة والبقرة وھی بالابل اشبہ وفی القاموس: البدنة محرکة من الابل والبقر وفی الفتح ان اصل البدن من الابل والحقت بھا البقر شرعا وحکی فی البحر عن ابی حنیفة واصحابہ والناصر انھا تطلق علی البقر وعن بعض اصحاب الشافعی انھا تطلق علی الشاة ایضا، قال ولا وجہ لہ وحکی فیہ ایضا ان البقرة عن سبعة والشاة عن واحد اجماعا اھ (ج ۴ ص ۲۳۲)

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ بدنہ کا اطلاق ابل وبقر پر ہوتا ہے نہ کہ شاۃ پر تو اس سے بقرہ کی فضیلت شاۃ پر دوسری طرح بھی ثابت ہوگئی وہ یہ کہ نص قرآنی میں ارشاد ہے وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ تو اس سے اولاً وبالذات اضحیہ ابل وبقر کا شعائر اللہ سے ہونا مستفاد ہوتا ہے نہ کہ اضحیہ شاۃ کا۔ اضحیہ شاۃ اگر شعائر اللہ میں سے ہوگا تو الحاقاً وتبعاً ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اضحیہ کبش کرنا دلیل فضیلت جب ہو سکتا تھا جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اسی پر اکتفا کیا ہو اور جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اضحیہ

ابل اور بقر بھی ثابت ہے تو لگتا ہے اضحیہ کبش کرنے سے اس کی فضیلت کیونکر ثابت ہوگئی
ہے اور اگر کبش ابل اور بقر سے افضل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضحیہ حجۃ الوداع
میں جو کہ آخری اضحیہ تھی ضرور اسی کو اختیار فرماتے حالانکہ اس وقت آپ نے بکری یا دنبہ کی
قربانی نہیں کی بلکہ صحیحین سے ثابت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں سو اونٹ
اپنی طرف سے اور ایک گائے یا چند گائیں اپنی ازواج کی طرف سے ذبح فرمایا۔
(والشک فی وحدۃ البقرۃ وتعددھا لاختلاف الروایات ففی روایۃ ضحی عن
ازواجہ بقرۃ وفی بعضھا عن ازواجہ بقرۃ بقرۃ ذکرہ الحافظ فی الفتح فی
باب الاضاحی)

رہی امام مالک کی دوسری دلیل کہ جنت سے فدیہ اسماعیل میں کبش آیا تھا معلوم
ہوا کہ وہی افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شرائع سابقہ کا کوئی حکم مسلمانوں پر اس
وقت حجت ہو سکتا ہے جبکہ شریعت اسلامیہ میں اس کے خلاف حکم نہ ہو اور یہاں ہم نے
بتلا دیا ہے کہ احادیث سے ابل وبقر کا افضل صراحۃً ثابت ہے پس شریعت سابقہ کا
حکم ہم پر حجت نہیں ہوگا دوسرے وہاں کبش جنت کا ذکر ہے اور ہم ابل وبقر دنیا کو کبش
جنت سے افضل نہیں کہتے بلکہ کبش وغنم دنیا سے افضل کہتے ہیں ممکن ہے کہ کبش جنت جثہ
اور جسامت میں ابل وبقر دنیا سے زیادہ ہو اس لئے افضل ہوا اور اس کا جنت سے آنا
ہی خود فضیلت کے لئے کافی ہے اور اس میں بحث نہیں گفتگو دنیا کے ابل وبقر وغنم میں
ہے جن میں دلائل سے یہی ثابت ہے کہ غنم کا درجہ سب کے بعد ہے۔ بہر حال اس مدعا پر متعدد
دلائل قویہ قائم ہیں کہ بقرہ کبش وغنم سے افضل ہے۔ پس اگر امام مالک کے یہ روایت ثابت ہے
کہ ایک بکری گھر بھر کی طرف سے اضحیہ میں کافی ہے تو ان کے قول پر بقرہ کا سب گھر والوں کی
طرف سے کافی نہ ہونا بہت عجیب ہوگا۔ اس کو ہرگز قیاس تسلیم نہیں کر سکتا کہ بکری تو گھر کے سو
آدمیوں کی طرف سے کافی ہو اور گائے جو قیمت وجسامت میں اور فضیلت میں اس سے زیادہ ہے
وہ سب گھر والوں کی طرف سے کافی نہ ہو۔ (ھذا ھو الذی الزم بہ الطحاوی
القائلین باجزاء الشاۃ عن اھل بیت واحد جمیعاً) بلکہ قیاس کا مقتضی یہ ہے
کہ جب بکری ایک گھر کے سب آدمیوں کی طرف سے کافی ہو تو گائے سات گھروں کے آدمیوں
کی طرف سے کافی ہوگی کیونکہ بالاجماع ایک گائے سات بکریوں کے برابر ہے۔

قال الشوكاني في النيل تحت حديث ابن عباس مرفوعاً ان رجلاً اتى النبي صلى الله عليه وسلم فقال ان علي بدنة وانا موسر ولا اجدها فاشتريها فامره صلى الله عليه وسلم ان يبتاع سبع شياه فيذبحهن رواه احمد وغيره -
مانصه : قوله سبع شياه استدل به من قال عدل البدنة سبع شياه ، وهو قول الجمهور وادعى الطحاوي وابن رشد انه اجماع اھ
(ج ۵ - ص ۱۳۱)

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اول تو ایک بکری کا سب گھر والوں کی طرف سے کافی ہونا امام مالکؒ کے مذہب میں متفق علیہ نہیں بلکہ ان سے دو روایتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک جمہور امت کے موافق ہے جیسا کہ رحمۃ الامۃ اور نیل الاوطار کی نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ بقرہ کا سات کی طرف سے کافی ہونا اور بکری کا ایک شخص کی طرف سے کافی ہونا اجماعی قول ہے دوسری روایت میں امام مالکؒ جمہور امت سے الگ ہیں اور اس حالت میں امام مالک کے ایک ایسے قول پر فتویٰ دینا جو دلائل سے ضعیف ہے یقیناً خلاف احتیاط ہے جو عبادات میں کسی طرح جائز نہیں۔ دوسرے اگر امام مالکؒ کے اس قول کو مان لیا جاوے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک گائے سات گھر والوں کی طرف سے کافی ہو تو پھر وہ مصلحت فوت ہو جائے گی جو امام مالک رحمہ اللہ کے قول کو اختیار کرنے میں ظاہر کی گئی ہے، کیونکہ اب بھی اقتصادی مصالح گائے میں زیادہ ہوں گی۔

تیسری یہ کہ حنفی کو اپنے امام کا قول چھوڑ کر دوسرے امام کے قول کو اختیار کرنا صرف دو حالتوں میں جائز ہو سکتا ہے ایک یہ کہ اپنے امام کا قول دلائل سے ضعیف ہو دوسرے کا قوی ہو اور یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ بلکہ اس مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ کا قول قوی اور امام مالکؒ کا قول ضعیف ہے اور جن آثار سے امام مالکؒ نے استدلال کیا ہے جمہور امت کے نزدیک ان کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے ذمہ قربانی واجب نہ ہوتی وہ ایک بکری اپنے گھر بھر کے لئے ذبح کر لیتا تھا کما ذکرہ فی الموطا (۲۶۸) اور قول قوی کو چھوڑ کر قول ضعیف کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ضرورت شدیدہ کی وجہ سے مضطر ہو کر دوسرے امام کے قول کو اختیار کیا جاوے اور ضرورت شدیدہ وہ ہے جس کو شریعت ضرورت تسلیم کرے

اور صورت موجود میں شرعاً کوئی ضرورت نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ قربانی کی پاکیزہ رسم کی بنیاد محبت و اخلاص پر رکھی گئی ہے اور ہمارے ذہن میں اس کا اظہار جنگ و قتل و خونریزی کے تخیل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور میں پوچھتا ہوں کہ قربانی کی بنیاد خدا تعالیٰ کی محبت کی بنیاد پر ہے یا باہمی کفار کی محبت پر۔ یقیناً کفار کی محبت پر شریعت کی کسی چیز کی بنیاد نہیں۔ بلکہ اگر قرآن کریم اور احادیث کا مطالعہ ایمان و اسلام کی آنکھ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت میں اعداء اللہ کی بغض و اغاظت کا خیال امر ہے۔ بالخصوص قربانی میں تو اس کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔

چنانچہ ابن القیمؒ زاد المعاد میں واقعہ حدیبیہ سے احکام شرعیہ مستنبط کرتے ہوئے لکھتے ہیں: و منها استحباب مغایظة اعداء الله فان النبی صلی اللہ علیه وسلم اهدی فی جملة هدیه جملاً لابی جهل فی انفه برة من فضة یغیظ به المشرکین (ای لکونه جمل سیدهم) وقد قال تعالیٰ فی صفة النبی صلی اللہ علیه وسلم واصحابه وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وقال عزوجل: ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (ص ۳۸۵ - ج ۱)

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر قربانی کی بنیاد نعوذ باللہ کفار کی محبت پر ہے تو خود اسلام کی بنیاد بھی اسی پر ہونا چاہئے پھر اگر کسی کا مسلمان ہونا ہندوؤں کو ناگوار ہو چنانچہ واقعہ ہے کہ ان کو یہ امر ناگوار ہے تو پس آج سے کسی کا فر کو بھی مسلمان نہ کیا جاوے تاکہ برادران وطن ناخوش نہ ہوں۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اسلام کا تو کوئی بدل نہیں اور قربانی کا بدل موجود ہے تو میں کہتا ہوں کہ اعلان اسلام کا بدل اخفاء اسلام ہے تو کیا آج سے نو مسلموں کو یہ مشورہ دیا جائے گا کہ وہ اپنے اسلام کو ظاہر نہ کریں مخفی رکھیں خصوصاً جبکہ ایک اسلامی فرقہ مرجیہ بھی ہے جو عمل کو چنداں ضروری نہیں کہتا صرف ایمان قلبی کو ضروری سمجھتا ہے اور یقیناً اظہار اسلام بھی صرف ایک عمل ہی ہے پھر ہم

پوچھتے ہیں کہ اگر آج تم نے ہندوؤں کی ایک جماعت کی خاطر اضحیہ گاؤ کو ترک کیا تو کیا کل دوسری جماعت کی خاطر سے جو مطلقاً جو مشابی کو جرم سمجھتے ہیں بکری کی قربانی بھی ترک کر دوگے اور اس وقت ان علماء کا قول لے لوگے جو اضحیہ کو واجب نہیں کہتے بلکہ محض سنت کہتے ہیں اور کیا مسجدوں میں اذانیں بھی بند کر دوگے جو کفار ہند کے دلوں پر تلوار سے زیادہ کاری زخم لگاتی ہے۔ چنانچہ جب جہاں ان کا بس چلتا ہے اذان کو فوراً روک دیتے ہیں تو بس پھر نعوذ باللہ اسلام کو یہ کہکر چھوڑ بیٹھنا کہ ہمارے مسلمان رہنے سے ہندوؤں کو ناگواری ہے۔ کیونکہ وہ ہندوستان میں صرف ہندوؤں ہی کا رہنا پسند کرتے ہیں کسی دوسری قوم کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے چھپی ہوئی بات نہیں۔ اور اگر معاذ اللہ اسلام اور اضحیہ کی بنیاد کفار کی محبت پر ہے تو شاید فاضل مضمون نگار کے نزدیک تو وہ خلفاء اسلام تو بہت بڑے مجرم ہوں گے جنہوں نے بلادِ کفر کو فتح کر کے بتخانوں اور بتوں کو توڑ کر مسمار کیا تھا۔ کیونکہ اس فعل سے یقیناً کفار کی آتش غضب تیز ہوئی ہے۔ پس قربانی گاؤ کو ترک کر کے امام مالکؒ کے قول پر گھر بھر کی طرف سے ایک بکری پر اکتفاء کرنا محض ہندوؤں کو راضی کرنے کے لئے ہرگز جائز نہیں۔ کیونکہ یہ شرعی ضرورت نہیں بلکہ مقصودِ شرع کے منافی ہے اور کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ قربانی کی بنیاد کفار کے ساتھ محبت و اخلاص کرنے اور ان کے ساتھ عاجزی و بیچارگی کی تصویر بننے پر ہے بلکہ اس کی بنیاد محبتِ الٰہی و فدائے نفس فی سبیل اللہ پر ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کسی عبادت کے وقت امن عامہ کو مفقود نہ کرنا چاہئے مگر دیکھنا یہ چاہئے کہ قربانی کی وجہ سے جو فسادات ہوتے اور امن عام مختل ہوتا ہے، اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ یقیناً مسلمان شرعاً و قانوناً اضحیہ گاؤ کے مختار ہیں اور یہ ان کا اسلامی حق ہے جس کو گورنمنٹ نے بھی ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنے اس جائز حق کو استعمال کریں تو بتلائیے اس میں مسلمانوں کا قصور ہے یا ہندوؤں کا؟ جو خواہ مخواہ مسلمانوں سے اس جائز حق میں مزاحمت کرتے ہیں۔ رہا یہ کہ وہ تو اپنی نادانی کی وجہ سے مزاحمت سے باز نہیں آتے تو آخر انسدادِ فساد کا کچھ تو انسداد ہونا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان واقعات کے انسداد کی یہ صورت نہیں جو مدوی فاضل نے اختیار کی ہے کہ ہندوؤں کی مزاحمت کو دیکھ کر اپنے مذہب کو بدلنے لگے اور ضعیف اقوال کا انتخاب کرنے لگے

کیونکہ میں بتا چکا ہوں کہ اول تو شرعاً جائز نہیں دوسرے اقتصادی اور تمدنی مصلحتیں
بھی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ اس سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھیں گے۔ اور
کل کو وہ کسی اور بات سے تم کو روکنے لگیں گے پھر کہاں تک تم اپنے مذہب کو بدلو گے
بلکہ اس کی دو صورتیں ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب ہندو مزاحمت کریں اس
وقت مسلمان صف بندی نہ کریں بلکہ حکام کو اطلاع کر کے ان کی مدد سے قربانی کریں۔
دوسرے یہ کہ حکام کی امداد کے بعد بھی اگر وہ مزاحمت سے باز نہ آئیں تو گورنمنٹ سے
اجازت لے کر مزاحمت کا جواب مدافعت سے دیں۔ اس صورت میں فساد نہ ہوگا۔
بلکہ یہ مزاحمت اعلاء کلمۃ اللہ میں داخل ہو کر باعث اجر عظیم ہوگی جس میں شہادت
عظمیٰ کا ثواب ملے گا۔ ہاں بدون گورنمنٹ کی اجازت و اطلاع کے مدافعت و
صف بندی کرنا ہمارے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کو ہرگز مناسب نہیں۔ یہ گفتگو
تو اس تقریر پر بھی کہ اضحیہ گاؤ اور اضحیہ غنم مساوی طور پر شعائر اسلام تسلیم کر لیا
جائے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اضحیہ گاؤ اعظم شعائر اسلام ہے جس کو ہم
نے رسالہ "الخیر النامی لدفع شر النظامی" میں مفصل طور پر ثابت کیا ہے۔ اس
کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جب تک مسلمانوں کو اضحیہ گاؤ پر قدرت ہو اس وقت تک
ہندوؤں کی خاطر اس کو ترک کرنا ہندوستان میں ہرگز جائز نہیں۔

اب میں آخر میں فاضل مضمون نگار کو اس کی چند غلطیوں پر اور بھی متنبہ کرتا ہوں۔
وہ یہ کہ اس نے امام مالکؒ کے اس قول کو ظاہر کر کے بزعم خود قتل و خونریزی کو کم کرنا چاہا
ہے حالانکہ اس سے اور زیادہ قتل و خونریزی بڑھے گی کیونکہ حنفی عوام ہرگز اس قول کو نہیں
مان سکتے جو آثار اور قیاس سے ہر طرح ضعیف ہے پھر اب تک تو ہندو یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں
کے لئے اقتصادی طور پر اضحیہ گاؤ ضروری ہے اور یہ سمجھ کر کسی وقت رواداری بھی ہو جاتی تھی
اور جب یہ سمجھیں گے کہ یہ اقتصادی مصالح امام مالکؒ کا قول لیکر بکری میں بھی حاصل
ہو سکتی ہیں اور مسلمان پھر بھی امام مالکؒ کے قول پر عمل نہیں کرتے تو اس سے ان کی آتش
غضب اور زیادہ بھڑکے گی۔

دوسری غلطی مضمون نگار نے یہ کی کہ گائے کے ذبح میں جو اقتصادی مصالح ہیں
اس نے بکری میں ان کا دعویٰ کر دیا ہے حالانکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول بکری کی ورد

اقتصادی مصالح بکری سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ امام مالکؒ کے قول مذکور پر ایک بکری صرف ایک گھر کے آدمیوں کے لئے کافی ہوسکتی ہے۔ دو یا دو سے زیادہ گھروں کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بوجہ افلاس کے ایسے گھر بہت کم ہیں کہ جن میں ایک گھر کے سب آدمیوں پر قربانی واجب ہوتی ہو بلکہ عام طور پر ایک گھر میں ایک دو آدمیوں پر قربانی واجب ہوتی ہے اور زیادہ تر یہ ہے کہ گائے کے شرکاء مختلف گھروں کے آدمی ہوتے ہیں۔ ان سب کی طرف سے ایک بکری تو کافی ہوگی نہیں کیونکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ تو ہر شخص جدا جدا بکری ذبح کریگا تو اس صورت میں وہ اقتصادی مصلحت کہاں حاصل ہوگی جو گائے میں سات آدمیوں کے شریک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ والسلام

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ

**ذبح کرنے کے بعد جان نکلنے سے پہلے جانور کی چھاتی کھولنا مکروہ ہے**

**السؤال:** قصائی لوگ گائے کو ذبح کرنے کے بعد فوراً، جان نکلنے سے پہلے اس کی گردن کی نرم نرم لٹکی ہوئی کھال سینہ تک چاک کر دیتے ہیں پھر سینہ میں چھری مار کر اس کا خون نکال دیتے ہیں۔ اور قصائی اپنی اصطلاح میں اس کو چھاتی کھولنا کہتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ گائے اس طرح (حوالی قلب کا) خون نکلنے سے جلد ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ بصورۃ جان نکلنے سے پہلے کھال ادھیڑنا اور اس طرح سینہ میں چھری مارنا تاذی بلا ضرورت معلوم ہوتا ہے۔ آیا ذبح کرنے (یعنی نرخرہ و مری) کاٹنے کے بعد اس طرح کھال سینے تک کاٹنا اور دوبارہ چھری مار کر خون بہانا جانور کو جلدی ٹھنڈا کرنے کے عذر سے شرعاً جائز ہے یا تاذی بلا ضرورت کے تحت میں آتا ہے اور ممنوع ہے۔ رسالہ "ارشاد الہائم فی حقوق البہائم" میں صفحہ پر دو جگہ اس کا ذکر ہے جس کا اس سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ صفحہ حدیث چہارم، تحت فائدہ .... رگوں کے کٹنے کے بعد کھال جسم کی کاٹنے لگے یا اور کسی طرح تکلیف پہنچائے .... صفحہ حدیث دہم کے تحت فائدہ ... قصابوں کا وہ فعل کہ محض کھال کی بہت تلیین مقدار بڑھانے کے لئے اوپر سے ذبح کر کے رگوں تک لاتے ہیں اور رگوں کے کٹنے

جنگل جتنی دور سے کیا ان قطع کی ہے تا ذی بلا ضرورت ہے لیکن ان عبارتوں سے مسئلہ میں تشفی نہیں ہوتی۔

## الجواب

قال فی الدر المختار: وكره كل تعذيب بلا فائدة مثل قطع الرأس والسلخ قبل ان تبرد ای تسكن عن الاضطراب وهو تفسير باللازم كما لا يخفى لانه يلزم من بروده سكونها بلا عكس (ج ۵- ص ۲۸۹)

وفی العالمگیریۃ والحاصل ان ما فيه زيادة الم لا يحتاج اليه فی الزكاة مكروه، كذا فی الكافی اھ (ج ۶- ص ۱۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ قصابوں کا یہ فعل مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس میں زیادہ الم ہے جس کی ذبح میں ضرورت نہیں اور گو اس فعل کے بعد جان جلدی نکل جائے مگر خود اس فعل کی تکلیف اشد ہے لہٰذا اس سے احتراز لازم ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ ذی الحجہ ۴۳ھ

**ایسا شکار ذبح کرنے کا حکم جس کے گلے کا اکثر حصہ باقی نہ رہا ہو**

السوال: ایک خرگوش پر بندوق چلائی اور اس کے منہ کا نیچے کا جبڑا جاتا رہا اور اوپر کا جبڑا سالم تھا بلکہ اس کی تمام ناک تک کی نشانیاں باقی رہیں لیکن دانت نہ رہے اور دانت کے بیچ میں سے گولی نکلنے سے گردن میں بھی صرف اگلے حصہ میں شہ رگ وغیرہ نہ رہی بلکہ کھال اور کچھ گوشت رہا اور پیچھے بھی اسی شکل میں گوشت اور کھال رہی۔ خرگوش کی کھال اور گوشت جو سامنے رہ گیا تھا ذبح کر دیا اور اس کا گوشت کھا لیا گیا اس کے واسطے شرعاً کیا حکم ہے۔

## الجواب

قال فی الدر المختار: وذكاة الاختيار ذبح بين الحلق واللبة وعروقه الحلقوم والمرئ والودجان وحل المذبوح بقطع اى ثلاث منها اذ للاكثر حكم الكل وهل يكفی قطع اكثر كل منها خلاف وصحح البزازی قطع كل حلقوم المرئ والاكثر من ودجين

بودكى والإقلاء اهـ (ج ۵ ص ۲۸۸) اگر خرگوش کا گلا اور نرخرہ اور شہ رگوں کا زیادہ حصہ باقی نہیں رہا تھا تو یہ ذبح درست نہیں ہوا اور اس کا کھانا حرام ہوا۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر لطف اللہ عفا اللہ عنہ

۲۶ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ یوم الجمعۃ

**کسی ایک شریک قربانی کا اپنے حصہ کی زیادہ قیمت دینے کا حکم**

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سات آدمی شریک ہو کر سولہ روپے سے ایک گائے خرید کر کے قربانی کرتے ہیں اب عرض یہ ہے کہ ہم ہر ادا کر کے کل پندرہ روپے اور ساڑھے پندرہ آنے ہوتے ہیں اور دو پیسہ کی کمی رہتی ہے۔ ان سات آدمیوں میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ وہ دو پیسہ میں اپنی خوشی سے زیادہ دیتا ہوں تم اطمینان رکھو۔ آیا اس صورت میں قربانی میں اس گائے مذکورہ کے کچھ حرج تو نہیں۔ بینوا توجروا

## الجواب

اگر اس شخص کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنا حصہ دو پیسہ زائد میں خریدتا ہوں۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں سب شرکاء کا دین بخوشی اپنی طرف سے ادا کرتا ہوں تو جائز ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ اس شخص کا حصہ بقدر دو پیسے کے قربانی میں دوسروں سے زیادہ ہوگا تو درست نہیں لکون السبعة لا يملك سبعا كاملا احد منهم

**مسجد یا رباط میں چرم قربانی کی قیمت صرف کرنے کا حکم**

السوال: اگر وقف ہو تو اس میں چرم قربانی کی قیمت صرف کرنا جائز ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

## الجواب

مسجد یا رباط موقوف میں چرم قربانی کی قیمت لگانے سے اس قیمت میں یا وقف میں

کوئی خبث لازم نہیں آتا بلکہ صرف یہ ہے کہ قربانی کرنے والے کے ذمہ چرم کی قیمت بحالہ واجب التصدق رہتی ہے۔ اس طریق سے واجب ادا نہیں ہوا پس اگر کسی نے مسجد یا مسافرخانہ میں چرم قربانی کی قیمت دی ہو اور وہ ان کی عمارت میں لگ چکی ہو تو جو سامان اس سے خریدا گیا ہو سب مسجد و مسافرخانہ پر وقف ہو گیا اور اس کو مسجد منہدم اور مسافرخانہ میں لگانا درست نہیں۔ البتہ اگر وہ قیمت چرم ہنوز صرف نہ ہوئی ہو تو مسئلہ بتلا کر مالک سے دریافت کر لیا جاوے کہ وہ اب بھی مسجد میں یا مسافرخانہ میں یہ رقم دینا چاہتا ہے اور صدقہ واجبہ کو اس سے الگ ادا کرے گا یا واپس لینا چاہتا ہے اگر واپس لینا چاہے تو واپس کر دی جائے

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۵ محرم الحرام سنہ ۴۳ھ

**قربانی کے جانور کے کسی عضو میں زخم ہو کر کیڑے پڑ جائیں تو اس جانور کو قربانی میں ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟**

السؤال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ جو گائے یا بچھڑا وغیرہ قربانی کے واسطے خریدا جائے اور اس کے کسی عضو میں زخم ہو کر کیڑے پڑ جائیں مگر ویسے تندرست ہو تو وہ قربانی ہو سکتا ہے یا نہیں اور موضع کھاری قصبہ جھالو سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور ہم ہمیشہ جھالو جا کر قربانی کرتے ہیں مگر شام ہو جاتی ہے اور کھاری میں ہوتی نہیں، بہت ہندو لوگ رہتے ہیں اگر ہم لوگ صبح کے وقت جھالو جا کر قربانی کر لیا کریں تو درست ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرما کر جلدی روانہ کریں۔

## الجواب

اگر کیڑوں کی وجہ سے اس قدر دبلی ہو جائے کہ اس کی ہڈی میں مغز نہ رہے تب تو اس کی قربانی جائز نہیں ورنہ جائز ہے قیاساً علی الجرباء، وقال فیہ صاحب الدر المختار (والجرباء السمینۃ) فلو مہزولۃ لم یجز لان الجرب فی اللحم نقص وقال الشامی قال فی الخانیۃ وتجوز بالثولاء والجرباء السمینتین فلو مہزولتین لا تنقی لا یجوز اذا ذھب مخ عظمھا فان کانت مہزولۃ

فیها بعض الشحم جاز یروی ذلک عن محمد اھ وفی قولہ لاتنقی ماخوذ من النقی بکسر النون واسکان القاف ھو المخ ای لامخ لھا وھذا یکون من شدۃ الھزال فتنبہ قال القھستانی : واعلم ان الکل لایخلو عن عیب والمستحب ان یکون سلیما عن العیوب الظاھرۃ فما جوز ھٰھنا جوز مع الکراھۃ کما فی المضمرات۔

الجواب اگر کوئی عیب مانع قربانی پیدا ہوگیا مثلاً پاؤں میں کیڑے ہوگئے اور وہ چل نہیں سکتی تو قربانی جائز نہ ہونا ظاہر ہے۔

اگر گاؤں کا باشندہ قصبہ میں قربانی کرے تو اس کو بھی نماز کے قبل قربانی جائز نہیں ہے (والمعتبر مکان الاضحیۃ الخ) فلو کانت فی السواد والمضحی فی المصر جازت قبل الصلوٰۃ وفی العکس لم تجز۔ قہستانی (شامی ج ۵ ص ۳۱۱) واللہ اعلم

عبد الکریم عفی عنہ

قبضہ کے بعد چرم قربانی کی قیمت مدرسہ کی تعمیر میں صرف کرنے کا حکم

السوال : رجال اعطوا قیم جلود اضحیتھم لمھتم المدرسۃ لیملکھا بین المستحقین من طلبۃ العلم والمھتمم ملکھا رجلاً فقیراً ثم استوھبھا منہ وصرفھا فی تعمیر المدرسۃ بغیر اذن من المعطین ولا رضائھم فھل یجوز للمھتمم ذلک الصرف ویسقط وجوب تصدق قیم الجلود عن المعطین ام لا۔

# الجواب

فی الشامی ج ۲ ص ۱۷ تحت قول الدر : وللوکیل ان یدفع لولدہ الفقیر وھذا حیث لم یأمرہ بالدفع الی معین اذلو خالف ففیہ قولان حکاھما فی القنیۃ وذکر فی البحر ان القواعد تشھد للقول بانہ لا یضمن لقولھم لو نذر التصدق علی فلان لہ ان یتصدق علی غیرہ۔ اھ

اقول وفیہ نظر لان تعیین الزمان والمکان والدرھم والفقیر غیر معتبر فی النذر لان الداخل تحتہ ماھو قربۃ وھو اصل التصدق دون

التعيين فيبطل و تلزم القربة كما صرحوا به وهنا الوكيل انما يستفيد التصرف من الموكل وقد امره بالدفع الى فلان فلا يملك الدفع الى غيره كما لو اوصى لزيد بكذا ليس للوصيه الدفع الى غيره فتأمل انتهى عبارة الشامي وقلت هذا التعيين المخصص غير تعيين النوع (اى العلة) لا يقضي في قول البحر بالاولى فلا يقضي المعتمد وان كان ما فعله خلاف الاحتياط لكون قول البحر منظورا فيه فالواجب ان يستفيد مثل هذه الاختيارات من المعطين والله اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ۔

الجواب صحیح

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۳ محرم ۱۳۴۳ھ

گابھن اور شیر دار گائے کی قربانی جائز ہے | السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ گابھن اور شیر دار گائے کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

جائز ہے۔ کما یعلم ضمنا من قول الدر: ولدت الاضحية ولدا قبل الذبح يذبح الولد معها، وقال الشامي تحت قوله قبل الذبح فان خرج من بطنها حيا فالعامة انه يفعل به ما يفعل بالام (ج ۵ ص ۳۱۵)

وفيه ايضا ويكره الانتفاع بلبنها قبله اى قبل الذبح (ج ۵ ص ۳۲۰)

والله اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۳ صفر ۱۳۴۳ھ

مذبوح فوق العقدہ حلال ہے یا حرام؟ | السوال: مذبوح فوق العقدہ حلال ہے یا حرام یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی۔

## الجواب

اگر تین رگیں کٹ جاویں تو جائز ہے ورنہ حرام ہے۔ کما فی الشامی (ج ۵ ص ۱۸۶)

بعد نقل الاختلاف اقول والتحریر للمقام ان یقال ان کان بالذبح فوق العقدۃ حصل قطع ثلاثۃ من العروق فالحق ما قالہ شراح الھدایۃ تبعًا للرستغفنی والا فالحق خلافہ اذ لم یوجد شرط الحل باتفاق اھل المذھب ویظھر ذلک بالمشاھدۃ او سؤال اھل الخبرۃ فاغتنم ھذا المقال ودع عنک الجدال۔
واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۸ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

**ختنہ کرنے سے اگر حشفہ کی کھال پوری نہ اترے تو دوبارہ ختنہ ضروری ہے یا نہیں**

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک لڑکے کا ختنہ کیا گیا لیکن پوری ساری تک تمام نہیں کاٹا گیا، نصف تک تخمیناً حشفہ ظاہر ہوتا ہے تو اس میں دوبارہ ختنہ کرانا ضروری ہے یا نہیں؟

## الجواب

قال فی العالمگیریۃ: غلام ختن فلم تقطع الجلدۃ کلھا فان قطع اکثر من النصف یکون ختانا وان کان نصفا او دونہ فلا۔ کذا فی خزانۃ المفتین اختن الصبی ثم طال جلدتہ ان صار بحال یستر حشفتہ یقطع والا فلا۔ کذا فی المحیط (ج ۴ - ۲۳۷)

صورت مسئولہ میں یہ دیکھا جاوے کہ جتنی کھال ختنہ میں قطع کی جاتی ہے وہ نصف سے زائد قطع ہو چکی ہے یا نہیں اگر نصف سے زائد قطع ہو چکی ہے تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت نہیں لان الحشفۃ غیر مستورۃ بل الظاھرۃ کما فی السؤال۔ اور اگر نصف سے کم یا نصف کھال قطع ہوئی ہے تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت ہے بشرطیکہ بچہ کو زیادہ تکلیف ناقابل برداشت نہ ہو۔ اگر اس تھوڑی سی کھال کے کھینچنے اور دراز کرنے میں تکلیف زائد ہو جو ناقابل برداشت ہو تو بچہ کو ایسی تکلیف دینے کی ضرورت نہیں بلکہ معتبر دیندار جراحوں کو دکھلایا جائے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ اس کی ختنہ دوبارہ دشوار ہے اور تکلیف سخت ہوگی تو اس کی دوبارہ ختنہ نہ کی جاوے۔

قال فی العالمگیریۃ: وفی صلاۃ النوازل الصبی اذا لم یختن ولا یمکن ان

یمد جلدتہ لیقطع الا بتشدید وحشفتہ ظاھرۃ اذا راٰہ انسان یراہ کانہ اختتن ینظر الیہ الثقات واھل البصر من الحجامین فان قالوا ھو علی خلاف ما یمکن الاختتان فانہ لا یشد علیہ ویترک۔ کذا فی الذخیرۃ (ج۱۵ - ص ۲۳۰)

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۴ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

صبی مجنون کا ختنہ سنت ہے یا نہیں | **السوال** : ختان صبی مجنون سنت است یا نہ، این مسئلہ واقع شدہ۔ اگر بجلدی جواب ارسال شود نہایت عنایت باشد، باید کہ حوالہ کتاب وغیرہ کتاب نوشتہ کنید کہ تسلی خاطر ما خوب تر گردد

رسول شاہ قریہ ڈھودہ ضلع کوہاٹ

## الجواب

فی الھندیۃ: وللاب ان یختن ولدہ الصغیر ویحجمہ ویداویہ وکذا وصی الاب ولیس لولی الخال والعم ان یفعل ذلک الا ان یکون فی عیالہ فان مات فلا ضمان علیہ استحسانا وکذلک ان فعلت الام ذلک۔ کذا فی السراج الوھاج (ج۱۵ - ص ۳۰)

وذکر الاصولیون ان المجنون کالصبی فی احکامہ

باپ دادا اور ماں کو صغیر کی ختنہ کرنے کا حق ہے اور جنون عذر مسقط ختان نہیں ہے۔ اگر ختنہ کرنا اور مختون کی حفاظت کرنا دشوار نہ ہو۔ اور اگر جنون کی وجہ سے ختنہ کرنا ہی دشوار ہو یا اس کی حفاظت کرنا دشوار ہو تو اس سے ختان ساقط ہو جائے گا اور جواب قواعد سے لکھا گیا ہے، جزئیہ نہیں ملا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ
از تھانہ بھون

قربانی میں ایک حصہ تمام امت محمدیہ کی طرف سے کرنے کا حکم اور شرکت اضحیہ کے چند احکام

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک گائے خرید کی اور اس میں ایک اپنا حصہ، ایک لڑکے کا اور ایک اپنی زوجہ کا اور ایک حصہ اپنے والد مرحوم کا اور ایک والدہ مرحومہ کی طرف سے متعین کیا باقی ایک حصہ میں تمام امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شریک کیا مگر اس شرکت میں یہ نیت نہ کی کہ یہ حصہ لیکر اس امت مرحومہ کو ثواب پہنچانا ہے محض شرکت کی نیت کی تو یہ قربانی درست ہوئی یا نہیں۔

نیز ایک شخص نے ایک گائے میں اپنا اور اپنے لڑکے کا جو کہ بالغ ہے اور علیحدہ ہے آدھا آدھا حصہ متعین کرکے ذبح کی اور گوشت باپ بیٹے نے ثلث فقراء کو تقسیم کر دیا قبل اس کے کہ وہ اپنا اپنا حصہ لیکر بانٹیں اور رشتہ داروں کو بھی تقسیم کر دیا اور باقی ایک جگہ کھا لیا۔

ونیز ایک گائے میں تین، چار یا پانچ یا چھ آدمی برابر حصہ متعین کریں تو یہ قربانی درست ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا

رحیم بخش، باندہ بادلی، ضلع مرادآباد
مدرسہ عربیہ اسلامیہ
۲۷ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ

# الجواب

قال فی البدائع: واما قدرہ فلا یجوز الشاۃ والمعز الا عن واحد وان کانت عظیمۃ سمینۃ تساوی شاتین، فان قیل الیس انہ صلی اللہ علیہ وسلم ضحی بکبشین املحین احدھما عن نفسہ والاخر عمن لا یذبح من امتہ فکیف ضحی بشاۃ واحدۃ عن امتہ علیہ الصلاۃ والسلام فالجواب انہ علیہ السلام انما فعل ذلک لاجل الثواب وھو انہ جعل ثواب تضحیتہ بشاۃ واحدۃ لامتہ لا للاجزاء وسقوط التعبیر عنہم ولا یجوز بعیر واحد ولا بقرۃ عن اکثر من السبعۃ ویجوز ذلک عن السبعۃ او

مہ قلت وسہم البقرۃ لا الشاۃ کما لا یخفی ۱۲ منہ

ذلك وهذا قول عامة العلماء الخ (ج ۵- ص ٧)

وفي الدر المختار تجب شاة او سبع بدنة ولو لاحدهم اقل من السبع لم يجز عن احد وتجزئ عما دون السبعة بالاولى اھ

قال الشامي تحت هذا: اطلقه فشمل ما اذا اتفقت الانصباء قدرا اولا لكن بعد ان لا ينقص عن السبع اھ (ج ۵- ص ۳۰۸)

صورتِ مسئولہ میں جس شخص نے ایک حصہ بقرہ میں سب امتِ محمدیہ کو شریک کیا ہے اگر اس کی نیت محض ثواب پہنچانے کی نہ تھی بلکہ سب کو اس حصہ میں شریک کرنا اور سب کی طرف سے قربانی کرنا تبرعا مقصود تھا تو یہ قربانی صحیح نہیں ہوئی۔ کیونکہ بعض شرکاء کے لئے ساتویں حصہ سے کم ہوا پس قربانی صحیح نہ ہوئی نہ اس حصہ میں اور نہ باقی حصوں میں بلکہ اس کے ذمہ باقی رہا۔

اور دوسری صورت میں باپ، بیٹے دونوں کی طرف سے قربانی صحیح ہوگی۔

اور تیسری صورت میں بھی قربانی درست ہے۔ جبکہ سب کے حصے برابر ہوں، یا متفاوت ہوں مگر کسی حصے کا ساتویں حصہ سے حصہ کم نہ ہو۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امداد

۸ محرم ۱۳۴۳ھ

| چرمِ اضحیہ کی قیمت میں تملیکِ فقیر ضروری ہے یا نہیں؟ |
|---|

السؤال: ما قولکم ایها العلماء رحمکم اللہ تعالیٰ اندریں مسئلہ کہ: زید میگوید کہ تصدق چرم جانوران قربانی گرچہ واجب نیست اما بعد فروختنش بر روپیہ مثل آن بحکم شرع شریف چون تصدق قیمتش برئے واجب گشت پس بہمہ وجوہ حکم آن حکم صدقہ واجبہ گردد و ہمچون صدقات واجبہ دیگر مشروط بشرط تملیک باشد بناءً علیہ در کفن میت و ساختن راہ و مساجد و مدارس و مجالس وعظ وغیرہ صرف آن جائز نباشد۔ اما عمرو می گوید کہ آن چرم قبل فروختنش واجب التصدق نبود اما بعد فروخت حکم وجوب التصدق بآن عارض گشت بناء بر آن بہمہ وجوہ حکم آن حکم صدقہ واجبہ نگردد۔ لہٰذا باعتبار اصل در امور مسطورہ صرف کردنش ہم جائز باشد۔

# الجواب

قول زید صحیح است لان معنی التملیک ماخوذ فی مفہوم الصدقۃ قال فی الدر: والصدقۃ کالہبۃ بجامع التبرع وحینئذ لا تصح غیر مقبوضۃ ولا فی مشاع یقسم ولا رجوع فیہا اھ (ج ۴ ص ۷۹۱)

فحیث امر الفقہاء بالصدقۃ انطلق یعنون بہا تملیک الفقیر۔

مخفی نیست کہ حکم جلد ضحیہ ومنافع اضحیہ در وجوب تصدق مساوی است ودر منافع اضحیہ تصریح بتصدق علی الفقیر وارد شدہ است۔

قال الشامی: والحاصل ان التی لا یوکل منہا ہی المنذورۃ ابتداءً والتی وجب التصدق بہا بعد ایام النحر والتی ضحی بہا عن المیت بامرہ علی المختار والواجبۃ علی الفقیر بالشراء علی احد القولین والذی ولدتہ الاضحیۃ کما قدمناہ عن الخانیۃ، والمشترکۃ بین سبعۃ نوی بعضہم القضاء عن الماضی کما قدمنا آنفا۔ فہذہ کلہا سبیلہا التصدق علی الفقیر فاغتنم ہذا التحریر (ج ۴ ص ۳۳)

قلت والذی ولدتہ الاضحیۃ من المنافع الزائدۃ کالجلد، فلما وجب تصدقہ علی الفقیر فکذا ثمن الجلد۔ واللہ اعلم۔

وایضا قیمۃ الجلد لہا شبہۃ بقیمۃ الاضحیۃ التی لم تذبح فی ایام النحر وسبیل الثانیۃ التصدق علی الفقیر فکذا الاولی۔ وقال فی البحر فی باب الزکوٰۃ تحت قول الکنز لا الی ذمی وبناء مسجد وتکفین میت وقضاء دینہ واصلہ وان علا وفرعہ وان سفل ما نصہ وفیہ اشارۃ الی ہذا الحکم لا یخص الزکوٰۃ بل یعم کل صدقۃ واجبۃ فلا یجوز دفعہا لہم کالکفارات وصدقۃ الفطر والنذور الی ان قال، وقید بالصدقۃ الواجبۃ لان صدقۃ التطوع الاولی دفعہا الی الاصول والفروع کذا فی البدائع (ج ۲ ص ۲۴۳)

ملحوظا وایں عبارت فقہاء صدقۃ واجبہ عام است ہر صدقہ واجبہ را کہ واجب

از اصل باشد بانہ پس تخصیص حکم تملیک باحدھما دون الآخر بلا دلیل است و مخفی نیست کہ صدقہ دراہم جلد اضحیہ در حکم صدقہ جلد اضحیہ ہرگز نیست زیرا کہ جلد اضحیہ مثل لحم اضحیہ است انتفاع بنفسہ ازان جائز است و دراہم جلد ضحیہ غیر جائز الانتفاع درحق بائع است پس دراہم جلد اضحیہ مثل دراہم لحم ضحیہ است در وجوب تصدق باثمنہ۔

وقال فی غنیۃ الناسک فی باب الھدایا: والھدایا یسقط وجوبھا بالذبح فان کان مما یجوز لہ اکلہ لایجب علیہ التصدق بشئ منہ لو استھلکہ بنفسہ بعد الذبح بان اتلفہ او ضیعہ او وھبہ لغنی او نحو ذلک لا یضمن شیئا وان کان مما لا یجوز لہ اکلہ یجب علیہ التصدق بکلہ بالتملیک او الاباحۃ ولو بالتخلیۃ حتی لو استھلکہ بنفسہ بعد الذبح یضمن قیمتہ للفقراء ولو ھلک او استھلکہ غیرہ لاضمان علیہ فی النوعین لانہ لا صنع لہ فیہ ولو باع اللحم جاز بیعہ فی النوعین (المراد بالجواز الصحۃ لا الحل کما صرح بہ بعد) الا انہ فیما لایجوز لہ اکلہ یتصدق بثمنہ لانہ ثمن مبیع واجب التصدق۔ کذا فی الجزار اجرہ منہ فعلیہ ان یتصدق بقیمتہ ای بقیمتہ ان کان اکثر و بالثمن ان کان اکثر علی ما فی البدائع۔ وھذا یرجح قولھم والھدایا کالضحایا فان الاضحیۃ لایجب التصدق بشئ منھا مع انہ لو استھلکھا بان باع لحمھا او جلدھا بمستھلک او بالدراھم او اعطی الجزار اجرہ منھا او اتلفھا او ضیعھا یجب التصدق بالثمن فی صورۃ البیع و بالقیمۃ فی غیرھا فکذا ھذا۔

(ص ۱۹۲)

قلت وقد صرح بمعنی التصدق فی الاولی فھو المراد بہ فی الثانیۃ لعدم القرینۃ علی الفرق۔

وفیہ ایضا ولایبیعہ ای الجلد بالدراھم لینتفع بہ او ینفقھا علی نفسہ او عیالہ فان باعہ لذلک او باعہ بما یستھلک تصدق بثمنہ وصح بیعہ مع الکراھۃ عند ابی حنیفۃ ومحمد وعن ابی یوسف باطل

لانہ کالوقف وکذا لو عمل منہ جرابا و آجرہ لم یجز وعلیہ التصدق بالاجرۃ ولہ ان یبیعہ بالدراھم لیتصدق بھا الی ان قال فلو باعہ بالدراھم لیتصدق بھا جاز لانہ قربۃ (ص۱۴۲)

قلت فیہ دلالۃ علی ان تصدق ثمن الجلد لیس کالصدقۃ النافلۃ من غیرھم فثبت ان حکمہ حکم الصدقۃ الواجبۃ الا ان الزکوٰۃ والفطرۃ لایکفی فیھما الاباحۃ وتکفی فی غیرھا۔

قال فی غنیۃ الناسک فی باب الھدایا ولو اطعم غیر اصولہ و فروعہ من الاقارب جاز وان کان نفقتہ واجبۃ علیہ اذا لم یحسبھا من النفقۃ اذ لا فرق بین الزکوٰۃ وبین بقیۃ الھدایا بل بین کل صدقۃ واجبۃ کالفطر والنذور والکفارات فی المصارف واموال الصرف الا ان الزکوٰۃ لایجوز صرفھا الی الذمی بالاتفاق بخلاف غیرھا فانہ یجوز صرفھا الی الذمی عند ابی حنیفۃ ومحمد لکن المفتی بہ قول الثانی وھو انہ لایجوز دفع الواجبات الیہ فی المختار والا ان الزکوٰۃ والفطرۃ یشترط فی صرفھما التملیک وفی ماسواھا یکفی الاباحۃ۔ ایضا ملخصا (ص۱۹۱)

قلت: وفی تکفین المیت وبناء المسجد لاتوجد الاباحۃ ایضا فلا یجوز صرف ثمن جلد الاضحیۃ الیھما کما لا یجوز صرف الکفارات الیھا فافھم۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۸/ محرم الحرام سنہ ۱۳۴۶ھ

مکہ میں یوم النحر ہندوستان سے ایک دن پہلے ہوا تو ہندوستان میں بارہ تاریخ کی قربانیاں صحیح ہوں گی یا نہیں؟

السؤال: اس سال مکہ میں حج جمعرات کو ہوا ہے جس کے حساب سے یہ جمعہ کو دس ذی الحجہ واقع ہوتی ہے اور ہندوستان میں دس ذی الحجہ شنبہ کو ہوئی ہے اور مکہ کی خبر متواتر ذرائع سے ثابت ہو چکی ہے تو جن لوگوں نے ہندوستان کے حساب سے بارہ تاریخ تک یعنی دوشنبہ تک قربانیاں کی ہیں ان کی قربانیاں درست ہوئیں یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

# الجواب

قال في الدر : كما لو شهدوا انه يوم العيد عند الامام فصلوا ثم ضحوا ثم بان انه يوم عرفة بجزاهم الصلوٰة والتضحية لانه لايمكن التحرز عن مثل هذا الخطا فيحكم بالجواز صيانة لجميع المسلمين زيلعی اھ (ج ۵ ـ ص ۳۱۲)

وفی ردالمحتار ، (ج ۲ ـ ص ۱۵) تحت قول الدرالمختار لا لو شهدوا برؤية غيرهم (ای غیرالشاهدین عند القاضی) لانه حكاية. نعم لواستفاض الخبر في البلدة الاخرى لزمهم على الصحيح من المذهب اھ مانصه قوله لانه حكاية فانهم لم يشهدوا بالرؤية ولاعلىٰ شهادة غيرهم انما حكوا رؤية غيرهم كذا في الفتح ـ

قلتُ وكذا لو شهدوا برؤية غيرهم وان قاضي تلك المصرامر الناس بصوم رمضان لانه حكاية بفعل القاضي أيضًا وليس بحجة بخلاف قضائه الخ

وفيه قوله نعم الخ قلت : وجه الاستدراك ان هٰذه الاستفاضة ليس فيها شهادة على قضاء قاض ولاعلى شهادة لكن لما كانت بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموا يوم كذا لزم العمل بها لان البلدة لاتخلوا عن حاكم شرعي عادة فلا بد ان يكون صومهم مبنيًا على حكم حاكمهم الشرعي فكانت تلك الاستفاضة بمعنى نقل الحكم المذكور وهي اقوىٰ من الشهادة بان اهل تلك البلدة رأوا الهلال وصاموا لانها لاتفيد اليقين فلذا لم تقبل الا اذا كانت على الحكم اوعلى شهادة غيرهم اھ

وفيه ايضًا ، واذا ثبت دخول رمضان ضمنًا وجب صومه كما سنذكر فيما لو تم عدد رمضان ولم يرهلال الفطر لعلة يحل الفطر وان ثبت رمضان بشهادة واحد لثبوت الفطر تبعًا وان كان لايثبت

وقصدًا الا بالعدد والعدالة اھ (ج ۲- ص ۱۵۰)

ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔

۱ اگر خبر مستفیض سے معلوم ہو جائے کہ مکہ میں حج ہندوستان کی نویں تاریخ سے ایک دن پہلے ہوا ہے اور خبر مستفیض ایام تشریق کے بعد پہنچی تو ہندوستان میں جن لوگوں نے یہاں کے حساب سے بارہ تاریخ تک قربانیاں کی ہیں ان کی قربانیاں درست ہوگئیں بحکم جزئیہ اولیٰ۔

۲ جب خبر مستفیض سے حج کا ہندوستان کی نویں ذی الحجہ سے ایک دن پہلے ہونا ثابت ہو جائے تو ہندوستان میں بھی تاریخ کو بدل دیا جاوے گا اور مکہ کے حساب سے تیس دن پورے ہو جانے کے بعد یکم محرم قرار دی جائے گی۔ گو یہاں انتیس تاریخ علت کی وجہ سے چاند نظر نہ آوے ملاحظہ ہو جزئیہ ثانیہ وثالثہ جس میں تصریح ہے کہ خبر مستفیض میں شہادت علی الحکم اور شہادت علی رؤیۃ اور شہادت علی الشہادۃ شرط نہیں

نیز یہ بھی تصریح ہے کہ ثبوت رمضان نے تبعاً ثبوت فطر بھی ہو جاتا ہے فکذا ھٰذا۔ فان بقی الشہود فی حکم الفطر والاضحی۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ہندوستان میں خبر مستفیض سے یکم رمضان کا مکہ مکرمہ میں ہندوستان سے ایک دن پہلے ہونا ثابت ہو جائے تو اگر وسط رمضان میں خبر مستفیض موصول ہو جائے تو رمضان کی تاریخ بدل دی جاوے گی۔ اور بعد میں ایک روزہ قضاء کرنا ہوگا۔ اور خبر مستفیض کے موافق تیس دن پورے کر کے فطر لازم ہوگا۔ اور بعد رمضان کے خبر موصول ہو تو صرف ایک روزہ کی قضا لازم ہوگی۔ اور تاریخ شوال بھی بدل دی جاوے گی۔ ولا یأمرون بصومھم یوم الفطر علی ھٰذا الخبر۔ واللہ اعلم۔

لا یقال یلزم منہ فی بعض الصور زیادۃ عدد الصوم علی ثلثین لانا نقول انھا زیادۃ فی الظاھر وفی الحقیقۃ صومھم الاول لم یکن لرمضان بل کان من شعبان ونظیرہ ما فی رد المحتار۔ لو صام رائی ھلال رمضان واکمل العدۃ لم یفطر الا مع الامام لقولہ علیہ السلام فطرکم یوم تفطرون رواہ الترمذی وغیرہ والناس لم یفطروا فی

مثل ھذا الیوم فیجب ان لا یفطر بعدہ (ج ۲ - ص ۱۴۴)

فقد لزم ھذا الرأي زیادۃ الصوم علی ثلثین

قال الشامی : یفھم من کلامھم فی کتاب الحج ان اختلاف المطالع فیہ معتبر فلا یلزمھم شئ لو ظھر انہ اُری فی بلدۃ أخری قبلھم بیوم وھل یقال کذلک فی حق الاضحیۃ لغیر الحجاج لم أرہ والظاھر نعم لان اختلاف المطالع انما لم یعتبر فی الصوم لتعلقہ بمطلق الرؤیۃ وھذا بخلاف الأضحیۃ فالظاھر انہا کأوقات الصلوٰۃ یلزم کل قوم العمل بما عندھم فتجزئ الاضحیۃ فی الیوم الثالث وان کان علی رؤیۃ غیرھم ھو الرابع. واللّٰہ اعلم (ص ۶-۱ ج ۲)

قلت ومقتضاہ ان یعتبر اختلاف المطالع فی بقیۃ الشھور غیر رمضان کلھا فان العلۃ ای تعلق الصوم والفطر منتفیۃ فی فی بقیۃ الشھور وعلی ھذا فلا یثبت ھلال المحرم بالخبر المستفیض من مکۃ - واللّٰہ اعلم.

قلت : ولکن ما فھمہ العلامۃ من کتاب الحج غیر ظاھر فان الذی ذکرہ ھناک ھو عدم قبول الشھادۃ لو شھدوا بعد الوقوف بوقوفھم بعد وقتہ للحرج الشدید والوقوف صحیح حتی فی حق الشھود أیضاً ولو شھدوا بان الوقوف کان قبل وقتہ تبات ان امکن التدارک والا لا اھ وحاصلہ ما قالہ الشیخ انہ اذا لزم من الشھادۃ فساد عبادۃ وقعت لاتقبل وان لزم منہا وجوب تدارک ما امکن تدارکہ قبلت فلیس مبنی ماذکروہ فی الحج علی اختلاف المطالع بل علی الحرج کما صرحوا بہ۔

قال الشیخ : وعلۃ عدم اعتبار اختلاف المطالع فی الصوم استلزامہ الاحتیاج الی الحساب وقول الموقتین وھو باطل لقولہ علیہ الصلاۃ والسلام نحن امۃ امیۃ فھذہ علۃ مشترکۃ

فی رمضان و بقیۃ الشہور، و اما ما ذکروہ قرینۃ عدم اعتبارہ فی الصوم من تعلقہ بمطلق الرؤیۃ فلا یمنع لکون الاطلاق ممنوعا

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

١٦ محرم الحرام ١٣٤٦ھ

**قربانی کی کھال ذبح کی اجرت میں دینی تو اس کی واپسی ضروری ہے، شرکا کو اطلاع دینا کافی ہے کہ وہ اس قدر تصدق کریں**

**السؤال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ ہمارے یہاں بعض گاؤں میں دستور ہے کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے کے واسطے کسی ایک شخص کو مقرر کرتے ہیں اور وہی شخص سب جانوروں کو ذبح کرتا ہے اور جانوروں کی کھال دوسرے کے ہاتھ بیچ کر اس کی قیمت میں سے ہر ایک کے حساب سے ایک ایک روپیہ معین کر کے ذبح کرنے والے کو دیتے ہیں۔ مثلاً پانچ روپیہ کے حساب سے کھال بیچی، چار روپیہ فقیروں کو خیرات کرتے ہیں اور ایک روپیہ ذبح کرنے والے کو دیتے ہیں اور یہ ایک روپیہ خیرات میں شمار جانتے ہیں۔ مگر ذبح کرنے والا خود کسی سے یہ نہیں کہتا ہے کہ ہم کو جب کھال ایک روپیہ دو گے تو ذبح کروں گا ورنہ نہیں۔ یہاں تک کہ کسی نے اتفاق سے کچھ نہ دیا تو اعتراض نہیں کرتے تو آیا اس صورت میں وہ روپیہ جو ذبح کرنے والے کو دیتے ہیں وہ خیرات میں شمار ہو جائے گا یا اجرت ہو جائے گی۔ اگر اجرت ہوگی تو آیا واپس لینا پڑے گی یا اجرت دینے والوں کو صرف اطلاع دینا کافی ہے کہ وہ اس اجرت کے بقدر تصدق کریں۔ فقط بینوا توجروا۔

عرض گذار:

مولوی عبدالوہاب کھٹکوی عفی عنہ

## الجواب

قال فی الدر المختار: فان بیع اللحم او الجلد بہ ای بمستہلک او بدراہم تصدق بثمنہ و مفادہ صحۃ البیع مع الکراہۃ وہو قول ابی حنیفۃ و محمد بدائع لقیام الملک والقدرۃ علی التسلیم۔ مضمرات۔ والکراہۃ

لطحطاوی الآتی ۱۲ شامی

قلت : وھو ماذکرہ بعد من قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام من باع جلد اضحیتہ فلا اضحیۃ لہ ۔ ھدایہ ۔ وعن الثانی باطل لانہ کالوقف ۔ مجتبیٰ ۔ ( ج ۵ ۔ ص ۳۲۱ )

قلت و مفاد صحۃ البیع مع علۃ الکراھۃ التی ذکروھا حل المشتری للمشتری ۔ وکذا حل الاجر للاجیر لوجود ارکان البیع باسرھا مع شرائط الصحۃ ولا یجب علیہ ردہ وانما الکراھۃ فی جانب البائع وھی کراھۃ الفعل تصرفہ بالتمول فیما جعلہ قربۃ ۔ و اما ما ذکرہ فی رد المحتار عن القھستانی عن الزاھدی فی باب الزکوٰۃ ولا یسترد منہ لو ظھر انہ عبد او حربی ۔ وفی الھاشمی روایتان : ولا یسترد فی الولد والغنی ۔ و ھل یطیب لہ فیہ خلاف واذا لم یطب لہ قیل یتصدق وقیل یرد علی المعطی اھ ( ج ۲ ۔ ص ۱۰۹ )

فلا یفید وجوب الرد علی المشتری فیما نحن فیہ لقولہ لا یسترد من الولد والغنی والعبد والحربی و انما الخلاف فی الھاشمی فقط ۔ وھذا یفید اختصاص علۃ الاسترداد بہ فقط دون غیرہ نعم قولہ فی الولد والغنی ھل یطیب لہ فیہ خلاف الا یوھم عدم الطیب فیما نحن فیہ ولکن عدم الطیب فی الولد والغنی لیس بمتفق علیہ ولم یذکروا ترجیح احد الطرفین علی الآخر وایضا فان الولد والغنی فی باب الزکوٰۃ یأخذان مالا یستحقانھا والمشتری فی ھذہ الصورۃ التی نحن فیھا یأخذ اللحم والجلد عوضا عن ثمنہ وکذا الاجیر عوضا عن عملہ فلا وجہ فی ایجاب الرد والتصدق علیھما وانما یجب التصدق علی صاحب الاضحیۃ فقط علی قدر ما یبذلہ فی الاجر کما صرحوا بانہ اذا باع اللحم او الجلد بدراھم تصدق بھا ولم یقل احد بوجوب التصدق علی المشتری وکذا الاجیر ۔

واللہ اعلم

صورت مسئولہ میں جو روپیہ چرم فروش کی طرف سے ذابح کو دیا جاتا ہے

وہ اجرت ہے خیرات نہیں ہے جو اس ذابح کے لئے تو قول طرفین پر جو مفتی بہ ہے حلال ہے البتہ قربانی کرنے والوں کے لئے یہ فعل مکروہ تھا کہ قربانی کی چلد کی قیمت سے اجرتِ ذابح ادا کی ان کو لازم ہے کہ بقدر اس اجرت کے کسی فقیر پر تصدق کردیں۔ پس ذابح کو اس رقم کا ادا کرنا واجب نہیں جو اس نے ذبح کی اجرت میں لی ہے۔ البتہ گاؤں والوں کو اس مسئلہ میں مطلع کرنا ضروری ہے کہ ان کا اجرتِ ذابح کو صدقہ سمجھنا غلط ہے۔ اس لیے وہ بقدر اس اجرت کے دوبارہ تصدق کریں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۷/صفر ۱۳۴۶ھ

امالۃ الستور عن حکم اطارۃ الطیور

کیا شکار پر قبضہ یدی ملک کے لئے کافی ہے یا نیتِ تملک بھی شرط ہے؟

السوال: صید پر قبضہ یدی ملک کے لئے کافی ہے یا نیتِ تملک بھی شرط ہے؟

# جواب

قال السرخسی رحمہ اللہ فی شرح السیر الکبیر: ان فی کل موضع یختص المصیب بالمصاب علی وجہ لایشارکہ فیہ غیرہ فتلک الاصابۃ فی معنی الاصطیاد فکما ان الملک فی الصید یثبت بنفس الاصابۃ للواحد کان او للجماعۃ فکذلک الملک یثبت للسریۃ بمثل ہذہ الاصابۃ و فی موضع لایختص المصیب بالمصاب ولکن یشارکہ فیہ اصحابہ فتلک الاصابۃ فی معنی اصابۃ الغنیمۃ ومجرد الاخذ فی الغنیمۃ لایوجب الملک قبل القسمۃ فکذلک ما یکون معناہ اھ (۱۲- ص ۴۶)

اس سے معلوم ہوا کہ صید میں اصابت ید تملک کے لئے کافی ہے کما یدل علیہ قولہ یثبت بنفس الاصابۃ۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۳ رجمادی الثانی ۱۳۴۶ھ

**گائے کا عقیقہ جائز ہے یا نہیں**

السوال: گائے کا عقیقہ جائز ہے یا نہیں لڑکے اور لڑکی کا فرق ہوگا یا نہیں؟

## جواب

گائے کا عقیقہ جائز ہے۔ گائے کے سات حصوں میں سے ایک حصہ بکری کے برابر ہے پس لڑکی کے واسطے ایک حصہ کافی ہے اور لڑکے کے لئے دو حصے دیئے جائیں۔ فقط واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۷ر شعبان ۱۳۴۶ھ

**کیا وقت اضحیہ گزر جانے کے بعد آئندہ سال قربانی کرنے سے سال گزشتہ کی قربانی ادا ہوگی؟**

السؤال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کسی شخص کی قربانی میں خرابی آ گئی تو اگلے سال میں قربانی میں وہ شخص پچھلے سال کی قربانی کا حصہ لے سکتا ہے۔ تو اس کی قربانی واجب ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

## جواب

بعد وقت اضحیہ گزر جانے کے تصدق قیمت واجب ہوتا ہے پس آئندہ سال قربانی میں حصہ لینے یا مستقل جانور کی قربانی کرنے سے گزشتہ سال کی قربانی ادا نہ ہوگی بلکہ اس کی ادا کی صورت صرف تصدق قیمت شاۃ ہے۔

صرح بہ فی الدر وغیرہ، قال فی الدر: وان کان شریک الستۃ نصرانیا او مریدا اللحم لم یجزء عن واحد منہم اھ

قال الشامی: قد علم ان الشرط قصد القربۃ من الکل وکل ما لو کان احدہم مریدا للاضحیۃ عن عامہ واصحابہ عن الماضی تجوز الاضحیۃ عنہ ونیۃ اصحابہ باطلۃ وصاروا متطوعین وعلیہم التصدق بلحمہا وعلی الواحد ایضا لان نصیبہ شائع کما فی الخانیۃ وظاہرہ

عدم جواز الاكل منها۔ (ج ۵۔ ص ۳۱۹) واللہ تعالیٰ اعلم۔
وفيه تصريح بان نية الاضحية عن العام الماضي ليس بقربة۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۸ رشوال سنہ ۱۳۴۶ھ

کیا حرم میں اضحیہ کا بھی اور عبادتوں کی طرح ثواب مضاعف ہے؟

**السؤال**: لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح حرم میں اور عبادات کا ثواب مضاعف ہے اسی طرح اضحیہ کا بھی۔ حالانکہ ان کے اس کلیے سے زکوٰۃ ہی مستثنیٰ ہے جس کا منتقل کرنا مکروہ ہے اور پھر قربانی بھی اراقۂ دم کے بعد انفاق مالی ہی ہے اس لئے یہ بھی زکوٰۃ کے مشابہ ہے اور بقاعدۂ زکوٰۃ اس کا منتقل کرنا بھی مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ نیز منیٰ میں سوائے اراقۂ دم کے انفاقِ مالی کا حصول عادۃً ناممکن ہے اس لئے اس میں بلا ضرورت اضاعتِ مال و اتلافِ حق مساکین بھی ہے اور نظر بر غیر حاج کے لئے قربانی منیٰ یا قربانی حرم کی کوئی فضیلت کی روایت نہیں ہے۔ مگر بعض لوگ خود یہاں موجود ہوتے ہیں اور قربانی نیابۃً یا وکالۃً وہاں کراتے ہیں یا میت کی طرف سے کرتے ہیں۔

## الجواب

قال الشامي: في بحث مضاعفة الصلوٰة بمكة ثم ذكر ان للعلماء خلافاً في هذا الفضل هل يعم الفرض والنفل او يختص بالفرض وهو مقتضى مشهور مذهبنا اى المالكية ومذهب الحنفية۔ والتعميم مذهب الشافعية وجاءت احاديث تدل على ان تفضيل ثواب الصوم وغيره من القربات بمكة الا انها ليست في الثبوت كاحاديث الصلوٰة فيها اھ

وذكر البيري في شرح الاشباه في احكام المسجد ان المشهور عند اصحابنا ان التضعيف يعم جميع مكة بل جميع حرم مكة الذي يحرم صيده كما صححه النووي۔ اھ (ج ۱۔ ص ۳۰۵)

قلت ومدار التصحيح فيه على النقل فالظاهر ان الاثار قد صحت في كون المراد به حرم مكة كله واما كراهة النقل فمتفقة بما قاله فقهاءنا كما في الدر وكره نقلها اى الزكوة (وفي حكمها القربات المالية كلها) الا الى قرابة او احوج او اصلح او اورع او انفع للمسلمين اومن دار الحرب الى دار الاسلام او الى طالب علم وفي المعراج التصدق على العالم الفقير افضل او الى الزهاد او كانت معجلة قبل تمام الحول فلا يكره خلاصه اھ

قال الشامي: لان فقراء المسلمين الذين في دار الاسلام افضل من فقراء دار الحرب - بحر. قلت ينبغي استثناء اسارى المسلمين اذا كان في دفعها اعانة على فك رقابهم من الاسر - فتامل اھ (ج ۲ - ص ۱۱)

پس قربانی کا منتقل کرنا جائز ہے - اس لئے کہ وہ دار الاسلام ہے ، دوسرا اس لئے کہ ان صور جزئیہ میں نقل کی اجازت کا مدار زیادت ثواب ہی پر ہے اور مکہ میں تضاعف ثواب ظاہر ہے اس لئے نقل الی مکہ مکروہ نہیں ۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳۴۶ھ

قربانی کی کھال فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں | السوال : معروض جناب تعالیٰ یہ ہے ۔ بہشتی زیور تیسرا حصہ ۳۲ میں جناب نے تحریر فرمایا :

مسئلہ : قربانی کی کھال یا تو یونہی خیرات کر دے اور یا بیچ کر اس کی قیمت خیرات کر دے ، وہ قیمت ایسے لوگوں کو دے جن کو زکوٰۃ کا پیسہ دینا درست ہے الخ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی کی کھال بیچنا بلا کراہت جائز ہے مگر اس کی قیمت کا تصرف اپنے لئے جائز نہیں جس نے قربانی کیا ۔ خیرات کرنا چاہئے وبس ۔

نور الاسلام نامی ایک کتاب ہے اس میں ذیل کی عبارت کو اس کے مصنف نے درج کر کے ایک فتویٰ شائع کیا ہے جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس نے اپنی قربانی کا چمڑا بیچا تو اس کی قربانی نہ ہوگی ۔

قوله ويتصدق بجلدها او يعمل منه نحو غربال وجراب وقربة وسفرة ودلو او يبدله بما ينتفع به باقيا كما مر لا بمستهلك كخل ولحم ونحوه كدراهم فان بيع اللحم او جلده به اي بمستهلك او بدراهم تصدق بثمنه ومفاده صحة البيع مع الكراهة . وعن الثاني باطل لانه كالوقف مجتبى . ولا يعطى اجر الجزار منها لانه كبيع واستفيد من قوله عليه الصلوٰة والسلام من باع جلد اضحيته فلا اضحية له (هدايه) وفي جامع الرموز ايضا انه قول الطرفين واما على قول ابي يوسف فالبيع باطل لانه كالوقف .

ملاذ منا دی زمن یہ مسئلہ لیکر یہاں جھگڑا ہے حضور سے فیصلہ مطلوب ہے۔ والسلام

خاکسار رحمت اللہ

ساکن اتن گیری ڈاکخانہ کاپرپور ضلع سلہٹ

# الجواب

قال في غنية الناسك في باب الهدايا وله ان يبيع بالدراهم ليتصدق بها والصحيح ان اللحم بمنزلة الجلد حتى جاز بيعه بما ينتفع بعينه لا بما يستهلك ولو باعه بالدراهم ليتصدق بها جاز لانه قربة كالتصدق اه وفيه ايضا قبله باسطر : ولا يشترى به ما لا ينتفع به الا بعد استهلاكه نحو اللحم والطعام ولا يبيعه بالدراهم لينتفع بها او ينفقها على نفسه او عياله فان باعه بالدراهم لذلك او باعه بما يستهلك تصدق بثمنه وصح بيعه مع الكراهة عند ابي حنيفة ومحمد رحمهما الله وعن ابي يوسف باطل اه

(ص ۱۹۳)

اس عبارت میں تصریح ہے کہ جلد اضحیہ ولحم اضحیہ کی بیع مکروہ یا باطل ہے جبکہ اس کی قیمت سے خود انتفاع کا قصد ہو اور اگر بیع سے تصدق قیمت کا قصد ہو تو مکروہ نہیں پس جو عبارت مشتہر مذکور نے شائع کی ہے وہ مجمل ہے اس سے احتجاج درست نہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۹ ذی [illegible]

**حکم ذبیحہ اہل کتاب** | السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ
کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انگریز کا ذبیحہ حلال ہے کیونکہ وہ نصاریٰ ہیں اور نصاریٰ کتابی ہیں۔ اور
کتابی کا ذبیحہ حلال ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ حرام ہے کیونکہ انگریز نصاریٰ نہیں بلکہ ان سے بڑھ کر
زیادہ متجاوز کتابی ہیں۔ جناب والا کیا فرماتے ہیں

حقر فیروز عبدالقادر، جماعت اول مدرسہ اسلامیہ
نواکھالی ڈاکخانہ سوناپور ۲۰ محرم ۱۳۴۷ھ

## الجواب

انگریز آجکل اکثر دہریہ ہیں اس لئے ہر انگریز کا ذبیحہ حلال نہیں ہے بلکہ جس کا معتقد
انجیل و معتقد عیسیٰ علیہ السلام و معتقد آخرت ہونا ثابت ہو جائے اور یہ کہ وہ مذہب
کو محض سیاسۃ نہیں مانتا بلکہ مذہب کو ذریعہ نجات آخرت سمجھتا ہے اس کا ذبیحہ حلال ہے
اور ایسے انگریز بہت کم ہیں۔ فقط

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۸ محرم ۱۳۴۷ھ

**خنثیٰ جانور کی قربانی جائز نہیں ہے** | السوال: خنثیٰ کی قربانی جائز ہے یا نہیں
زید کہتا ہے کہ اگر مذکر یا مؤنث کی علامت غالب ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟

عبدہ سید عبدالرحیم عفی عنہ

## الجواب

زید کا قول صحیح ہے کہ خنثیٰ کی قربانی جائز نہیں ہے۔ ولا بالخنثیٰ لان لحمہا لا ینضج
شرح وہبانیہ۔

قال الشامی: وبہذا التعلیل یندفع ما اوردہ ابن وہبان من انہ لا تخلو اما
ان تکون ذکرا او انثیٰ وعلیٰ کل تجوز اھ (ج ۵ ص ۳۱۲)
اور اگر علامت ذکر یا انثیٰ غالب ہو تو جائز ہے کیونکہ وہ خنثیٰ نہیں

ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

ثمن جلد اضحیہ کا بعینہ تصدق واجب ہے یا دوسری رقم بھی اس کے بدلہ میں دی جاسکتی ہے

السوال: اگر کوئی شخص چرم جانور قربانی یا چرم جانور عقیقہ کو بارادہ تصدق بیع کردے اور ثمن کو اپنے پاس رکھے کہ کسی موقع پر تصدق کردوں گا پھر اس کو موقعہ تصدق دستیاب ہوگیا لیکن اس وقت ثمن بعینہ اس کے پاس موجود نہیں بلکہ مکان پر ہے جو بوجہ سفر ہونے کے بعید ہے تو کیا یہ شخص بجائے اس ثمن کے دوسری رقم کو تصدق کرسکتا ہے یا بعینہ اسی ثمن کا تصدق واجب ہے کہ بدون اس کے بری عن وجوب التصدق نہ ہوگا۔

السائل:
الحاج نظام الدین کانپوری

# الجواب

قال فی غنیۃ الناسک فی بیع لحوم الھدایا وجلودھا ما نصہ: ولو باع اللحم جاز بیعہ لأن ملکہ قائم الا انہ فیما لا یجوز لہ یتصدق بثمنہ لانہ ثمن مبیع واجب التصدق کذا فی الفتح عن البدائع وان کان مما یجوز لہ الاکل منہ فان باع شیئا او أعطی الجزار اجرہ منہ فعلیہ ان یتصدق بقیمتہ اھ ای بقیمتہ ان کان اکثر او بالثمن ان کان اکثر علی ما فی البدائع اھ (ص ۱۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تصدق ثمن اس صورت میں واجب ہے جبکہ بیع جائز الاکل نہ ہو اور جائز الاکل میں تصدق قیمت واجب ہے نہ تصدق ثمن۔ پس یہ واجب فی الذمہ ہوا واجب فی العین نہ ہوا لہٰذا صورت مسئولہ میں بجائے ثمن کے دوسری رقم کو تصدق کرسکتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ثمن اگر قیمت سے کم ہو تو قیمت کاملہ تصدق کی جائے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ

### کسرِ عظام ورِ عقیقہ اور دایہ کو ران دینے کا حکم

السؤال: بہشتی زیور میں عقیقہ کے باب میں جو نیچے حاشیہ ہے اس میں لکھا ہے کہ ہڈیاں اگر نہ توڑی جائیں تو بہتر ہے اور پھر گوشت تقسیم سری پائے اور ران و کھوپڑی کا ذکر ہے۔ یہ حاشیہ اس وقت پہلے بہشتی زیور میں موجود نہیں تھا۔ جبکہ میں نے اس کے مسائل کی تخریج کی تھی، اس لئے اس کا ماخذ مجھے نہیں ملتا۔ شامی میں اس کی افضلیت کا کچھ ذکر نہیں بلکہ توڑنے نہ توڑنے کو برابر لکھا ہے اور تقسیم اعضاء یا عقیقہ کا بھی وہاں کچھ ذکر نہیں ہے۔ براہ کرم اس کے حوالے سے مطلع فرمادیں۔

## الجواب

یہ حاشیہ میرا لکھا ہوا نہیں ہے۔ غالباً احمد حسن سنبھلی کا ہے اور اس میں جن امور کا ذکر ہے اُن کو علامہ شامی نے تنقیح فتاوی حامدیہ میں ذکر کیا ہے۔ صرف اس جزو کا حوالہ نہیں ملا کہ سری حجام (بال مونڈنے والے) کو دلوائیں۔ اھ

ونصه وحكمها كاحكام الاضحية الا انه يسن طبخها وتحلو تفاؤلاً بحلاوة اخلاق المولود وحمل لحمها مطبوخاً للفقراء ولا باس بندائهم اليها وتعطى القابلة رجلها لامره عليه الصلوٰة والسلام فاطمة رضى الله عنها باعطائها اياها واليمنى اولى ولا يكسر عظمها وان كسر لا يكره اھ

وفيه ايضاً قبله ويستحب ان يفصل لحمها ولا يكسر عظمها تفاؤلاً بسلامة اعضاء الولد ويأكل ويطعم ويتصدق ويعطى القابلة فخذها ويطبخ جميعها ثم يتصدق بها اھ ملخصاً ص۲۳۲ وص۲۳۳ ج۲

واعطاء الرجل القابلة ذكره الحافظ في التلخيص الكبير فقال وروى الحاكم من حديث على قال امر رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة فقال زنى شعر الحسين وتصدقى بوزنه فضة واعطى القابلة رجل العقيقة۔ رواه حفص بن غياث عن جعفر بن محمد عن ابيه مرسلاً اھ (ج ۲ ۔ ص ۳۸۸)

واحاديث الحاكم صحاح الا ما تعقب منها وهذا لم يتعقبه الحافظ بشئ فليعلم واما ترك كسر العظام واعطاء الجزار من العقيقة شيئاً فقد ينفيه

كلام ابن رشد وهذا نصه وحكم العقيقة حكم الضحايا لانه نسك فلا يباع جلدها ولا لحمها (وروى ان بيع فيتصدق بثمنه) ولا يعطى الجزار على جزارته بشئ من لحمها ويتقى فيها من العيوب ما يتقى فى الضحايا ويوكل منها ويتصدق وتكسر عظامها ولا يمس الصبى بشئ من دمها لان ترك كسر عظامها وان يلطخ الصبى بشئ من دمها من افعال الجاهلية اھ من المقدمات المطبوعة مع المدونة لمالك (ج ۲ ص ۱۹) واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۳ / جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ

**اگر چودہ آدمی دو گایوں میں بلا تعیین کے شریک ہوں تو ان کی قربانی درست ہوگی یا نہیں۔**

السؤال: اگر چودہ آدمی دو گایوں میں شریک ہو کر قربانی کریں کہ ہر ایک کا حصہ کسی خاص گائے میں متعین نہ کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ گائے سات شخصوں کی ہے اور دوسری گائے دوسرے سات شخصوں کی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ دونوں گائیں مشترک طور پر چودہ شخصوں کی طرف سے ہیں تو اس طرح قربانی درست ہوگی یا نہیں۔ امر حضرۃ الشیخ دام مجدہ وعلاہ تحقیقہ۔

# الجواب

یہ صورت قیاساً تو جائز نہیں ہے۔ اور استحساناً جائز ہے۔ ولو اشترك سبعة فى سبع شياه لا يجزيهم قياسا لان كل شاة بينهم على سبعة اسهم وفى الاستحسان يجزيهم وكذا اثنان فى شاتين اھ (ج ۵ ص ۳۰۸) واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵ / ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ

**قربانی ترک ہونے کی صورت میں بکری کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہے یا گائے کے ساتویں حصہ کی قیمت دینا؟**

السؤال: مندرجہ ذیل مسئلہ میں شریعت مقدسہ کا جو حکم ہو اس کو تحریر فرمایا جاوے۔ کہ ایک شخص صاحب نصاب ہے اور ایک سال میں اس سے کسی وجہ سے قربانی ترک ہوگئی تو اس صورت میں اس کو بکری کی قیمت خیرات کرنی چاہیے یا

گائے کے ساتویں حصہ کی قیمت خیرات کرے ۔ السائل :

سید احمد خان

## الجواب

متوسط درجہ کی بکری کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہے ۔ گائے کے ساتویں حصہ کی قیمت صدقہ کرنا کافی نہیں ۔

قال فی الدر : و تصدق بقیمتھا غنیا اولا لتعلقھا بذمتہ شراھا اولا فالمراد بالقیمۃ قیمۃ شاۃ تجزی فیھا اھ

قال الشامی : فبین ان المراد (بقیمتھا) اذا لم یشترھا قیمۃ شاۃ تجزئ فی الاضحیۃ کما فی الخلاصۃ وغیرھا ۔

و قال القھستانی : او قیمۃ شاۃ وسط ۔ کما فی الزاھدی والنظم وغیرھا اھ

(ج ۵ ۔ ص ۳۱۴)

قلت و قیود الفقہ احترازیۃ فالتقیید بقیمۃ الشاۃ یفید بعدم اجزاء قیمۃ سبع البقرۃ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۸ ۔ ذی الحجۃ سنہ ۱۳۴۷ھ

**ذبح فوق العقدہ میں موضع ذبح کے چار چیزوں میں سے تین کٹ جائیں تو ذبیحہ حلال ہے ورنہ حرام**

السؤال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں

۱ زید نے چند گائے ذبح کیں جن میں سے بعض گایوں کو حلق کے اوپر جبڑوں کے نیچے سے بسبب ناواقفی ذبح کیا اور ان ذبیحوں کا زخرہ نہیں کٹا ۔ اس موقع پر ایک اہل علم نے آکر معائنہ کیا اور کہا کہ ذبیحہ حرام ہے بلکہ اس کا استعمال مثل خنزیر کے ہے ۔ باوجود اس کے بعض لوگوں نے اس کا ذبیحہ کھایا اور بعض نے کفار کے حوالہ کر دیا ۔ اب عرض یہ ہے کہ ذبیحہ مذکورہ حلال ہے یا نہیں قربانی ادا ہوگی یا نہیں ؟

۱ کتب فقہ کی اکثر عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام اعظم کے نزدیک اکثر رگوں کا کٹ

جانا کفایت کرتا ہے اور موطا امام محمد اردو کے مضمون سے بھی یوں ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں۔

۲۔ اگر مذکورہ بالا ذبیحہ حلال ہے تو اسے حرام قرار دینے والے اہل علم پر کوئی الزام تو نہیں۔

۳۔ اگر مذکورہ بالا ذبیحہ حرام ہے تو ذبح کرنے والے پر کیا الزام عائد ہوگا۔ اس کو کیا کرنا چاہئے۔

المستفتی

حاجی احمد داد بھائی سواتی بازار

## الجواب

مواضع ذبح چار چیزیں ہیں: حلقوم، مری، دو رگیں۔ پس اگر ذبح فوق العقدہ ہو یا تحت، ان چار میں سے تین کٹ جائیں تو ذبیحہ حلال ہے ورنہ حرام۔ (شامی ج۵ ص...)

۱۔ ہاں صحیح ہے۔ پس چار میں سے تین قطع ہو جائیں تو ذبیحہ حلال ہے۔

۲۔ ان پر کوئی الزام نہیں کیونکہ مسئلہ مختلف فیہا ہے۔

۳۔ ذبح کرنے والے پر الزام اس وقت ہے جبکہ بلا اذن مالک کے ذبح کیا ہو، اور اگر اذن سے ذبح کیا ہے تو ذابح پر ضمان نہیں۔ ہاں اس کو اس بات کا گناہ ہے کہ جس کام کو وہ جانتا نہ تھا اس پر پیش قدمی کیوں کی۔ پس صورت مسئولہ میں اگر تین رگیں کم کٹی ہوں تو یہ لوگ جن کی قربانی تھی ہر ایک شخص ایک متوسط بکری کی قیمت صدقہ کر دے اور اگر تین رگیں کٹ گئی تھیں تو ذبیحہ حلال ہے اور قربانی درست ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۱ ذی الحجہ ۴۳ھ

**غیر مسلم کی بندوق سے شکار کئے ہوئے جانور کو اگر مسلمان ذبح کر دے تو وہ حلال ہے یا نہیں؟**

السوال: ایک غیر مسلم نے ہرن کو بندوق کی گولی سے شکار کیا۔ ہرن گولی کھا کر جاں بلب ہوا یعنی بقدر رمق باقی رہا، بعدہ ایک مسلم نے بالتسمیہ ذبح کیا تو

وہ ہرن حلال ہے یا حرام ۔

## الجواب

بندوق کے شکار میں بندوق چلانے والے کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے ۔ بلکہ مسلمان یا اہل کتاب کا ذبح شرط ہے ۔ پس صورت مسئولہ میں جب مسلمان نے اس کو ذبح کیا تو حلال ہے کیونکہ بندوق کا شکار بدون ذبح حلال نہیں ہوتا اور تیر اندازی میں مسلم یا کتابی کی شرط اس بنا پر ہے کہ خود تیر کا لگ جانا ہی قائم مقام ذبح کے ہے۔

قال قاضیخان : لا یحل صید البندوقۃ وما اشبہ ذلک وان جرح لانہ لا یخرق الا ان یکون شئی من ذلک قد حددہ وطولہ کالسہم وامکن ان یرمی بہ الخ شامی ج ۵ ۔ ص ۲۶۰

وفی الشامی بعد بیان شرائط حل الصید من کون الصائد اھلاً للذکوٰۃ وغیرہ ومجمع ھذہ الشروط لما یحل اکلہ ولم یدرکہ حیاً اھ صفحہ ۲۵۹

الجواب صحیح

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

۲۷ ، جمادی الاولیٰ ۵۴ھ

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

**بدون اذن و اطلاع کے شوہر نے بیوی کی طرف سے قربانی کی تو بیوی اور سب کی قربانی ہوگی یا نہیں**

السؤال : احقر نے امسال عید الضحیٰ میں قربانی میں شرکت کی اور تین حصہ ایک گائے میں لئے اور باقی اور لوگوں نے لیے ۔ احقر پر تو قربانی واجب نہ تھی میری شادی حال ہی میں ہوئی اور بیوی اکثر آل اور اپنے میکے ہی گئی ۔ چنانچہ عید الضحیٰ میں وہ اپنے مکان یعنی میکہ ہی میں تھی ۔ احقر نے اپنے خسر کو ایک ماہ قبل اطلاع دی تھی کہ میری بیوی کی طرف سے آپ قربانی کر دیں کیونکہ اسی پر واجب ہے ۔ اگر وہاں آئے گی تو آپ ہی کو قربانی کرنی ہوگی مگر کسی وجہ سے انہیں یہ خط ملا نہیں ۔ اب جبکہ قربانی کا وقت آیا تو احقر نے بدون اطلاع بیوی خود اس کی طرف سے بھی ایک حصہ لیکر کر دیا اور ایک اپنے والد مرحوم و مغفور کی طرف سے کر دیا ۔ اب حال ہی میں دعوات عبدیت حصہ ششم کو پڑھ رہا تھا تو اس کے صلاۃ مسئلہ میں لکھا ہوا تھا دیکھا اکثر لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے

عزیز کی طرف سے قربانی کرتے ہیں اور اس کو اطلاع نہیں ہوتی اس صورت میں قربانی ادا نہیں ہوتی اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے گی کہ جس سے ایک قربانی صحیح نہ ہو تو باقی کی قربانی بھی صحیح نہ ہوگی۔

۲ کیا احقر کی قربانی صورت مذکورہ میں ادا ہوتی ہے یا نہ

۳ اگر ادا نہیں ہوئی تو پھر زندوں کی طرف سے اب بھی واجب رہی یا مُردوں کی طرف سے بھی واجب ہے۔ اور اسی طرح میرے اوپر بھی واجب رہی یا نہیں۔ کیونکہ پہلے مجھ پر واجب نہ تھی بلکہ مستحب تھی۔ مگر نفل شروع کرنے کے بعد واجب ہو جاتا ہے۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح بیوی پر بھی واجب تھی کیونکہ وہ میکہ میں تھی اس لئے مجھ پر ان کی طرف سے واجب نہ تھی مگر میں نے ان کا حصہ بھی لے لیا اور انہیں اطلاع نہیں کی جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔

۴ اگر سب پر واجب ہے تو کل یعنی چار اور حصہ داروں کو تاوان احقر پر ہی ہے یا ان لوگوں پر واجب رہی کیونکہ قربانی میں جو فساد لازم آیا ہے وہ صرف میری ہی وجہ سے ہے۔

۵ اس کے ادا کی صرف یہی صورت ہے کہ قیمت کل کی کل جتنی کی وہ گائے ہے احقر صدقہ کردے یا اور کوئی صورت بھی ہے۔

۶ بیوی کی طرف سے میکہ میں جیسا کہ میں نے ہدایت کی تھی بوجہ خط نہ ملنے کے قربانی نہیں کی گئی تو کیا حکم ہے۔ المستفتی

محمد احمد کتب خانہ احیاء الدین

محلہ شاہ گنج الہ آباد

## الجواب

قال فی الخانیۃ: ولیس علی الرجل ان یضحی عن اولادہ الکبار وامرأتہ إلا باذنہم وعن ابی یوسف انہ یجوز بغیر امرہم استحسانا (ھ ج ۳، ص ۳۴۹)

وفی العالمگیریۃ: ولو ضحی ببدنۃ عن نفسہ وعرسہ واولادہ لیس ھذا فی ظاہر الروایۃ۔ وقال الحسن بن زیاد فی قول ابی حنیفۃ وابی

یوسف وان فعل بغیر امرھم او بغیر امر بعضھم لا تجوز عنہ ولا عنھم فی قولھم جمیعا لان نصیب من لم یامر صار لحما فصار الکل لحما الی ان قال: بعد ذکر صورۃ مثلہ قال ابو القاسم تجزی عن نفسہ کذا فی قاضیخان (ج ۲ ص ۲۰۲)

صورت مسئولہ میں قیاس کا مقتضا تو وہی ہے جو دعوات عبدیت میں مذکور ہے کہ سب شرکا کی قربانی باطل ہو جائے اور اس صورت میں ہر شخص کے ذمہ بشرطیکہ غنی ہو ایک متوسط بکری کی قیمت خیرات کرنا واجب ہے اور جو غنی نہ ہو اس کے ذمہ تصدق واجب نہیں نہ اپنے حصے کا اور نہ میت کے حصے کا۔ لکون الاضحیۃ متعینۃ فی المذبوحۃ فاذا ضلت او بطلت فلا ضمان علیہ لعدم الوجوب فی ذمتہ۔ اور جس شخص کی غلطی سے یہ فساد لازم آیا ہے اس کے ذمہ دوسرے شرکاء کے حصہ کا ضمان و تاوان بھی واجب نہیں (لعدم ضمانہا علی المتسبب الا فی مسائل ولیس ذلک منہا ۱۲) مگر استحسان یہ ہے کہ اولاد اور بیوی کی طرف سے بدون اجازت و اطلاع کے بھی قربانی درست ہے (ولعل وجہ الاستحسان ثبوت الاذن دلالۃ فی مثل ذلک) اس روایت کے موافق یہ قربانی سب کی طرف سے صحیح ہوگی (وقد ذکروا فی رسم المفتی اذا کان فی المسئلۃ قیاس واستحسان یرجح الاستحسان ویوخذ بہ) پس صورت مسئولہ میں سائل کی اور اس کی بیوی کی اور سب شرکاء کی قربانی درست ہوگی۔ کسی کے ذمہ اس کی قضا واجب نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون ۹ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ

**کیا گابھن گائے وغیرہ کی قربانی جائز ہے**

السوال: ۔ از رائے بریلی جواب مسائل عنایت فرمائیں۔ یہ کہ ایک گائے مادہ دو روز یا ایک روز کی حمل ہوتی ہے اسے جان بوجھ کر قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں بینوا توجروا

## الجواب

گابھن گائے وغیرہ کی قربانی درست ہے مگر بہتر یہ ہے کہ جو گابھن نہ ہو اس کی قربانی کی جائے یعنی جبکہ گابھن ہونا ظاہر ہو جائے۔ ایک دو روز کا کوئی اعتبار نہیں۔

اور اگر ایسی گابھن ہو کہ جس کے بچہ پیدا ہونے کا وقت قریب آگیا ہو تو اس کی قربانی کرنا مکروہ ہے۔

کما فی غنیۃ الناسک: ویجوز فیھا الجماء الیٰ ان قال والحامل مع الکراھۃ اذا کان مشرفۃ علی الولادۃ الخ صحت۔ واللہ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۱۵ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ

کیا پورے دنوں کی گابھن گائے وغیرہ کی قربانی جائز ہے

السوال :- ایک گائے چند اشخاص نے قربانی کے واسطے خریدی بعد میں معلوم ہوا کہ گابھن تقریباً پورے دنوں کی ہے۔ اب اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں اور اگر اس کو بیچ کر دوسری خرید لیں تو کیا حکم ہے۔ نیز اگر اس کا بیچنا جائز ہے تو حصہ داروں میں سے کوئی شخص بقیہ حصہ داروں سے اُسے خرید لے تو کیا حکم ہے۔ فقط۔

## الجواب

فی العالمگیریۃ: رجل اشتری شاۃ للاضحیۃ واوجبھا بلسانہ ثم اشتری اخریٰ جاز لہ بیع الاولیٰ فی قول ابی حنیفۃ ومحمد وان کانت الثانیۃ شریٰ من الاولیٰ وذبح الثانیۃ فانہ یتصدق بفضل ما بین القیمتین۔ (ج ۲ ص ۲۹۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اُسی گائے کو بیچ کر دوسری گائے خریدنا جائز ہے لیکن دوسری گائے اس کی قیمت سے کم میں آئے تو باقی دام مساکین کو دینا لازم ہے۔ اور گابھن کی بھی قربانی کردی جائے تو قربانی درست ہو جاوے گی۔ مگر گابھن کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔ قربانی میں بھی اور ویسے بھی۔

کما فی العالمگیریۃ ایضاً: شاۃ او بقرۃ اشرفت علی الولادۃ قالوا یکرہ ذبحھا الخ (ج ۲ ص ۱۹۲)

اور جب فروخت کرنا جائز ہے تو حصہ داروں میں سے کوئی شخص بھی لے سکتا ہے۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ۔ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔ مورخہ ۲ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ

چرم قربانی اور گوشت اجرت میں دینا | **السوال:** چہ میفرمایند علمبرداران شریعت بیضائے مصطفوی و نکتہ دانان اندرین مسئلہ کہ خورانیدن گوشت قربانی و لحوم ہمان مر مزدوران و نوکران را شرعاً چہ حکم دارد جائز یا ناجائز و بر تقدیر ثانی اگر خورانند چہ کنند درین دیار خورانیدن گوشت قربانی مر مزدوران را بلا نکیر میان خواص و عوام جاری است یا آنکہ طعام و آنقدر نان خورش کہ بدان طعام خوردہ شود در اجرت مزدوران داخل است کہ اگر طعام خورانند اجرت کم دهند و اگر نہ خورانند بیشتر دهند

**بینوا توجروا!**

## الجواب

باید دانست کہ چیزے از جانور قربانی گوشت باشد یا جلد کسے را بطور اجرت آنچ عمل دادن شرعاً جائز نیست۔

فی الدر المختار: ولا یعطی اجر الجزار منہ لانہ کبیع۔ وفی الھدایۃ: ولا یعطی اجر الجزار من الاضحیۃ لقولہ علیہ السلام لعلی رضی اللہ عنہ تصدق بجلالھا وخطامھا ولا تعط اجر الجزار منھا شیئا۔ والنھی منہ نھی عن البیع ایضاً لانہ فی معنی البیع۔ فی الحاشیۃ: قولہ لانہ فی معنی البیع لان کل واحد منھما معاوضۃ لانہ انما یعطی الجزار بمقابلۃ جزارتہ والبیع مکروہ فکذا ما ھو بمعناہ۔ اھ

ازین عبارت بخوبی روشن گردید کہ گوشت اضحیہ را باجرت آنچ عمل دادن جائز نیست ہمچو فروختن آن۔ و چون طعام مزدوران و قدر کافی از نان خورش باجرت ایشان محسوب است کما مر فی السوال پس اگر گوشت قربانی مزدوران را بخورانند لا قائم قدر کافی از نانخورش کہ باجرت داخل و محسوب بود گوشت قربانی ادا کردہ شد پس آن قدر گوشت کہ بمقابلہ قدر کافی نانخورش افتاد در حق باجرت مزدوران شد کہ منھی عنہ است پس نہ جائز باشد و من ادعی الجواز فعلیہ البیان بالبرھان و اگر مزدوران لحم اضحیہ خورند قیمت آن مقدار گوشت کہ بمقابلہ قدر کافی نانخورش افتد تصدق کنند۔

فی الھدایۃ: ولو باع الجلد او اللحم بالدراھم او بما لا ینتفع بہ

لا بعد استهلاكه فيتصدق بثمنه لان القربة انتقلت الى بدله انتهى۔

با این چنین کند که بقدر قیمت آن قدر گوشت فلوس در اجرت مزدوران زیاده دهد تا این فلوس با جرت محسوب شود و آن گوشت از اجرت خارج گشته در حق و محض هدیه ماند فقط ۔ واللہ اعلم۔

المجیب

احقر الوریٰ بندہ فیض اللہ عفی عنہ

مدرس مدرسہ معین الاسلام چاٹگام

## جواب از خانقاہ

بے شک اگر کھانا اجرت میں مشروط ہے تو گوشت قربانی ان مزدوروں کو اجرت میں محسوب کرکے دینا جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر کھانے میں اور کوئی سالن بھی دیدیں اور تبرعاً دیگر مسلمانوں کی طرح یہ گوشت بھی ان کو دیدیں تو مضائقہ نہیں۔ وھذا کلہ مقتضی القواعد ولم ار نصاً صریحاً واللہ اعلم بالصواب۔

احقر عبد الکریم عفی عنہ

از تھانہ بھون مورخہ ۲ محرم ۱۳۵۲ھ

| اس جانور کی قربانی جائز نہیں جس کے دانت پیدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ | السوال: جس گائے کے دانت بالکل نہ ہوں کہ خلقۃً پیدا ہی نہیں ہوئے اس کی قربانی جائز ہے یا |
|---|---|

نہیں۔ از سائل

حکیم عبد الرحمن کاندھلوی از شاملی

## الجواب

جائز نہیں۔ قال فی الدر المختار: ولا بالهتماء التی لا اسنان لها ویکفی بقاء الاکثر وقیل ما تعتلف به اھ (ج۵) واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۴ ذی قعدہ ۱۳۴۳ھ

---

**اختلاف جہات در اضحیہ و عقیقہ**

**السوال** :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ مسک الختام شرح بلوغ المرام میں لکھا ہے کہ امام احمدؒ نے بتاکید بیان کیا ہے کہ عقیقہ میں شترو گائے کامل شرط ہے۔ اور امام رافعی نے ذکر کیا ہے کہ مثل قربانی کے سات شخص کی شرکت عقیقہ میں بھی جائز ہے۔ اور فتح الباری میں ہے:
ونص احمد علی اشتراط کاملة وذکر الرافعی بحثا انها تتادی بالسبع کما فی الاضحیة اور نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ۔ ونص احمد علی انها تشترط بدنة أو بقرة کاملة وذکر الرافعی انه یجوز اشتراك سبعة کما فی الاضحیة اھ۔

ان عبارتوں میں فیصلہ اور محاکمہ فرمائیے اور کتب معتبرہ سے مع ادلہ و براھین۔ نیز حضرت مولانا تھانوی صاحب کے دستخط سے مزین فرما کر مطمئن کیجئے۔ ایک گائے یا اونٹ میں کچھ آدمی بنیت قربانی اور کچھ بنیت عقیقہ شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہو سکتے ہیں تو فقہ میں کون سی صورت ہے کہ جس میں تعدد نیت سے قربانی جائز نہیں۔

المستفتی : معین الدین جاٹگامی

## الجواب

امام احمدؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر قربانی میں اونٹ یا گائے ذبح کی جائے تو اس کا حصہ کافی نہیں۔ بلکہ کامل جانور عقیقہ ہی کی طرف سے ہو کیونکہ اختلاف جہات جب مانع اضحیہ ہے اسی طرح مانع عقیقہ ہے اور بکرا بکری کر دیا جائے تو چونکہ وہ ایک حصہ سے زیادہ کو متحمل نہیں اس سے عقیقہ بلا تردد درست ہے اور اس بات میں حنفیہ کی دو روایتیں ہیں۔

ایک یہ کہ صحت اضحیہ کیلئے شرط یہ ہے کہ سب شرکاء نے قربت کا قصد کیا ہو۔ کسی نے محض گوشت کھانے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ نیز کوئی شریک ایسا نہ ہو جو نیت قربت کا اہل نہیں ہے مثلاً کافر و مرتد اور اتحاد جہات شرط نہیں۔ پس اگر ایک شریک نے قربانی کا حصہ لیا دوسرے نے عقیقہ کیلئے تو قربانی صحیح ہے۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ اتحاد جہت مستحب ہے اور شرکت باختلاف جہت

مکروہ ہے۔ اس روایت کی بنا پر بھی اضحیہ اور عقیقہ کی شرکت کے ساتھ گائے اونٹ کی قربانی درست ہے مگر مکروہ ہے۔

قال فی رد المحتار: وقد علم ان الشرط قصد القربة من الکل وشمل ما لو کانت القربة واجبة علی الکل او البعض اتفقت جهاتها اولا کاضحیة واحصار وجزاء صید وحلق ومتعة وقران لان المقصود من الکل القربة خلافا لزفر۔ وکذا لو اراد بعضهم العقیقة عن ولد ولد له من قبل لان ذلک جهة التقرب بالشکر علی نعمة الولد ذکره محمد ولم یذکر الولیمة وینبغی ان تجوز لانها تقام شکرا للّٰه تعالی علی نعمة النکاح ووردت بها السنة فاذا قصد بها الشکر او اقامة السنة فقد اراد القربة وروی عن أبی حنیفة أنه کره الاشتراک عند اختلاف الجهة وانه قال لو کان من نوع واحد کان أحب الی وهکذا قال ابو یوسف بدائع (ج ۵، ص ۳۱۹)

قلت وظاهر کلام الشامی ترجیح الروایة الاولی واللّٰه اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللّٰہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۲۹ ذی قعدہ سنہ ۱۳۴۸ھ

ایضاً اختلاف جہات در اضحیہ و عقیقہ

السوال: غنیۃ الناسک ص۱۴۴ فی جواز الاشتراک فی الہدی میں ہے: وبشرط ارادۃ الکل القربۃ وان اختلفت اجناسہا من دم متعۃ وحصار وجزاء صید وغیر ذلک کتطوع وعقیقۃ لمن ولد ونذر لہ من قبل وولیمۃ العرس وغیر ذلک مما یقصد بہ القربۃ الی اللہ تعالیٰ۔ اھ

یہاں یہ شبہ ہے کہ ولیمہ عرس میں ذبح مقصود نہیں بلکہ طعام مقصود ہے بخلاف اضحیہ تطہیر و عقیقہ کے وہاں اراقۃ دم مقصود ہے پس ولیمہ کو بھی اور اضحیہ میں شریک کرنا درست نہ ہونا چاہیے۔

## الجواب

فی الشامیۃ عن البدائع: وکذا لو اراد بعضہم العقیقۃ عن ولد ولد لہ من قبل لأن ذلک جہۃ التقرب بالشکر علی نعمۃ الولد ذکرہ محمد ولم یذکر الولیمۃ۔ وینبغی أن تجوز لأنہا تقام شکراً للہ تعالیٰ علی نعمۃ النکاح وقد وردت بہا السنۃ فاذا قصد بہا الشکر او اقامۃ السنۃ فقد اراد القربۃ اھ (ج ۵ ص [illegible])

اور گو ولیمہ بدون اراقۃ دم کے ادا ہو جاتا ہے مگر حدیث اولم ولو بشاۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اراقۃ دم ولیمہ میں بھی مسنون ہے پس جو درجہ عقیقہ کا ہے وہی ولیمہ کا ہے۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۹ شعبان [illegible]

مسئلہ ذکاۃ: السوال: نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ بخدمت فیض درجت جامع شریعت وطریقت حضرت مولانا مدظلہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یہاں پر ایک قسم کے جانور ذبح ہونے کا مسئلہ درپیش ہے جو کہ وہ صورت شرح بحر الرائق و در مختار وغیرہ فتاوی میں تحریر ہیں، چنانچہ اس علم کو اس میں تخریج ہے بعض حلال کہتے ہیں اور بعض حرام، فریق اول کی دلیل یہ عبارت ہے۔

وعند أبی یوسف اذا کان بحال لا یعیش مثلہ لا یحل لأنہ لم یکن موتہ بالذبح، وقال محمد ان کان مثلہ یعیش فوق ما یعیش المذبوح یحل والا لا لأنہ

معتبر بهذه الحياة علی ما قررناه الخ هدایہ کتاب الصید۔

فریق ثانی کی دلیل یہ ہے کہ حضور نے بیان القرآن پارہ چھ کے تحت آیت والموقوذة و المتردیة والنطیحة وما اکل السبع الا ما ذکیتم الآیۃ۔ میں صورت متنازعہ فیہ کو موقوذہ میں داخل فرما کر بعد از ذبح جانور مذکور حلال فرمایا ہے، کیا حضور نے بیان القرآن میں یوں ہی تحریر فرمایا ہے کیونکہ یہ صورت اکثر وقوع ہوتی رہتی ہے اس لئے اس مسئلہ کی سخت ضرورت ہے۔ فریقین نے حضور کے فتویٰ کو بلا چوں وچرا تسلیم کرنے کا حتمی وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا مہربانی فرما کر جواب سے سرفراز فرمایا جاوے۔ فریقین میں سے کسی نے یہ عبارت بھی پیش کی ہے جو بے موقع معلوم ہوتی ہے۔ والاصل فی جنس هذه المسائل ان الموت اذا حصل بالجرح بیقین الحل وان حصل بالثقل او شك فيه فلا يحل حتما او احتياطا۔ البحر الرائق ج ۸، ص ۲۲۹

صورت مسئولہ نافہ و کاست مندرجہ ہے جواب اگر بعد جواز عبارت ہو تو سبحان اللہ ورنہ جیسا مناسب ہو۔

میرے گاؤں کے قریب ایک سرکاری جگہ ہے۔ جو نا ڈپو نام اس میں گھوڑے بیل چرتے ہیں۔ جب کوئی گھوڑا بیل عمر کی خاص میعاد تک پہنچ جاتا ہے یا مرض کا شبہ ہوتا ہے تو انگریز افسر ایک نوکر کو خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو حکم دیتا ہے کہ بیل کو کھڑا کر کے پیشانی پر بندوق چلاؤ، افسر مذکور کی غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ جانور مر جائے۔ چنانچہ نوکر بندوق چلاتا ہے بندوق کی گولی دماغ کو پھاڑ کر بعض دفعہ پار بھی نکل جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ بیل فوراً گر پڑتا ہے اور حالت مذبوحی ظاہر کرتا ہے کیونکہ اگر یہ گولی لگتے ہی تھوڑا دوڑ کر چلا جاتا ہے۔ بعض مسلمان لوگ فوراً چھری لے کر افسر کی غیر موجودگی میں اس بیل کو شرعی طریقے سے ذبح کر لیتے ہیں اس جانور کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

از سائل

مولوی حافظ کامل الدین از لوکالا ڈاکخانہ پیلوان

تحصیل بھیرہ، ضلع سرگودھا پنجاب

# الجواب

از دار الافتاء مجلس مستشار العلماء پنجاب لاہور۔ حلت وحرمت کا مدار مذبوح کی حیات وموت پر ہے۔ اگر عند الذبح جانور میں آثار تڑپنا وغیرہ موجود ہوں تو ذبح کو کھانا جائز ہے اور گولی لگنے سے جانور میں آثار حیات موجود نہ ہوں تو اس کا کھانا ناجائز ہے ـــہ

تائید الجواب از خانقاہ امدادیہ   مستشار علماء کا جواب صحیح ہے اور حوالہ مسلم قول امام ابو یوسف و محمد کی بناء پر اس جواب سے اختلاف کرتے ہیں اور حالت مذکورہ میں مطلقاً حرمت کے قائل ہیں ان کا قول مفتیٰ بہ نہیں۔ ہدایہ میں جہاں قول ابی یوسف و محمد نقل کیا ہے اس سے پیشتر امام صاحب کا قول بھی موجود ہے۔ اور اس کے بعد وعلیہ الفتویٰ بھی موجود ہے۔ پس مفتیٰ بہ قول کو ترک کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔ فقط

واللہ اعلم

| احقر عبد الکریم عفی عنہ | الجواب صحیح مع الحاشیہ |
| --- | --- |
| از تھانہ بھون | اشرف علی عفی عنہ |
| مورخہ ۱۵ ر جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۳ھ | مورخہ ۱۰ ر جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۳ھ |

ـــہ خادم شرع جمیل محمد خلیل عفی عنہ

# کتاب الحظر والاباحۃ

## باب الرشوۃ والہدایا والضیافات

### طلبا کے والدین کا استاذ کو ہدیہ دینا اور اس کی مختلف صورتوں کا حکم

سوال : کئی سال سے اس ناچیز کا پیشہ معلمی رہا ہے چونکہ سرکاری مدارس میں بوجہ دیگر حقوق کے تنخواہیں قلیل ہیں۔ اس لئے بعض حقوق کی زبانی اور بعض کی تحریری اجازت سے اور اہل دیہہ دینے کے عادی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات شرعاً بھی جائز ہیں یا نہیں جوکہ درج ذیل ہیں۔

(۱) جس وقت کوئی لڑکا داخل مدرسہ ہوتا ہے اس وقت اس کا وارث علاوہ فیس سرکاری کے کچھ نقد یا جنس کی قسم سے دیتا ہے۔ بعض کچھ نہیں دیتے۔

(۲) اوقات معینہ پر جب عام طلبا ترقی پاتے ہیں تب روپیہ دو روپیہ حسب حیثیت استاذ کو دیتے ہیں۔

(۳) بعض مدارس میں ہفتہ وار خشک خوراک یا کھانا کھلانے کا رواج ہے۔

(۴) فصل کی پیداوار سے لڑکا یا سرپرست کچھ گڑ روٹی مکئی وغیرہ لاتا ہے۔

(۵) کچھ لوگ بطور خود ماہانہ مقرر کرکے (جبکہ اس کا لڑکا درج رجسٹر سرکاری ہو چکا ہو) اپنے لڑکے کی زیادہ تربیت چاہتے ہیں اور وہ لڑکا اسی استاد کا شاگرد ہوتا ہے یا دیگر مدرسین کا طالب علم ایسی صورت میں مدرسین کا یہ طرز عمل رہتا ہے کہ سکول کے ٹائم میں اس کے ساتھ زیادہ توجہ سے پیش آتے ہیں یا غیر اوقات میں تعلیم دیتے ہیں۔

(۶) ہندوؤں میں ایک تہوار گنیش چوتھ بھادوں کے مہینے میں ہر سال ہوتا ہے۔ اس موقع پر استادوں کو کچھ دینے کا خیال مدنظر رکھ کر تقریباً کل ہندو/مسلمان تمام لڑکوں اور مدرسین کو اپنے مکان پر بلاکر چوپائی (جس طرح بچے کی پیدائش یا شادی کے وقت لڑکے کو آمین پڑھا کرتے ہیں) پڑھواتے ہیں جن میں کسی بادشاہ کا ذکر یا نصیحت ہوتی ہے پھر دیر بعد نقد یا کپڑا استادوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ پس اسی طرح تمام لڑکوں

کے مکان پر بھیجے بعد دیگرے پہنچ کر دو چار یوم میں سو پچاس روپیہ مدرس لوگ وصول کر لیتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے اس کی اجازت تحریری ہے اس لئے کوئی افسر معائنہ بھی نکتہ چینی نہیں کر سکتا لیکن جو تھا کا زیادہ تر رواج ضلع میرٹھ کی ہر تحصیل دیہات میں موجود ہے۔ بعض مقامات پر اس کا رواج نہیں۔

(نوٹ) تنخواہ ہر صورت میں ملتی ہے۔

# الجواب

(۱) دارث وغیرہ سے صاف کہہ دیا جائے کہ اس ہدیہ کی وجہ سے اس لڑکے کے ساتھ کچھ زیادہ توجہ نہ کی جائے گی جیسے اور سب ہیں ویسے ہی یہ بھی ہوگا پھر بھی دے تو قبول کرنا جائز ہے۔

(۲) ترقی کے وقت جو ہدیہ دیا جاتا ہے اس کا قبول کرنا جائز ہے۔

(۳) اس میں وہی تفصیل ہے جو نمبر اول میں لکھی گئی کہ اس سے صاف کہہ دیا جائے کہ اس کی وجہ سے کوئی زیادہ خصوصیت نہ ہوگی۔

(۴) اس کا بھی وہی حکم ہے جو نمبر ا اور نمبر ۳ کا ہے۔

(۵) ایسے لڑکے کے ساتھ اسکول کے وقت میں زیادہ توجہ سے پیش آنا تو درست نہیں اگر کچھ وقت خارج میں اس کو زیادہ دیا جائے تو ماہانہ کا لینا جائز ہے ورنہ نہیں۔

(۶) ہندوؤں کے تہوار میں کسی قسم کی شرکت بھی جائز نہیں۔ یہ پائی پڑھنا گویا تہوار پر مسرت کا اظہار کرنا ہے اس لئے حرام ہے اور اگر بدون چوپائی پڑھے اور بدون ان کے گھر جانے کے وہ مدرس کے گھر پر ہی کوئی ہدیہ بھیج دیں لیکن اگر قبول نہ کرنے میں یہ اندیشہ ہو کہ یہ لوگ آئندہ بھی خدمت نہ کریں گے تو قبول کر لینے میں مضائقہ نہیں دل میں اس سے کراہت رکھی جائے۔ اور قبول کر لیا جائے۔ فتاوی ذخیرہ میں ہے۔

لا ینبغی للمؤمن ان یقبل ھدیۃ الکافر یوم عیدھم ولو قبل لا یرسل الیھم شیئاً انتھی۔

اور خزانۃ الروایات میں ہے۔

فی الفصول والتتارخانیۃ فی المحیط ما یاتی المجوس فی یوم

نیروزهم من الاطعمة إلی الاکابر والسادات من کانت بینه وبینهم معرفة وذهاب ومجیٔ فقد قیل من أخذ ذالك علی وجه الموافقه یضره ذالك بدینه انتهی۔

باقی تقریبات شادی اورغمی میں اگر ہندو دعوت کرے تو اس کا قبول کرنا بعض فقہاء کے نزدیک درست ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک مکروہ ہے۔

کما فی خزانة الروایات فی مفید المستفید من الموافقات لا بأس بالذهاب إلی الضیافة اهل الذمه هکذا ذکر محمد لکن المذکور فی النوازل یخالف هذا فانه ذکر فیه الاجابة انتهی۔

(از فتاوی عبدالحی ص ۱۱۹ ج ۲)

پس سائل کو اگر ضرورت مجبور کرے تو قبول کرے کیونکہ اس میں گنجائش ہے۔

واللہ اعلم۔ کتبہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۳ محرم سنہ ۴۶ھ

نکاح سے قبل ولیمہ کا حکم

سوال: دعوت ولیمہ شادی کے قبل درست ہے یا نہیں۔ بعض اشخاص کہتے ہیں کہ جب تک لڑکے اور لڑکی میں مقاربت نہ ہو اس وقت تک دعوت ولیمہ ہو ہی نہیں سکتی۔

## الجواب

قال فی مجمع البحار: الولیمة وهی طعام یصنع عند العرس من اولمت اهـ وفیه ایضاً هی طعام العرس وهی مستحبة ووقتها بعد الدخول او وقت العقد او عندهما اقوال لمالك اهـ ص ۴۲۳ ج ۲

اس سے معلوم ہوا کہ ولیمہ کا وقت مقاربت کے بعد ہے یا نکاح کے وقت یا دونوں وقت باقی نکاح سے پہلے تو کسی طرح ولیمہ کا وقت نہیں۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۶ جمادی الاولی سنہ ۴۶ھ

**جس شخص کی آمدنی حرام ہو اس کی دعوت قبول کرنے کا حکم**

سوال، بہت سے لوگ اس شہر میں ایسے ہیں کہ دین کا پاس کچھ نہیں کرتے ہیں اور کھلم کھلا کسب حرام سے مال جمع کرتے ہیں یعنی گانجا افیون کی بیوپاری کرتے ہیں اور کوئی زن فاحشہ کے ذریعہ کچھ کماتے ہیں اور نماز روزہ کی بالکل پاسداری نہیں کرتے۔ جب کوئی معاملہ یا مقدمہ میں پڑجاتے ہیں تو علا مولویوں کو جمع کر کے دعوت پڑھاتے ہیں اور ملا بلکہ مولوی لوگ بھی اکثر ایسی دعوت کے متلاشی رہتے ہیں۔ جب کوئی دعوت مل گئی بطیب خاطر دعا مانگتے ہیں مگر صاحب دعوت کو کچھ بھی لحاظ نہیں رہتا کہ میں بھی اللہ پاک سے دعا مانگوں وہ صرف ملا لوگوں کے دعا مانگنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ آیا ایسے لوگوں کی دعوت پڑھنا اور اس سے اجرت لینا اور اس کا کھانا کھانا درست ہے یا نہیں۔ صاف صاف حکم تحریر فرمائیں۔

## الجواب

جن لوگوں کی زیادہ آمدنی ذریعہ حرام سے ہے ان کے یہاں کی دعوت قبول کرنا اور کھانا عموماً حرام ہے اور خصوصاً مولویوں کو تو ایسے لوگوں کی دعوت قبول کرنا سختی کے ساتھ ممنوع ہے کیونکہ اس میں علم کی تذلیل اور احکام شرعیہ کی توہین ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۹ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۴۴ھ

**اہل مقدمہ کی امداد کے صلے میں مہتمم مدرسہ کا ان سے مدرسہ کے لئے رقم وصول کرنا**

سوال، ایک رئیس شخص مدرسہ اسلامیہ کے مہتمم ہیں اور آدمی کے مقدمہ وغیرہ میں بہت کام کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم لوگ ہم کو ایک پیسہ نہ دینا مگر ہمارے مدرسہ میں روپیہ پیسہ امداد کرنا۔ یہ رشوت ہوگا یا نہیں؟ اور لینا درست ہے یا نہیں؟

## الجواب

یقیناً رشوت ہے یقیناً درست نہیں۔

(مجیب کا نام درج نہیں)

## ولیمہ کی تعریف اور اس کا مستحب وقت

سوال: ولیمہ بغیر وطی کرنے کے جائز ہے یا نہیں؟ اور ولیمہ کا کھانا فقط مکان والے کو کھلانا اور دوسروں کو نہ کھلانا یہ جائز ہے یا نہیں۔ اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

### الجواب

قال فی الفتح: وقد اختلف السلف فی وقتها ای الولیمة هل هو عند العقد او عقبه او عند الدخول او عقبه او موسع من ابتداء العقد الی انتهاء الدخول اھ من حاشیة البخاری (ص ۷۷۵ ج ۲)

وفی الشامیة الولیمة هی طعام العرس وقیل اسم لکل طعام (صـ۲ ج ۵) وفی العالمگیریة: وولیمة العرس سنة وفیها مثوبة عظیمة وهی اذا بنی الرجل بامرأته ینبغی أن یدعو الجیران والأقرباء والأصدقاء ویذبح لهم ویصنع لهم طعاما الخ من خزانة المفتین ولا بأس بأن یدعو یومئذ من الغد وبعد الغد ثم ینقطع العرس والولیمة کذا فی الظهیریة (ص ۳۴۹ ج ۵) وفی حاشیة البخاری عن اللمعات واختلف فی تکرارها اکثر من یومین فکرهه طائفة واستحب مالك کونها اسبوعا (ص مذکور)

اس سے معلوم ہوا کہ ولیمہ مشہور قول میں تو اسی دعوت کا نام ہے جو شب زفاف دخول کے بعد ہو اور بعض اقوال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے وقت سے دخول کے بعد تک جو بھی دعوت ہو ولیمہ ہی ہے مگر راجح قول اول ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ولیمہ بعد الدخول ہی ثابت ہے اور ان عبارات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ولیمہ پڑوسیوں اور دوستوں اور قرابت داروں کی دعوت کرنے کو کہتے ہیں تو اگر گھر والے ہی خود کھالیں تو وہ ولیمہ نہ ہوگا۔ نعم کونہ ضیافۃ، باقی یہ ضروری نہیں کہ پڑوسیوں اور قرابت داروں اور دوستوں سب کو بلایا جائے بلکہ حسب توفیق و ہمت بلایا جائے دو چار کو بلالینا بھی کافی ہے اور ہر حال میں رسوم سے اور نام ونمود

سے بدنامات سے بلاوجہ تعرض سے بچنا واجب ہے۔ فقط

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۳ محرم ۵۳ھ از تھانہ بھون

**حقہ پینے کا حکم**

سوال: حقہ پینے کے بارے میں اختلاف مکروہ و حرام کا ہو رہا ہے صحیح تحقیق عنایت فرمائیں۔

## الجواب

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیة: (ج۲/۳۳۲،۳۳۳) فی مسئلة شرب الدخان بعد تفصیل ربط زائد ما لفظه وبالجملة ان ثبت فی هذا الدخان اضرار صرف خال عن المنافع فیجوز الافتاء بتحریمه وان لم یثبت فالأصل حله مع ان فی الافتاء بحله دفع الحرج عن المسلمین فان اکثرهم مبتلون بتناوله مع ان تحلیله ایسر من تحریمه وما خیر رسول الله علیه الصلوٰة والسلام بین امرین الا اختار ایسرهما واما کونه بدعة فلا ضرر فانه بدعة فی التناول لا فی الدین فاثبات حرمته امر عسیر لا یکاد یوجد له نصیر نعم لو اضر ببعض الطبائع فهو علیه حرام ولو نفع ببعض وقصد به التداوی فهو مرغوب ولو لم ینفع ولم یضر هذا ما سنح فی الخاطر اظهار الصواب اھ۔

حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو حقہ سے نقصان و ضرر ہوتا ہو اس کے لئے حرام ہے اور جس کو نفع ہوتا ہو یا نفع و ضرر کچھ نہ ہوتا ہو اس کو جائز ہے لیکن حقہ پی کر مسجد میں آنا جائز نہیں جب تک کہ اچھی طرح بدبو زائل نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد از تھانہ بھون۔

**مفتی کی آمدنی اور اس کی دعوت قبول کرنے کا حکم**

سوال: مفتی جس کو اس ملک کے لوگ

عرف میں قوال کہتے ہیں جو مزامیر کے ساتھ گانا بجاتا ہے اس کے مکسوبہ مال کی نسبت کیا حکم ہے۔ اس کی دعوت قبول کرنا کوئی شئی اس کے ہاتھ فروخت کرکے اس کی اس کمائی سے زرِ ثمن لینا یا اس سے وہ چیز خریدنی جو اس نے اسی کمائی سے بنوائی یا خریدی ہو کیا ارشاد ہے۔

## الجواب

اگر مغنی کی آمدنی کسی اور طریقہ حلال سے بھی ہو تو غالب کو دیکھا جائے اگر غالب آمدنی حلال ہے تو یہ معاملات اس کے ساتھ جائز ہیں اور اگر غالب حرام ہے تو اس کی دعوت کھانا یا اس آمدنی کی بنائی چیز اس سے خریدنا جائز نہیں اور بیچنے کے وقت اس سے کہا جائے کہ کسی ہندو سے روپیہ قرض لے کر قیمت میں ادا کردے اور ہندو کا قرض اپنے روپیہ سے ادا کردے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲ رجب ۱۳۴۳ھ

---

**سود سے توبہ کرنے والے کے گھر دعوت کا حکم**

سوال: ایک شخص اپنی عورت کو پردہ نہیں کراتا اور نکاح میں خلافِ شرع کام کرتا ہے اور بے نمازی بھی ہے اور تھوڑی کچھ زمین رہن رکھ کر اس سے نفع بھی حاصل کرکے تصرف کرتا ہے اب وہ شخص توبہ کرکے یوں کہتا ہے کہ میں آئندہ ایسا کام نہیں کروں گا جس مال میں شک ہے وہ نہیں کھاؤں گا۔ اب اس کے گھر میں دعوت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

جب مشکوک مال نہیں کھلاتا تو دعوت میں کیا شک ہے۔

سوال: ایک شخص کا دو قسم کا مال ہے اور اکثر حلال ہے تو اس کے گھر میں دعوت کھانا جائز ہے یا نہیں۔ وہ شخص یوں کہتا ہے کہ میں نے حلال مال الگ رکھا ہے اور اسی حلال سے کھلانا چاہتا ہوں۔ اب یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

اگر حلال علیحدہ ہے تو اس کا کھانا ہر حال میں جائز ہے لیکن اگر مقصد اکی

دعوت قبول کرنے سے عوام کو ایسی آمدنی کمانے پر جرأت بڑھتی ہو تو مقتدا کو احتیاط چاہیئے
فقط واحقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفی عنہ ۲۱ شوال ۵۳ھ

کسی شبہ سے ترک دعوت مشروع ہے یا مطلقاً قبولِ دعوت مسنون ہے۔

سوال: کسی شبہ کی وجہ سے ترک دعوت بھی مشروع ہے یا قبول الدعوۃ ہی مسنون ہے۔

## الجواب

اگر موضع دعوت میں کوئی امر خلاف شرع ہو تو دعوت میں نہ جانا چاہیئے البتہ اگر یہ گمان ہو کہ میرے جانے سے وہ خلاف شرع امر موقوف ہو جائے گا تو جانا چاہیئے۔ فی الدر: (وان علم اولا) باللعب (لا یحضر اصلاً) سواء من کان یقتدی به او لا الخ۔ وقال الشامی تحت (قوله اصلاً) الا اذا علم انهم یترکون ذالک احتراماً له فعلیه أن یذهب اتقانی (ص ۳۴۱ ج ۵)

واللہ سبحانہ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۱ ذی الحجہ ۵۳ھ۔

فاسق اور بدعتی کے ساتھ معاملہ اور اس کی ضیافت کا حکم

سوال: ایک شخص کے ساتھ ہمارا دنیوی معاملات لین دین رہتا ہے اور یہ شخص شریعت کا پابند نہیں ہے اور بدعت کے کام بھی کرتا ہے۔ اب ہم اس کی دعوت کرنا چاہیں تو جائز ہے یا ناجائز؟

## الجواب

اگر یہ شخص کبھی از خود آجائے تو وہ مہمان ہوگا اور اکرام ضیف مطلقاً مباح و مستحسن ہے۔ گو وہ کافر ہی ہو۔
اور اس کو خود بلانا اور دعوت دینا بطور دوستی کے تو جائز نہیں مگر یہ کہ آپ

کے ساتھ قرابت نسبت بھی ہو تو جائز ہے۔

فتكون صلة الرحم عامة لكل بر وفاجر لحديث اسماء حين جاءتهما امها راغبة وفي رواية راغمة فسألت النبي صلى الله عليه وسلم هل تصلها فقال صلى امك رواه ابوداؤد وارسل عمر بن الخطاب رضي الله عنه الى اخيه وهو مشرك بمكة حلة سيراء ذكره الحافظ في الفتح۔

ہاں فاسق بتدع اجنبی کو اس صورت میں دعوت دینا جائز ہے جبکہ اس سے اس کی تالیف قلب کرکے اصلاح کا قصد ہو۔ اس صورت میں جب تک امید اصلاح ہو یہ برتاؤ جائز ہے یا معاملات دنیوی کی وجہ سے کبھی خود اس کے گھر مجبوری کی وجہ سے کھانا پڑ جاتا ہو اور دعوت کرکے اس کے احسان کی مکافات مقصود ہو مگر مکافات کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ جب اوّل اس کی طرف سے ضیافت ہو اور مجبوری کی وجہ سے قبول کرنا پڑے تو اس کے بعد خود ضیافت کردی جائے، ابتداءً نہ کی جائے اور مکافات سے دفعات میں زائد نہ کی جائے،

والوجه ما ذكره العلماء في عموم حرمة الموالاة لكل فاسق او مبتدع، كما بينته في رسالة تحذير المسلمين واستشنوا منها ما كان لتاليف القلب بقصد الاصلاح كما فيها ايضًا ولا بد من استثناء مكافاة الهدية ايضًا. والاحاديث بانه صلى الله عليه وسلم كان يقبل الهدية ويثيب عليها وقد قبل هدية المشركين والكفار ايضًا.

والله اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ

**قاضی کے لئے ماتحت ملازمین کی دعوت قبول کرنے کا حکم**

سوال: معروض آنکہ عہدہ قضاء آنکہ از گورنمنٹ عالیہ بذریعہ محکمہ ڈسٹرکٹ بورڈ فدوی را عطا شدہ است صرف برائے پڑتال انکو مندرجہ رجسٹرات نکاح خوانان

علاقہ فدوی دورہ علاقہ میکند از سرکار عالی اجرت مقرر است نکاح خوان ایک روپیہ میگیرد برائے قاضی روپیہ دے بورڈ این تمام رقومات از ناکح وصول میشوند۔

بوقت دورہ ہر جاکہ شب می آید نکاح خوانان بلا گفتہ فدوی ضیافت و مہمان نان وآب دانہ گیاہ اسپ می کنند چنانچہ رسم مہمان نوازی است مگر حال طیب خاطر معلوم نمی گردد کہ امر مخفی است و افسر بودن فدوی برایشان ظاہر است این نان خوردن ودانہ اسپ گرفتن بلا طلب جائز است یا نہ۔ بینوا توجروا۔

## الجواب

درصورت مسئولہ کہ سائل بر عہدہ قضاء برائے تفتیش انکو مامور است اور ضیافت بحالت دورہ از نکاح خوانان گرفتن کہ افسر بودن سائل برایشان ظاہر است، بظاہر در رشوت داخل می شود پس احتیاط ازان لازم است۔

واللہ اعلم

ہدیہ دینے والے کا تسلیم وغیرہ الفاظ سے شکریہ ادا کرنا کیسا ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کے سامنے کوئی چیز پیش کی اس نے اس کو لے کر کہا کہ تسلیم، اور تسلیم کے معنی سلامتی کے ہیں اس لحاظ سے کہا نہ کہ اس رواج کے موافق جو آج کل مروج ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کے معنی سلامتی کے ہیں، یہ دعائیہ فقرہ سمجھ کر کہا تو کیا جائز ہے یا ناجائز۔ ایک شخص کہتا ہے کہ یہ کہنا ناجائز ہے۔ جو حکم ہو تحریر فرمائیں۔

## الجواب

اودھ اور لکھنؤ میں ایسے موقعہ پر جو تسلیم کہا جاتا ہے تو اس کے معنی شکر کے ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں پس اس رواج کے موافق تسلیم کرنا اور دعائیہ فقرہ سمجھ کر تسلیم کرنا دونوں جائز ہے البتہ یہ فعل سنت کے خلاف ہے۔ سنت یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر جزاک اللہ وغیرہ کہا جائے۔ واللہ اعلم۔

حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ شعبان ۱۳۴۴ھ

**بعض ورثاء اگر مورث کا مال اپنا مملوک کہہ کر بنیت ایصال ثواب دیں تو اس کے قبول کرنے کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء اسلام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ورثاء میں اس کی اولاد ذکور و اناث یتامیٰ اور زوجہ اور والدہ موجود ہیں۔ والدہ اور زوجہ نے متوفی کے مال میں سے کچھ سامان اثاث البیت بستر لحاف وغیرہ کسی کو ایصال ثواب کی غرض سے دیا معطی لہ نے ان سے کہا کہ چونکہ اس مال میں یتامیٰ کا بھی حصہ ہے اس لئے یہ مال نہ کسی کو دینا جائز ہے نہ کسی کو لینا جائز اس لئے میں اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس پر والدہ اور زوجہ نے کہا کہ یہ مال فی الحقیقہ متوفی کا ہے ہی نہیں اور نہ یہاں کا تیار شدہ ہے بلکہ ہمارا اپنا مملوک ہے اس لئے دیتے ہیں کہ متوفی کی روح خوش ہو اس صورت میں معطی لہ کو اس مال کا لینا والدہ اور زوجہ کے قول پر اعتماد کر کے جائز ہے یا نا جائز بحوالہ کتب تحریر فرمائیں۔ اور وہ سامان متوفی کی حیات میں اس کے استعمال میں تھا۔

الجواب

من مفتی مظاهر علوم سہارنپور

حامداً ومصلیاً ومسلماً شرعاً درصورت مسئولہ چونکہ والدہ اور زوجہ متوفی کی یہ کہتی ہیں کہ یہ مال ہمارا مملوک ہے اور ہم اپنی طرف سے دیتے ہیں تو اس صورت میں ان کا قول قبول کر لیا جائے گا اور اس کا لینا شرعاً جائز ہوگا۔ درمختار میں ہے:

كل من حكى امراً لا يملك استئنافه ان فيه ايجاب الضمان على الغير لا يصدق وان فيه نفي الضمان عن نفسه صدق انتهى باب الشركة. والله اعلم. رقمہ ضیاء احمد عفی عنہ

۳ شعبان المعظم ۱۳۶۶ھ

الجواب صحیح. وقال سيدي حكيم الامة ليس هذا من باب القضاء بل هو من باب الديانات فان شهد قلبه بصدق النساء لم يكذبهن الظاهر يجوز له اخذه وانما لم يكن من

باب القضاء تکون احد لا ینازعهن فی ما قلن و اللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۲ شعبان ۱۳۴۳ھ از تھانہ بھون

## جس شخص نے وارث کا حق روک رکھا ہو اس کے گھر دعوت کھانا اور اس کی آمدنی سے اجرت لینے کا حکم

سوال (۱) یہاں پر عام طور پر ورثاء کا حق نہیں دیتے اور اسی سے جس میں ورثاء کا حق ہے کھاتے ہیں اور دعوت کھلاتے ہیں ایسی دھان کو بیچ کر ہدیہ صدقہ وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سوائے اس کے اور کوئی طریقہ معاشس کا نہیں۔ میں ان کے بچوں کو تعلیم دیتا ہوں تنخواہ میں وہ مجھے دھان دیتے ہیں۔ بعض دھان بیچ کر روپیہ دیتے ہیں اور کبھی دعوت کرکے کھلاتے ہیں اور للہ ہدیہ بھی دیتے ہیں اور وہ سب اسی زمین کے دھان یا پیسہ سے کرتے ہیں جس میں ورثاء کا حق ہے۔ میرے پاس طلبہ بہت دور ڈھاکہ کمیلا کے وغیرہ رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا کھانا انہی میراث نادہندگان کے گھر مقرر ہے اور میرے معاشس کا انتظام اس طرح ہے کہ وہ طلبہ فیس دیتے ہیں آٹھ دس روپیہ فیس سے ہوتا ہے۔ باقی دھان وغیرہ دیتے ہیں جیسے اوپر ذکر کیا۔

(۲) میں نے تھوڑی سی زمین میراث نہ دینے والوں سے خریدی تھی اس سے تھوڑا دھان ملتا ہے۔ غرض یہ کہ طلبہ کی فیس ہمسایوں کا دھان اور اپنی زمین کا کچھ دھان اسی سے خوراک پوشاک چلتا ہے۔ کوئی زیادتی کے ساتھ نہیں بلکہ ضرورت کے لحاظ سے کفایت ہوتا ہے اب طلبہ سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں بھی ورثاء کا حق نہیں دیتے۔ اب میں کیا کروں مدرسہ چھوڑنے میں معاشس کی تکلیف ہے اور علم کی عدم حفاظت بھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضور والا از راہ مہربانی دستگیری فرمائیں۔

## الجواب

(۱) جن لوگوں نے زمین میں سے اپنی ہمشیرگان یا کسی شرعی وارث کا حق نہیں

دیا ہے اس زمین کی پیداوار میں یہ تفصیل ہے کہ جتنا تخم ریزی میں صرف ہوا ہے اتنی پیداوار حلال ہے جس نے خرچ کیا ہے وہ اس کو کھا سکتا ہے اور پیداوار میں سے اس قدر حلال ہے کہ جس قدر اس قابض کے حصہ میں از روئے شرع آیا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے ایک بیٹا بیٹی چھوڑے اس بیٹے نے بہن کو حصہ نہ دیا اور زمین کاشت کی اور ۴؎ کاشت پر اور تخم ریزی پر اور آبپاشی پر خرچ ہوئے اور پیداوار ۱۲؎ کی ہوئی تو اب اس کے واسطے ۴؎ خرچ شدہ اور بقیہ میں ۸؎ حصہ میراث سے کل ۸؎ کا غلہ حلال ہے۔ باقی ۴؎ کا غلہ حرام ہے کہ وہ ہمشیرہ کا حق ہے سو اگر ہدیہ وغیرہ کے وقت اس کا لحاظ کر لیا جائے کہ یہ اپنے حصہ سے زائد میں تصرف نہ کرے تو جائز ہے۔ مثلاً مثال مذکورہ میں جب تک ۸؎ کے غلہ میں تصرف کرے اس وقت تک ہدیہ وغیرہ لینا جائز ہے اور جب غلہ فقط ۴؎ کا رہ جائے تو اس میں تصرف حرام ہے اس لئے ہدیہ ہرگز قبول نہ کیا جائے۔

والجزء الآخر من الجواب یتضمن قاضیخان ونصّہ هذا رجل له ثلثة اقفزة حنطة باع منها قفیزاً من رجل آخر ثم باع منها قفیزاً من آخر ثم باع منها قفیزاً من ثالث ثم قال لهم الا قفزة الثلثة ثم جاء رجل وستحق من الکل قفیزاً فان المستحق یأخذ القفیز الثالث لأن صاحب الید حین باع القفیز الاول والثانی باع ما یملکہ وباقی الجواب ظاهر۔

اور یہ غلہ اور اس کی قیمت کا حکم ہے اگر کپڑے وغیرہ ترکہ مشترکہ میں سے ہو کوئی دے اس کا حکم اور ہے ضرورت ہو تو دریافت کر لیا جائے۔

(۲) اور جو زمین خریدی ہے اس کے متعلق یہ بات قابل تحقیق ہے کہ جو قطعہ آپ نے خریدا ہے اس جگہ فقط اتنا ہی قطعہ مشتری کے مورث نے ترکہ میں چھوڑا تھا یا اس قطعہ مبیعہ کے متصل اور زمین بھی اس کی متروکہ ہے۔ اس کا جواب لکھنے پر ہر بیع کی صحت وبطلان کا حکم معلوم ہو سکتا۔ کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

۲۸ ربیع الاول ۵۳ھ از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

# باب الأكل والشرب

**حلال ذبح شدہ جانور میں کون کون سی اشیاء حرام ہیں**

سوال: زید ایک شخص مسلمان نے مطابق شرع شریف ذبح کیا۔ یہ امر دریافت طلب ہے کہ اس کے کون کون سے اجزاء ایسے ہیں جن کا کھانا حرام ہے۔ بالتفصیل جواب ملنا چاہیئے۔

## الجواب

حلال ذبح شدہ جانور میں سے سات چیزیں کھانا حرام ہیں (۱) خون بہنے والا (۲، ۳) پیشاب گاہ نر و مادہ دونوں کی (۴) خصیتین (۵) غدود (۶) مثانہ (۷) پتا۔

كما في العالمگيرية ج ۶/۱۹۵، واما بيان ما يحرم اكله من اجزاء الحيوان سبعة الدم المسفوح والذكر والانثيان والقبل والغدة والمثانة والمرارة كذا في البدائع اھ

كتبه الاحقر عبد الكريم عفي عنه ۱ صفر ۱۳۵۳ھ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔

**جو جانور کثرت سے نجاست کھائے اس کا دودھ اور گوشت کھانے کا حکم**

سوال: جو گائے یا بھینس یا بکری کثرت سے نجاست کھائے اس کا دودھ پینا شرعاً درست ہے یا نہیں اور اس کے گوشت کھانے کے متعلق ارشاد فرمائیں۔

## الجواب

اگر گائے یا بکری اس قدر نجاست کھاتی ہے کہ اس سے بدبو آنے لگے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔ جب تک کہ اس کو اتنے روز بند نہ کیا جائے کہ بدبو زائل ہو جائے اور اگر اس بکری میں بدبو پیدا نہیں ہوتی تو اس کا کھانا جائز ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے اس لئے چند روز بند رکھنا چاہیئے اور یہی حکم دودھ کا ہے۔

كما في الدر: ولو اكلت النجاسة وغيرها بحيث لم ينتن لحمها حلت وقال الشامي وعن هذا لا بأس بأكل الدجاجة لانه يخلط ولا يتغير لحمه وروي انه عليه السلام كان يأكل الدجاجة

تجس ثلاثة ایام ثم تذبح فذلک علی سبیل التنزہ۔ زیلعی
(شامی ج ۵ ص ۲۳۳) وفیہ ایضاً (ولبنها) لتولدہ من اللحم۔

فقط کتبہ الاحقر
عبدالکریم عفی عنہ ۲۰ ربیع الاول ۵۰ھ

**آلائش نکالنے سے قبل مرغی کو گرم پانی میں ڈالنے کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مرغی وغیرہ کی آلائش نکالنے سے پہلے پر اتارنے کے لئے گرم پانی میں ڈال رکھے اور پھر پانی سے نکال کر علیحدہ کرکے پکائے تو اس کا کھانا درست ہوگا یا نہ اور وہ پاک رہے گی یا ناپاک ہو جائے گی۔ اگر ناپاک ہو جائے تو اس کو پاک کرنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں۔

## الجواب

آلائش نکالنے سے قبل گرم پانی میں ڈالنے سے اگر نجاست گوشت کے اندر سرایت کرجائے تب تو گوشت کسی طرح پاک ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے ڈالا گیا ہے کہ گوشت میں نجاست نے سرایت نہ کیا ہو تو اوپر کی ناپاکی تین مرتبہ دھونے سے دور ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ شامی میں تصریح کی ہے لیکن سرایت کرنے نہ کرنے کی شناخت پورے طور پر ہونا ضروری ہے اور بہتر یہ ہے کہ آلائش نکالنے کے بعد پانی میں ڈالے یا بغیر پانی ڈالے پَر الگ کردے اشتباہ میں کیوں پڑے۔

فقط عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۱۸ جمادی الاول ۵۰ھ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ

**بکری کے بچہ کو انسان کا دودھ پلایا گیا تو اس کا گوشت کھانا حلال ہے یا نہیں؟**

سوال: بکری کے بچہ کو انسان کا دودھ پلا کر پالا ہے اس بچہ کے گوشت میں حرمت یا کراہت تو

---

۱ے شامی ایچ ایم سعید ص ۳۴۱ ج ۶ ۔ مرتب ۱

نہیں آئی۔

## الجواب

یہ بچہ حلال ہے لیکن اگر صرف دودھ ہی غذا ہوا ور دودھ پلانے کے زمانے میں ذبح کیا جائے تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر دودھ موقوف کرنے سے کچھ عرصہ بعد ذبح کیا جائے یا دودھ کے ساتھ اور غذا بھی دی جاتی ہو تو کراہت بھی نہیں۔

ونظیرہ مافی الدرحیث قال حل اکل جدی غذی بلبن خنزیر لأن لایتغیر وماغذی به یصیر مستهلکاً لایبقی له أثر ونقل الشامی عن الخانیة أن الحسن قال لابأس بأکله وأن ابن مبارك قال معناه اذا اعتلف ایاماً بعد ذالك کالجلالة قلت ذکر الشامی عن البزازیة ان حبس الجلالة شرط فی التی لا تأکل الا الجیف وأن مدة الحبس فی الشاة عشرة ایام۔

البتہ اگر دودھ پلاتے ہی فوراً ذبح کیا جائے تو مکروہ تحریمی ہے۔

کما فی الدر: ولو سقی مایوکل لحمه خمراً فذبح من ساعته حل أکله ویکره زیلعی وشرح الوهبانیه وقال العلامة الشامی ظاهرهٔ ان الکراهة تحریمیة وماقال بعده من أن ینظر ما الفرق بینه وبین الجلالة التی لا تأکل النجاسة وغیرها والجدی فجوابه أن الفرق ظاهر لان هذه الجزئیة مقید بالذبح من ساعته بخلاف مامر فی الجلالة وغیرها۔ والله اعلم۔

اس بکری کے بچے کا جو جفتی اور بچہ جننے کے قابل نہیں کے دودھ نکلے تو اس کا پینا جائز نہیں۔

سوال: ایک بکری نے دو بچے دیئے۔ مالک نے ایک چگانے والے کو دے دیا۔ ایک بچہ اپنے واسطے رکھ لیا۔ اس بچے کے چار یا چھ روز کے بعد تھنوں میں سے دودھ جاری ہے جس سے تعجب ہوا۔ اب دریافت طلب یہ ہے کہ اس بچہ کا دودھ شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ اکثر لوگ اس کو منحوس بتلاتے ہیں کہ اس کا گھر

رکھنا جائز اور ٹھیک نہیں۔ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

## الجواب

جو بکری کا بچہ کہ ابھی تک جفتی کے اور بچہ جننے کے قابل نہیں ہوا اس کے جو دودھ نکلتا ہے وہ دودھ نہیں بلکہ پانی ہے۔

قال فی الشامیۃ: فی باب الرضاع فی حکم لبن البکر انہا ان لم تبلغ تسع سنین فنزل لہا لبن لا یحرم جوھرہ لانہم نصّوا علی ان اللبن لا یتصور الا ممن تتصور منہ الولادۃ فیحکم بانہ لیس لبنا اھ ص ۔۴۷۰ ج ۲ ۔

اور جب وہ دودھ نہیں ہے تو اس کا پینا بھی جائز نہیں۔ لأنہ لا یحل من الحیوان الا اللحم واللبن والجلد وھذا لیس منہا۔ البتہ اس جانور کو منحوس کہنا غلط ہے۔ شریعت میں اس کے منحوس ہونے کی کوئی اصل نہیں۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ

۲۰ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ

**اُلّو اور طوطا کا کھانا حلال ہیں یا نہیں؟** سوال: چغد (الّو) بتغا (طوطا) کا کھانا حلال ہیں یا نہیں؟

## الجواب

الّو حرام ہے۔ طوطا حلال ہے اور شافعیہ کے نزدیک اصح یہ ہے کہ حرام ہے ذکر حکمہ الدمیری فی حیٰوۃ الحیوان وقال یحرم اکل جمیع انواعہا اھ ج ۱/ ۲۱۰م۔ وذکر القولین فی البغاء ج ۱/ ۱۰۲۔ وعلل الحرمۃ لخبث لحمہا۔ والحل بکونہا تأکل الطیبات لیست من ذوات السموم ولا من ذوات المخلب ولا أمر بقتلہا ولا نہی عنہ اھ

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

جند بیدستر اور بیر بہوٹی اور ریگ ماہی کسی امام کے نزدیک حلال ہے یا نہیں؟

سوال: جند بیدستر، بیر بہوٹی اور ریگ ماہی کا کھانا آئمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

جند بیدستر امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق حلال ہے۔

قال الدمیری فی حیوۃ الحیوان: الجند بادستر حیوان کھیئۃ الکلب لیس ککلب الماء ویسمّی القندر ویسمّی السمور ایضًا وھو علی ھیئۃ ثعلب احمر اللّون اھ ص ۱۹۶ ج ۱۔

ثم قال فی باب السمور وحکمہ حلّ الاکل الحاقالہ بالثعلب ولأنہ لایأکل شیئًا من الخبائث اھ ص ۳۰ ج ۲۔

فان قیل ان الجند بادستر خصیتا ھذا الحیوان فالحکم بحلہ لا یستلزم الحکم بحل خصیتہ قلنا خصیتا الحیوان الحلال حلال عند الشافعیؒ فقد قال العزیزی فی شرح حدیث کان یکرہ من الشاۃ سبعًا المرارۃ والمثانۃ والحیا (ای الفرج) والذکر والانثیین والغدۃ والدم مانصّہ ای اکل سبع مع کونھا حلالًا اھ

وکذا قال الحفنی ان الکلام فی الحلال الذی تباح النفس (ج ۲، ۱۷۱/۲) اور بیر بہوٹی اور ریگ ماہی امام مالکؒ کے نزدیک حلال ہے۔ مع الکراھۃ لکونھما من حشرات الارض

قال فی رحمۃ الامۃ ویحرم اکل حشرات الارض کالفار عند الثلاثۃ وقال مالک بکراھتہ من غیر تحریم ومنھا الجراد ویؤکل میتا علی کل حال وقال مالک لایؤکل منہ مامات حتف انفہ من غیر سبب بصنع بہ ومنھا القنفذ وھو حلال عند الشافعیؒ ومالک وقال ابوحنیفۃ واحمد بتحریمہ۔ وقال مالک لابأس بأکل الخلا والحیات اذا ذکیت

الارض ۲۰۰ ج ۱ وفی المدونہ لسحنون، قلت لابن القاسم ارأیت هوام الارض كلها خشاشها وعقاربها ودودها وحياتها واشبه هذا من هوامها أيؤكل في قول مالك قال سمعت مالكا يقول في الحيات اذا ذكيت في موضع ذكاتها انه لا بأس بأكلها من احتاج اليها قال ولم اسمع من مالك في هوام الارض أنه اذا مات في الماء أنه لا يفسد الماء والطعام وما لم يفسد الماء والطعام فليس بأكله بأس اذا أخذ حيا فصنع به ما يصنع بالجراد اهـ ص ۲۰۲ ج ۱ قلت وانما يحرم من الجراد عنده ما مات حتف انفه وما مات بصنع يصنع به ولو غير الذبح يجوز عنده۔ البتہ باوجود تتبع کتب یہ امر واضح نہیں کہ رگ ماہی کا ذبح کرنا امام مالک کے نزدیک شرط ہے یا نہیں۔ فلیحقق۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۹ ذیقعدہ ۵۳ھ

**میونسپل کمیٹی کی طرف سے گوشت کے پارچوں پر نشان لگانا اس کے مذبوحہ مسلم ہونے کی دلیل نہیں۔**

سوال: یہاں میونسپل کمیٹی نے اپنی حدود کے اندر حکم نافذ کر رکھا ہے کہ بکری کا جو گوشت مذبحہ سے باہر ہندو (کھٹیک) قصاب کی دوکان پر جائے اس پر گلابی خواہ دیگر رنگ کا نشان نمبر گوشت کے ہر ٹکڑے پر لگایا جائے جسے دیکھ کر مسلمان خریدار کو اطمینان رہے کہ یہ باقاعدہ ذبح کیا ہوا ہے۔ اب اگر وہ ٹکڑے کسی وقت مسلم کی نظر سے غائب رہیں یعنی دوکان پر مسلم موجود نہ رہے تو شرعاً اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب من مفتی مدرسہ دیوبند

اس صورت میں جبکہ ذابح مسلمان ہے اور میونسپلٹی کا یہ قانون ہے کہ اس پر علامت لگا دی جائے تو غالب گمان یہی ہے کہ وہ ذبیحہ مسلمان کا ہے۔ کما یفهم من العالمگیریة کتاب التحری۔

ریاض الدین دار العلوم دیوبند، ۱۰ محرم ۵۳ھ

## الجواب من جامع امداد الاحکام

مفتی صاحب دیوبند نے جو جواب دیا ہے کہ جو گوشت مذبح سے باہر ہندو
ٹھیکہ کی دکان پر علامت لگا کر جاتا ہے تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ ذبیحہ مسلمان کا
ہے اس لئے اس کا کھانا درست ہے الخ اس سے ہم کو اتفاق نہیں کیونکہ جب وہ
گوشت مسلم کی نظر سے مخفی ہو گیا کہ دکان پر کوئی مسلم موجود نہ رہا تو اب اس کا
ذبیحہ مسلم ہونا صرف اس ہندو ٹھیکہ کے قول سے معلوم ہوگا یا علامت سے۔
اور ہندو کا قول دیانات میں معتبر نہیں اور یہ علامت بھی قابل اعتبار نہیں دو وجہ
سے ایک تو اس لئے کہ یہ علامت فی نفسہ ذبیحہ مسلم ہونے پر دال نہیں کیونکہ
مذبوحہ یا ذبیحہ غیر مسلم پر بھی ایسا نشان بنایا جا سکتا ہے اور دوسری یہ کہ یہ
علامت لگانے والے بھی ہمیشہ مسلمان نہیں ہوتا۔ کبھی کافر ڈاکٹر بھی ہوتا ہے
تو اس کی علامت پر اعتماد کیونکر جائز ہے جبکہ خود اس کے قول پر اعتماد جائز
نہیں ہے اور کتاب التحری میں جس علامت پر اعتماد جائز کہا گیا ہے اس سے مراد
ایسی علامت ہے جو خود گوشت کی ذات میں موجود ہو۔ مثلاً ایک شخص کے پاس
گوشت کے چند پارچے رہوں بعض مردار کے بعض مذبوحہ کے پھر وہ مخلوط ہو
جائیں تو اسی علامت سے جو خود گوشت کی ذات میں ہو۔ مذبوحہ کو غیر مذبوحہ
سے ممتاز کرنا جائز ہے۔ مثلاً پانی میں ان پارچوں کو ڈال کر دیکھا جائے مذبوحہ پانی
میں تہ نشین ہو جائے گا اور مردار تہ نشین نہ ہوگا تو علامت ایسی ہے جو خود
گوشت کے اندر موجود ہے[عه]۔ بخلاف گلابی رنگ کی علامت کے جو میونسپلٹی کی
طرف سے لگائی جاتی ہے کہ وہ خارجی علامت ہے خود وجہ امتیاز نہیں تو اب اس
اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا، بلکہ علامت کنندہ پر اعتماد ہوا اور اس کا مسلم ہونا
معلوم نہیں اور معلوم بھی ہو جائے تو مسلم علامت کنندہ کے سامنے جب تک وہ

---

عه اس علامت سے مذبوحہ اور غیر مذبوحہ میں فرق ہو سکتا ہے مگر مذبوحہ مسلم و غیر مسلم میں فرق
نہیں ہو سکتا۔ نیز ان علامات سے اسی وقت کام لے سکتے ہیں جبکہ اس گوشت میں غیر مسلم
کا واسطہ نہ ہو ورنہ جائز نہیں ۱۲ منہ

پارچے موجود ہیں اس وقت تک اس کا قول معتبر ہے اور جب اس کی نظر سے مخفی ہوگئے اور کوئی مسلم ساتھ نہ رہا۔ اب اس کا قول بھی معتبر نہیں کیونکہ یہ علامت مثل تحریر کے ایسی نہیں ہوتی جس میں ہر شخص کا خط ممتاز ہو بلکہ کافر بھی ایسی علامت کر سکتا ہے۔

لا یقال ان خبر الواحد اذا حفت بالقرائن یفید العلم لانا نقول ذلک فی خبر الواحد العدل لا مطلقا کما یظہر من احکام الاحکام للآمدی ص ۴۹ - ۵۰ - ۵۱ ج ۲ وایضاً فلم یقم مثل تلک العلامۃ مقام الجز تأمل۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون ۸ صفر ۴۸ھ

---

**تاڑی کی بنی ہوئی چیزوں کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟**

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل میں کہ تاڑی رجو عصارہ تاڑیا کھجور سے بنائی جاتی ہے اس کے خمیر سے روٹی یا بسکٹ بنا کر کھایا جاتا ہے اس علم کے باوجود کہ یہاں اسی کے خمیر سے روٹی تنوری یا بسکٹ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ کھائیں تو عندالاحناف جائز ہے یا ناجائز۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مقدار قلیل میں کثیر آٹے میں ملایا جاتے تو سکر نام کو بھی نہ ہوگا اور خمر بھی نہیں۔

## الجواب

امام ابو حنیفہ کے قول پر اس میں گنجائش ہے مگر فتوی امام محمدؒ کے قول پر ہے اس لئے تاڑی کی بنی ہوئی چیزوں سے احتراز لازم ہے واللہ تعالی اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ بھون ۴ جمادی الثانیہ ۴۸ھ

---

**تاڑ کا پھل پکنے سے پہلے کھانا حلال ہے یا نہیں؟**

سوال: بعض لوگ تاڑ کا پھل پکنے سے پہلے کھا جاتے ہیں اس کا کھانا حلال ہے یا حرام؟

## الجواب

اگر اس میں نشہ پیدا نہ ہوا ہو تو کھانا جائز ہے اور نشہ پیدا ہو گیا ہو تو قدر سکر سے کم کھانا جائز ہے۔ قدر سکر کھانا حرام ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ظفر احمد عفی عنہ از تھانہ بھون

۱۰ محرم ۱۳۴۵ھ

---

**دال میں پکنے کے بعد کیڑے نظر آئیں تو اس کا کھانا کیسا ہے۔**

سوال: دال میں اگر گھن لگ گیا ہو (یعنی جالا پڑ گیا ہو) اور پکنے کے بعد اس میں کیڑے نظر آتے ہوں تو ایسی دال کے کھانے کا کیا حکم ہے؟

## الجواب

لا بأس بدود الزنبور قبل ان ینفخ فیہ الروح لان ما لا روح لہ لا یسمی میتۃ (خانیہ وغیرھا) قال ویؤخذ منہ ان اکل الجبن او الخل او الثمار کالنبق بدودہ لا یجوز ان نفخ فیہ الروح (شامی ج ۵/۲۹۹) سطر ۲۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کیڑوں میں جان پڑ گئی ہو تو دال کا مع کیڑوں کا کھانا جائز نہیں بلکہ کیڑوں کا صاف کرنا ضروری ہے اور جان نہ پڑی ہو تو جائز ہے۔

ویجوز عند الشافعیہ مطلقاً بدلیل ما رواہ الطبرانی عن ابن عمر مرفوعاً فنھی ان تفتش التمر عما فیہ قال العزیزی ان من نحو سوس ودود ویجوز اکل دود الفاکھۃ معھا معسر تمییزہ۔ (ج ۳/۲۰۸) قلت ولا یخفی ان دود الطعام والثمار لیس من حشرات الارض المنصوص حرمتہا فی المذھب وانما اخذ الطحطاوی تحریمہ من مفھوم عبارۃ قاضی خان وغیرہ فلیس من المنصوص تحریمہ فی المذھب وقد ذھبت الشافعیہ الی اکل دود الفاکھۃ معھا فکذا دود الطعام اذا تعسر تمییزہ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

**کوا حلال ہے یا حرام؟**

سوال: عرض آنکہ غالباً مولانا رشید احمد صاحب مرحوم نے اپنے فتاویٰ میں ہر قسم کے کوّے کی حلّت کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ فقہ کی کتابوں سے تین قسم کے کوّے ثابت ہوتے ہیں۔ دو کے حلال ہونے کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ تیسرا جو زاغ سیاہ مردار خور اور غلیظ ہے اس کو ہر ایک نے حرام یا مکروہ لکھا ہے تو آیا یہ زاغ سیاہ مردار خور بھی حلال ہے اور کھانا جائز ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ کو ذرا وضاحت سے تحریر فرمائیے گا کیونکہ ادھر بہت شور برپا ہے۔

## الجواب

قال فی الدر: وحل غراب الزرع الذی یاکل الحب والأرنب والعقعق ھو غراب یجمع بین اکل جیف وحب والأصح حلہ (ج۵ ۲۰۱)

اس سے کوّے کی دو قسموں کا حلال ہونا معلوم ہوا۔ مولانا گنگوہیؒ نے بھی ان ہی دو قسموں کو حلال کہا ہے۔ ہر قسم کو حلال نہیں کہا۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں مولانا پر افتراء کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۸ شوال ۱۳۴۸ھ

---

**مچھلی کو آلائش صاف کئے بغیر پکانے کا حکم**

سوال: مچھلی میں کیا چیزیں حرام ہیں بعض مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ پتہ حرام ہے لہٰذا جو مچھلی بہت چھوٹی ہے پتہ کی تمیز کرنا ممکن نہیں ہے اس کا کھانا کیا مکروہ تحریمی ہے۔ جواب عنایت فرمائیں۔

## الجواب

قال فی رد المحتار: وفی سمك الصغار التی تقلی من غیر ان یشق جوفہ فقال اصحابہ (ای اصحاب الشافعی) لا یحل اکلہ لأن رجیعہ نجس و عند سائر الائمہ یحل (ج۵ ۲۰۱)

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ چھوٹی مچھلی کو اگر بدون آلائش صاف کئے ہوئے بھی پکا لیا جائے تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے اور امام شافعی کے نزدیک آلائش

صاف کرنے کے بعد جائز ہے اور صغار کی قید سے مفہوم ہوتا ہے کہ بڑی مچھلی کی آلائش صاف کرنا سب کے نزدیک واجب ہے۔ بدون صاف کئے کھانا جائز نہ ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں چھوٹی مچھلی کو بدون پیٹ صاف کئے ہمارے نزدیک کھانا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

**خرگوش کی کون سی قسم حرام ہے اور کون سی حلال؟**
سوال: خرگوش حلال ہے یا حرام اور خرگوش کتنی قسم کے ہوتے ہیں۔ بعضے کہتے ہیں کہ اس کے ہرن کے پاؤں جیسی کھری ہوتی ہے وہ حلال ہے دوسرا جس کا پنجہ بلی جیسا ہوتا ہے وہ حرام ہے مگر اول قسم کا خرگوش کسی جگہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ فقط نام ہی نام ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کا خرگوش کھایا وہ کس قسم کا تھا۔

## الجواب

خرگوش حلال ہے۔ قال فی الخلاصة وجميع هوام الأرض لا الأرنب فإنه يحل أكله (ھ ج ۴/ ۲۰۲)
اور پہلی قسم کا خرگوش ہم نے بھی نہیں دیکھی۔ دوسری ہی قسم کا دیکھا ہے اور ہم اسی کو حلال کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرگوش تناول فرمایا مگر یہ تصریح کہیں نہیں دیکھی کہ وہ کس قسم کا تھا، بظاہر پہلی قسم کسی کی گھڑی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۱ شعبان ۱۳۴۴ھ

**بیرو مرغ حلال ہے یا حرام**
سوال: بیرو مرغ حلال ہے یا حرام؟

## الجواب

حلال ہے لأنه ليس من ذي مخلب ولا من الخبائث۔
واللہ اعلم

**ماکول اللحم جانور کی کھال اور ہڈی کھانے کا حکم**

سوال: چرم واستخوان حلال جانور کا کھانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

کھال کو بالوں سے صاف کرکے کھانا جائز ہے اور ہڈی کا کھانا بوجہ ضرر کے مکروہ ہے اگر دواءً کھائے تو مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ آدمی اور خنزیر کی نہ ہو۔ ماکول اللحم کی ہڈی تو دوا میں خشک وتر دونوں جائز ہیں اور غیر ماکول کی خشک جائز ہے، تر جائز نہیں۔ البتہ نرم ہڈی جس کو چبنی کہتے ہیں بوجہ عدم ضرر کے کھا لینا جائز ہے وان اضر فلا۔

قال فی العالمگیریۃ: قال محمد ولا بأس بالتداوی بالعظم إذا کان عظم شاۃ أو بقرۃ أو بعیر او فرس أو غیرہ من الدواب الا عظم الخنزیر والآدمی فانہ یکرہ التداوی بھما وماذکر من الجواب یجری علی اطلاقہ إذا کان الحیوان ذکیًا لأن عظمہ طاھر رطبًا کان او یابسًا یجوز الانتفاع بہ جمیع انواع الانتفاعات اما اذا کان الحیوان میتًا فانما یجوز الانتفاع بہ إذا کان یابسًا ولا یجوز الانتفاع بہ اذا کان رطبًا۔ (ج ۵/ ۳۳۶)

واللہ اعلم

ظفر احمد عفی عنہ از تھانہ بھون

**خشک مچھلی کھانے کا حکم**

سوال: ہمارے ملک بنگال میں ماہی گیر لوگ ایک قسم کی مچھلی پکڑ کر مع اس کی آلائش کے سکھا کر فروخت کرتے ہیں۔ اس سوکھی ہوئی مچھلی کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر مچھلی چھوٹی ہو تب تو بدون غسل کے اس کا کھانا جائز ہے اور اگر بڑی ہو تو اندر سے خوب دھونے کے بعد کھانا جائز ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ ۲۲ ذی الحجہ ۴۲ھ

حرام مغز کا کھانا حلال ہے یا حرام

سوال: معروض اینکہ آیا مغز حرام مرغ و ماہی خوردن روا است یا نہ؟

## الجواب

بر حرمت مغز حرام ہیچ دلیل قائم نشد و اجزا سبعہ از شاۃ مکروہ نوشتہ اند دراں ہم مغز حرام داخل نیست پس خوردن آں حلال ست۔ واللہ اعلم

احقر ظفر احمد عفی عنہ

---

ایضاً۔ ایضاً

سوال: مسئلہ نخاع یعنی حرام مغز کی حرمت اکل تو کتب فقہ میں مصرح ہے، کیا وہ نجس بھی ہے یعنی اگر سالم مرغ کا یا اس کا ٹکڑا گوشت کے ساتھ پکایا جائے اور پکانے سے قبل حرام مغز نہ نکالا جائے جو ایک گونہ دشواری بھی ہے تو اس صورت میں کیا کل گوشت سالن نجس ہو جائے گا۔ مثلاً پکانے میں اکثر سالم رہتا ہے اس واسطے بعض علما اس دیار کے مثمن کو قطعی حرام بتاتے ہیں بعض علماء کہتے ہیں کہ حرام مغز کا کھانا تو حرام ہے مگر وہ نجس نہیں بلکہ گوشت چھیل کر کھایا جائے اور ہڈی کو نہ چبایا جائے، حرام مغز کے ساتھ پھینک دے تو درست ہے جواب سے مطلع فرمائیں۔

## الجواب

حرام مغز کی حرمت کا مصرح ہونا ہم کو کتب فقہ میں نہیں ملا اگر آپ نے تصریح دیکھی ہو تو عبارت کتاب مع حوالہ صفحہ و جلد و باب لکھ کر مطلع فرمائیں اس کے بعد نجاست سے بحث کی جائے گی۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ از تھانہ بھون

۹ جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ

---

کچا پیاز، لہسن اور حقہ کا حکم

سوال: کچا پیاز یا لہسن کھانا جائز ہے یا نہیں حقہ پینا کیسا ہے؟

## الجواب

کچا پیاز و لہسن کھانا اور حقہ پینا جائز ہے لیکن مسجد میں بدون منہ صاف

کے رو یہ بو زائل کئے نہ جائے ورنہ کراہت تحریمیہ کا مرتکب ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ رجب ۱۳۴۶ھ

---

حیوان کے انثیین کھانا حنفیہ کے نزدیک کیسا ہے

سوال: ماکول اللحم حیوانات کے انثیین (خصیتین) کا عند الاحناف کیا حکم ہے۔ اگر مکروہ ہیں تو کراہت کیسی ہے؟

## الجواب

انثیین کا کھانا حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲ رجب ۱۳۴۶ھ

چھوٹی مچھلیوں کو چاک کئے اور آلائش صاف کئے بغیر کھانا جائز ہے یا نہیں؟

سوال: ملک بنگال میں نہایت چھوٹی اور بڑی مچھلیوں کی آلائش شکم جس میں پتا اور گوہ وغیرہ بھی شامل ہوتا ہے ان کے پیٹ یا گلے کاٹ کر نہیں نکال جاتی، بجائے اس کے انگلیوں سے ان کے پیٹ یا گلے زور سے دباتے ہیں جس سے پیٹ پھٹ کر وہ آلائش نکل جاتی ہے پھر پانی سے خوب تر بتر دھو لیتے ہیں مگر کاٹی ہوئی جگہ سے پانی جس طرح اندر پہنچتا ہے اور آلائش دور کرتا ہے، پھٹی ہوئی جگہ سے ویسا ہونے میں شک ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس طریقہ سے آلائش صاف کرکے جس میں بالکلیہ زائل ہونے میں شک ہے مچھلیاں کھانا جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

بہت چھوٹی مچھلی کا کھانا بدون چاک کئے اور آلائش صاف کئے بھی حلال ہے کما فی الشامی۔ وفی السمك الصغار التی تقلی من غیر ان یشق جوفه فقال اصحابه لا یحل اکله لان رجیعه نجس وعند سائر الائمة یحل اھ۔

عبدالکریم گمتھلوی عفی عنہ

## الجواب صحیح

ظفر احمد عفی اللہ عنہ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ

یہ جواب لکھنے کے بعد سائل نے حاشیہ مالا بد منہ کی عبارت ذیل سے اس پر شبہ کیا۔ ص ۱۴۱ حاشیہ مالا بد منہ) والعبارۃ ہذہ۔ لکن ماھی نہایت کوچک مکروہ تحریمی است وھو الاصح ھکذا فی جواھر الاخلاطی ۲)
مگر اس کے بعد بھی حلت ہی راجح معلوم ہوتی ہے۔

لما فی غایۃ الحواشی وانواع السمک سواء کان اسماءً صغیرا لا یمکن اخراج المرۃ عنھا او کبیرا کما فی السراج الوھاج، حیث قال کل نوع من انواع السمک الغیر الطافی حلال صغیرا کان او کبیرا وفی مختصر الوقایہ والھدایۃ وحل انواع السمک وکذا فی غیرھا ولم یستثن فی المتون الصغیر الا الطافی ومقرر المتون یفتی علیہ کما فی جواھر الاخلاطی وفی المحور ان وقع التعارض بین المتون والفتاوی فالترجیح للمتون فالروایۃ التی فی بعض الفتاوی ان السمک الصغار التی لا یخرج المرۃ عنھا حرام لا عبرۃ بھا فانھا مرجوحۃ اھ کما فی امداد المسائل (ج ۳/۴۳)

پس جس چھوٹی مچھلی میں سے پتا وغیرہ نکالنا ممکن نہ ہو وہ تو بدون چاک کئے اور آلائش صاف کئے حلال ہے البتہ وہ چھوٹی مچھلی کہ جس میں آلائش نکل سکتی ہے مگر چاک نہیں کرتا بلکہ دبانے پر کفایت کی جاتی ہے جیسا کہ سوال میں درج ہے اس کے متعلق یہ تفصیل ہے کہ جس کو اس طریق پر دھونے میں طہارت کا گمان غالب ہو اس کو کھانا جائز ہے اور جس کو طریق مذکور پر دھونے سے طہارت کا گمان غالب نہ ہو اس کو کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ جب اخراج نجاست ممکن ہے تو بدون اخراج نجاست بالاتفاق حرام ہے۔ فی تنویر الابصار سمکۃ فی سمکۃ فان کانت المظروفۃ صحیحۃ حلتا والا حل الظرف لا المظروف وقال صاحب الدر تحتہ کما لو خرجت من دبرھا

لا استعمالها عذرة وقال الشامی تحت قوله عذرة فلو فرض خروجها غیر مستحیلة حلت ایضاً لان مناط الحرمة استعمالها لا خروجها من الدبر (۵/۳۰۱) واللہ اعلم۔ احقر عبدالکریم گمتھلوی عفی عنہ
۹/ ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

آوارہ مرغی کو تین دن تک بند رکھ کر ذبح کیا جائے یا اس کی ضرورت نہیں؟

سوال: آوارہ پھرتی ہوئی مرغی خرید کر اس کو ذبح کر کے کھانے میں کچھ حرج ہے یا اس کو تین روز تک بند رکھا جائے اور اس کا پالنا درست ہے یا نہیں۔

الجواب

آوارہ مرغی کو تین دن بند رکھنا افضل ہے اگر بدون بند رکھے ذبح کر لیا تو مکروہ نہیں۔ فی العالمگیریة (ج ۵/۱۴۲) ولا یکرہ اکل الدجاج المخلی وان کان یتناول النجاسة لأنه لا یغلب علیه اکل النجاسة بل یخالطها بغیرها وهو الحب والافضل أن یحبس الدجاج حتی یذهب ما فی بطنها کذا فی البدائع وفی الدر وقدر بثلاثة ایام لدجاجة (ج ۵/۲۳۳)

البتہ اگر مرغی فقط نجاست ہی کھاتی ہو اور اس کی وجہ سے گوشت میں بدبو آنے لگے تو بند رکھنا ضروری ہے۔ کما فی الشامی (صفحہ مذکورہ)

وفی البزازیة ان ذالک شرط فی التی لا تأکل الا الجیف اھ۔ واللہ اعلم

کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح
ظفر احمد ۱۲/ صفر ۱۳۵۵ھ

# باب التداوی

گرگٹ اور چھپکلی کے روغن کو بطور دوا استعمال کرنا | سوال: ایک شخص کو گلے میں گلٹیاں ہیں اس کے واسطے اطباء گرگٹ و چھپکلی کو کڑوے تیل میں جلا کر اس میں حل کرکے اطباء تجویز کرتے ہیں۔ پس تحقیق طلب امر یہ ہے کہ اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا ناجائز، تو اس کے لگے ہوئے ہونے کی صورت میں نماز وغیرہ ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں ہر وقت دھونا یا پونچھنا اور اس بات کی احتیاط رکھنا کہ کپڑے ملوث نہ ہوں نہایت دشوار ہے بعض گرگٹ و چھپکلی میں خون بھی ہوتا ہے نیز جلتے وقت بہت ہی خفیف مقدار میں خود ان میں سے دہشت بھی نکل کر روغن تلخ میں مل گئی اس کے قریب قریب تمام ادویہ اسی قسم کی ہیں۔

## الجواب

طبی جوہر مؤلفہ مولانا حکیم مصطفیٰ صاحب مصدقہ حضرت حکیم الامت دام مجدہم میں تحریر ہے۔ (مسئلہ) اگر تیل میں حشرات الارض جلا کر کوئلہ کر لئے گئے تو اس تیل کا کھانا اور لگانا اور اس جلے ہوئے کوئلہ کا کھانا اور لگانا سب درست ہے۔ کیونکہ بوجہ تبدیل ماہیت کے استخباث جاتا رہا صنہ۔ دلائل رسالہ مذکورہ میں مفصل موجود ہیں۔ پس صورت مذکورہ میں اس تیل کا استعمال جائز ہے اور کپڑے بھی اس کے لگنے سے ناپاک نہ ہوں گے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

۲۱ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ

مٹی سے دانت صاف کرنے کا حکم | سوال: مٹی سے دانت ملنے سے اگر فائدہ ہو اور درد کی شکایت دور ہوتی ہے تو جائز ہے یا نہ؟

## الجواب

پاک مٹی سے دانت ملنا جائز ہے مگر اس کو حلق سے نیچے نہ اتارے کلی کر کے

تھوک دینا چاہیئے۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ
۱۵ محرم ۱۳۶۲ھ

---

**انگریزی دوا کورڈپسل کا حکم**

سوال: ایک انگریزی دوا جس کا نام ہوگلوبن میرب باشربت ہے اس کے اجزاء میں مسمی بہ سرخ "کورڈپسل" ہے اس میں یہ چیز مشکوک معلوم ہوتی ہے جس کے بارے میں استفسار کر رہا ہوں کورڈپسل وہ رنگ ہے جو حیوان کے خون میں ہوتا ہے۔ یہ ایک سرخ ٹھوس چیز ہے خون کی طرح سیال نہیں مگر خون کا ایک جز بنا رہتا ہے۔ فوق الذکر دوا کے بنانے میں اس چیز کا بھی استعمال کرتے ہیں اس کو بھیڑی کے خون سے بذریعہ فصد نکال کر لیتے ہیں اور خشک کر کے سفوف بناتے ہیں یا یونہی پیس لیتے ہیں۔ پھر ادویات مباحہ کے ساتھ ملا کر دوا تیار کرتے ہیں۔ کل اجزاء کو ملانے کے لئے غالباً آگ پر رکھ کر گرم بھی کرتے ہیں۔ یہ دوا قوت اعضاء رئیسہ اور بدن میں خون پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سرخ کورڈپسل کیا خون کا ایک جزء ہونے کی وجہ سے بعنوان اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ الخ مانند خون کے اس کا استعمال حرام ہوگا یا صرف اس کے جزء ہونے کی وجہ سے جو شکل میں خون سے علیحدہ اور دوا کے دوسرے اجزاء کے ساتھ مل کر اس کی ہیئت بدل جاتی ہے جائز سمجھا جائے گا؟ اس سوال کے متعلق یہ کہہ دینا شاید بہتر ہوگا کہ کسی خاص شخص کے مرض میں یہ دوا مفید ثابت ہوئی ایسی حالت میں جبکہ دوسری کسی دوا نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ مرض عام کمزوری اور جسم میں قلت خون ہے۔ یہ اگرچہ مہلک نہیں مگر آئندہ باعث فساد جسمانی ضرور ہے۔ اس دوا کا استعمال پہلے کرایا گیا تھا مگر توہم کراہیۂ شرعیہ کی وجہ سے استعمال بند کر دیا گیا حکم ارشاد فرمائیں۔

**الجواب**

قال فی مراقی الفلاح: وکل شئ من اجزاء الحیوان غیر الخنزیر لا یسری فیہ الدم لا ینجس بالموت کالشعر والمنقار والمخلب وبیضة القشر ولبن وانفحة فانہ

کان الانفحۃ جامدۃ تطھر بالغسل والا تعذر تطھیرھا اھ (ص ۲۰۹) چونکہ یہ مرئیہ سخت اور ٹھوس بتلایا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں سریان دم نہ ہوگا جیسے علم وغیرہ میں لہذا یہ جزء پاک ہے اس کو دھوکر دوا میں شامل کرکے استعمال کر سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

**حرام اشیاء سے دوا تیار کرنے کا حکم** سوال: فی زماننا سلطنت کی بے توجہی سے طب یونانی قریب رخصت ہوگئی۔ پھر نہ ویسا علم وحافظہ استاذ ہیں نہ ذہانت کہ قبض و قارورہ سے جدید امراض کا اطباء کو پتا چلے۔ اس پر ایک طرف تو قوی میں کمزوری کہ بغیر سریع الاثر علاج تکلیف رفع نہیں ہوتی اور دوسری طرف مفلسی کہ ہر شخص یونانی دوا کی قیمت آسانی سے ادا نہیں کرسکتا۔ پھر گرانی اتنی کہ آمدنی قوت ہی کے لئے کفایت نہیں کرتی تو دوا کے لئے کیا بچے۔ ان وجوہ سے ہر شخص ڈاکٹر سے علاج کی طرف مائل بلکہ مضطر ومجبور ہے کہ اول تو ہر جگہ ڈاکٹر کا علاج آسان ہے پھر غریبوں کے لئے سرکاری ہسپتال ہیں جہاں دوا غذا بھی مفت ملتی ہے۔ اور یہ امر یقینی ہے کہ ڈاکٹری ادویہ داخلی یا خارجی کے استعمال میں شراب و شحم خنزیر شامل ہے۔ مثلاً برانڈی کہ یہ تو خالص اشربہ اربعہ میں سے ہے اور بہت سے مرہم ہیں کہ ان میں شحم خنزیر اپنے مخصوص آثار کی وجہ سے شامل ہے اور یہ سب اجزاء یقیناً بنص قطعی نجس وحرام ہیں اس وقت دنیا کی حالت مجموعی طور پر ایسی ہے کہ "الا ما اضطررتم الیہ" میں داخل کی جاسکتی ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اگر تداوی بالمحرم پر فتویٰ ہو تو مناسب ہوگا کہ مسلمان بہت سی آفتوں سے بچ جائیں گے۔

(۲) اگر ان علماء کے قول پر عمل کیا جائے جو تداوی بالمحرم کے قائل ہیں تو ان کے نزدیک مسلمان کو ان ادویہ کی بیع بھی جائز ہے یا نہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ برانڈی تو خالص شراب انگوری ہے جو کمزور مریض کو استعمال کرائی جاتی ہے اور شحم خنزیر کا مرہم بہت ہی شدید زہریلے زخموں میں کام آتا ہے اور اگر ان کی بیع جائز نہ ہو

تو مسلمان بغیر احتیاج کفار تداوی بالمحرم کے فتویٰ سے منتفع نہیں ہو سکتے آیا محض دوا، ایسی ادویہ کی بیع مسلمان کو کس طور پر جائز ہے یا نہیں ؟

## الجواب

تداوی بالمحرم صرف اس وقت جائز ہے جبکہ کوئی طبیب مسلم حاذق یا مسلمان ڈاکٹر حاذق یہ کہہ دے کہ اس مرض کے لئے صرف ایک دوا ہے اس کے قائم مقام کوئی دوا نہیں۔ اگر اس کے قائم مقام کوئی دوا ہو مگر اس سے شفا دیر میں ہوگی اور محرم میں جلدی ہوگی تو اس میں دو قول ہیں۔

قال فی الهندیة: وان مریضاً اشار الیه الطبیب بشرب الخمر روی عن جماعة من ائمة بلخ انه ينظر ان كان يعلم يقيناً انه يصح حل له التناول اه يجوز للعليل شرب البول والدم واكل الميتة للتداوى اذا اخبره طبيب مسلم ان شفاءه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه وان قال الطبيب يتعجل شفاءك فيه وجهان هل يجوز شرب القليل من الخمر للتداوى اذا لم يجد شيئاً يقوم مقامه فيه وجهان. اه (ج ۲/۲۳۶)

پس جن دواؤں میں برانڈی یا شحم خنزیر کا ہونا معلوم ہو ان کا استعمال بدون شرط مذکور کے جائز نہیں اور دوا کو "ما اضطررتم الیہ" میں اس کو داخل کرنا عجیب فہم ہے۔ اضطرار اسباب یقینیہ میں ہوا کرتا ہے اور تداوی وعلاج اسباب مظنونہ میں سے ہے۔ فلا اضطرار فیہ اصلاً حتی لو ترك الدواء ومات لم یأثم، ولو شرب الخمر وهو عطشان ومات اثم لتيقن زوال العطش شربها وعدم تيقن زوال المرض به فافترقا.

(۲) قال فی الهندیة: واكل الترياق يكره اذا كان فيه شئ من الحيات وان مباح ذا للعسل جاز اه

(ج ۲/۲۳۶)

اس سے ان ادویہ کا جواز بیع مفہوم ہوتا ہے جن میں شئ محرم ملی ہوتی ہے بیع خالص محرم کی ناجائز ہے جیسے خالص شراب یا خالص شحم خنزیر اور مخلوط بالحرام کی بیع جائز ہے۔ کالنسر قین المخلوط بالتراب یجوز بیعہ۔

باقی یہ عصبیت لغو ہے کہ مسلمان تداوی بالمحرم میں کفار کے محتاج ہوں گے۔ آخر کون سی تجارت ہے جس میں کفار سے مسلمانوں کو استغناء ہے۔ پس احتیاج الی الکفار میں حرج کیا ہے جبکہ ہم مباحات میں بھی ان سے مستغنی نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر
ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۲۰ محرم ۱۳۴۳ھ

**بحالت مجبوری بیوی کو مانع حمل دوا کھلانا**

سوال: میری شادی کو ہوئے ۹ سال ہوئے اور آٹھ اولاد میرے گھر سے ہوئیں جن میں سے تین حیات ہیں اور پانچ فوت ہو گئے جو حیات ہیں ان کی عمر ایک کی آٹھ سال، ایک کی پانچ سال اور ایک کی گیارہ یوم ہے۔ سب سے پہلے میرے گھر میں ایک لڑکا ہوا جو حیات ہے۔ خدا کے فضل سے اس کی عمر آٹھ سال ہے۔ اس کے بعد ایک لڑکی ہوئی جو بچوں کی بیماری میں فوت ہو گئی۔ اس کے بعد ایک لڑکا ہوا وہ بھی مر گیا۔ اسی طرح باقی بچے بھی مر گئے ہیں اب کے جو بچی ہوئی اس نے بھی اپنی ماں کا دودھ نہیں پیا، بکری کا دودھ پی رہی ہے۔ حالانکہ میں نے اپنے گھر میں وقت حمل مولوی نذیر احمد صاحب دیوبندی کا علاج کرایا جو بچوں کے علاج میں اچھے مانے جاتے ہیں میری بیوی جو بچوں کو مرتے دیکھتی ہے اور صدمہ کرتی ہے جس کا اثر اس کے جسم اور صحت پر پڑتا ہے۔ قریب قریب ہر بچے کی پیدائش میں بیوی کو بخار اور کھانسی شروع ہو جاتی ہے۔ اب کی لڑکی پیدا ہونے پر تو اس کی زندگی کی بھی امید جاتی رہی تھی۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے کیا میں اپنے گھر میں ایسی دوا کھلا سکتا ہوں جس سے بچہ نہ پیدا ہو یا ایسی دوا جو دو تین چار سال تک بچہ پیدا نہ ہونے دے۔

**الجواب**

ویعزل عن الحرۃ باذنہا لکن فی الخانیۃ انہ یباح فی

رمانناافساده قال الکمال فلیعتبر عذرا مسقطا لاذنہا اھ
درمختار: وقال الشامی (تنبیہ) اخذ فی النہر من ھذا
ومما قدمہ الشارح عن الخانیہ والکمال انہ یجوز لہا
سد فم رحمہا کما تفعلہ النساء مخالفا لما بحثہ فی البحر
من انہ ینبغی ان یکون حراما بغیر اذن الزوج قیاسا
علی عزلہ بغیر اذنہا قلت لکن فی البزازیۃ ان لہ
منع امرأتہ من العزل اھ نعم النظر الی فساد الزمان
یفید الجواز من الجانبین اھ وقد بین الشامی قبل ذالک
جواز اسقاط الحمل قبل نفخ الروح فیہ لعذر ونصہ
قال ابن وہبان ومن الاعذار ان ینقطع لبنہا بعد
ظہور الحمل ولیس لابی الصبی ما یستأجر بہ الظئر
ویخاف ہلاکہ اھ (ج ۲/ ۹۲۳)
ولا یخفی ان الصورۃ المسئولۃ اھون من الاسقاط
بکثیر واھون من العزل بلا اذن ایضا بل ھو یشبہ
العزل برضا الجانبین فیجوز ای مع کراھۃ التنزیہ
بلا عذر ویدونہا بہ .

صورت مسئولہ میں عذر مذکور کی وجہ سے مانع حمل دوا کھا دینا جائز ہے اور بدون عذر کے کراہت سے خالی نہیں۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ
۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۵ھ

---

**انگریزی دوا اور سپرٹ کا حکم** | سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ تبدیل ماہیت سے حکم بدل جاتا ہے جیسے شراب انگوری سرکہ ہو جائے تو حلال و پاک ہو جاتا ہے۔ اب بعض ادویہ انگریزی کا حال بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ٹارٹری کو لکھا ہے کہ انگوری شراب کے پیپوں سے نکال کر جو تلچھٹ یا برادہ

میں لگی رہتی ہے اس سے ٹارٹری بناتے ہیں کہ شراب ڈال کر ادویہ کو حل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو خشک جوہر بناتے ہیں تو ایسے شرعاً قلب ماہیت ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اور شراب مثلث حکم میں اسپرٹ کے آتا ہے یا نہیں بلکہ مثلث سے بظاہر اسپرٹ شراب میں یہ بات زیادہ ہے کہ اڑ جاتی ہے۔ ٹارٹرک ایسڈ یا ٹارٹری (ریا اہلی کا ست یا انگور کا ست) آب انگور کی شراب بننے کے بعد جو چیز شراب کے پیپوں میں لگی رہ جاتی ہے اس کو ٹارٹار یعنی درد شراب کہتے ہیں اسی درد شراب سے پوٹاسیم ٹارٹریٹ بنائی جاتی ہے۔

(منقول از کتاب غلام جیلانی ص ۵۰۲) اور اس پوٹاشیم سے ٹارٹرک ایسڈ جنجر ٹیڈ کا فوداسپٹن آب جنجر سونٹھ ایک حصہ الکحل حسب ضرورت ایکی نائٹڈ اسپرٹ میں سے کاربونیٹ آف پوٹاسیم یا کلورائڈ آف کیلشیم کے ذریعہ اس کو کشید کرنے سے خالص الکحل حاصل ہوتا ہے۔ (حصہ اول ص ۶۲۳)

ولایتی عرق لیمن یا لیمن جوس ______ عرق لیموں زیادہ عرصہ تک رکھنے سے خراب ہوجاتا ہے۔ اگر اس میں دس فیصد الکحل ملا دیں تو وہ پھر بگڑتا نہیں۔

## الجواب

ٹارٹری سے متعلق صرف تحریر غلام جیلانی سے اس امر کا انکشاف نہیں ہوا کہ ٹارٹری میں خمر کی حقیقت منقلب ہو جاتی ہے یا نہیں اس لئے بنانے والوں سے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ باقی اسپرٹ کو شراب مثلث پر قیاس نہیں کرسکتے کیونکہ مثلث میں اجزاء خمریہ نکل جاتے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ مسکر باقی نہیں رہتا اور اسپرٹ میں سکر باقی رہتا ہے۔ اور ابخرت شئ نجس سے جس چیز پر لگیں اگر ابخرات لگنے سے وہ شئ تر ہو جائے تو ناپاک ہے ورنہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ

۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ

---

عہ الکحل: انگریزی لفظ ایلکحال مشتق ہے۔ عربی لفظ الکحول سے جس کے معنی اصطلاح کیمیا میں نہایت مقطر یا روح کے ہے مگر اب اس لفظ کا اطلاق مطلق روح شراب پر ہوتا ہے۔

**"اوکاسا" دوا کے استعمال کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک دوائی جس کا نام "اوکاسا" ہے۔ جانوروں مثلاً بندر کے غدود سے تیار کی جاتی ہے اس میں سوکھا ہوا جگر بھی شامل کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ فائدہ یہ دوائی جریان، احتلام اور نامردی وغیرہ جیسے امراض کو پہنچاتی ہے اس کے نافع ہونے کی تصدیق تمام دنیا کے مشہور ڈاکٹر کرتے ہیں۔ متعدد بین الاقوامی تعریفات اس کے موجد جرمن ڈاکٹر حاصل کر چکے ہیں۔ کیا کسی مسلمان کو اس کے استعمال کی شرعاً اجازت دی جا سکتی ہے۔

## الجواب

تعریفات اور تصدیقات سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ جس مریض کے متعلق کوئی مسلمان طبیب یہ تجویز کر دے کہ اس سے ضرور نفع ہوگا اور دوسری کوئی جائز دوا اس کے لئے مفید نہیں ہے تب ناجائز دوا کا استعمال جائز ہو جاتا ہے کما صرح به صاحب الدر المختار فی فصل فی البیع من الحظر والاباحة۔

## تتمة السوال

اور اگر بالفرض معمولی حالات میں اس کا استعمال جائز نہ ہو تو کن خاص حالات میں اس کی اجازت ہو سکتی ہے مثلاً کسی شخص کو نامردی موذی جیسا مرض لاحق ہو۔

## تتمة الجواب

اس میں ایذاء کہاں سے آئی۔

## تتمة السوال

اور عام علاج سے کوئی فائدہ مرتب نہ ہوتا ہو تو اس کا مریض اس دوائی کے استعمال کا حق رکھے گا۔

## تتمة الجواب

درحقیقت یہ مرض نہیں ضعف ہے اور تحصیل قوت کے لئے حرام دوائی کا استعمال کسی طرح جائز نہیں پس نامرد کسی حال میں اس دوا کو استعمال نہیں کر سکتا۔ کما فی الشامی تحت قول الدر (للتداوی) ای من مرض او نهوال الیه لانفع نما هو کالتقوی علی الجماع کما قدمناه ولا للسمن کما فی العنایة (ج ۵/ ۳۸۳)

احقر عبدالکریم عفی عنہ از تھانہ بھون ۱۵ شوال ۱۳۵۵ھ

# کتاب اللباس والزینۃ

### کرتے کی آستین کی لمبائی کتنی ہونی چاہیے

سوال: کیا کرتے کی آستین کی لمبائی ہاتھ کے گٹے تک ہونی چاہیے یا کہ کل بالکل چھپ جانا چاہیے۔

## الجواب

قال الملا علی القاری فی شرح الشمائل ص ۱۱۰ ج ا قال الجزری فیہ دلیل علی ان السنۃ ان لا یتجاوز کم القمیص الرسغ واما غیر القمیص فقالوا السنۃ فیہ لا یتجاوز رؤس الاصابع من جبۃ وغیرہا وفی شرح الشمائل للمناوی واخرج سعید بن المنصور والبیہقی عن علی رضی اللہ عنہ أنہ کان یلبس القمیص ثم یمد الکم حتی اذا بلغ الاصابع قطع ما فضل ویقول لا فضل للکمین علی الاصابع اھ۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ کرتہ کی آستین گٹے تک ہونی چاہیے اور چونکہ غایۃ الکثر معین سے خارج ہوتی ہے اس لیے گٹے کا کھلا رہنا بہتر ہے اور ہاتھ کی انگلیوں سے آستین کا بڑھا ہونا خلاف سنت ہے۔ واللہ اعلم۔

احقر ظفر احمد عفی عنہ

۵ المحرم [illegible]

### ولایتی کپڑوں کے جلانے اور مال کے ضائع کرنے کا حکم

سوال: ایک اسلامی اخبار میں ایک مضمون ہماری نظر سے گزرا ہے جس کی سرخی یہ ہے کہ کپڑا جلانا اسراف بیجا نہیں) اور اس سرخی کے تحت لکھا ہے کہ حضرات علماء کرام کی آواز گاندھی کی سودیشی دفعہ پر متفق ہے۔ آگے چل کر صحیح مسلم کی ایک روایت لکھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ثوبین معصفرین فقال ان ھذہ من ثیاب الکفار فلا تلبسھما وفی روایۃ قلت اغسلھما قال بل احرقھما رواہ مسلم۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسم رنگ کے لباس کو آپ نے کفار کا لباس فرمایا اور جب عرض کیا کہ رنگ دھو ڈالیں تو فرمایا کہ نہیں بلکہ جلا ڈالو۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ میرے نزدیک ایسے کپڑوں کا (مراد ولایتی کپڑا ہے) جلا دینا فرض ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ دشمنِ اسلام اسلام کو فنا کرنے کے لئے کسی طریقے کا پابند نہیں اسلام بھی مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ تم بھی مدافعت میں کسی خاص طریق کے پابند نہ رہو اب قابل دریافت یہ امر ہے کہ آیا بحالت موجودہ مسلمانوں کو ولایتی کپڑے کا جلا دینا جائز ہے یا اس سے بڑھ کر فرض واجب ہے یا کہ نہیں۔

## الجواب

صورت موجودہ میں مسلمانوں کو اپنے کپڑے کو جلانا جائز نہیں۔

عن المغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ کرہ لکم ثلاثا۔ قیل وقال اضاعۃ المال وکثرۃ السوال: رواہ البخاری واللفظ لہٗ ومسلم وابو داؤد۔

باقی اخبار کے مضمون نگار نے جس حدیث سے اس کے جواز پر استدلال کر کے اس کو فرض قرار دیا ہے یہ استدلال بالکل صحیح نہیں کیونکہ جس حدیث سے اضاعت مال کی حرمت ثابت ہوتی ہے وہ عام ہے اور عبد اللہ بن عمرؓ کا واقعہ خاص ہے جو کہ احادیث میں مختلف الفاظ سے مذکور ہے جن میں باہم تعارض ہے۔ چنانچہ ایک طریق مسلم کا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

انک امرتک بھذا فقلت اغسلھما قال بل احرقھما

اور روایت نسائی کے یہ الفاظ ہیں:

عن عبد اللہ بن عمر انہ اتی النبی صلی اللہ علیہ وعلیہ ثوبان معصفران فغضب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقال اذھب فاطرحہما عنک قال این یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی النار۔ وسکت عنہ النسائی اور ابوداؤد واحمد وابن ماجہ کے یہ الفاظ ہیں۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال ھبطنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ثنیۃ فالتفت الیّ وعلیّ ریطۃ مضرجۃ بالعصفر فقال ما ھذہ الریطۃ علیک فعرفت ما کرہ فاتیت اھلی وھم یسجرون تنورا لھم فقذفتھا فیہ ثم اتیتہ من الغد فقال یا عبد اللہ ما فعلت الریطۃ فاخبرتہ فقال افلا کسوتھا بعض اھلک فانہ لا بأس بھا للنساء اھ رجالہ ثقات وعمرو بن شعیب الجمھور علی توثیقہ والاحتجاج بروایتہ عن ابیہ عن جدہ وکذا فی الترغیب للمنذری قال فی النیل قولہ لبعض اھلک یعنی زوجتہ او بعض نساء محارمہ واقاربہ وفیہ دلیل علی جواز لبس المعصفر للنساء وفیہ الانکار علی احراق الثوب المنتفع بہ لبعض الناس دون بعض لانہ من اضاعۃ المال المنھی عنھا اھ۔

پس یہ روایت ابوداؤد اور روایت مسلم کے معارض ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عبد اللہ بن عمرؓ کو اس کپڑے کے جلا دینے کا حکم دیا تھا اور اس سے یہ معلوم ہے کہ جب انہوں نے اس کو جلا دیا اور حضورؐ کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے اس پر انکار فرمایا کہ تم اپنے کسی گھر والے کو وہ کپڑا کیوں نہ پہنا دیا کیونکہ عورتوں کے لئے اس کے استعمال کی اجازت ہے اھ اب ان روایتوں کی تطبیق میں فقہاء و محدثین نے مختلف توجیہیں بیان فرمائی ہیں بعض نے ان سب روایات کو ایک ہی واقعہ پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ اولاً تو آپ نے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود حقیقۃً جلا دینا نہیں تھا بلکہ مطلب یہ تھا کہ ان کو اپنے پاس سے دور کر دو، خواہ بیچ دو یا کسی کو دے دو۔ آپؐ نے مبالغہ کے طور پر سختی انکار کے لیے اس مراد کو مجازاً احراق سے تعبیر فرمایا جیسا کہ ہمارے محاورہ میں ایسے موقع میں یہ کہا کرتے ہیں کہ چولہے میں ڈالو۔ جس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ سچ مچ جلا دو بلکہ صرف اظہار نفرت اور اس چیز کے علیحدہ کر دینے کی ترغیب مدنظر ہوتی ہے اور اس تاویل کی تائید روایت نسائی سے ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ قال اذھب فاطرحھما عنک۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو سے فرمایا کہ جاؤ ان کپڑوں کو اپنے سے جدا کر ڈالو۔ قال این یا رسول اللہ قال فی النار: انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ کہاں ڈال دوں، فرمایا کہ آگ میں جھونک دو۔ اس روایت میں صاف تصریح ہے کہ حضورؐ نے اولاً ان کو یہی حکم دیا تھا کہ ان کو اپنے سے جدا کر دو پھر جب صحابی نے دوبارہ سوال کیا تو آپؐ نے سختی کے ساتھ فرمایا کہ چولہے میں ڈالو۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ روایت نسائی اور روایت مسلم جس میں احرقھما کا لفظ ہے دونوں کے راوی طاؤس ہیں اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت احرقھما بصیغۂ امر روایت بالمعنی ہے کہ فی النار کے بجائے اس کے مضمون کو صیغۂ امر سے راوی نے بیان کر دیا۔ غرض آپ نے تو فی النار یا احرقھما سے مجازاً ان کپڑوں کا علیحدہ کرنا مراد لیا تھا مگر عبداللہ بن عمرو اس کے حقیقی معنی سمجھے اور جا کر ان کو جلا دیا۔ اگلے دن جب وہ آئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کے اس فعل پر انکار کیا اور فرمایا کہ تم نے اپنے گھر کی عورتوں میں سے کسی عورت کو وہ کپڑا کیوں نہ پہنا دیا۔ کیونکہ ان کے لئے اس کا مضائقہ نہ تھا۔

(مرقات ص ۲۱۱ ج ۴) میں ہے۔ قال القاضی قیل اراد بالاحراق افناء الثوبین ببیع او ھبۃ ولعلہ استعار بہ عنہ للمبالغۃ والتشدید فی النکیر وانما لم یاذن فی الغسل لان المعصفر وان کان مکروھا للرجال فھو غیر مکروہ للنساء فیکون غسلہ تضییعا واتلافا للمال ویدل علی ھذا التاویل ماروی انہ اتی اھلہ وھم یسجرون التنور فقذفھا فیہ ثم لما کان

الغداتا دفقال لہ یا عبد اللہ ما فعلت فأحسبہ فقال افلا کوتھا بعض اھلک فأنہ لا باس بھما للنساء ثم قال فاتھما فعل عبد اللہ ما فعل لما رأی من شدۃ کراھۃ الرسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم او یفھمہ الظاھر او لتوھمہ عموم الکراھتہ والحمل علی الاخیر اولی۔

اور بعض علماء نے ان روایات کو متعدد واقعات پر محمول کرکے تعارض کو رفع کیا ہے مگر یہ تاویل بعید ہے کیونکہ ایک صحابی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کے بعد دوبارہ اسی فعل کا صادر ہونا بہت مستبعد ہے بہرحال ان بعض علماء نے یہ توجیہ بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار عبداللہ بن عمرؓ کو نرمی سے منع فرمایا تھا کہ یہ لباس کفار کا ہے اس کو نہ پہنو مگر وہ بھول گئے اور دوبارہ پھر اس کو استعمال کیا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ غصہ آیا اور آپ نے ان کو بطور سزا کے حکم دیا کہ ان کو جلا دو، تاکہ اس نقصان کے بعد یہ ممانعت بخوبی یاد رہے۔

قال النوویؒ واما الامر باحراقھا فقیل ھو عقوبۃ و تغلیظ لزجرہ وزجر غیرہ عن مثل ھذا الفعل و ھذا نظیر أمر تلک المرأۃ التی لعنت الناقۃ بارسالھا وأمر اصحاب بریرۃ ببیعھا وانکر علیھم اشتراط الولاء ونحو ذالک۔ واللہ اعلم ص ۱۹۳ ج ۲ مسلم شریف۔

خلاصہ یہ کہ عبداللہ بن عمرؓ کی جس روایت سے مضمون نگار نے کپڑوں کے جلانے کو بصورت موجودہ جائز بلکہ فرض قرار دیا ہے۔ یہ دین میں بہت بڑی تعدی اور تحریف ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ آج کل بعض نام کے مولوی ہر وقت اسی کوشش میں رہیں کہ گاندھی کے منہ سے جو کچھ نکلے اس کو گڑھ مڑھ کر شریعت میں ٹھونس دینا چاہیئے بھلا پھر اس صورت میں نصرت الٰہی مسلمانوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اہل علم نے اس تفصیل سے بخوبی سمجھ لیا ہوگا کہ اس حدیث میں جس

سے مضمون نگار نے استدلال کیا ہے تو جیہ اول کی بنا پر تو احراق کا حکم ہی نہیں۔ بلکہ احراق سے مجازاً ان کپڑوں کا علیحدہ کرنا مقصود تھا۔ پھر دوسری روایت میں عبداللہ بن عمر کے فعل احراق پر حضور کا انکار فرمانا مصرح ہے اور دوسری توجیہ بعید ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ نے ان کو احراق کا حکم دیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ عبداللہ بن عمرؓ نے حضورؐ کی ممانعت کے بعد ایسا رنگین لباس پہنا تھا جس کا پہننا مردوں کے لئے حرام اور اس کا استعمال کفار کا شعار تھا (کما یظھر من قولہ انھما من ثیاب الکفار) اس لئے آپ نے بطور سزا اور جرمانہ کے احراق کا حکم فرمایا۔ پس مستدل بتلائے کہ صورت موجودہ میں وہ مسلمانوں کو کپڑے جلانے کا حکم کس جرم کی سزا میں دے رہا ہے اور یہ بھی بتلائے کہ مسلمانوں پر جرمانہ مالی عائد کرنا آیا بجز امام کے کس کو حق ہے وہ ہرگز اس کو ثابت نہیں کر سکتا اور اگر وہ یہ کہے کہ ہم کفار کو جلانے اور غیظ دلانے کے لئے ولایتی کپڑے جلانے کا حکم دیتے ہیں تو اس کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمر کو احراقِ ثیاب کا حکم کفار کو غیظ دلانے کے لئے فرمایا تھا وہ ہرگز اس کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو حضورؐ بعد میں یہ نہ فرماتے کہ تم نے اپنے گھر کی کسی عورت کو وہ کپڑا کیوں نہ پہنا دیا اور اگر وہ واقعہ بنی نضیر سے استدلال کرے کہ حضورؐ نے یہود بنی نضیر کے باغات اور کھجوریں اور کھیتیاں جلوا دی تھیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تک وہ مال مسلمانوں کے قبضہ میں نہ آیا تھا کیونکہ اس وقت تک آپ یہود کا محاصرہ کئے ہوئے تھے اور جنگ ختم نہ ہوئی تھی تو وہ مال کفار حربین کا مال تھا جو کہ معصوم نہیں۔ اس لئے اس کا جلا دینا جائز تھا۔ یہ کہیں ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کفار کو غیظ دلانے کے لئے مسلمانوں کا مال جلا دیا ہو اور کسی کو یہ شبہ ہو کہ ان احادیث سے جواز احراق اگرچہ ثابت نہ ہو مگر مسلم کی روایت سے اتنا تو معلوم ہوا کہ ثیاب کفار کا پہننا جائز نہیں (لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ھذہ ثیاب الکفار فلا تلبسھا) اور ولایتی مال بھی کفار کا لباس ہے کیونکہ ان کے ملک سے آتا ہے اور کفار اس کو پہنتے ہیں اس لئے یہ بھی حرام ہونا چاہیئے اور اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث

مسلم میں ثیاب کفار سے یہ مراد نہیں ہے کہ چونکہ یہ کپڑا کفار کا بنا ہوا ہے اور ان کے ملک سے آیا ہے اس لئے اس کو نہ پہنو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس خاص رنگ کا استعمال مردوں میں ہونا کفار کا شعار ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ میں کسم کا رنگا ہوا کپڑا مردوں کے لئے اب تک حرام ہے اور معنی اوّل اس لئے غلط ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کفار کے ملک کا کپڑا بلا تکلف استعمال کرتے جو کفار ہی کے ہاتھ کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ چنانچہ زاد المعاد جلد اوّل میں ہے:

وفی الصحیحین عن قتادة قلت لانس ای اللباس کان احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الحبرة والحبرة برد من برود الیمن فان غالب لباسهم کان من نسج الیمن لأنها قریبة منهم وربما لبسوا ما یجلب من الشام ومصر کالقباطی المنسوجة من الکتان التی کانت تنسجها القبط[۳]

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اکثر یمن کا کپڑا پہنتے تھے۔ کیونکہ وہ قریب تھا اور ظاہر ہے کہ یمن کے لوگ آپ کی حیات میں سب مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نیز آپ نے شام اور مصر کا کپڑا بھی استعمال کیا ہے حالانکہ وہ اس وقت خالص کفار کا ملک تھا اور وہاں کا کپڑا کفار ہی کا بنا ہوا تھا۔ نیز آپؐ نے فارس کا بنا ہوا کپڑا بھی پہنا ہے اور یہ ملک تھا جہاں کے بادشاہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کے ساتھ گستاخی کی تھی اور اس وقت وہاں کے لوگ سب کافر تھے۔

وفی صحیح مسلم عن اسماء بنت أبی بکر قالت هذه جبة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فأخرجت جبة طیالسة کسروانیة (وفی روایة خروانیة) لها لبنة دیباج وفرجاها مکفوفان الخ۔

پس کفار کے ملک کا کپڑا یا ان کا بنا ہوا استعمال کرنا ہرگز حرام نہیں۔ البتہ ان کی وضع اور ہیئت اور شعار کو اختیار کرنا حرام ہے۔ اب آپ اس سے فیصلہ کر لیجئے کہ آج کل کپڑوں کے جلانے سے اتباع شریعت کہاں تک مقصود ہے کہ شریعت نے کفار کے ملک کا کپڑا اور ان کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرنا جائز کیا ہے اس کو تو یہ

لوگ جزم کر رہے ہیں اور شریعت نے کفار کی وضع قطع ہیئت کو منع کیا ہے اس کو یہ لوگ اختیار کر رہے ہیں کہ اگر گاڑھے کا کپڑا ہی پہنیں گے تو اس کو کوٹ پتلون کی وضع پر سلوائیں گے۔ نعوذ باللہ من ھذہ المعاندۃ للشریعۃ المطہرۃ۔

پس ہمارے نزدیک دلائل شرعیہ سے ولایتی کپڑا کا استعمال بالکل جائز ہے مگر واجب بھی نہیں اس لئے اگر کسی مصلحت کے لئے ولایتی مال کو چھوڑ کر دیسی مال اختیار کر لیا جائے اور اعتقاداً اس کو بھی جائز سمجھا جائے تو یہ بھی جائز ہے بلکہ مصلحت پر نظر کر کے اچھا ہے۔ اس سے آگے بڑھنا شریعت کی تحریف ہے اور مضمون نگار نے آخیر میں جو لکھا ہے کہ دشمن اسلام اسلام کے تباہ کرنے کے لئے کسی طریق کا پابند نہیں۔ اسلام بھی مسلمانوں کو اجازت دیتا ہے کہ تم بھی مدافعت میں کسی خاص طریق کے پابند نہ رہو۔ الخ

اس پر میں مضمون نگار سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی یہ اجازت بایں الفاظ ہم کو کہیں دکھلا دیں اور یہ بھی بتلا دیں کہ کیا شریعت نے اس کا بھی حکم کیا ہے کہ دشمن کی مدافعت میں تم جو کچھ کرو اس کو فرض و واجب بنا کر دو اور دین میں تحریف کر دیا کرو۔ کیا مضمون نگار کے نزدیک اگر کسی وقت کفار مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے لگیں تو اسلام مسلمانوں کو بھی یہ اجازت دے گا کہ وہ بھی مدافعت میں کفار کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے لگیں اور کسی خاص طریق کے پابند نہ رہیں۔

افسوس مضمون نگار نے اسلامی تعلیم کو کس غلط طریقے سے برے عنوان میں بیان کیا ہے اسلام کی تعلیم یہ ہے۔ ولا یجرمنکم شنآن قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے جس میں عدل و صبر کی نہایت درجہ رعایت اور حد سے آگے بڑھنے کی پوری ممانعت ہے۔

واللہ اعلم۔

حررہ احقر الطلبہ
ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۴ محرم سنہ ۴۲ھ

عینک کی کمانی سونے کی بنانے کا حکم | سوال: چشمہ یعنی عینک جو کہ آنکھ میں بینائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا فریم یعنی کمانی اگر سونے کی ہو تو استعمال جائز

ہے یا نہیں؟

## الجواب

عینک کی کمانی سونے اور چاندی کسی کی جائز نہیں۔

قال فی الدر: وکذا الاناء المضبب بذهب أو فضة والکرسی المضبب بهما وحلیة مرآة روفی المنح والهدایة وغیرهما حلقة مرآة بالقاف قال فی الکفایة والمراد بها التی تکون حوالی المرآة اه شامی) رمضیف لهما الی أن قال ولم یضع یده موضع الذهب والفضة الخ (ص ۳۲۷ ج ۵)

پس عینک کی کمانی حلقۂ مرآۃ کے مشابہ ہے اور وہ اس شرط سے جائز ہے کہ چاندی اور سونے کی جگہ پر ہاتھ نہ رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ عینک کا لگانا بدون کمانی کو ہاتھ لگائے دشوار ہے۔ اس لئے ناجائز ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد ۲۹ محرم سنہ ۵۱ھ

---

**ریشمی رومال اور نشتر سے بنے ہوئے رومال کا حکم**

سوال: (۱) کیا رومال ریشمی مردوں کو استعمال کرنا درست ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ درست ہے اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں، رومال لباس میں داخل نہیں۔ (۲) بہا گیوری صافہ کو بعض لوگ کہتے ہیں ریشم ہے اس کا استعمال جائز نہیں۔ حضور تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

## الجواب

(۱) ریشمی رومال کاندھے پر ڈال کر چلنا یا گلے میں باندھنا یا اس سے منہ ہاتھ پونچھنا جائز نہیں کہ یہ داخل استعمال ہے اور اگر اس میں روپے پیسے باندھ کر جیب میں ڈال لیں تو جائز ہے۔

قال فی الدر: وکذا تکره القلنسوة وان کانت تحت العمامة والکیس الذی یعلق اه قال الشامی والظاهر ان المراد بالکیس المعلق نحو کیس التمائم المسماة بالحمائل بخلاف کیس

الدراهم اذا كان يضعه في جيبه مثلاً بدون تعليق ۔ وفي القنية ولا يلقي الثوب الديباج على منكبيه للبيع يجوز اذا لم يدخل يديه في الكمين وقال الكرابيسي فيه كلام بين المشائخ اه ووجه الاول ان القاء الثوب على الكتفين انما قصد به الحمل دون الاستعمال فلم يشبه اللبس المقصود للانتفاع تأمل اه (ج ۵/۲۲۷)

قلت ولا شك ان المنديل يلقى على المنكبين بقصد الاستعمال فيكره وفي القنية انه تكره اللفافة الابريسمية والظاهر ان المراد بها شئ يلف على الجسد او بعضه لا ما يلف به الثياب تامل اه

(۲) ہم کو بھی تحقیق ہوئی ہے کہ تسر ریشم ہے اور بھاگلپوری عمامے اکثر تسر ہی کے ہوتے ہیں۔ پس اگر تانا بانا دونوں تسر ہے تو استعمال ناجائز ہے اور اگر بانا سوت کا ہو تو جائز ہے۔ قال فی الدر: ویحل ما سداه ابریسم ولحمته غیره کالکتان وقطن اه (ج ۵/۲۲۹) واللہ اعلم۔

حررہ ظفر احمد، ۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۸ھ

**حلق رخسار اور گردن کے بال مونڈنے کا حکم** سوال: مونچھ یا مونچھ کے نیچے یا حلق یا رخسار یا گردن کے بال استرہ سے بنوانا کیسا ہے۔

**الجواب**

قال فی العالمگیریة ویأخذ من شاربه حتی یصیر مثل الحاجب كذا فى الغياثية وكان بعض السلف يترك سباليه وهو اطراف الشوارب كذا فى الغرائب ذكر الطحاوى فى شرح الآثار ان قص الشارب حسن قال والحلق سنة وهو احسن من القص وهذا قول أبى حنيفة وصاحبيه (ج ۴/۲۳۰)

وفی ہدایۃ النور فی احکام الشعور للمفتی سعد اللہ۔

حلق شعور بھروت بدعت است بر قول اصح ابو المکارم و شرح مختصر از زاھدی می آرد حلق الشارب بدعۃ و قیل سنۃ اھ وفی النیل و ذھب کثیر منھم الی منع الحلق والاستیصال والیہ ذھب مالک و کان یری تادیب من حلقہ وروی عنہ ابن القاسم انہ قال احفاء الشارب بدعۃ قال النووی المختار انہ یقص حتی یبدو طرف الشفۃ ولا یحفہ من اصلہ اھ (ج ۱/۱۱۱) قال فی النھایۃ احفاء الشوارب أن یبالغ فی قصھا۔

پس مونچھوں کا مونڈنا اگرچہ ایک قول پر جائز ہے مگر راجح یہ ہے کہ بدعت ہے اور سنت یہ ہے کہ قینچی سے کتروا دے اور کترنے میں مبالغہ کرے کہ بال کھال سے مل جائیں۔

وفی ھدایۃ النو ایضاً محدث و ھو در شرح صراط مستقیم می آورد حلق طرفین عنفقۃ لا بأس بہ است وفیہ ایضاً۔ محدث (یعنی سرحد) جانب قفا تا گردن است اما گردن خارج است اھ وفیہ ایضاً ور مضمرات لا بأس بأخذ الحاجبین وشعور وجھہ مالم یشبہ المخنث اھ وفی العالمگیریہ عن ابی حنیفۃ یکرہ ان یحلق قفاہ الا عند الحجامۃ وفیہ لا یحلق شعر حلقہ وعن أبی یوسف لا بأس بہ اھ (۴/۲۳۸)

بقیہ سوالات کا جواب ان عبارات میں موجود ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گردن اور رخسار کے بال مونڈنا جائز اور حلق میں اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد

۲۴ ربیع الثانی سنہ ۴۳ھ

**ولایتی اشیاء کے استعمال کا حکم** سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و شرع متین اس مسئلہ میں کہ ولایت کا بنا ہوا کپڑا یا دیاسلائی چاقو قلم کاغذ یعنی جو جو چیز ضرورت کی ہے اس کا استعمال کرنا جائز ہے کسی کتاب

سے حرمت ثابت ہوتی ہے کہ نہیں ؟

## الجواب

ان سب چیزوں کا استعمال کرنا جائز ہے کسی کتاب سے حرمت ثابت نہیں ہے نہ شارع نے منع کیا ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ

**کرتے کالر لگوانے کا حکم**

سوال: کثر لوگ انگرکھے یا کرتے میں گلے کے پاس کالر لگواتے ہیں۔ زید کہتا ہے کہ یہ کالر نصاریٰ کے ساتھ مشابہت ہے۔ کالر وغیرہ کچھ نہیں لگوانا چاہیئے تو کیا واقعی یہ ممنوع ہے اور مشابہت بالنصاریٰ ہے یا نہیں ؟

## الجواب

بے شک کالر لگانا مشابہت بالنصاریٰ میں داخل ہے بدون ناجائز ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

**ریشم کی جانماز پر نماز پڑھنے کا حکم**

سوال: ریشم کی جانماز پر نماز پڑھنا جائز ہے یا ہے ؟

## الجواب

قال فی الدر فی باب لبس الحریر من کتاب الحظر والاباحۃ مانصہ ویحل توسدہ وافتراشہ والنوم علیہ وقالا والشافعی ومالک حرام وھو الصحیح کما فی المواھب فلیحفظ ھذا التصحیح خلاف ما علیہ المتون المشھورۃ المعتبرۃ والشروح الیٰ ان قال (تتمۃ) یجری الاختلاف المار بین الامام وصاحبیہ فی ستر الحریر وتعلیقہ علی الابواب کما فی الھدایۃ وکذا لایکرہ وضع ملاءۃ الحریر علی مھد الصبی وقدمنا کراھۃ استعمال اللحاف من الابریسم لانہ نوع لبس بخلاف الصلاۃ علی السجادۃ منہ لان الحرام ھو اللبس دون الانتفاع الیٰ ان قال لکن نقل الحموی عن شرح الھاملیۃ للحدادی انہ

مكره الصلاة على الثوب الحرير للرجال اھ قلت والاول اوجه اذ لا فرق يظهر بين الافتراش للجلوس أو النوم او للصلاة تدبر اھ (ص ۲۴۹ ج ۵) وفيه ايضا وانما حل (ای التوسد والنوم على الحرير ۱۲) لما روی ان النبی صلی الله علیه وسلم جلس على مرفقة حرير وكان على بساط ابن عباس مرفقة حرير وروى ان انسا رضی الله عنه حضر وليمة فجلس على وسادة حرير ولان الجلوس على الحرير استخفاف به وليس بتعظيم فجرى الجلوس على بساط فيه تصاوير منح عن السراج اھ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ریشم کے کپڑے پر بیٹھنا اور سونا اور تکیہ لگانا اور نماز پڑھنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۸ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ

بیسے ہی ہوئی ٹوپی پہننے کا حکم | سوال: اس دیار بنگال میں بیسے تار نکال کر ٹوپیاں بناتے ہیں۔ یہ ٹوپی استعمال کرنا جائز ہے یا نہ۔

الجواب

جائز ہے لعدم ما يدل على الحرمة. واللہ اعلم
ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲ جمادی الثانیہ ۱۳۴۴ھ

پاجامہ ٹخنوں سے نیچا رکھنا | سوال: مرد کے لئے پاجامہ گھوٹی سے نیچا رکھنا نماز میں یا غیر نماز میں درست ہے یا نہیں؟

الجواب

سوال میں ایک لفظ گھوٹی سمجھ نہیں آیا اگر اس کے معنی ٹخنہ کے ہیں تو ٹخنہ سے نیچے پاجامہ یا لنگی کا رکھنا نماز و غیر نماز ہر حالت میں گناہ ہے۔
واللہ اعلم۔ ۴ رجب ۱۳۴۴ھ

**عورتوں کے لئے بالوں کا جوڑا باندھنا جائز ہے**

سوال: عورتوں کو سر کے بالوں کا جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا کہ مکروہ ہے۔

## الجواب

عورت کے لئے بالوں کا جوڑا باندھنا مکروہ نہیں۔

قال فی رد المحتار روی الطبرانی انہ علیہ الصلاۃ والسلام نھی ان یصلی الرجل ورأسہ معقوص اھ (ج ۱/ ۹۷۱) اس میں ممانعت مردوں کو ہے قال العزیزی واسناد صحیح (ج ۳/ ۴۰۳)

وفی حاشیۃ النحوی خرج المرأۃ والخنثی فیطلب عقص شعرھما لطلب المبالغۃ فی سترھما، قلت وقواعدنا لاتاباہ۔ واللہ اعلم۔ ظفر احمد عفی عنہ ۲ رجب سنہ ۴۵ھ

**چہرہ اور ہتھیلیوں کا ضرورت کے وقت ستر واجب نہیں**

سوال: پردہ کے بارے میں فقہاء کرام نے یہ کیسے لکھ دیا کہ الا وجھہا وکفیھا اور ولا یُبدِینَ زِینَتَھُنَّ اِلَّا لِبُعُولَتِھِنَّ سے مستنبط کرتے ہیں کہ زینت سے مواضع زینت مراد ہیں اور وجہ وکف موضع زینت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں عضو اعلیٰ درجہ کے موضع زینت ہیں یعنی وجہہ کی زینت پان، مسّی، سرمہ سے اور ناک کی زینت کیل اور نتھ سے کی جاتی ہے اور ہاتھ کی مہندی اور انگوٹھیوں سے کی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے عضو مستور مواضع زینت نہیں ہیں کیونکہ نہ اس کے لئے خاص زیور ہے اور نہ کوئی خاص مسالحہ یا خضاب۔ پھر اگر فقہاء کا قول مان لیا جاوے تو مروجہ پردہ بالکل رخصت ہو جائے گا بلکہ امتثال امر بلکہ اجتناب بدعت کے طور پر اسے خود رخصت کرنا پڑے گا۔

## الجواب

فقہاء کرام نے وجہ وکفین کا استثناء ولا یُبدِینَ زِینَتَھُنَّ سے مستنبط نہیں کیا بلکہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے الا ما ظھر منھا فرمایا ہے۔

اس سے یہ استثناء مستنبط ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ زینت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک زینت خفیہ (جس کے اخفاء میں حرج نہیں) دوسری زینت ظاہرہ (جس کے اخفاء میں کام کرنے والی عورتوں کو حرج ہوتا ہے) پس وجہ وکفین بھی داخل زینت ہیں مگر وہ از قبیل زینت ظاہرہ ہیں۔ منجملہ زینت خفیہ کے نہیں اور یہ بات بالکل بدیہی ہے۔ غریب عورتوں کو کام کاج کے حرج کے واسطے اظہار وجہ وکفین کی سخت ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اس کو عورت نہیں قرار دیا گیا البتہ اگر خوف فتنہ ہو تو اس وقت اس کا چھپانا بھی واجب ہے۔ چنانچہ اس وقت کے لئے حکم ہے یاایہا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المؤمنین یدنین علیہن من جلابیبہن (فی الجلالین جمع جلباب وہی الملحفۃ التی تشتمل بہا المرأۃ ای یرخین بعضہا علی الوجوہ اذا خرجن لحاجتہن الا عینا واحدۃ اھ (ص ۳۵۵)

اور جس وقت باہر نکلنے کی ضرورت نہ ہو بلکہ اس سے استغناء ہو تو اس وقت کے لئے یہ حکم ہے وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الاولیٰ۔ وفی الجلالین تحت قولہ تعالیٰ ولا یبدین زینتہن الا ما ظہر منہا، وہو الوجہ والکفان فیجوز نظرہ لاجنبی ان لم یخف فتنۃ فی احد الوجہین والثانی یحرم لانہ مظنۃ الفتنہ ورجح حسما للباب۔

ولیضربن بخمرہن علی جیوبہن ولا یبدین زینتہن الخفیۃ وہی ما عدا الوجہ والکفین الخ اس سے معلوم ہو گیا کہ استثناء وجہ وکفین الا ما ظہر سے مستنبط ہے اور اس کو محل زینت سے خارج نہیں کیا گیا اور اس کا کھولنا بوقت ضرورت بقید امن عن الفتنہ جائز ہے۔ ان عورتوں کو جن کو باہر نکلنے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو اس سے مستغنی ہوں ان کے لئے قرار فی البیوت کا حکم ہے۔ پس پردہ مروجہ کس طرح رخصت ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۹ رمضان المبارک

**سونے چاندی کے بنے ہوئے دانت لگانا اور اس حالت میں وضو وغسل کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ دانت خراب ہو جانے کی حالت میں

ان کی درستی مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے اگر دانت بالکل اکھڑ گئے ہوں تو پتھر یا سونے یا چاندی کے مصنوعی دانت یا تو بالکل جما دیتے ہیں کہ وہ ہمیشہ جمے رہتے ہیں۔ بغیر ڈاکٹر کے نکالے نہیں نکلتے یا اس طرح لگا دیئے جاتے ہیں کہ جب چاہو خود ان کو نکال لو۔ اور جب چاہو لگا لو۔ اور اگر اصلی دانت اکھڑا ہوا نہ ہو بلکہ اور کچھ خرابی اس میں آگئی ہو تو اس پر چاندی یا سونے کا خول چڑھا دیتے ہیں کہ وہ ہمیشہ چڑھا ہوا رہتا ہے جب چاہو نکال لیجئے اور لگا لیجئے کی شکل اس میں نہیں اور اگر کیڑا وغیرہ لگ جانے کی وجہ سے سوراخ ہوگیا ہے تو اس میں چاندی یا سونا گلا کر بھر دیتے ہیں پس ارشاد ہو کہ جملہ صور مذکورہ میں کون سی صورت جائز ہے اور کون سی ناجائز یا کل صورتیں شرعاً جائز ہیں خول چڑھانے یا چاندی سونا بھر دینے کی صورت میں بحالت غسل کوئی خرابی آئے گی یا نہیں۔

## الجواب

(۱) پتھر کے دانت بالکل جائز ہیں سونے کے مسلم دانت جائز نہیں امام صاحب کے نزدیک اور امام محمدؒ کے نزدیک سونے چاندی دونوں کے جائز ہیں۔

(۲) چاندی یا سونے کے تاروں سے دانتوں کو مضبوط کر دینا جائز ہے تاکہ وہ حرکت نہ کریں باقی سونے کا خول نہ چڑھایا جائے گو جائز ہے۔ امام محمدؒ کے نزدیک سونے کا بھی چاندی کا بھی۔

(۳) دانت میں سوراخ ہو جائے تو اس میں چاندی یا سونے کو گلا کر بھر دینا جائز ہے جس سے دیکھنے میں مثل میخ اور کیل کے معلوم ہو۔ فقہاء نے مسامیر ذہب کی اجازت دی ہے۔

قال فی العالمگیریة: قال محمد فی الجامع الصغیر ولا یشدّ الاسنان بالذهب ویشدها بالفضة وهذا قول أبی حنیفة وقال محمدؒ یشدّها بالذهب ایضاً. قطعت أنملة یجوز ان یتخذها من ذهب او فضّة. بخلاف لو قطعت یده او اصبعه اهـ۔

(۲۲۵/۹ ج)

وفی الشامیۃ: اذا لجدع الفہ او اذنہ او سقط سنہ فاراد أن یتخذ سنا آخر فعند الامام یتخذ ذلک من الفضۃ فقط وعند محمد من الذہب ایضا ۔ اھ (ج ۵/۲۵۶)

جس وقت دانت اچھی طرح جمے ہوئے ہوں کہ بدون مشقت کے جدا نہ ہوسکیں تو ان کا منہ میں رہنا غسل کے لئے مضر نہیں جو حکم اصلی دانتوں کا ہے وہی حکم ان کا ہے اور اگر بسہولت جدا ہوسکیں تو غسل کے وقت ان کو نکال کر کلی کرنا چاہیے۔ قلت ووجہہ ما فی الھدایۃ، اذا کانت حلیۃ السیف لا یمکن انفصالہا منہ لا یبطل البیع فی السیف بالافتراق قبل قبض ثمنہ، واذا کان لا یتخلص الا بضرر بطل البیع فیہما (ج ۳/۹۰) فعلم بہ ان ما لا یتخلص الا بضرر فھو کالمتصل وما یتخلص بغیر ضرر فھو فی حکم المنفصل واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

**تسبیح میں ریشم کا ڈورا ڈالنا** سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ تسبیح کے ڈورے میں ریشم کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

جائز ہے لأن الحرمۃ فی لبس الحریر وھذا لیس من اللبس فی شیء۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۳ شعبان ۱۳۴۵ھ

**کوٹ پتلون پہننے کا حکم** سوال: نصاریٰ لوگ جو کوٹ پتلون وغیرہ پہنتے ہیں اس کا مسلمانوں کو پہننا اور فٹ بال کا کھیلنا نصاریٰ کی مشابہت ہے یا نہیں۔ یہاں ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ ریل، بندوق وغیرہ جو کچھ ان کی ایجاد کی ہوئی چیزیں ہیں ان کا استعمال کرنا، ریل پر سوار ہونا، بندوق رکھنا وغیرہ یہ بھی جائز نہیں

## الجواب

کوٹ پتلون وغیرہ انگریزوں کا قومی شعار ہے لہٰذا اس کا پہننا مکروہ ہے۔

اور اگر تشبہ کی بھی نیت ہو تو حرام ہے۔ رائفل، بندوق وغیرہ پر اس کا قیاس کرنا غلط ہے کیونکہ وہ نصاریٰ کا قومی شعار نہیں۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر
ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۵ شعبان ۱۳۴۲ھ

لڑکی کا سر منڈانا کس عمر تک جائز ہے | سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ لڑکی کا سر منڈوانا کس عمر تک جائز ہے اور کتنی عمر تک اس کو بال رکھنا فرض ہے۔ ہمارے بعض لوگ دو سال اور بعض لوگ چار سال اور بعض لوگ پانچ سال تک کی لڑکی کا سر منڈواتے رہتے ہیں اور پھر اس کے بعد بال رکھوانا شروع کرتے ہیں تو یہ درست ہے یا نہیں؟ اس میں عذر یا عدم عذر وغیرہ کا کچھ خیال نہیں ہوتا محض دستور کے مطابق یہ بات جاری ہے۔

## الجواب

قال الطحطاوی فی حاشیۃ علی مراقی الفلاح قال فی السراج الصغیر جدا لا تکون لہ عورۃ ولا بأس بالنظر الیہا ومسّہا. (ص ۱۳۰)
وفی الدر لا عورۃ للصغیر جدًا ثم ما دام لم یشتہ فقبل ودبر ثم تغلظ الی عشر سنین ثم کبالغ اھ قال الشامی قولہ الصغیر جدًا قال: وفسرہ شیخنا بابن اربع فما دونہا ولم ار لمن عزاہ اھ وحد الاشتہاء یعتبر بحال کل صبی وصبیۃ فاذا بلغ حد الشہوۃ وقدرہ بعضہم بسبع وبعضہم بتسع وسیاتی فی باب الامامۃ تصحیح عدم اعتبارہ بالسن بل المعتبر ان تصلح للجماع بان تکون عبلۃ ضخیمۃ فلہ حکم البالغین فیجب علی الولی أن یأمرہ بستر العورۃ ھذا ما علمتہ من کلام الشامی (۲۴۲/۱۰)

ان جزئیات سے معلوم ہوا کہ نابالغ لڑکی ستر عورۃ کے بارہ میں نو دس سال میں اور جو عمان کی زیادہ ہو اور اس کی طرف خواہش ہونے لگی ہو تو اس سے پہلے ہی مثل بالغ کے شمار ہوتی ہے اور عورت بالغ کو بلا عذر قوی کے سر منڈانا

جائز نہیں تو جو لڑکی بالغ ہے اس کا بھی یہی حکم ہوگا اور مناسب یہ ہے کہ جب لڑکی نو برس کی ہو جائے مگر قابل شہوت نہ ہوئی ہو اس کا سر نہ مونڈا جائے کیونکہ یہ اول مدت اس کے بلوغ کی ہے۔ باقی عذر کی وجہ سے تو بالغ عورت کا سر مونڈنا بھی جائز ہے۔ نابالغ کا بدرجہ اولیٰ اور عذر کی مثال یہ ہے کہ سر میں ایسا درد ہو جو بدون سر مونڈے اچھا نہ ہو یا سر سام وغیرہ پڑ جائے وغیرہ وغیرہ۔

قال فی العالمگیریۃ: فلو حلقت المرأۃ رأسها فان فعلت لوجع اصابها لا بأس به وان فعلت ذالك تشبهًا بالرجال فهو مكروه اھ (ج ۵/ ۲۳۸) واللہ اعلم احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۰ ربیع الآخر ۱۳۵۰ھ

**استرے سے مونچھوں کو صاف کرنے کا حکم**

سوال: مونچھوں کے بالوں کو استرے سے صاف کرنا کیسا ہے؟

## الجواب

مونچھوں کے بارے میں صرف اتنا ضروری ہے کہ جس قدر لبوں سے زیادہ ہوں وہ کتر دی جائیں خواہ صرف قینچی سے یا اوّل استرا لبوں کے اوپر لگا کر پھر قینچی سے کتری جائیں۔ دونوں طرح جائز ہے۔

**مردوں کے لئے ضفائر کا حکم**

سوال: وفی جامع الترمذی ابواب اللباس المجلد الاوّل عن ام ھانی قالت قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی مکۃ وله اربع غدائر (او ضفائر) اس کی توجیہ کیا ہے۔ اس کا حکم منسوخ ہے یا اب بھی رجال کو ضفائر گوندھنا جائز ہے۔

## الجواب

مردوں کے لئے ضفائر اب بھی جائز ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اسی ہیئت پر نہ ہوں جس سے تشبہ بالنساء لازم آئے یعنی عورتیں ضفائر کو پیچھے پشت پر رکھتی ہیں مرد اس طرح نہ کریں بلکہ آگے یا شانہ پر رکھیں۔

قال الملا علی القاری فی شرح الشمائل له قال ابن حجر د

فيه رأى في حديث ام هانى احل ضفر الشعر حتى للرجال وليس تختص بالنساء الا باعتبار ما اعتيد في اكثر البلاد في هذه الازمنة المتأخرة ولا اعتبار بذلك. اقول عادة السادة في بعض البلدان ايضا هى الضفر لكن على غديرتين واقعتين بين أيديهم لتفرقة بينهم وبين النساء اذ عادتهن وضع العقاص خلفهن وهذا الفرق يكفي في عدم التشبه بهن والله اعلم. (ج ۶/ )

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲ جمادی الاخری ۱۳۴۵ھ

سوال: عرض ہے کہ ایک پابند صوم و صلوۃ عورت گرگابی جوتہ کو استعمال میں لاسکتی ہے اگر اس کا ایک مسلمان عورت کے لئے استعمال کرنا جائز ہو تو واضح طور پر ارشاد فرمائیں تاکہ آئندہ انسداد کے لئے مستند دلیل قائم کرسکوں۔ عورتوں کے لیے گرگابی پہننا جائز ہے یا نہیں

الجواب

في الحديث لعن الله المترجلات من النساء والمتشبهين بالنساء من الرجال اوكما قال وقال صلى الله عليه وسلم من تشبه بقوم فهو منهم۔ چونکہ اس قسم کا جوتہ عموما وہ عورتیں پہنتی ہیں جو کافر ہیں یا کافر عورتوں سے تشبہ کرنے والی ہیں اس لئے اس کا پہننا مسلمان عورت کو زیبا نہیں البتہ اگر کسی جگہ اس کا رواج عام ہو تو سوال دوبارہ کیا جائے۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون ۲۴ جمادی الثانیہ ۱۳۴۵ھ

سوال: ٹوپی میں زر کا کام کیا گیا۔ زر اگر دور میں انگشت سے کم ہے اور اوپر پورا زر ہے تو اس صورت میں اس ٹوپی کا پہننا روا ہے یا نہیں حکم کلاہ زرین

الجواب

في الشامي (ج ۵/ ۳۴۴) وظاهر المذهب عدم جمع المتفرق اى الا اذا كان خط منه قز وخط منه غيره بحيث يرى كلا قز افلا

يجوز كما سنذكره عن الحاوي ومقتضاه حل الثوب المنقوش بالحرير تطريزاً ونسجاً اذا لم تبلغ كل واحد من نقوشه اربع اصابع وان زادت بالجمع ما لم يرى كله حريراً. تامل (١) هل حكم المتفرق من الذهب والفضة كذلك يحرر.

وفيه ايضاً (٢) وبه يعلم حكم العرقية المسماة بالطاقية فاذا كانت منقشة بالحرير وكان احد نقوشها اكثر من اربع اصابع لا تحل وان كان اقل تحل وان زاد مجموع نقوشها على اربع اصابع بناءً على ما مر من ان ظاهر المذهب عدم جمع المتفرق.

وفيه ايضاً (٣) تحت قول الدر لا يكره علم الثوب من الفضة ويكره من الذهب قال هذا مشكل رخص الشرع في الكفاف الا اقول: الظاهر أن وجه الاشكال ان كلا من العلم والكفاف في الثوب انما حل لكونه قليلاً وتابعاً غير مقصود كما صرحوا به وقد استوى كل من الذهب والفضة والحرير في الحرمة فترخيص العلم والكفاف من الحرير ترخيص لهما من غيره ايضاً بدلالة المساواة ويؤيده عدم الفرق ما مر من اباحة الثوب المنسوج من ذهب اربعة اصابع

ان روایات سے معلوم ہوا کہ اگر اوپر کا کام چار انگشت ہے تو اس ٹوپی کا استعمال جائز نہیں اور اگر اوپر کا کام بھی چار انگشت سے کم ہے تو جائز ہے۔

فقط واللہ اعلم۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

**سونے چاندی کے بٹن کا حکم**

سوال: آپ کی کتاب صفائی معاملات سے سونے چاندی کے بٹن یعنی پوتام لگانے کا مرد کے لیے جواز

(١) ج ٥/ ٣٥٢، ایچ ایم سعید، مرتب (٢) ص: ٣٥٣، ایچ ایم سعید، مرتب (٣) ج ٥/ ٣٥٥ مرتب۔

معلوم ہوتا ہے لیکن دلائل جواز کی صراحت نہیں ہے اس واسطے اس کا جواب دلیل سے مطلوب ہے۔

## الجواب

و فی الدر المختار مع الشامی (ج ۵/ ۲۴۴): ولا بأس بأزرار الدیباج والذہب الخ.

اس میں تصریح ہے جواز گھنڈی کی اور اس کی وجہ سونے کے تابع ثوب ہونے کے مورد کیا جا سکتی ہے اور بٹن بھی تابع ثوب ہوتا ہے، پس گھنڈی کی طرح بٹن بھی جائز ہے لیکن اس کے بعد بعض روایات سے خود مؤلف صاحب کو اس میں تردد ہو گیا اور یہ احتمال غالب ہو گیا کہ ازرار سے کلابتون کی گھنڈیاں مراد ہیں کہ وہ تابع ثوب ہیں بخلاف بٹن کے کہ وہ منفصل اور مستقل ہیں۔ اشرف علی

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

۳۰ ربیع الاول ۵۳ھ

**سونے کی انگشتری مردوں کے لئے حرام ہے:** سوال: ہمارے اس دیار میں سونے کی انگشتری کے استعمال کا زیادہ رواج ہے حتی کہ مرد بھی زور شور سے پہنتے ہیں۔ عرصہ سے ہم نے سنا ہے کہ سونے کی انگشتری کا پہننا مرد کے لئے حرام ہے۔ اب عرض خدمت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلقہ انگشتری کو سونے سے جڑوا دے اور نگینہ پتھر کا لگوائے تو درست ہے یا نہیں مع حوالہ کتب ارقام کریں۔

## الجواب

سونے کی انگشتری میں پتھر کا نگینہ لگانے سے اس کا پہننا جائز نہیں ہو جاتا بلکہ حرام ہے۔

کما فی العالمگیریة (۱): والتختم بالذہب حرام فی الصحیح کذا فی الوجیز للکردری وقال بعد سطر والحلقة فی الخاتم هی المعتبر لان قوام الخاتم بها ولا معتبر بالفص حتی انه

(۱) ج ۵/ ۳۵۵ - مرتب

یجوز ان یکون حجرا و غیرہ کذا فی السراج والوہاج۔

فقط کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۲ھ

ظفر احمد عفی عنہ

**بغرض شادی داڑھی منڈوانے کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کی عمر اس وقت تخمیناً ۲۸، ۲۹ سال ہے اور اب تک بباعث عسرت وتنگی اس کی شادی نہیں ہوئی اور وہ ایک باشرع آدمی ہے۔ فی الحال چند بھی خواہان برادری نے اس کی نسبت ایک جگہ ٹھہرائی ہے لیکن جو شخص اس کا بانی ہے وہ یہ کہتا ہے کہ زید کی داڑھی چونکہ موافق شرع شریف ہے لہٰذا لڑکی کے وارث اس کی موجودہ صورت کو دیکھ کر اپنی لڑکی نہیں بیاہ سکتے۔ اگر زید شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ بالکل صفایا کرادے اور بعد انجام شادی کے پھر وہ رکھ سکتا ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے۔ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خالفوا المجوس اعفوا اللحی واحفوا الشوارب، اخرجہ احمد ومسلم کما فی النیل (ج ۱/۱۱)

ڈاڑھی کا مونڈنا حرام ہے اور کترکر ایک قبضہ سے کم کرنا بھی حرام ہے۔ اس لئے زید کو اس فعل کی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر ڈاڑھی ایک قبضہ سے زیادہ ہو تو اس کو ایک قبضہ کرے اور زیادہ کو کم کردے اور قبضہ کے معنی کسی عالم سے زبانی معلوم کرے اگر اس طرح شادی ہوجائے تو کرلے ورنہ روزے بکثرت رکھا کرے اس سے ہیجان شہوت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ، ۲۴ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۲ھ

**سیاہ خضاب لگانا جائز نہیں ہے**

سوال: قابل گزارش یہ ہے کہ ایک عالم صاحب نے ایک حدیث لکھ کر روانہ فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت میں سے وہ لوگ ہوں گے جو سیاہ خضاب لگائیں گے اور ان کو جنت کی خوشبو

نصیب نہ ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ خضاب لگانا بالکل مطابق گناہ شرک ہے۔ کیونکہ جنت مشرک کے لئے حرام ہے۔ اب رہا یہ کہ کتاب درمختار ص ۲۳۳ باب الخضاب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ سیاہ خضاب زینت کے لئے لگانا جائز ہے۔ علاوہ اس کے بعض لوگوں نے اس مکروہ لکھا ہے اور بعض نے بلا مطلق مکروہ نہیں۔ اکثر علماء سے سیاہ خضاب لگانے والے کی نسبت دریافت کیا وہ فرماتے ہیں کہ ایسی حدیث کوئی نظر سے نہیں گزری اور اگر ہے بھی تو وہ ضعیف حدیث ہے اس لئے حضرت والا کے پاس یہ عریضہ روانہ کرکے جواب کا امیدوار ہوں سوال صرف سیاہ خضاب کے بارے میں ہے۔

## الجواب

اخرج النسائی فی سننہ (ص ۲۷۷ ج ۲)

اخبرنا عبد الرحمن بن عبد اللہ الحلبی عن عبید اللہ وھو ابن عمرو عن عبد الکریم عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رفعہ انہ قال قوم یخضبون بھذا السواد آخر الزمان کحواصل الحمام لا یریحون رائحۃ الجنۃ اھ وقد اخرج بعدہ حدیث ابی قحافہ انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فیہ غیروا ھذا بشئ وجنبوہ السواد رواہ الجماعۃ الا البخاری والترمذی (نیل ج ۱) وھو حدیث صحیح۔

پس یہ حدیث تو صحیح ہے کہ سیاہ خضاب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ بعض لوگ آخر زمانہ میں سیاہ خضاب لگائیں گے ان کو جنت کی خوشبو نہ پہنچے گی اور فتویٰ اسی پر ہے کہ سیاہ خضاب جائز نہیں۔ مگر یہ کہ جہاد میں دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے لگانا جائز ہے۔

قال فی العالمگیریہ اما الخضاب بالسواد فمن فعل ذالک من الغزاۃ لیکون اھیب فی عین العدو فھو محمود منہ اتفق علیہ المشائخ ومن فعل ذالک لیزین نفسہ للنساء ولیحبب نفسہ الیھن مکروہ (ای کراھۃ التحریم للاطلاق) وعلیہ

عامۃ المشائخ (ج ۱/۲۲۴) اور امام ابو یوسفؒ سے اس میں جو رخصت مروی ہے، جیسا کہ عالمگیری و شامی میں مذکور ہے۔ وہ روایت ضعیف ہے یا مؤول ہے اس خاص صورت کے ساتھ جبکہ کسی کے بال بوجہ مرض قبل از وقت سپید ہو جائیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

### بنگالی عورتوں کے متعارف لباس کا حکم

سوال: چہ می فرمایند دریں مسئلہ کہ زنان ایں دیار مثل زنان ہنود ثیاب دو گزی پوشند ایں ہمہ بدعت منکر و تشابہ بالکفر شود یا نہ و زنان گویند کہ لباس مسنون یعنی لنگی یا قمیص وردا ما یان نمی توانیم پوشید از جہت کہ غیر استعمال تکلیف می شود پس زنان را برائے اختیار کردن لباس مسنون در شریعت زجر و جبر کردن جائز است یا نہ۔

## الجواب

اگر لباس متعارف زنان تشبہ بالکفار دارد یا دراں ستر کافی نباشد جبر بر ترک آں لازم است ہے۔ واگر از ہر دو مصئون است جبر جائز نیست فانہ لا اکراہ فی المباحات۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

غرہ جمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ

### سور کے بالوں کا برش استعمال کرنا جائز نہیں

سوال: ایک امر دریافت طلب ہے کہ قرآن شریف میں آیہ کریمہ "حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر الآیۃ" ہے جس کی تشریح آپ پر واضح ہے۔ میرے دانتوں میں کیڑا لگ گیا ہے جس کے علاج کے لئے ڈاکٹر ٹوتھ برش کا استعمال تجویز کرتے ہیں مگر تمام برش سور کے بال سے جو کیمیاوی اجزا سے صاف کئے جاتے ہیں بنے ہوئے ہیں۔ یہ وضاحت فرمائیں کہ اس قسم کے برش کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟۔

## الجواب

جب دانتوں کے برش کے متعلق یہ محقق ہے کہ وہ سور کے بالوں سے بنتا ہے

تو اس کا استعمال جائز نہیں۔ امرتسر میں ڈاکٹر عزیز احمد صاحب دندان ساز خاص طور پر جائز برش تیار کرتے ہیں ان سے منگوا لئے جائیں۔ فقط

ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون ۲ شعبان ۱۳۵۱ھ

**تذکرۃ الواعظین کے ایک مضمون کی تغلیط**

سوال: ایک کتاب مسمی تذکرۃ الواعظین میں تحریر ہے کہ بروز سہ شنبہ اور سہ شنبہ اور ناخن کتروانے سے بیماری آتی ہے اور ان ایام میں کپڑا قطع کرنے سے اس کے استعمال بھی مبتلاء رنج و مصیبت رہے گا۔ یہ صحیح ہے یا نہیں؟

## الجواب

یہ مضمون غلط ہے اس پر ہرگز اعتقاد نہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفی عنہ ۱۰ شعبان ۱۳۵۱ھ

**مصنوعی دانت لگانا جائز ہے**

سوال: مصنوعی دانت لگانے ضرورت خورد و نوش و حسن تلفظ اور تزئین کے لئے جائز ہے یا نہیں۔ اور اگر جائز ہیں نخود کے دانہ کے برابر چیز منہ میں ہوتے ہوئے نماز نہ ہونے کا مسئلہ عام مشہور ہے۔ سو عرض یہ ہے کہ مصنوعی دانت لگانے کے بعد نماز پڑھنے سے نماز درست رہے گی یا فاسد؟

## الجواب

مصنوعی دانت لگانا جائز ہے اور ان کو لگا کر نماز پڑھنا بھی جائز ہے اور نخود کے برابر کوئی چیز کھانے کی نگل جائے تو نماز نہیں ہوتی اور دانت کھانے کی چیز نہیں اور نہ اس کو نگلنے کے واسطے لگاتے ہیں اور کوئی چیز منہ میں رکھ کر نماز پڑھنا جب مکروہ ہے جبکہ اس کے منہ میں ہونے سے قرات میں دشواری ہو اور مصنوعی دانت لگانے سے تو قرات میں دشواری نہیں بلکہ سہولت ہوتی ہے۔

فقط واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر

ظفر احمد عفی عنہ

۱۱ رمضان ۱۳۵۱ھ

### مصنوعی دانت بنوانا اور اس پر سونے کا خول چڑھانا

سوال: میرے دانت ہلنے لگے ہیں۔ ان کو اکھڑوا کر مصنوعی دانت لگوانے کا ارادہ ہے بعض ڈاکٹر مصنوعی دانتوں پر سونے کا خول چڑھا کر لگاتے ہیں اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آدمی کے منہ میں بغیر کسی بندش (دمکا) ان کے دانت چڑھ جاتے ہیں اور تا دیر تک لگے رہتے ہیں۔ جس اصلی دانتوں کے اوپر کسی انگریزی دوا کے ذریعے لگا دئے جاتے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسے دانتوں کا لگوانا جائز ہے اگر سونے کا خول چڑھانے میں شرعاً کچھ خرابی نہ ہو تو میں ایسے دانت بنواؤں ورنہ نہیں۔ آپ کی اجازت کا انتظار ہے۔

## الجواب

في الشامية عن التاتارخانية وعلى هذا الاختلاف اذا جدع انفه او اذنه او سقط سنه فاراد ان يتخذ سناً آخر فعند الامام يتخذ ذلك من الفضة فقط وعند محمدٌ من الذهب ايضاً اه والامام ابي يوسفؒ فقيل معه وقيل مع الامام (ج ۵، ۲۵۶)

سونے کا خول چڑھانا مختلف فیہ ہے۔ امام صاحب نے اس کو منع کیا ہے اور صاحبین سے گنجائش منقول ہے پس تقویٰ احتیاط میں ہے اور فتویٰ جواز پر ہے اور بہتر یہ ہے کہ پتھر کے دانت بنوا لئے جائیں یا ہلتے ہوئے دانتوں کو سونے کے تاروں سے مضبوط کر لیا جائے خول نہ چڑھایا جائے۔

نیز اگر سونے کا خول چڑھانے کے بعد دانت سہولت سے الگ ہو سکیں تو غسل کے وقت ان کو الگ کرکے کلی کرنا واجب ہوگا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفیر احمد عفا اللہ عنہ

۲ر شوال [illegible]ھ

### عورتوں کے لئے ان اشیاء کا استعمال: گرگابی پہننا واسکٹ پہننا ساڑی کا پہننا وغیرہ

سوال: عورتوں کے لئے اشیاء ذیل کا استعمال کرنا کیسا ہے۔ جن میں سے بعض کے استعمال میں تشبہ غیر قوم کا شبہ ہے اور بعض میں نئی روشنی کے اتباع کا ابہام ہوتا ہے (۱) میکسی پہننا (۲) گرگابی پہننا (۳) ویجی ماتھے

کرنا (۴) ٹیڑھی مانگ کرنا (۵) کنگھا لگانا (۶) قمیص پہننا (۷) واسکٹ پہننا (۸) افشاں چننا (۹) دوپٹہ چننا (۱۰) سر پر رومال باندھنا (۱۱) سلوکہ پہننا (۱۲) شلوار پہننا۔ (۱۳) ڈھیلا پائجامہ پہننا (۱۴) گتّی بنانا (۱۵) بیوہ کے لئے رنگا ہوا کپڑا پہننا ایام عدّت میں تیل استعمال کرنا (۱۶) سر پر جوڑا باندھنا۔ (۱۷) چشمہ لگانا۔

## الجواب

ایک سے پانچ تک جائز نہیں۔ للتشبہ بالکفار فی البعض وبالرجال فی البعض اور ۶، ۷ جائز ہے مع الکراھۃ التنزیھیۃ۔ یعنی اس کا ترک اولیٰ ہے اور وجہ فرق یہ ہے کہ ان استعمال مردوں کے ساتھ یا غیر اقوام کے ساتھ خاص نہیں نہ ان کا شعار قوی ہے اور ۸ سے ۱۰ تک جائز ہے کہ محض زینت ہے البتہ افشاں چننے کی حالت میں نماز کا وقت آجائے تو اس کو اتار کر وضو کرنا واجب ہے اور ۱۱، ۱۲، ۱۳ اس مقام پر جائز ہے، جہاں یہ لباس مردوں کے ساتھ خاص نہ ہو جیسا کہ پنجاب میں اور جہاں مردوں کے ساتھ خاص ہو وہاں تشبہ بالرجال کی وجہ سے ممنوع ہوگا اور ۱۴ سمجھ میں نہیں آیا۔ ۱۵ کے متعلق یہ ہے کہ بیوہ کو عدت کے بعد لباس زینت حرام نہیں۔ ہاں عدت کے اندر ممنوع ہے اسی طرح عدت کے اندر سر میں تیل ڈالنا حرام ہے اگر درد سر کی وجہ سے ڈالا جائے تو جو تیل خوشبودار نہ ہو جائز ہے۔ ۱۶ جائز ہے اور ۱۷ ضرورت سے جائز ہے۔ بلا ضرورت کے ممنوع ہے کہ تشبہ بالرجال ہے چشمہ لگانا اس وقت تک مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۸ شوال [illegible]ھ۔

---

### بواسیر کے علاج کے لئے چاندی کے چھلے یا انگشتری پہننا

سوال: مرض بواسیر و دیگر امراض کا علاج جو چاندی وغیرہ کے چھلوں یا انگوٹھیوں سے کیا اور کرایا جاتا ہے درست ہے یا نہیں؟ مخفی مبادکہ چاندی ۱۰ ماشہ ہوتی ہے بلکہ اس سے زائد بھی چھلے پاؤں کے دونوں انگوٹھوں میں پہنے جاتے ہیں۔ انگوٹھی چاندی کی بھی ہوتی ہے اور دیگر دھاتوں کی بھی میرے ایک رشتے دار کے پیسر

کے دونوں انگوٹھوں میں چھلے ہیں ان کا بیان ہے چھلے پہننے سے قبل ادویہ کا علاج کرایا گیا جس سے مرض میں کمی ہو جاتی۔ پھر چند دن بعد عود کرتا اور جب سے یہ چھلے پہنے گئے ہیں مرض نہیں رہا اور نہ عود کیا۔

## الجواب

بواسیر کا علاج انگوٹھی اور چھلوں سے اس شرط سے جائز ہے کہ انگوٹھی اور چھلے اس قدر سخت نہ ہوں کہ وضو اور غسل کے وقت پانی نہ پہنچ سکے بلکہ قدرے ڈھیلے ہوں کہ ہلانے سے ہل سکیں اور پانی کو اندر پہنچنے سے مانع نہ ہوں اگر پانی کو اندر پہنچنے سے مانع ہوں تو جائز نہیں اسی طرح اگر چھلوں کے سوا کوئی دوسرا علاج اس کے مثل نافع ہو تب بھی یہ علاج جائز نہیں کیونکہ اس میں تشبہ بالنساء ہے جو بدون سخت حاجت کے جائز نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۹ ربیع الثانی ۵۰ھ

**عورتوں کے لئے سونے یا چاندی کی گھڑی کا استعمال**

سوال: عورتوں کو سونے کی گھڑی خواہ جیبی ہو یا دستی استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ سونے چاندی کے تعویذات پہننا جائز ہے کہ نہیں؟

## الجواب

جائز نہیں۔ اصلہ ما ذکرہ الفقہاء فی خاتم الذہب اذا کان فیہ المراٰۃ لایجوز للمراٰۃ ان تری وجہہا فیہ لکون الذہب محل لبہت للزینۃ لا لغرہا من الاستعمالات فکذا الساعۃ من الذہب یجوز لبسہا للنساء علی انہ للزینۃ ولکن لایجوز اوینتہا لمعرفۃ الوقت واما فی الجیب فلا یجوز اصلاً لعدم الزینۃ فیہ۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ر جمادی الثانیہ ۵۰ھ

**جس عبا پر زری کا کام کیا گیا ہو اس کے پہننے کا حکم**

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب ناظم تعلیمات دیوبند نے اپنا ایک عبا دکھلایا جس کی گردن اور پشت پر چار انگل سے بہت زیادہ زری کا سچا کام تھا مولانا نے اس کے اوپر سورت کے

دھاگے سے پھول بوٹے نکلوا کر زری کا کام مستور کر دیا تھا مگر اطمینان نہ ہوا اور تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت کو دکھلایا کہ اس ترکیب کے بعد اس کا لبس جائز ہو گیا یا نہیں؟ اس کا جو جواب دیا گیا وہ حسب ذیل ہے۔

## الجواب

آپ کے عبا کی بابت میں نے بہت غور کیا جو احقر سمجھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جواز کی گنجائش تو اس صورت میں بھی ہے کہ زری کے کام پر کوئی سوتی کپڑا اس دیا جائے یا سوت کے دھاگے سے پھول بوٹے اس قدر نکالے جائیں کہ زری کا کام مستور ہو جائے اور کسی جگہ چار انگشت سے زیادہ مکشوف نہ رہے اس صورت میں زری کا کام بمنزلہ حشو کے ہو جائے گا مقصود نہ رہے گا کیونکہ مقصود ظہارۃ و بطانۃ ہے اور جو شئی ظہارۃ و بطانۃ کے درمیان ہے وہ مقصود نہیں ہے محض تابع و حشو ہے، ھذا ھو ما ذکرہ الشامی ثم أمر بالتأمل فیہ مگر احوط وہی ہے جو زبانی عرض کی گئی تھی کہ زری کے کام کو کاٹ کر درمیان میں سوتی کپڑے سے فصل کر دیا جائے۔

قال فی الھندیۃ: عن فتاوی آھو سئل قاضی برھان الدین اگر عنق را چکن کردند باکشیدہ از ابریشم فلبسہ قال ینبغی ان لا یکرہ لأنہ صار مستھلکًا فیکون تبعًا و اشار شمس الائمۃ السرخسی انہ یکون تبعا اھ و ھذا ھو مؤید للجواب المذکور اولاً و فیہ ایضًا عن شرح القدوری عن ابی یوسف قال اکرہ ثوب القز یکون بین الفرو و بین الظھارۃ کذا فی المحیط (ج ۴/۲۲۴) واللہ تعالیٰ اعلم - و ھذا مؤید لما جعلتہ أحوط فقط۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۷ رجب ۱۳۴۸ھ

---

ع: الظاھر الخز فصحفہ الکاتب بالفرو فان الخز الذی کان فی الزمن القدیم من دابۃ البحر کان جائزًا فان الحاصل أنہ کرہ جعل الخز ای الحریر بین الخز و الظھارۃ و ھذا ھو ما افادہ الشامی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۲ منہ۔

## عورتوں کے لئے بال کٹوانے کا حکم

سوال : اخبار مدینہ میں کسی کا فتوی شائع ہوا ہے جس میں مذکور ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی اپنے سر کے بال کانوں تک کٹواتی تھیں ایک روایت ہے کہ وفرہ کرتی تھیں جس میں کانوں تک معلوم ہوتا ہے کیا یہ روایت موضوع ہے یا اس کے معنی مطلب کچھ اور ہیں ۔ امید ہے کہ اس کی تشریح سے بھی مطلع فرمائیں گے ۔

### الجواب

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ عورتیں بوقت ضرورت اپنے بالوں کو کتر کر کس قدر کم کر سکتی ہیں چنانچہ حج میں عورتوں کے لئے قصر بقدر انملہ جائز بلکہ تحلل کے لئے ضروری ہے ۔ اور حضرات ازواج مطہرات کا فعل ضرورت ہی پر محمول ہے کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زینت ترک کر دی تھی (کیونکہ وہ عمر بھر کے لئے عدت ہی میں تھیں ۔ ان کو حضورؐ کے بعد عمر بھر کسی سے بھی نکاح جائز نہ تھا تو وہ معتدہ کی طرح عمر بھر زینت ترک کئے رہتی تھیں ۱۲) اور ترک زینت کے ساتھ بالوں کی خدمت دشوار ہوتی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے اس لئے وہ اپنے بالوں کو کچھ کم کر دیتی تھیں مگر پھر بھی ان کے بال مردوں کے برابر نہ ہوتے تھے بلکہ مردوں کے بالوں سے بڑے ہوتے تھے جس کی دلیل خود حدیث کا لفظ ہے کہ ان کے بال مثل وفرہ کے تھے ۔ اور وفرہ وہ بال ہیں جو مونڈھوں سے نیچے ہوں تو جو بال کم کرنے کے بعد مثل وفرہ کے ہوں وہ اس سے بھی زائد ہوں گے ۔ پس ازواج مطہرات کے بال کمی کے بعد بھی مردوں کے بالوں سے ممتاز اور زیادہ تھے اور ان کے کم کرنے کا منشا بھی ضرورت اور ترک زینت تھی ۔ پس اس سے اس فعل کے جواز پر استدلال کرنا جو بلا ضرورت ہے (کیونکہ ازواج مطہرات کے سوا کسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن سے زیادہ نہیں) اور جس کا منشا تشبہ بنساء الکفار ہے اور جس میں تشبہ بالرجال بھی ہے اور ان دونوں پر سخت وعید وارد ہے کیونکر صحیح ہو سکتا ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ، ۸ شوال سنہ ۴۷ھ

### الدلیل علی الجواب

قال سفیان بن عیینہ کان نساء رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم في معنى المعتدات وللمعتدة ما سكنى فجعل لهن البيوت ما عشن ولا يمكن رقابها اھ ذكر السيوطي في الخصائص له في تفسير قوله تعالى وقرن في بيوتكن وقوله صلى الله عليه وسلم في حجة الوداع لنسائه هذه الحجة ثم ظهور الحصر (ج۲/۲۵۱)
وقال النووي الوفرة الشعر واكثر من اللمه واللمة ما يلم بالمنكبين من الشعر قاله الاصمعي وقال القاضي عياض رحمه الله ولعل ازواج النبي صلى الله عليه وسلم فعلن هذا بعد وفاته صلى الله عليه وسلم لتركهن التزين واستغنائهن من تطويل الشعر وتخفيفا لمؤنة رؤسهن الى ان قال وهو متعين ولا يظن بهن فعله في حياته صلى الله عليه وسلم (ج ۱/۱۴۸)
في شرح حديث ابي سلمة بن عبدالرحمٰن قال دخلت على عائشة انا واخوها من الرضاعة فسألته عن غسل النبي صلى الله عليه وسلم الى قوله وقال ازواج النبي صلى الله عليه وسلم يأخذن من شعورهن حتى تكون كالوفرة. اھ۔

پس اس حدیث سے اگر استدلال ہو سکتا ہے تو صرف اس پر استدلال ہو سکتا ہے کہ بیوہ عورت کو جائز ہے کہ اپنے سر کے بال زیادہ لمبے نہ کرے بلکہ وفرہ کے قریب کر دے اور وفرہ کے جو معنی ہم نے بیان کئے ہیں نووی نے اسی کو ترجیح دی ہے اور گو اس کے معنی میں اور بھی اقوال ہیں مگر جب احتمال پیدا ہو گیا تو اس کے خلاف پر استدلال نہیں ہو سکتا اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، اور نوویؒ کے قول، ولا یظن بھن فعلھن في حياته صلى الله عليه وسلم سے معلوم ہوا کہ شوہر کی زندگی میں عورت کو اپنے سر کے بال کم کرنا جائز نہیں ورنہ اس ظن کی نفی متعین نہ ہوگی۔ رہا یہ کہ ازواج مطہرات نے عدت کی وجہ سے ایسا کیا اور ان پر ترک زینت عمر بھر واجب تھی یا نہ تھی؟ دونوں احتمال ہیں مگر یہ متعین ہے کہ ان کا یہ فعل تو بوجہ ترک زینت

عہ قلت يرجح عدم وجوب ترك الزينة عليهن (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہی کے تھا اور ابن عیینہ کا ازواج کو بمنزلۃ المعتدۃ فرمانا احتمال اوّل کو مرجح ہے اور ترک زینت اسی عورت کو جائز ہے جس کے شوہر نہ ہو۔ شوہر والی کو جائز نہیں پس اس سے مطلقاً قصر شعور کے جواز پر استدلال بہرحال باطل ہے۔ غایت ما فی الباب بیوگان کے لئے قصر شعور کی اجازت پر استدلال ہو سکتا ہے مگر یہ استدلال بھی مجتہد ہی کر سکتا ہے۔ غیر مجتہد نہیں کر سکتا کیونکہ غیر مجتہد کو قرآن و حدیث سے استنباط کا حق نہیں۔ وہو ظاہر۔ اور مجتہدین سے کہیں ثابت نہیں کہ انہوں نے شوہر والی عورت یا بیوہ کے لئے بلا ضرورت مرض ودجع و دیع قصر شعر کی اجازت دی ہو بلکہ فقہاء نے عورتوں کو حلق وتقصیر راس سے مطلقاً منع فرمایا ہے (ملاحظہ ہو اشباہ و احکام الانثیٰ) اور نوویؒ کا اس حدیث کے تحت میں وفیہ جواز تخفیف الشعر للنساء فرمانا حجت نہیں کیونکہ وہ خود مقلد ہیں اور کسی مجتہد کی طرف اس قول کو منسوب نہیں کیا دوسرے ازواج مطہرات کے اوپر دوسری بیوہ عورتوں کو قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ ازواج مطہرات کو دوسرے شخص سے نکاح حرام تھا اور دوسری بیوہ عورتوں کو حرام نہیں۔ تیسرے تخفیف کے مراتب مختلف ہیں۔ مطلق تخفیف کے جواز سے تخفیف مشکل فیہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ما فی الصحیحین عن زینب بنت ام سلمۃ دخلت علی ام حبیبۃ حین توفی ابوہا ابو سفیان فدعت بطیب فیہ صفرۃ خلوق أو غیرہ فدھنت منہ جاریۃ ثم مست بعارضیہا ثم قالت واللہ ما لی بالطیب من حاجۃ الحدیث (زیلعی ص ۲۲۵ ج ۲) قلت لیس فیہ الا مس الطیب فی الجملۃ لاستعمالہا ومثل ھذا القدر الیسیر لا یمنع المعتدۃ عنہ التطیب واستعمال الطیب ولیس ذالک منہ فی شیء ولئن سلمنا فانما فعلت ذالک لضرورۃ شرعیۃ وھو انہا الاحداد علی الاب شیء یدل علی ترک الاحداد وقولہا وقولہا واللہ ما لی بالطیب من حاجۃ یحتمل أن یکون اشارۃ إلی کونہا معتدۃ بعدۃ وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔ فقط۔ ظفر۔

یہ جواب تو اس صورت میں ہے جبکہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرات ازواج مطہرات اپنے بال کتر کر کم کرتی تھیں مگر ہم کو اس حدیث سے اس مفہوم کو ثابت ہونا ہی مسلم نہیں کیونکہ اس کے راوی ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن تمام ازواج مطہرات کے محرم نہیں تو انہوں نے تمام ازواج مطہرات کا یہ فعل خود تو دیکھا نہیں۔ کسی سے سنا ہوگا اور وہ واسطہ مجہول ہے۔ لہٰذا حدیث حجت نہیں۔ رہا یہ کہ حضرت عائشہ کا فعل تو وہ دیکھ سکتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں اس کی بھی تصریح نہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ کا قصر شعر خود دیکھا اور چونکہ روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سر کے بال بیماری کے سبب کم ہو گئے تھے اس لئے یہ احتمال غالب ہے کہ ابو سلمہ نے ان کے بال عام عورتوں سے کم دیکھ کر اپنے گمان سے یہ سمجھ لیا ہو کہ حضرت عائشہ بال کترتی ہیں اور بیماری سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بال کم ہو جانا شیخین کی روایت میں مصرح ہے۔ قالت۔

(کذا فی جمع الفوائد ص ۲۱۲ ج ۱)

اور ظاہر یہ ہے کہ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد سب نہیں بلکہ حضرت عائشہؓ ہی مراد ہیں۔ تعظیماً واحد کو صیغہ جمع سے تعبیر کر دیا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۱ شوال ۱۳۴۷ھ

**عورتوں کے لئے چیتل دھات وغیرہ کی انگشتری اور بالوں میں مخصوص قسم کے دھاگے کا جوڑا لگانے کا حکم**

سوال: دو مسئلے دریافت طلب ہیں۔

(۱) عورتوں کو موباف یعنی قند کا سرخ پارچہ جس میں سر کے بال چوٹی کے نیچے لپیٹ کر دوہرا بل کر کے نیچے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نیز چوٹی جو سوتی ہیں دھاگوں سبز سرخ سیاہ رنگین ہی ہوتی بازاروں میں بکتی ہیں اور نیچے چوٹی میں شامل کر کے چوٹی کی طرح تہہ سے بل سے گتھ کر نیچے چھوڑ دی جاتی ہے جائز الاستعمال ہے یا ناجائز کہ ستر صلوٰۃ میں داخل ہے۔ یہ بال نہیں ہوتے اور نہ سر پہ بندش نیچے کے بالوں میں جوڑ لگایا جاتا ہے۔ مگر بال اور دھاگا جدا جدا نظر آتا رہتا ہے۔

۲۔ انگشتری چیتل یا دھاگہ جدید جو میل قبول نہیں کرتا۔ پہننا مستورات کو جائز ہے یا

ناجائز. ولوخاتماً من الحديد کا کیا مطلب جبکہ مرد کو سونے نقرہ کے اور عورت کو سونے، ذہب وفضہ اور شبہ کی انگوٹھی حرام ہے نیز حرمت ہے یاکراہت.

الجواب

(۱) قال فی العالمگیریة ووصل الشعر بشعر الأدمی حرام سواءً کان بشعرها أو بشعر غیرها ولا بأس للمرأة أن تجعل فی قرونها وذوائبها شیئاً من الوبر کذا فی فتاویٰ قاضیخان (ج ۵، ۳۳۸)

قلت فیجوز أن تجعل فی القرون خیوطاً أو نحوها.

(۲) فی العالمگیریة التختم بالحدید والصفر والنحاس والرصاص مکروه للرجال والنساء جمیعاً وأما الشبه ونحوه فلا بأس بالتختم به کالعقیق کذا فی العینی هو الصحیح کذا فی جواهر الاخلاطی التختم بالعظم جائز کذا فی الغرائب ولا بأس بأن یتخذ خاتم حدید قد لوی علیه فضة (او ذهب) حتی لا یری کذا فی المحیط (ج ۵، ۳۳۵)

قلت: والکراهة اذا اطلقت یراد بها کراهة التحریم وبالجملة فلا یجوز التختم بشئ من المعادن للرجال الا بالفضة وللنساء بها وبالذهب وأما غیر المعادن من الحجریات والعظم فیجوز التختم بها للنساء والمعدن الحدید ما الظاهر من الاطلاق کراهة التختم به وأما بالنظر الی العلة وهو قوله صلی الله علیه وسلم لمن لبس خاتماً من شبه (ای صفر وهو ضرب من النحاس یشبه الذهب) مالی أجد منک ریح الأصنام ولمن لبس خاتماً من حدید مالی أری علیک حلیة أهل النار. رواه ابوداود وسکت عنه (ج ۲، ۲۲۹)

ولا بأس بالتختم بما لیس من هذین النوعین والنحاس والصفر نوع واحد وکذا الحدید والرصاص

واما المعدن الحدید فلعله غیر هذه الانواع۔ واللہ تعالٰی اعلم۔ والاحوط الترك واما قوله صلی اللہ علیه وسلم التمس ولو خاتما من حدید فلا یدل علی جواز اللبس وانما یدل علی جواز اعطائه لمرأة فی مهرها لتنتفع به ببیعه ونحوه وقد حمله علمائنا الحنفیة علی المبالغة فی الالتماس فان المهر عندهم لا یکون اقل من دینار فمعناه التمس ولو شیئا قلیلا حتی تعجله فی مهرها۔ واللہ تعالٰی اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ
از خانقاہ تھانہ بھون ۷ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ

ترکی ٹوپی کا استعمال کیسا ہے؟

سوال: ترکی ٹوپی کے استعمال کا کیا حکم ہے اور اس کے پہننے کا کیا حکم ہے؟

الجواب

ترکی ٹوپی کا استعمال عام مسلمانوں کو جائز ہے مگر خواص علماء وصلحاء کو نہ پہننا چاہئے کیونکہ ہنوز اس کا رواج صلحاء وعلماء میں نہیں ہوا البتہ جس جگہ خواص میں بھی اس کا رواج ہو گیا ہو وہاں سب کو جائز ہے اور پھندنا اگر ریشم کا ہو تو حرام ہے اگر ریشم کا نہ ہو تو جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفی عنہ ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۶ھ

مردوں کو کون کون سے رنگ کے کپڑے پہننا منع ہے۔

سوال: کون کون سے سرخ وزرد رنگ کے کپڑے مردوں کو پہننا منع ہیں ایک تو وہ رنگ ہیں جو ولایت سے سفوف کی شکل میں آتے ہیں۔ دوسرے خود ولایت ہی سے رنگین کپڑے پکے یا کچے رنگ کے آتے ہیں، پھر ممانعت کس قسم کی ہے یعنی تنزیہی ہے کہ تحریمی حدیث سے سرخ وزرد کپڑے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔

الجواب

سرخ رنگ صرف معصفر مردوں کو حرام ہے یعنی کسم کا رنگ ہوا اور

زرد صرف مزعفر حرام ہے جو زعفران سے رنگا گیا ہو۔ اس کے سوا زرد سب بلا کراہت جائز ہے اور سرخ خالص بکراہت تنزیہی اور سرخ مخلوط بلا کراہت جائز ہے۔ رہا ولایتی اور دیسی رنگوں کا فرق سو وہ صرف اسپرٹ کے شبہ کی وجہ سے ہے ورنہ دونوں مساوی ہیں۔ واللہ اعلم ظفر احمد عفا عنہ ۲ رمضان ۴۵ھ

# تتمہ

اس کے بعد سائل کا دوسرا خط آیا جو مع سوال وجواب مذکور ہے۔

سوال: آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر مزعفر کی نہی کے علاوہ یعنی لفظ اصفر سے کوئی روایت نظر سے گزری ہو تو مطلع کرو لہٰذا درج ذیل کرتا ہوں۔

عن انس بن مالک عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان عندہ رجل بہ اثر صفرۃ قال وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یکاد یواجہ احدا بشئ یکرھہ فلما قال للقوم لو قلتم لہ یدع ھذہ الصفرۃ (شمائل ترمذی باب ما جاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

## الجواب

میرا مقصود یہ تھا کہ صفرہ مطلقہ سے نہی ہو اور اس حدیث میں تو یدع ھذہ الصفرۃ ہے جس سے صفرہ معینہ مفہوم ہوتا ہے جس کو احتمالاً بھی صفرہ خلوق یا زعفران کے ساتھ مقید کیا جا سکتا ہے اور حدیث انسؓ کے طرق جمع کرنے سے تو یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ مراد صفرت زعفران وخلوق ہے۔ قالہ الشارح الشمائل العلامہ الحنفی (ج ۲/۱۰)

اور ابوداؤد میں بھی ایک طریق حضرت انسؓ سے بلفظ تزعفر وارد ہوا ہے اور جس رجل مجہول کا واقعہ حضرت انسؓ نے بیان فرمایا ہے غالباً وہ حضرت عمار بن یاسر ہی اور ان کا واقعہ ابوداؤد میں بلفظ خلوق وزعفران وارد ہے اور حمرت سے بعض احادیث میں مطلقاً کراہت وارد ہے۔ حتیٰ کہ حمرت صفرہ سے بھی ملاحظہ ہو۔ ابوداؤد جلد دوم کتاب اللباس والترجل واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ رمضان [illegible]ھ

**بہشتی زیور کے اس مسئلہ کی دلیل کہ آرسی کا زینت کے لئے پہننا درست ہے لیکن آرسی میں منہ دیکھنا حرام ہے**

سوال۔ عرض ہے کہ بہشتی زیور صفحہ ۔۔۔ تیسرا حصہ مضمون سونے چاندی کے برتنوں کے بیان میں جو آپ نے تحریر کیا ہے کہ آرسی کا زینت کے لئے پہننا درست ہے لیکن آرسی میں منہ دیکھنا حرام ہے اس کے واسطے کوئی مستدل عطا فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

## الجواب

فی الدر المختار۔ وحلیۃ مرآۃ وقال الشامی التی فی المنح والھدایۃ وغیرھما۔ حلقۃ بالقاف قال فی الکفایۃ المراد بھا التی تکون حوالی المرآۃ لاانا نأخذہ المرآۃ بیدھا فانہ مکروہ اتفاقا (ج۵ ص۳۳) ای استعمالھا دون لبسھا یدل علیہ کلامہ السابق فرات الکلام فی الاستعمال والمراد بالکراھۃ کراھۃ التحریم للاطلاق۔

کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

۶ جمادی الاول [illegible]ھ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفی عنہ ۶ جمادی الاولیٰ [illegible]ھ

**مردوں کے لئے ریشمی اور سرخ رنگ کا کپڑا پہننا اور اس میں نماز ادا کرنا**

سوال: یہ مسئلہ دریافت طلب ہے کہ زرد کپڑا یا سرخ کپڑا یا ریشم کا کپڑا پہن کر آیا نماز ہو جاتی ہے یا نہیں اور اگر نیچے کپڑا سرخ ہو یعنی سوت کا اور اوپر ریشم ہو آیا یہ جائز ہے یا نہیں ایسا ہی سرخ کپڑے کے بابت عرض ہے مثلاً جیسے زردانی یا ردی کا کوٹ یا واسکٹ، ردی کی ہو نماز جائز ہو سکتی ہے یا کہ نہیں۔

## الجواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ریشم کا کپڑا مرد کو پہننا حرام ہے خواہ کسی کپڑے کے اوپر پہنا جاوے خواہ کسی کپڑے کے نیچے اور نماز پڑھنے کی حالت میں بھی حرام ہے اور پہن کر نماز پڑھیں تو نماز مکروہ ہوگی۔ اور سرخ رنگ مردوں کے لئے بلا کراہت جائز نہیں ہے اگر کسم سے رنگا ہوا ہے تو حرام ہے اور اگر علاوہ کسم کے کسی اور چیز

سے سرخ رنگا ہے تو مکروہ تنزیہی ہے۔ کما حققہ فی منتخب الفتاوی الحامدیۃ (ج ۲/ ۲۲۳) اور اس میں بھی ریشمی کپڑے کی طرح بہرحال بدرجہ مذکورہ ممانعت ہے خواہ نماز پڑھنے میں پہنا جائے خواہ نماز سے خارج میں پہنا جائے البتہ اگر کسی کپڑے میں سرخ دھاری ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں اور زرد رنگ بھی مکروہ ہے جبکہ زعفران یا کسم سے رنگا ہو اور اگر ان دو کے سوا کسی چیز سے رنگا ہو تو وہ جائز معلوم ہوتا ہے اس کے متعلق جزئیہ نہیں ملا۔ ۱۲ منہ۔ واللہ اعلم

احقر عبدالکریم عفی عنہ از خانقاہ

۱۶ جمادی الثانیہ ۱۳۵۸ھ

## مصنوعی دانت بنوانا اور ان پر سونے کا خول چڑھانے کا حکم

سوال: میں نے سامنے کے اوپر کے چار دانت ڈاکٹر کے مشورہ سے مرض پائیریا کے احتمال سے نکلوا دیئے اور مصنوعی دانت تیار کرائے گئے ہیں ان دانتوں کی پشت پر سونے کی پیٹی لگائی گئی ہے اور ان کے بازوؤں کے دو دانتوں پر یعنی کچلیوں پر سونے کا خول چڑھایا گیا ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ سامنے کے چاروں دانتوں کی گرفت رہے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے مصنوعی دانتوں کا استعمال ناجائز ہے اور چونکہ دو دانتوں پر خول چڑھا ہوا ہے اس لئے وضو اور غسل بھی نہیں ہوسکتا۔ براہ کرم اطلاع بخشی جائے کہ کیا یہ صحیح ہے۔ اگرچہ دانتوں کی تیاری میں میرے ایک سو بیس روپے صرف ہوئے ہیں اور ضرورتاً دردناک دانتوں کو نکلوا کر مصنوعی دانت تیار کئے گئے ہیں مگر ناجائز ہونے کی صورت میں ان کو نکلوا دوں گا۔ بحالت موجودہ مصنوعی دانت بعینہ دانتوں کے ساتھ پختہ طور سے باندھ دیئے گئے ہیں اور وہ معمولی دانتوں کی طرح نہ تو نکل سکتے ہیں اور نہ ان کو نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے ناجائز ہونے کی صورت میں ان کو دندان ساز سے نکلوا کر معمولی چوکھٹا ربڑ کے پشت کا تیار کرالوں گا مگر ایسا چوکھٹا نہ تو کسی کام کا ہوتا ہے اور نہ اس سے راحت ملتی ہے۔ پہلے میں نے ایسا ہی چوکھٹا تیار کرایا تھا جو ہر وقت آسانی کے ساتھ علیحدہ ہوسکتا تھا مگر اس سے مطلق راحت نہیں ملتی تھی اور لگانے کے بعد سخت بے چینی رہتی تھی اور اس سے چوسنے تک کا

کو موم بھی نہیں لیا جا سکتا تھا اور بات کرتے وقت ان میں حرکت ہوتی تھی اس لئے حسب تفصیل صدر سونے کے پترہ کا دوسرا چوکھٹا تیار کرایا گیا۔

## الجواب

دانتوں پر سونے کا خول چڑھانا جائز ہے۔

قال في الهداية عن الجامع الصغير ولا يشد الاسنان بالذهب ويشدها بالفضة وهذا قول ابي حنيفة وقال محمد يشدها بالذهب ايضا وذكر الحاكم في المنتقى يخاف سقوط السن فشدها بالذهب او بالفضة لم يكن بأسا عند أبي حنيفة وأبي يوسف وفيه ايضا قطعت انملة يجوز أن يتخذها من ذهب أو فضة بخلاف ما لو قطعت يده او اصبعه كذا في التمرتاشي اه (ج ۴/ ۲۲۵)

وفيه دلالة على اتخاذ العضو الصغير من الذهب أو الفضة دون العضو الكبير لا سيما إذا كان غير الذهب ينتن في الفم ولا ينتن الذهب فلا بأس باتخاذ السن منه. والله اعلم۔

وفي رد المحتار عن التاترخانية. وعلى هذا الاختلاف اذا جدع انفه او اذنه او سقط سنه فاراد ان يتخذ سنا آخر فعند الامام يتخذ ذلك من الفضة وعند محمد من الذهب ايضا وذكر فيه مساعدة الاتفاق لمحمد واستدل لثبوت جواز الانف من الذهب بحديث عرفجة لعلة انتان غيره. قال ولا نسلم انها تنتفع في السن بالفضة لانها تنتن ايضا (ص۲۵۰ ج۵)

رہا وضو اور غسل کا حکم تو اگر ان دانتوں کے نکالنے میں دقت ہوتی ہو تو غسل و وضو کے وقت ان کے نکالنا ضروری نہیں۔

قال في الدر: ويجب أي يفرض غسل ما يمكن من البدن بلا حرج لا غسل ما فيه حرج كعين وثقب انضم وداخل قلفه

بل يندب وهو الأصح وفى المسعودى ان امكن فتح القلفة بلا مشقة يجب والا لا (ج ۱/ ۱۵)

اس وقت نہ ہوئی ہو تو ان کا نکالنا ضروری ہوگا اور وقت ہونے نہ ہونے کا مبتلی بہ خود سمجھ سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون ۲۷ محرم ۵۳ھ

سوال:- دانتوں پر سونے کا خول چڑھا کیا ہے اور خول پائیدار اور مستحکم اس قدر ہو کہ بغیر خاص اہتمام کے علیحدہ نہ کیا جا سکے تو کیا حکم ہے۔

| دانتوں پر سونے کا خول چڑھانا کیسا ہے؟ |
|---|

## الجواب

امام محمدؒ کے قول پر گنجائش ہے، امام صاحبؒ کے قول میں گنجائش نہیں اور اگر خول سہولت سے اتر سکے تو غسل جنابت کے وقت اس کو اتار کر کلی کرنا ضروری ہے ورنہ وقت ہو تو اتارنے کی ضرورت نہیں۔

فى الهندية فى السن المجوف الذى تبقى فيه طعام ثم غسله على الأصح ولدرن الباس فى الانف يمنع تمام الغسل إلى أن قال: وقيل كل ذالك يجزيهم للحرج والضرورة ومواضع الضرورة مستثناة من قواعد الشرع كذا فى الظهيرية ج ۱/ ۹- وفيه ايضا اذا تحركت الاسنان وخيف سقوطها. فأراد صاحبها أن يشدها شدها بالفضة لا بالذهب وهذا قول أبى حنيفة وقال محمدؒ يشدها بالذهب ايضا (ج ۶/ ۲۲۴) والله اعلم.

ظفر احمد عفا عنہ

۲۰ شعبان ۵۳ھ

# باب اللعب والغناء والتصاویر

**غیر ذی روح کی تصویر کا حکم** | سوال: مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی رسالہ القاسم میں تحریر فرماتے ہیں کہ جن اشیاء غیر ذی روح کی پرستش ہوتی ہے جیسے چاند وغیرہ ان کی تصاویر کھینچنی ناجائز ہے اگر کوئی جزئیہ حضور والا کی نظر سے گزرا ہو تو مع حوالہ کتاب ارقام فرمائیں۔

## الجواب

غیر ذی روح کی تصویر کھینچنی مطلقاً جائز ہے خواہ اس کی عبادت کفار کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔

قال فی الدر: أو لغیر ذی روح لا یکره لأنها لا تعبد أی هذه المذکورات فحینئذ فلا یحصل التشبه فافهم. قیل عبد الشمس والقمر والکواکب والشجرة الخضراء قلنا عبد عینه لا تمثاله (ج ۱/۶۰۸)

لیکن اس دلیل سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چاند وغیرہ کی تصویر اس لئے جائز ہے کہ ان کی ذات کی عبادت کی جاتی ہے۔ تصویر کی عبادت نہیں کی جاتی۔ اس لئے لازم آتا ہے کہ اگر کسی غیر ذی روح کی عبادت کی جاتی ہو تو اس کا بنانا جائز نہیں نہ گھر میں رکھنا۔ چنانچہ صلیب کے بارہ میں یہ حکم مصرح ہے[1]۔

قال فی الدر: ولبس ثوب فی تماثیل ذی روح اھ

قال الشامی اقول والظاهر أنه یلحق به الصلیب وان لم یکن تمثال ذی روح لان فیه تشبها بالنصاری الخ ص ۶۰۷ ج ۱۔

واللہ اعلم۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۶ محرم سنہ ۴۲ھ

---

[1] جواب تشنہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل قدیم رجسٹر میں اتنا ہی جواب منقول ہے۔ واللہ اعلم۔ مرتب

**گیند بلا اور کبڈی کھیلنے کا حکم**

سوال: زید کہتا ہے کہ کبڈی، گلی ڈنڈا، یا گیند بلا وغیرہ سراسر حرام ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ محض لہو و لعب ہیں اور خالد کہتا ہے کہ ان کے کھیلنے میں کوئی حرج نہیں تو کیا یہ سب لہو و لعب میں داخل ہیں یا نہیں، ان کا کھیلنا جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

کبڈی اور گیند بلا وغیرہ سے کھیلنا اگر محض کھیل اور لہو و لعب کی نیت سے ہو تو ناجائز ہے اور اگر قوت و شجاعت بڑھانے کی نیت سے ہو تو جائز ہے۔

قال فی الدر: والمصارعة لیست ببدعة الا للتلهی فتکرہ برجندی واما السباق بلا جعل فیحل فی کل شیء کما یأتی۔ (ج ۵/ ۳۹۸) (۱)

وفی رد المحتار: اقول قدمنا عن القهستانی جواز اللعب بالصولجان وهو الكرة للفروسية وفی جواز المسابقة بالطير عندنا نظر وکذا فی جواز معرفة ما فی الید واللعب بالخاتم فانه لهو مجرد واما المسابقة بالبقر والسفن والسباحة فظاهر کلامهم الجواز ورمی البندق والحجر کالرمی بالسهم واما اشالة الحجر بالید وما بعده فالظاهر أنه إن قصد به التمرن والتقوی علی الشجاعة لا بأس به۔ واللہ اعلم۔

فقط احمد عفا اللہ عنہ، ۶ شوال ۱۳۸۶ھ

**ورزش کی نیت سے فٹبال کھیلنے کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ نصاری لوگ جو ہینڈ بال اور فٹ بال کھیلتے ہیں اسی طرح ہندو مسلمانوں کا حال کہ یہ کھیل کھیلنا جائز ہے یا نہیں اور اس میں نماز کا اور اس کے وقت کا خیال تک نہیں کرتے بلکہ نماز فوت بھی ہو جاتی ہے

---

(۱) شامیہ مع الدر (ج ۶/ ۴۰۳) ایچ ایم سعید۔ مرتب۔

## الجواب

یہ کام نصاریٰ کے قومی شعار یا مذہبی رسوم نہیں ہیں اس لئے اگر ورزش کی مصلحت سے کھیلا جائے تو مضائقہ نہیں اگر نصاریٰ کے ساتھ تشبہ کی نیت ہو تو مکروہ ہوگا اور نماز کے فوت کرنے کا گناہ تو ہر ورزش میں ہے خواہ یہ ہو یا کوئی اور لہٰذا ایسا مشغول ہو کر کھیلنا کہ نماز کا بھی خیال نہ رہے ہر حال میں ناجائز ہے واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۲۵ شعبان ۱۳۴۷ھ

**سفر کے واسطے بضرورت شدیدہ نصف بدن کی تصویر کھنچوانی جائز ہے۔**

سوال: گورنمنٹ برطانیہ کا قانون ہے کہ ہر وہ شخص جو افریقہ جانا چاہے اپنی پوری تصویر کھنچوا کر پاسپورٹ یعنی پروانہ راہداری حاصل کرے بغیر اپنا فوٹو دیئے ہوئے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی حضور والا ارشاد شریعت تحریر فرمائیں کہ فوٹو دینا کیسا ہے اور اگر آدھی تصویر کھنچوائی جائے تو کیا حکم ہے۔

## الجواب

قال ابن حجر فی الصورۃ فاما لو کانت ممتہنۃ او غیر ممتہنۃ لکنہا غیرت عن ہیئتہا اما بقطعہا من نصفہا او بقطع رأسہا فلا امتناع (۳۲۹)

وفی الشامیۃ: والتمثال خاص بمثال ذی روح ویأتی ان غیر ذی الروح لایکرہ قال القہستانی وفیہ اشعار بانہ لا تکرہ صورۃ الرأس وفیہ خلاف کما فی اتخاذہا کذا فی المحیط۔ (ج ۱/۶۴۷)

وفی الدر: او کانت صغیرۃ لاتتبین او مقطوعۃ الرأس او الوجہ او ممحوۃ عضو لا تعیش بدونہ اھ (ج ۱/۶۴۸)

قال الشامی قولہ: او ممحوۃ عضو الخ تعمیم بعد تخصیص۔ وہل مثل ذالک مالو کانت مثقوبۃ البطن مثلاً والظاہر انہ لو کان الثقب کبیرا یظہر بہ نقصہا فنعم اھ (ج ۱/۶۴۸)

عبارت اولیٰ وثانیہ وثالثہ سے صورت مقطوعۃ النصف کا اقتناء یعنی گھر میں
رکھنا جائز معلوم ہوتا ہے کیونکہ بدون بطن کے تعیش نہیں ہو سکتا اور مقطوعۃ النصف
میں بطن کی تصویر نہیں ہوتی اور جزئیہ ثانیہ سے صورۃ رأس مجرد کے اتخاذ یعنی بصفت
کا مختلف فیہ ہونا مستفاد ہوتا ہے اور گو ہمارے نزدیک صورۃ رأس بنانے میں
راجح یہ ہے کہ جائز نہیں کیونکہ تصویر میں اصل رأس ہی ہے لیکن ضرورت شدیدہ
میں ضعیف قول پر بھی فتویٰ دینے کی گنجائش ہے پس جو تاجر افریقہ جانے میں
مضطر ہو نہ جانے میں اس قدر ضرر عظیم ہو جس کا تحمل طاقت سے باہر ہو اس کو
اپنی نصف تصویر اترواکر دے دینا جائز ہے مگر بار بار اتروانا جائز نہیں بلکہ
جب سخت ضرورت سفر کی ہو۔ بدون جانے کے چارہ نہ ہو اس وقت گنجائش
ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۲ صفر ۴۶ھ

**گھوڑ دوڑ اور اس پر انعام لینے کی ایک صورت کا حکم**

سوال: گھوڑوں کو ضد سے دوڑنا اور جیت جانے پر انعام کا روپیہ لینا شرعاً جائز ہے یا کہ نہیں۔ یہ انعام کا روپیہ ان لوگوں سے بطور ٹکٹ داخلہ وصول کیا جاتا ہے جو گھوڑ دوڑ کو دیکھنے آتے ہیں اور کچھ روپیہ گورنمنٹ خود اچھے گھوڑوں کی نسل بڑھانے اور پالنے کے لئے اور رعایا کو ترغیب دلانے کے لئے دیتی ہے۔

## الجواب

انعام کی جو صورت سوال میں درج ہے جائز ہے۔ گھوڑ دوڑ کا انعام وہ ناجائز ہے جس میں دونوں طرف سے شرط ہو کہ ایک جیتے تو دوسرا اس کو اتنا دے اور دوسرا جیتے تو یہ اس کو اتنا دے اور اگر انعام دینے والا تیسرا ہو تو یہ صورت جائز ہے رہا یہ کہ انعام کا روپیہ تماشبینوں سے بطور ٹکٹ داخلہ لیتے ہیں تو اگر یہ ٹکٹ داخلہ کی رقم گورنمنٹ لیتی ہے اور وہ زمین جس میں گھوڑ دوڑ ہوتی ہے گورنمنٹ کی ملک ہے یا اس نے کرایہ پر لے رکھی ہے تو اس رقم سے انعام لینا حلال ہے اور اگر ٹکٹ داخلہ کی رقم کوئی دوسرا لیتا ہے تو سوال

دوبارہ کیا جائے اور یہ بتلایا جائے کہ یہ رقم لینے والا کافر ہے یا مسلم اور زمین اس کی ملک ہے یا اجارہ میں اس نے لے رکھی ہے یا نہیں اور جو رقم گورنمنٹ بطور خود انعام میں دے ٹکٹ داخلہ کی رقم سے علاوہ اس کا لینا مباح ہے۔

واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ

**ورزش کی نیت سے فٹبال کھیلنے کا حکم**

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ اکثر طلباء بنیت صحت ابدان فٹ بال کھیلتے ہیں بعض مدرسین بھی اس نیت سے کھیلنے کو جائز بتلاتے ہیں۔ کیا فقہاء کرام نے جو کل لہو حرام کو عام بتلایا ہے اس سے عموم کا ابطال لازم آتا ہے۔

## الجواب

کل لھو حرام کے معنی یہ ہیں کہ جو لہو کے لئے موضوع ہو اور اس میں کوئی نفع بجز لہو کے نہ ہو اور اگر علاوہ لہو کے اس میں کوئی نفع شرعی بھی ہو تو قصد لہو سے حرام ہے اور قصد نفع سے حرام نہیں۔ کما دل علیہ کلام الھندیۃ قال فی العالمگیریۃ: المصارعۃ ھی بدعۃ وھل یترخص للشبان قال لیست ببدعۃ وقد جاء الاثر فیھا الا ان ینظر ان ارادبہ التلھی، یکرہ لہ ذالک ویمنع عنہ وان اراد تحصیل القوۃ لیقدر علی مقاتلۃ الکفرۃ فانہ یجوز ویثاب علیہ کذا فی جواھر الفتاوی قال القاضی الامام ملک الملوک اللعب الذی یلعب الشبان ایام الصیف بالبطیخ بان یضرب بعضھم بعضا مباح غیر مستنکر کذا فی جواھر الفتاوی الباب السادس (۱) (ج ۹/۲۳۴)

قوت اور حفظ صحت کے لئے جو کھیل کھیلا جائے وہ مباح ہے ان لہو

(۱) ہندیۃ: (ج ۵/۳۵۲) مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔ مرتب

لعب کی نیت سے کھیلا جائے تو مکروہ ہے ۔ پس فٹ بال بھی حفظ صحت کے لئے سبل ہوتا مگر اس میں تشبہ بلعب الکفار کا شائبہ ہے ۔ گو عادات کفار میں قصد تشبہ سے کراہت ہوتی ہے مگر بلا قصد بھی کراہت تنزیہی سے خالی نہیں ۔ جبکہ اس سے احتراز متعذر نہیں ۔ پس طلبا کو جو علم دین کے عامل ہیں ایسا کھیل مناسب نہیں حفظ صحت کے لئے دیسی کھیل بھی بہت ہیں ۔ ان میں سے کسی کو اختیار کر لیں ۔ فقط واللہ اعلم ۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۲۱ جمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ

یہ حکم تو اس عمل کا فی نفسہ ہے مگر اہل علم کا اس میں مشتغل ہونا جن مفاسد کو مشتمل ہے ۔ ان پر نظر کر کے اہل علم کے لئے اس فعل میں شدید ممانعت ہوگی ۔ کیا اور طریق ورزش کے نہیں رہے جو اس کی طرف اضطرار ہو ۔

اشرف علی

**جاندار کی تصویر بطور مارکہ استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں**

سوال (۱) اب سے تقریباً ساٹھ ستر سال پہلے براہ راست دیسی تاجروں کا تعلق ولایت یعنی یورپ سے بالکل نہ تھا بلکہ جو اہل یورپ کی کمپنیاں ہندوستان میں تھیں دیسی تاجر انہی سے مال خرید کر تجارت کیا کرتے تھے جس میں دیسیوں کو بہت کم برائے نام نفع حاصل ہوتا تھا کیونکہ وہ کمپنیاں اپنی حسب منشا ڈیوڑھی دونی قیمتیں وصول کیا کرتی تھیں یورپین کمپنیاں جو مال ولایت سے منگاتی تھیں اس مال پر خاص اپنا مارکہ لگایا کرتی تھیں جیسے کپڑے کے تھانوں میں تصویریں یا پھول وغیرہ خاص علامت کے طور پر ہوا کرتے ہیں ۔ اسی مارکہ کی بنا پر اکثر اقسام مال کی شہرت ہو جاتی ہے جیسے کپڑے کے تھانوں میں نٹ مارکہ یا قینچی مارکہ وغیرہ اس کے بعد بڑے بڑے دیسی تاجروں نے بھی براہ راست ولایت کی ملوں اور کارخانوں سے مال منگوانا شروع کر دیا اور اپنے اپنے مارکے ڈلوانا شروع کر دیئے ۔ بعض اس کے دشواری تھی جاندار یا بے جان کسی کی خصوصیت کا خیال نہ تھا جس کو جس مارکے میں عوام کے متوجہ ہونے کا غالب گمان ہوا وہی مارکہ اس نے اختیار کر لیا اور وہ رجسٹرڈ ہو گیا ۔ پس ارشاد فرمائیں کہ ایسی حالت میں جاندار مارکوں

کو رہنے دینا جائز ہے یا نہیں۔

## الجواب

جاندار مورتوں کے بنوانے میں کوئی گنجائش نہیں اگر اس کے ترک سے نقصان عظیم ہوتا ہو جس کے تحمل کی ہمت نہ ہوتی ہو تو استغفار اور توبہ کرتے رہیں اور اپنے کو گنہگار سمجھتے رہیں۔

قال فی الشامیة: وظاهر کلام النووی فی شرح مسلم الاجماع علی تحریم تصویر الحیوان وقال وسواء صنعه لما یمتهن اولغیره فصنعته حرام بکل حال لان فیه مضاهاة لخلق اللّٰه وسواء کان فی ثوب او بساط او درهم واناء وغیرها (۲۷۷/۱)

و فیه ایضاً۔

تنبیه: هذا کله فی اقتناء الصورة واما فعل التصویر فهو غیر جائز مطلقاً لانه مضاهاة لخلق اللّٰه تعالیٰ کما مرّ۔ قال فی النهر جوّز فی الخلاصة لمن رأی صورة فی بیت غیره ان یزیلها وینبغی ان یجب علیه ولو استأجر مصوّراً فلا أجر له لان عمله معصیة کذا عن محمد اھ (۲۷۹/۱)

وفی حاشیة الاشباه للحموی تحت مسئلة اجیر القصار أن عمل الأجیر منقول الیه لأنه عمل باذنه هذا فی الولوالجیه اھ (۲۷۹) ومقتضاه أن عمل المصور هناك منقول إلی مستأجره لکونه یعمل باذنه فلا وسعة فیه اللّٰهم إلا أن یکون کالمضطر إلی اکل الحرام وهو محل النظر فی صورة السوال فافهم۔ واللّٰه اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۵ محرم [illegible]

**ذی روح کی تصویر کا حکم اور اس سے متعلق چند سوالات**

سوال: ذی روح کی تصویر بنانے کا خواہ کسی ہو خواہ عکسی خواہ مجسم مورت ہو خواہ کاغذ اور کپڑے وغیرہ پر بنا ہو) اور اسے رکھنے کا شرعاً کیا حکم ہے (۲) اور جس جگہ میں ذی روح کی

تصویر ہو وہاں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے۔ (۳) اور جس گھر میں تصویر یا کتا ہو وہاں فرشتے آتے ہیں یا نہیں (۴) تصویر کے محلل اور مجوز پر شرعاً کیا حکم عائد ہوتا ہے۔ اور تصویر کی تحریم میں سلف سے لے کر خلف تک تمام فقہاء اور محدثین اور مفسرین کی تغلیط و تضلیل کرنے والے کا کیا حکم ہے۔ بینوا توجروا۔

## الجواب

تصویر بنانا حرام خواہ وہ تصویر کپڑے پر بنائی جائے یا برتن پر یا دیوار پر کسی چیز پر بنانا جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ تصویر چھوٹی ہو یا بڑی کما فی الشامی رحمہ اللہ۔

فی البحر وفی الخلاصة وتکره التصاویر علی الثوب صلی فیه اولا انتهی وهذه الکراهة تحریمیة۔ وظاهر کلام النووی فی شرح المسلم الاجماع علی تحریم تصویر الحیوان وقال وسواء صنعه لما یمتهن او لغیره فصنعته حرام بکل حال لان فیه مضاهاة لخلق الله تعالی وسواء کان فی ثوب او بساط او درهم واناء وحائط وغیرها اه فینبغی ان یکون حراما لا مکروها ان ثبت الاجماع او قطعیة الدلیل متواتره کلام البحر ملخصا (وقال الشامی بحثا) ان التصویر یحرم ولو کانت الصورة صغیرة کالتی علی الدرهم او کانت فی الید او مستترة او مهانة وقال ایضا ص ۶۴۹۔ هذا کله فی اقتناء التصویر فهو غیر جائز مطلقا لانه مضاهاة لخلق الله تعالی کما مر۔

پس تصویر بنانا ہرگز جائز نہیں۔ نہ تعظیم کے لئے نہ غیر تعظیم نہ چھوٹی نہ بڑی اور کسی بھی چیز پر بنائی جائے ہر طرح ناجائز ہے اور عکسی و دستی میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ تصویر کا مقصد دونوں طرح حاصل ہے) اور یہ جو بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بے جسم یعنی مجسمہ ناجائز ہے اور کاغذ وغیرہ پر تصویر جائز ہے یہ غلط ہے۔

قال النووی فی شرح المسلم ولا فرق فی هذا کله بین ما له ظل وما لا ظل له هذا تلخیص مذهبنا فی المسئلة وبمعناه قال جماهیر العلماء من الصحابة والتابعین ومن بعدهم

وهو مذهب الثوري ومالك وأبي حنيفةؒ وغيرهم وقال بعض السلف انما ينهى عما كان له ظل ولا بأس بالصور التي ليس لها ظل وهذا مذهب باطل فان الستر الذي انكر النبي صلى الله عليه وسلم الصورة فيه لا يشك احد أنه مذموم وليس له ظل مع باقي الاحاديث المطلقة في كل صورة (مسلم ج ۲/۱۹۹)

(۲) اگر تصویر ایسی جگہ لٹکی ہے کہ نمازی کے سر پر ہو لیتی ہے یعنی چھت میں ہے یا نمازی کے آگے ہے یا اس کے دائیں بائیں یا سجدہ کی جگہ ہو تو نماز مکروہ ہے اور اگر نمازی کی پشت کی جانب ہے کراہت نہیں البتہ اگر پاؤں کے نیچے ہو تو نماز مکروہ نہ ہو گی اگر چہ بنانا اس کا جائز نہیں) اسی طرح اگر تصویر بہت چھوٹی ہو کہ کھڑے ہوئے آدمی کو اس کے اعضاء معلوم نہ ہوں جبکہ وہ زمین پر رکھی ہو یا اس کا سر کٹا ہوا ہو یا کوئی ایسا عضو کٹا ہوا ہو کہ جس کے بدون زندہ نہیں رہ سکتا تو نماز مکروہ نہ ہو گی (وھذا کلہ من الدر المختار ج ۱/۴۷۷)

(۳) جس گھر میں تصویر یا کتا ہو اس میں فرشتے نہیں آتے جیسا کہ مسلم و نووی کی روایت سے ثابت ہے۔ (وهو قول جبريل للنبي انا لا ندخل بيتا فيه كلب و صورة رواه مسلم)

(۴) وہ شخص فاسق ہے کیونکہ کافر جب ہوتا جب حرام قطعی کو حلال جانتے کما فی العالمگیریۃ (ج ۲/۱۹۲) انما يكفر اذا كانت الحرمة ثابتة بدليل مقطوع به اما اذا كانت باخبار الاحاد لا يكفر كذا في الخلاصة وفي ثبوت تواتره او الاجماع على حرمته تامل وان ثبت الاجماع على حرمته ماله ظل ولكن لا يكفر منكر كل اجماع والتفصيل في حاشية فيكفر جاحده (ص ۲۲۱، ۲۲۲) فبحث الاجماع نورالانوار۔

(۵) اس کا وہی جواب ہے جو ملا میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۵ شوال ۱۳۵۲ھ

احقر عبدالکریم عفی عنہ
۱۴ شوال ۱۳۵۲ھ

**ظروف پر تصویریں بنانا جائز ہے یا نہیں؟**

سوال: میں سیاہ قلم کے ظروف کی تجارت کرتا ہوں۔ سیاہ قلم کے سانپ بنتے ہیں جس پر موم بتی بنائی جاتی ہے اندرونی حصہ یعنی اس کا پیٹ خالی ہوتا ہے۔ ہر ایک آرڈر میں اس کی فرمائش اکثر ہوتی ہے اور فرمائش کی تعمیل نہ کرنے سے خریدار ناراض ہوتے ہیں۔ ان کا بنانا اور فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ کسی برتن پر مورکی یا بطخ کی تصویر بنانا جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

چھوٹی بڑی ہر قسم کی تصویر بنانا منع ہے۔ البتہ چھوٹی تصویر کسی برتن پر ہو کہ بدون غور کے معلوم نہ ہوتی ہو تو ایسے برتن کا بیچنا جائز ہے اور جس برتن پر بڑی تصویر ہو اس کی تجارت کرنا ممنوع ہے (گو بیع کے بعد جو قیمت وصول ہو وہ حلال ہے مگر ایسے برتن کا رکھنا اور اس کی تجارت ممنوع ہے) ۱۲

کما فی الدر المختار: واختلف المحدثون فی امتناع ملائکۃ الرحمۃ بما علی النقدین فنفاہ عیاض واثبتہ النووی وفی الشامی (قولہ فنفاہ عیاض) ای وقال ان الاحادیث مخصصۃ بحر وھو ظاھر کلام علمائنا فان ظاھرہ ان ما لا یؤثر کراھۃ فی الصلوۃ لا یکرہ ابقاؤہ وقد صرح فی الفتح وغیرہ بان الصورۃ الصغیرۃ لا تکرہ فی البیت الخ وقال تنبیہ ھذا کلہ فی اقتناء الصورۃ واما فعل التصویر فھو غیر جائز مطلقا۔ (۱/۶۴۹)

الجواب صحیح
ظفر احمد عفی عنہ

کتبہ الاحقر
عبد الکریم عفی عنہ

**افطار و سحری کے وقت ساز و باجے کے ساتھ گانے بجانے کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ چند لوگ باہم متفق ہو کر ماہ رمضان المبارک میں مع ساز و باجے کے گانا گاتے ہوئے گشت لگاتے ہیں، وقت افطاری جس مکان کا مکین مسجد میں افطاری

روزہ داران کے لئے بھیجتا ہے تو اس کے مکان پر سب گویئے مع ساز و باجے کے موجود ہوتے ہیں اور گانے بجاتے ہوئے مسجد تک آتے ہیں یہی شغل وقت سحری کا بھی ہے۔ گھر گھر جگاتے پھرتے ہیں کبھی اِس محلّہ اور کبھی اُس محلّہ اور یہی شغل عید الفطر کے بعد نماز پڑھ لینے کے بعد ہوتا ہے۔ کیا یہ امر جائز ہے؟ میں نے اس فعل کو بالکل بدعت سمجھ کر ممانعت کی۔

## الجواب

گانا بجانا ساز وغیرہ سے شرعاً بالکل حرام ہے اور افطار کے وقت افطاری کے ساتھ لوگوں کا آنا محض اظہار تفاخر و ریاء ہے کہ ہمارے گھر سے افطاری جاری ہے جس کو مخلص کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ رات کو سحری میں جگانا جائز ہے مگر ساز و سامان سے گانا جائز نہیں۔ صرف آواز دے کر جگا دیں بشرطیکہ اہل محلّہ کو ناگوار نہ ہو اور وہ اس کے طالب ہوں کہ ان کو جگایا جائے اور آواز کافی نہ ہو تو نقارہ بجا دینا جائز ہے۔ عید الفطر کے دن کسی قدر لہو و لعب کی اجازت ہے غربال و دف سے گانا بھی جائز ہے بشرطیکہ گانے والا امرد یا عورت نہ ہو۔ اور گانا قاعدہ موسیقی پر نہ ہو اور دف یا غربال بھی قاعدہ موسیقی پر نہ بجایا جائے بلکہ ویسے ہی بلا قاعدہ بجایا جائے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۲۲ شعبان ۳۵ھ

### شادی بیاہ وغیرہ میں عورتوں کے گانے کی حرمت کا بیان

سوال: در ملک ما رواج است کہ در مواقع شادی ولیمہ وختنہ وولادت اولاد وغیرہ اہل شادی نساء علیحدہ را دعوت دادہ مجمع عودہ زنان تغنی می کنند و بہ آواز بلند قوامی کنند بطوریکہ آواز ایشان بدر رمی و ایں قوال را در عرف ما محراہی مانند و ایں مجلس سحرا چند شب پیش از موقع شادی می کنند و مضمون سحرا ہم غالبا مالایعنی می باشد و اگر کدامی مردے اہل خانہ خود را بایں دعوت سحر با اجازت د دہد بسبب احتیاطہ آنرا الشخص قاطع ق پندارند و بایں مصیبت اشراف وذو مروت ہم مبتلا اند الحال سوال است کہ دریں چنیں مواقع ایں چنیں تغنی کردن زنان و سحرا مصروفہ علی الاجتماع سرا کندن بطوریکہ آواز گوشش اجنبیاں

رسد شرعاً درست یا حرام۔ وعلی الشق الثانی جواب از احادیث کہ مشعر رخصت علی الغنی است مثلاً قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فلو بعثتم معہا من یقول أتیناکم أتیناکم فحیانا وحیاکم یا عائشۃ الا تغنین کہ در مشکوٰۃ شریف در باب اعلان نکاح مذکور اند چیست بینوا توجروا۔

## الجواب

جس غنا کی حالت سوال میں مذکور ہے یہ حرام ہے اس کے جواز کی گنجائش نہیں اور احادیث میں جس غناء کا ذکر ہے وہ غناء نسواں بآواز بلند نہ تھا بلکہ کلمات چند بطور مسرت استعمال کرنا مراد ہے جیسا کہ خود حضورؐ نے کلمات بیان فرمائے اتیناکم اتیناکم (۱) الخ تو اس طرح دو چار باتیں کہنا غناء محرم میں داخل نہیں اور عورتوں کا جو طریقہ سائل نے بیان کیا ہے اس کو حدیث سے کچھ مس نہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

از تھانہ خانقاہ امدادیہ ۱۴ شعبان ۱۳۴۵ھ

| | |
|---|---|
| سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل صورتوں میں کہ (۱) آج کل لوگ انگریزی فیشن کی پیروی میں | سب ٹیموں سے چندہ جمع کرکے کپ لاکر جیتنے والی ٹیم کو دینا کیا درست ہے؟ |

ورزش اور کسرت جسمانی بھی انگریزی کھیلوں کے ذریعے کرتے ہیں اور مقامالی فائدے بھی حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی قیمتی دھات کا برتن نہایت خوبصورت بناتا ہے جس کو انگریزی میں کپ کہتے ہیں اور باقی متفرقات بھی ساتھ ہی تیار کراتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ یہ کپ اور گیارہ تمغے فٹ بال یا کرکٹ یا ہاکی انگریزی کھیلوں کے نام ہیں۔ جیت جانے والی ٹیم کو دیا جائے گا (ٹیم اس گروہ کو کہتے ہیں جس میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں اور ایک رقم مقرر کرتا ہے مثلاً دس یا پندرہ روپیہ جس کو فیس داخلہ کہتے ہیں۔ چنانچہ جو ٹیمیں رقم مقررہ ادا کرتی ہیں آپس میں مقابلہ کھیلتی ہیں۔ مثلاً دس ٹیمیں داخل ہوئیں۔ اس صورت میں کپ تیار کرنے والے کو سو روپے پہنچے اگر اس نے فیس داخلہ دس روپے مقرر کیا ہے۔ اب وہ ان دسوں

(۱) رقم الحدیث ۳۱۵۵
(مشکوٰۃ شریف باب اعلان النکاح الفصل الثانی: مرتب)

ٹیموں کے پانچ کھیل مقابلہ کراتا ہے یقیناً پانچ ہار جاتی ہیں اور پانچ جیت جاتی اب ان پانچ جیت جانے والیوں کا کھیل کراتا ہے غرضیکہ آخر میں دو ٹیمیں رہ جاتی ہیں پھر وہ کھیلتی ہیں۔ ان دونوں میں جو جیت جاتی ہے اس کو کپ اور گیارہ تمغے ملتے ہیں اور آخر ہاری بعد ٹیم کو صرف باقی ماندہ گیارہ تمغے ملتے ہیں اور باقی آٹھ ٹیمیں بالکل محروم رہتی ہیں گویا وہ ہار گئیں۔

مذکورہ بالا کھیلوں میں سے دو کھیل (فٹ بال اور ہاکی) جانگیا پہن کر کھیلے جاتے ہیں جس سے زانو جن کا کھولنا شرعاً حرام ہے کھلے رہتے ہیں لیکن اگر کوئی مسلمان متقی ہو تو وہ پاجامہ پہن کر کھیلنے کا محتاج ہے ورنہ غیر مسلم جانگیا پہن کر کھیلتے ہیں ایسے ہی عام مسلمان بھی دریافت طلب یہ امور ہیں کہ آیا یہ صورت جوا یا شرط دو طرفہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔ ان کھیلوں میں پاجامہ پہن کر کھیلنا جبکہ ساتھی زانو کھلے کھیل رہے ہوں مسلمان کے لئے کیسا ہے؟ اور دنگل وغیرہ کا بھی حکم بیان فرمائیے اس میں بھی پہلوان تقریباً ننگے ہی ہوتے ہیں۔ بمفصل بیان فرمائیں چونکہ دہلی میں بہت سے مسلمان نوجوان جو متبع شریعت مشہور ہی نہیں بلکہ حقیقتاً شریعت کے پابند ہیں ان امور میں شامل ہوتے ہیں۔

## الجواب

جب کھیلنے والی ٹیموں سے بھی فیس داخلہ کے نام سے رقم لی جاتی ہے اور انعام صرف جیتنے والوں کو دیا جاتا ہے تو یہ صورت قمار میں ہی داخل ہے اس لئے اس سے احتراز واجب ہے۔ مسلمانوں کو قمار ہرگز جائز نہیں۔

اور اگر قمار کی صورت نہ ہو تو یہ نفسِ ورزش جس سے صحت جسمانی مقصود ہو جائز ہے۔ بشرطیکہ ستر نہ کھلے اور ستر کی حفاظت کی جائے اور اگر بطور قمار کے یہ کھیل کھیلے ہوں تو ان کے کھیل کو دیکھنا بھی جائز نہیں کیونکہ دیکھنے والوں کی وجہ ہی سے ان کے حوصلے بڑھتے ہیں لہٰذا یہ بھی اس فعل میں ان کے معین ہیں اور کشف عورت کا گناہ اور بلا ضرورت نظر الی کشف العورت کا گناہ جدا رہا۔

قلت وان کان فی کشف الرکبۃ مندوحۃ عند غیر الاحناف وفی کشف الفخذ لعمل الارض ونحوہ سعۃ عند مالک

ولکن لا یفتی بغیرہ مذ ھبنا الا عند الحاجۃ۔ ولا حاجۃ فی ذلک اصلاً۔ اس سے دنگل کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ اس کا دیکھنا بھی بصورت کشف عورت جائز نہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی کھیلوں میں فی الجملہ تشبہ بالکفار بھی ہے جس سے مسلمان کو احتراز چاہیے کیونکہ تشبہ بالکفار امور مذہبی میں حرام اور شعار کفار میں مکروہ تحریمی اور عادات کفار میں مکروہ تنزیہی ہے۔

قال فی الدر: دعی الی ولیمۃ وثمۃ لعب او غناء قعد واکل لوفی اعتدل دون المائدۃ وان علم اولا باللعب لا یحضر اصلاً وفی السراج دلت المسئلۃ علی ان الملاھی کلھا حرام الی ان قال ومن ذالک ضرب النوبۃ تفاخرا فلو للتنبیہ فلا ۔ الشامی فاللعب وھو اللھو حرام بالنص قال علیہ السلام لھو المؤمن باطل الا فی ثلث تادیبہ فرسہ ورمیہ واھلہ الخ (ص ۲۲۴ ج ۵)

قلت دل جزئیۃ النوبۃ علی ان اللھو لا یبقی لھوا اذا کان فیہ نیۃ صالحۃ وانما اللھو ماکان علی قصد اللھو واللہ اعلم قال الشیخ معنی قولھم ان الملاھی کلھا حرام ای مثل تلک الملاھی وھی ماکان بالمعازف والآلات المطربۃ والا فقد رخص النبی صلی اللہ علیہ وسلم بشیئ من اللھو واللعب فی الاعیاد والاعراس وقد ورد فی النسائی ان جاریۃ کانت ترقص عند المسجد یوم العید فزجرھا عمر فنہاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقال دعھم فانھم۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ از تھانہ بھون

**ورزشں کی مختلف قسمیں اور ان کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ آج کل جو نئے نئے اقسام کی ورزش اس ملک میں رائج ہوگئیں ان کے بارے میں شریعت کا کیا فیصلہ ہے۔ آیا یہ کہ چونکہ یہ ورزشیں صحت وقوت بدنی حاصل کرنے کا ایک بہتر ذریعہ ہے جن کا مرغوب فیہ

وجوب ہونا آیت کریمہ بسطۃ فی العلم والجسم۔ نیز حدیث شریف المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف وفی کل خیر سے معلوم ہوتا ہے تو بقاعدہ شرعیہ مقدمات الشئ فی حکم ملحقاتہا۔ کیا یہ ورزشیں بھی جائز بلکہ محبوب و مرغوب فیہ ہو جائیں گی یا نہیں۔ ذیل میں ان ورزشوں کے مختلف اقسام لکھی جاتی ہیں۔

(الف) فٹ بال، کرکٹ، ہاکی، پولو، ٹینس وغیرہ آج کل اس قسم کے کھیلوں میں دنیا بھر میں ملوث ہونا شرط بازی اور انگریزوں کا لباس جیسے چڈی وغیرہ جس میں زانو کے اوپر کا حصہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

(ب) فاتیون انقرہ سے فٹ بال کھیلنا جن میں نہ تو ملوث ہونا شرط بازی چلتی ہے نہ تو لباس بدلا جاتا ہے۔ ان کا حکم بھی بتلا دیں۔

(ج) ایک ورزش ڈول (قواعد) جس میں بدن مختلف طرف سے ہلایا جاتا ہے یہ ملوث ہر سرکاری سکول میں ہر لڑکے سے جبراً کرایا جاتا ہے۔

(د) بعض ورزشیں سائنس وطب کے اصولوں کے موافق بنا کر بعض انگریزوں نے (مثلاً مسٹر سنڈو، ملکنڈن وغیرہ) نے ان ورزشوں کے نمونے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں اور فوٹو بھی دیئے ہیں اور یہ سمجھایا کہ اس قسم کی ورزش اس خاص مرض کا علاج ہے وغیرہ وغیرہ تو اگر کوئی شخص مسلمان ان صورتوں کو دیکھ کر یہ ورزشیں کرے تو اس کا کیا حکم ہے اور اگر فوٹو نہ دیکھے بلکہ کسی دوسرے آدمی سے سیکھ کر یہ ورزشیں کرے تو اس کا کیا حکم ہے۔

(س) انہی ورزشوں میں بعض خاص خاص اوزاروں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ جیسے ڈمبل، پیتل اور لوہے کی رسیاں وغیرہ جو کہ بعض طرق سے کرنے سے قوت بدنیہ خاص اور جلد اثر پیدا کرتی ہیں۔ بخلاف دوڑنے تیرنے وغیرہ کے تو ان کا بھی شریعت میں کیا حکم ہوگا۔

## الجواب

ہر ورزش جس سے بدن کی قوت وصحت مطلوب ہو فی نفسہٖ جائز اور مباح ہے اگر اس میں حرمت یا کراہت آئے گی تو کسی عارض کی وجہ سے آئے گی۔ مثلاً

کسی کی نیت کفار کے ساتھ تشبہ کی ہو یا ورزش کے وقت لباس کفار کا پہنا جائے یا اس کا وقت ایسا مقرر کیا جائے جس سے نماز ضائع ہو یا اس میں خلل پڑے یا ورزش میں قمار کی صورت ہو کر جانبین سے مال کی شرط ہو یا کسی ورزش میں کفار یا فساق کا اختلاط ناگزیر ہو یا کسی ورزش کا اثر طبائع پر یہ پیدا ہوتا ہو کہ اس کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں کفار کے ساتھ تشبہ کرنا معیوب نہ رہے بلکہ تشبہ کی رغبت پیدا ہو یا اس کے مثل اور کوئی عارض شرعی ہو۔ اس تفصیل سے تقریباً تمام سوالات کا جواب ہو گیا۔ اب خلاصہ کے طور پر بطور فیصلہ کے ہم کہتے ہیں کہ انگریزی ورزشوں میں جو ورزش دوسروں کے ساتھ مل کر کی جاتی ہے جیسے فٹ بال، ہاکی وغیرہ ان سے تو ہم منع کرتے ہیں اور مدارس دینیہ عربیہ کے طلبہ کو سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں کیونکہ یہ عوارض مذکورہ بالا سے خالی نہیں۔ کم از کم ان کا یہ اثر تو ضرور ہوتا ہے کہ عربی طلبہ کے دلوں میں تشبہ بالکفار کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے بعد انگریزی طلبہ کے ساتھ اختلاط بھی کرنے لگے ہیں نہ بقصد اصلاح و امر بالمعروف بلکہ بقصد موالات و لہو و لعب ولا یخفی ما فیہ من المفسدہ، اور جو انگریزی ورزشیں تنہا کی جا سکتی ہیں ان میں کچھ حرج نہیں جیسے بدن کو خاص طور سے حرکت دینا یا ڈمبل وغیرہ ہلانا بشرطیکہ ان ورزشوں کو تنہائی میں کیا جائے اور جن کتاب میں ورزشوں کے اصول لکھے ہیں۔ ان کو دیکھنا پاس رکھنا بھی جائز ہے مگر تصویروں کا چہرہ پھاڑ دینا یا سیاہی وغیرہ سے چھپا دینا لازم ہے۔

واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۴ رمضان ۱۳۴۶ھ

**گراموفون سے کون کون سی آوازیں سننی جائز ہیں**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل میں کہ گراموفون جو ایک مشہور و معروف مشین ہے جس کو بعض لوگ مجذب الصوت بھی کہتے ہیں جس کے اندر ہر قسم کی آواز بھر دی جاتی ہے اور جب چاہو اس مشین کے ذریعے اس صوت کو سن لو۔ یہ مشین کی آواز سننا کیسا ہے اس میں راگ کلام مجید کی آوازیں غرض ہر آواز بھری اور سنی جا سکتی ہے۔ اس میں کون سی آواز سننا جائز ہے اور کون سی

ناجائز؟ چونکہ اس نواح میں شہرت ہے کہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہ نے جواز کا فتویٰ دیا ہے لہٰذا ضرورت ہوئی کہ حضرت کی منشا خصوصیت سے معلوم ہو۔

## الجواب

گراموفون میں تقریریں اور جانوروں کی آوازیں سننا جائز ہیں اور قرآن مجید سننا جائز نہیں کیونکہ یہ تلہی بالقرآن ہے جو جائز نہیں اور اسی طرح راگ عورتوں کا سننا بھی جائز نہیں کیونکہ اس سے اجنبیہ کے ساتھ التذاذ ہے اور بالتلذذ از بالا جنبیہ ممنوع ہے اور مردوں کی راگ سننا جائز ہے بشرطیکہ راگ کے ساتھ ڈھول باجہ کی آواز بند کی گئی ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم هذا كله من القواعد

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ ۱۵ ذی الحجہ ۴۸ھ

تتمہ: اس کے بعد حضرت اقدس حکیم الامۃ دام مجدہم کا جواب جو مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی کے سوال پر مفصل لکھا گیا ہے دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ جن آوازوں کا سننا گراموفون میں جائز بھی ہے اس میں بھی جواز کی دو شرطیں ہیں۔

(۱) یہ کہ وہ کسی حرام کی طرف مفضی نہ ہو۔ مثلاً نماز وغیرہ سے غفلت نہ ہو اور اس کے فعل سے عوام مطلقاً گراموفون کی ہر آواز سننے کے جواز پر استدلال نہ کریں جبکہ یہ شخص عوام میں دیندار یا دینداروں کا خاص متعلق شمار ہوتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اصوات مباحہ کے سننے میں نیت محض تلہی کی نہ ہو بلکہ کوئی غرض صحیح ہو ورنہ مکروہ و خلاف اولیٰ ہوگا۔ (۱) حیرت ہے کہ اس قدر تفصیل کے بعد کس نے حضرت والا کی طرف گراموفون سننے کا جواز اطلاق کے ساتھ منسوب کر دیا۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفی عنہ

۱۹ ذی الحجہ ۴۸ھ

### تصویر اور فوٹو میں فرق اور کھینچنے اور کھنچوانے والے کی اقتداء کا حکم

سوال: بعض لوگ فوٹو اور تصویر میں فرق کرتے ہیں کہ فوٹو مثل آئینہ کے عکس کے

(۱) دیکھئے امداد الفتاویٰ (ج ۴/ ۲۴۵ تا ۲۵۱) مرتب

ہے۔ اس لئے جائز ہے اس کے متعلق شرعی حکم بتلایا جائے اور یہ کہ فوٹو کھینچنے والے اور کھنچوانے والے کی اقتدار کا کیا حکم ہے۔

## الجواب

اشد الناس عذاباً المصورون اخرجه الشیخان عن ابن مسعود مرفوعاً وفی الباب عن عمرو عن عائشۃ و ابن عباس و ابی ھریرۃ وعلی و ابی طلحۃ و ابن عمر و میمونہ وغیرھم من الصحابہ۔ ولاجل ذالک قال صاحب الحجۃ القاھرۃ ان حرمۃ التصاویر متواترہ ولکن الاحادیث التی تثبت بھا الحرمۃ کلھا احاد فرداً فرداً الا ان من مجموعھا تکون الحرمۃ متواترہ وفی التوضیح قال اصحابنا و غیرھم تصویر صورۃ الحیوان حرام شدید التحریم و ھو من الکبائر سواء صنعۃ لما یمتھن اولغیرہ (وان اختلف حکم الاستعمال فیھا) فحرام بکل حال واما مالیس فیہ صورۃ حیوان کالبحر ونحوہ فلیس بحرام بشرط ان لا یکون مما یعبد فیحرم وبمعناہ قال جماعۃ العلماء مالک والشافعی و سفیان و ابوحنیفۃ وغیرھم وذکر الحافظ نحوہ عن النووی قال۔ وقال بمعناہ جماھیر العلماء من الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم وھو مذھب الثوری ومالک و ابی حنیفۃ وغیرھم۔ (ص ۱۹۹ نووی مع مسلم) وعمدۃ القاری (۲۰۵/۴۲) وبالجملہ فالحرمۃ مجمع علیھا۔

تصویر کی حرمت احادیث متواترہ سے ثابت ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے۔ اس کے بعد چند مقدمات ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔ ایک یہ کہ جرائم کے مقدمات ومبادی بھی ہر قانون میں جرم سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں اور فساق و فجار کے ساتھ صورت و وضع میں بھی

مشابہت پیدا کرنا ممنوع ہے۔ یہ دونوں مقدمے عقل و نقل سے ثابت اور اسلام کے اہم مسائل میں سے ہیں۔

تیسرے یہ کہ حرام چیز کا نام بدل دینے سے وہ حلال نہیں ہو جاتی۔ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت کے لوگ شراب کا نام بدل کر اس کو پئیں گے اور بہت سے مجلس راگ باجے اور گانے بجانے کا مشغلہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دیں گے اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنا دیں گے پس جس طرح سود کا نام منافع اور رشوت کا نام حق الخدمت اور شراب کا نام برانڈی یا اسپرٹ اور قمار کا نام بیمہ لاٹری اور گانے کا نام گراموفون رکھ دینے سے وہ حلال نہیں ہو جاتے اسی طرح تصویر کشی کا نام فوٹوگرافی یا عکاسی کہہ دینے سے وہ حلال نہ ہو جائے گی۔

چوتھے یہ کہ اگر کسی فعل حرام کا طریقہ ذریعہ ارتکاب بدل جائے تو اس سے بھی وہ حلال نہ ہوگا جبکہ حقیقت اور وجہ حرمت باقی ہے مثلاً قتل کا کوئی نیا طریقہ ایجاد ہو جائے کہ بجلی کی رو سے جان نکال دی جائے یا شراب کی کشید کا نیا طریقہ ایجاد ہو جائے جس طرح آج کل مشینوں سے مقطر شراب حاصل کی جاتی ہے اور پہلے یہ طریقہ نہ تھا یا قمار کا نیا طریقہ ایجاد ہو جائے جیسا آج کل بیمہ اور لاٹری کی قسم سے بہت صورتیں ایجاد ہوئی ہیں جو پہلے نہ تھیں یا زنا کا کوئی نیا طریقہ رائج ہو جائے جیسا آج کل یورپ میں بہت سی صورتیں رائج ہیں تو اس سے یہ فعل محرم حلال نہ ہوگا۔ پس اسی طرح جب تصویر کشی حرام ہے تو اس کی جو صورت بھی ایجاد ہوگی حرام ہوگی۔ نام بدلنے یا طریقہ بدلنے سے حرمت زائل نہ ہوگی کیونکہ حرمت تصویر کا جو سبب ہے وہ مبادی شرک ہے وہ یہاں بھی موجود ہے۔ نیز مشابہت کفار بھی اس میں موجود ہے کہ یہ کام مسلمانوں کا نہیں رہا یہ کہنا کہ فوٹو کی پرستش نہیں ہوتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض جگہ ہوتی ہے اور نہ بھی ہو تو جب تصویر کا عام طریقہ آج کل یہی رہ گیا ہے تو اگر آج پرستش نہ ہوتی تو آئندہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیا ہاتھ کی تصویریں اور بت ایجاد کے دن ہی پوجے جانے لگے تھے۔ نہیں بلکہ کچھ مدت کے بعد ان کی پرستش ہوئی

اس لئے شریعت نے اس کو حرام کیا وہی سبب فوٹو میں موجود ہے، رہا یہ کہ فوٹو گرافی درحقیقت عکاسی ہے جیسے آئینہ اور پانی میں عکس اتر آتا ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے بڑا فرق تو دونوں میں یہی ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائیدار نہیں ہوتا اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کر لیا جاتا ہے پس وہ اسی وقت تک عکس ہے جب تک مسالہ سے اسے قائم نہ کیا جائے اور جب اس کو کسی طریقہ سے قائم اور پائیدار کر لیا جائے وہی تصویر بن جاتا ہے۔ رہا یہ کہ فوٹو گرافر مسالہ لگاتے ہوئے اعضاء کی تخلیق نہیں کرتا اس کا جواب یہ ہے کہ سانچہ میں مورتیں اور مجسمے ڈھالنے والا بھی اعضاء کو نہیں بناتا تو کیا ڈھلی ہوئی مورتیں اور مجسمے بھی جائز کر دیئے جائیں گے اس کا تو حاصل وہی ہوا کہ آج کل تصویر کشی کا طریقہ وہ نہیں جو پہلے تھا، سو اوپر بتلا دیا گیا کہ ارتکاب محرم کا طریقہ نیا ایجاد کرنے سے وہ حلال نہیں ہو جاتا۔ پھر کون نہیں جانتا کہ فوٹو کھینچنے اور کھنچوانے سے وہی مقصود ہے جو پہلے تصویر کشی سے مقصود تھا اور اس میں بھی مصور اور مصور کے فعل اختیار کو اسی طرح دخل ہے جس طرح تصویر کشی میں داخل تھا۔ پس دونوں حرمت میں برابر ہیں اور ان میں فرق کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہاتھ سے نچوڑی ہوئی شراب اور مشین سے مقطر شراب میں فرق کرنا۔ پس فوٹو کھینچنے والے اور کھنچوانے والے دونوں مرتکب حرام مرتکب گناہ کبیرہ اور بعض حدیثوں کی رو سے ملعون و فاسق ہیں۔ ایسے لوگوں کے نماز میں اقتداء مکروہ تحریمی ہے اور اس قسم کی تصویریں گھر میں یا اپنے پاس رکھنا سراسر گناہ اور حرام ہے مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ رسالہ احکام التصویر مصنفہ مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی مفتی دارالعلوم دیوبند مرقومہ ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ

ھذا ھو الحق وماذا بعد الحق الا الضلال۔

کتبہ اشرف علی ۲۳ رجب ۱۳۵۴ھ۔

# معاملات المسلمین باہل الکتاب والمشرکین

**ہندوؤں کے جلسہ میں شرکت کا حکم**

سوال: جس جلسے و مجمع میں لیکچرار ہندو اور عورتیں یا صرف ہندو مرد اور کچھ مولوی مدعو کئے جائیں اور سامعین ہندو مسلمان دونوں بلائے جائیں تو ایسے جلسے میں شرکت کرنی چاہئے کہ نہیں۔

## الجواب

ایسے جلسہ میں شرکت جائز نہیں۔

**ہندوؤں کے میلہ میں جانے اور خرید و فروخت کرنے کا حکم**

سوال: ہندوؤں کے میلہ میں جانا اور کوئی چیز خریدنا بیچنا اور اس کا کھانا یا استعمال میں لانا کیسا ہے۔ اگر کوئی مولوی میلہ کے اندر وعظ کہے تو اس کو میلہ کے اندر وعظ کہنا اور لوگوں کا وعظ کی نیت سے میلہ میں شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

ہندوؤں کا میلہ اگر مذہبی ہو تو اس میں شرکت جائز نہیں اور نہ مسلمانوں کو ان کے ایسے میلے میں اپنی دوکان لے جانی چاہئے۔ باقی سودا خریدنے میں دو قول ہیں۔ بعض فقہاء نے اس کو بھی منع کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اگر معمول کے مطابق ضروریات خریدنے جائیں اور اس میلہ کی وجہ سے خاص کوئی چیز نہ خریدی جائے تو جائز ہے مگر احتیاط اسی میں ہے کہ ان کے مذہبی میلہ میں سے کچھ بھی نہ خریدے کیونکہ خریداروں سے بھی میلہ کی رونق بڑھتی ہے اور کفار کے مذہبی میلہ کی رونق کو بڑھانا مناسب نہیں۔ ہاں اگر تجارتی میلہ ہو جیسے بعض جگہ جانوروں کی تجارت کے لئے میلہ لگتا ہے۔ اس میں جانے اور خرید و فروخت کرنے میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ ناچ رنگ وغیرہ سے دور رہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد

۲۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۶ھ

## کفار جو مال حرام طریقے سے حاصل کریں اس کا حکم

سوال: عرض ہے کہ میں نے اموال کفار کے متعلق بہت دریافت کیا کتابوں کا مطالعہ بھی کیا لیکن مجھ کو تشفی حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ حضرت اقدس کے ارشاد سے کچھ خلجان دور ہو گیا کہ ملازمین کو جو روپیہ دیا جاتا ہے اجرت وغیرہ میں یہ حلال ہے کسی اور شخص نے جو دلیل بیان کی ہے۔ نہایت شبہات پیدا ہو گئے۔ وہ دلیل یہ تھی کہ اموال ان کے اس واسطے حلال ہیں کہ کفار مکلف بالفروع نہیں چونکہ نورالانوار میں مجھ کو اس کے متعلق معلوم تھا مگر مطالعہ کر کے کچھ تشفی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ کفار مخاطب بالعقوبات و بالمعاملات و بالاعتقادیات تو ہیں۔ الغرض شبہات بہت ہیں پس سوال یہ ہے کہ کفار سے عام مراد ہیں خواہ ذمی ہو یا حربی پھر انہوں نے جس طریقہ سے مال کو کمایا ہو یعنی بیوع باطلہ فاسدہ سے غصب، چوری یا سود سے اور معاملات میں مخاطب فقط آپس میں جو معاملات کرتے ہیں یا عام ہے خواہ آپس میں ہو یا ذمی کے ساتھ یا خواہ مسلم کے ساتھ چونکہ مجھ کو حضرت کی تصنیفات میں سے کوئی تصنیف معلوم نہ تھی۔ لہٰذا عرض کرنے پر آمادہ ہوا۔

### جواب اوّل از حضرت مولانا مدظلہٗ

اس کا پورا جواب تو مراجعت کتب کے بعد ہو سکتا ہے مجھ کو فرصت نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہ سوال مولوی ظفر احمد کو دے دیا جائے وہ تحقیق کر کے جواب لکھ دیں گے۔ باقی جو کچھ میرے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ کفار سے مراد عام ہیں اور حلت اموال بھی تمام عقود باطلہ و استیلاء کو عام ہے۔ سرقہ و خداع اس میں داخل نہیں اور غصب میں شبہ ہے ملحق باستیلاء ہے یا ملحق بسرقہ اگر آپ کو کہیں سے تفصیل مسئلہ کی تحقیق ہو جائے تو مجھ کو بھی اطلاع کیجئے۔ اور اگر خانقاہ ہی میں تحقیق ہو جائے تو مجیب سے کہہ دیجئے کہ مجھ کو بھی مطلع کر دیں۔

### جواب دوم از مولوی ظفر احمد صاحب

قال فی الھدایۃ: و اذا تزوج النصرانیۃ علی میتۃ أو علی غیر مہر و ذالک فی دینہم جائز فدخل بہا او طلقہا قبل الدخول بہا او مات عنہا فلیس لہا مہر و کذالک الحربیان فی دار الحرب

وهذا عند ابی حنیفة وهو قولهما فی الحربیین واما الذمیة فلها مهر مثلها ان مات عنها او دخل بها والمتعة ان طلقها قبل الدخول بها وقال زفر لها مهر المثل فی الحربیین ایضا له ان الشرع ما شرع ابتغاء النکاح الا بالمال وهذا الشرع وقع عاما فنثبت الحکم علی العموم ولهما ان اهل الحرب غیر ملتزمین احکام الاسلام وولایة الالزام منقطعة لتباین الدار بخلاف اهل الذمة لانهم التزموا احکامنا فیما یرجع الی المعاملات کالربا والزنا وولایة الالزام محققة لاتحاد الدار ولابی حنیفة ان اهل الذمة لا یلتزمون احکامنا فی الدیانات وفیما یعتقدون خلافه فی المعاملات وولایة الالزام بالسیف وبالمحاجة وکل ذلک منقطع عنهم باعتبار عقد الذمة. فانا امرنا بان نترکهم وما یدینون فصاروا کاهل الحرب بخلاف الزنا لانه حرام فی الادیان کلها والربا مستثنیٰ عن عقودهم لقوله علیه الصلوٰة والسلام الامن اربیٰ فلیس بیننا وبینه عهد اھ۔

وقال فی فتح القدیر. الهمام ان اهل الحرب غیر ملتزمین الاحکام ولیس لنا علیهم ولایة الالزام بخلاف اهل الذمة فانهم التزموها فی المعاملات وولایة الزامنا ثابتة فنعزره اذا زنیٰ وننهاه عن الربا ونحکم بفساده والنکاح منها ولذا نجری علیهم احکامه من لزوم النفقة والعدة وثبوت النسب والتوارث به وثبوت خیار البلوغ وحرمة المطلقة ثلثا ونکاح المحارم الخ وفیه ایضا (قوله ولابی حنیفة) حاصله منع المقدمة القائلة انهم (ای اهل الذمه) التزموا احکامنا فی المعاملات بل لیسوا ملتزمین بعقد الذمة ما یعتقدون خلافه منها الا ما شرط علیهم ولذا لا نمنعهم من بیع الخمر والخنزیر

ونکاح المحارم الخ (ج ۳/۲۹۰) وفی الهدایة ایضًا واذا تزوّج الکافر بلا شهود وفی عدّة کافر وذالك فی دینهم جائز ثم اسلما أُقرّا علیه وهذا عند أبی حنیفة وقال زفر النکاح فاسد فی الوجهین الا انهٗ لا یتعرض لهم قبل الاسلام والمرافعة إلی الحکام. قال ابویوسف ومحمدؒ فی الوجه الاوّل کما قال ابوحنیفة وفی الوجه الثانی کما قال زفر له (ای لزفر) ان الخطابات عامّة علی مامرّ من قبل فتلزمهم وانما لا یتعرض لهم لذمّتهم اعراضًا لا تقریرًا فاذا ترافعوا او اسلموا والحرمة قائمة وجب التفریق ولهما ان حرمة النکاح ولهما ان حرمة نکاح المعتدة مجمع علیها فکانوا ملتزمین لها وحرمة النکاح بغیر شهود مختلف فیها ولم یلتزموا احکامنا بجمیع الاختلافات ولأبی حنیفة أن الحرمة لا یمکن اثباتها حقًا للشرع لأنهم لا یخاطبون بحقوقه ولا وجه الی ایجاب العدة حقًا للزوج لأنهٗ لا یعتقدهٗ الخ وفی الفتاوی السعیدیات ولو اداف التاجر حربیهٗ او استدان من حربی او غصب احدهما الآخر ثم خرجا إلی دار الاسلام وترافعا امّا القاضی لا یحکم بشیٍٔ لاحدهما علی الآخر لعدم الولایة والقضاء یعتمد ها فی وقت (الولایة) الادانة والاستدانة معدومة وفی وقت القضاء الولایة معدومة علی المستأمن فیما مضی من فعله والتزامهٗ فیما یستقبل فی حق احکام یباشرها فی دار الاسلام فلا طریق إلی الحکم ولکن یامر المسلم ویفتی بالرد بعدا عن الغدر والحربیات اذا فعلا هذا وکذ لك لو اسلما وخرجا إلی دار الاسلام وترافعا عند القاضی قضی بینهما بالدین لصحة المداینة بتراضیهما ولثبوت الولایة حال القضاء لانهما التزما احکام الشرع بالاسلام

ولا یقضی بالغصب لتملك الغاصب لورود الید علی المباح حتی لا یفتی بالرد (ج ۴/ ۲۵۳)

وفی الهدایة ایضًا اذا تزوج المجوسی امه او بنته ثم اسلما فرق بینهما، وفی الکفایة وقال ابو یوسف ومحمد هذا النکاح باطل فی حقهم ولا یتعرض لهم بعقد الذمة لان الخطاب بحرمة هذه الانکحة شائع فی دیارنا وهم من اهل دیارنا فثبت الخطاب فی حقهم لانه لیس فی وسع المبلغ التبلیغ الی الکل وانما فی وسعه جعل الخطاب شائعًا فیجعل شیوع الخطاب کالوصول الیهم ولابی حنیفة ان الخطاب فی حقهم کانه غیر نازل لانهم یکذبون المبلغ ویزعمون انه لیس برسول الله ولا ولایة الالزام بالسیف او المحاجة وقد انقطعت بعقد الذمة فقصر حکم الخطاب عنهم وشیوع الخطاب انما یعتبر فی حق من یعتقد رسالة المبلغ فاذا اعتقدوا ذلك بان اسلموا ثبت حکم الخطاب۔

عبارات مذکورہ سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔

(۱) امام زفرؒ کے نزدیک تمام خطابات عامہ واردہ فی الشرع دربارۂ معاملات کفار کو بھی شامل ہیں خواہ وہ حربی ہوں یا ذمی اور عموم خطاب کی وجہ سے حکم بھی کوثًا ثابت ہوگا بلذا جو معاملات کفار اہل حرب واہل ذمہ خلاف شرع کریں گے ان پر حکم فساد لگایا جائے گا مگر اہل حرب سے بوجہ عدم ولایت واہل ذمہ سے بوجہ معاہدہ کے تعرض نہ کیا جائے گا۔

(۲) صاحبینؒ کے نزدیک اہل حرب کے معاملات خلاف شرع ہیں ہر ایک پر حکم فساد نہ لگایا جائے گا کیونکہ انہوں نے احکام اسلام کا التزام نہیں کیا گویا ثبوت حکم کے لئے ان کے نزدیک عموم خطاب کافی نہیں بلکہ التزام بھی شرط ہے اور وہ اہل حرب میں مفقود ہے لیکن اہل ذمہ کے جو معاملات اسلام کے مسائل متفق علیہا کے خلاف ہوں گے ان پر حکم فساد لگایا جائے گا کیونکہ وہ معاملات میں احکام اسلام کا التزام

کر چکے ہیں۔

(۳) امام اعظمؒ کے نزدیک اہل ذمہ کے بھی معاملات خلاف شرع پر حکم فساد نہ لگایا جائے گا بشرطیکہ وہ معاملات خود ان کے دین کے موافق ہوں کیونکہ اہل ذمہ نے معاملات میں احکام اسلام کا التزام اپنے معتقدات کے خلاف میں نہیں کیا۔ ہاں اگر کسی معاملہ کی بابت معاہدہ ہی میں ان سے شرط کر لی جائے اس کا التزام ان کی طرف سے ہوگا۔ باقی معاملات شرعیہ جو ان کے معتقدات کے موافق نہیں اور نہ ان سے ان کے بارے میں کوئی شرط کی گئی ہے۔ ان میں اہل ذمہ کی طرف سے التزام نہیں پایا گیا لہٰذا ایسے معاملات جب وہ اپنے مذہب کے موافق کریں گے تو ان کو صحیح مانا جائے گا اور حکم فساد نہ دیا جائے گا۔ اس تفصیل سے شبہات مذکورہ سوال کا جواب ظاہر ہوگیا۔ اشکال کا منشا یہ تھا کہ جب کفار مخاطب بالعقوبات و معاملات ہیں تو اگر وہ کوئی معاملہ خلاف شرع کر کے روپیہ حاصل کریں اس کو حلال نہ کہنا چاہیے بلکہ حرام کہنا چاہیے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ کفار مخاطب بالشرع فی العقوبات والمعاملات اگرچہ ہیں لیکن حکم بالحرمۃ والفساد کے لئے خطاب عام کافی نہیں بلکہ التزام بھی شرط ہے۔ اہل حرب نے تو احکام اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا۔ نہ اپنے معتقد کے موافق ہیں اور نہ مخالف میں لہٰذا وہ تو جس طرح بھی روپیہ کمائیں خواہ ربا سے خواہ غصب سے خواہ بیوع باطلہ و فاسدہ سے خواہ اپنے مذہب کے موافق خواہ مخالف طریقے سے بہرصورت وہ روپیہ وغیرہ ان کی ملک میں داخل ہو جائے گا اور مسلمان کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے اور اہل ذمہ نے احکام اسلام کا التزام اپنے معتقدات کے موافقات میں کیا ہے۔ مخالفات میں نہیں کیا۔ سوا ان امور کے جن کی شرط ان سے کر لی جائے۔ پس جو عقد اہل ذمہ اپنے دین کے موافق کریں اور شرائط معاہدہ کے بھی خلاف نہ ہو اس میں حکم صحت دیا جائے گا گو وہ شریعت کے خلاف ہو البتہ جو عقد ان کے دین کے بھی خلاف ہو یا شرائط معاہدہ کے خلاف ہو اس میں حکم فساد دیا جائے گا۔ ولعل الحق لا یتجاوز عن ذالک ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۹ ذی القعدہ ۱۳۴۳ھ

**ہندو اگر اسلام کی مخالفت میں سنکھ بجانا شروع کردیں تو اس کو روکنے کا حکم**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسئلہ میں کہ شہر الہٰ اہل ہنود کے متصل مسجد اور مکانات اہل اسلام واقع ہیں کبھی سنکھ وغیرہ نہیں بجایا گیا مگر اب اہل ہنود نے اس امر کی تجدید کی ہے اور اہل اسلام کے مانع ہونے کے باعث اہل ہنود کی جانب سے بغرض دل آزاری سنکھ بجانے کا عزم بالجزم کرلیا گیا۔

(۱) آیا اس جدید فعل کو محض دل آزاری کی غرض سے کرنے پر ہتک اسلام ہوگی یا نہیں

(۲) اگر ہتک اسلام ہو تو مسلمانوں کا ایسے موقع پر کیا فرض ہے۔

(۳) اگر حرمت اسلام برقرار رکھنے کے لئے مسلمان جدوجہد کریں اور نقصان جان ہو تو ان کو درجہ شہادت ملے گا یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

## الجواب

قال فی رد المحتار: علی انہ لو ارادوا ان یتخذ بیتاً لھم معد اللکنیٰ ککنیسة یجتمعون فیه یمنعون منه لان فیه معارضةً للمسلمین وازدراءً بالدین اھ اسے لانهٗ زیادة معبد لھم عارضوا به معابد المسلمین۔

(۱) جب سنکھ بجانا ایک عرصہ سے ہنود نے بند کر رکھا ہے تو ان کا اس جدید امر کو ظاہر کرنا مسلمانوں کی اہانت وتحقیر ہے اور مسلمانوں کی اہانت سے مذہب اسلام کی اہانت بھی لازم آتی ہے۔

(۲) مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ اس موقع پر حکومت کی طرف صدائے احتجاج بلند کریں اور گورنمنٹ کو توجہ دلائیں۔ اگر حکومت نے مسلمانوں کے حق میں موافق فیصلہ کیا تو شکر کریں اور اگر خلاف فیصلہ کیا (العیاذ باللہ منہ) تو صبر کریں کشت وخون وغیرہ نہ کریں کیونکہ اس میں حکومت سے مقابلہ لازم آئے گا جس کی مسلمانوں میں قدرت نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۹ صفر [illegible]

## ہندوؤں کے طعام اور روغن کا حکم

سوال: ہندو (بنیہ) لوگ جو اکثر ہمارے ملک سندھ میں دوکاندار اور تونگر دباج خور لوگ ہیں ان کی روٹی اور شوربا گوشت اور مینی اور برنج وغیرہ کھانا درست ہے یا نہیں۔ نیز ان کا گھی (روغن زرد) اور مٹھائی جلیبی حلوا تیار کیا ہوا کھانا درست ہے یا نہ۔

### الجواب

ہندو کی روٹی کھانا درست ہے لیکن گوشت کھانا درست نہیں اور چاول وغیرہ کھانا درست، گھی مٹھائی وغیرہ کھانا درست ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ

۱۹ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

## کافر کو سلام کرنے کا طریقہ

سوال: غیر مسلم سلام علیک کرتے ہیں ان کا جواب وعلیکم دینا چاہیئے یا نہیں۔ اب تک خاکسار سلام علیک کا جواب وعلیکم السلام دیتا رہا۔

### الجواب

غیر مسلم اگر سلام کرے تو اس کے جواب میں صرف وعلیک کہہ دیا جائے زیادہ نہیں۔ فی البخاری: اذا سلمت الیهود علیکم فقولوا وعلیکم او کما قال۔ واللہ اعلم۔

حررہ ظفر احمد

از تھانہ بھون ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

## کفار سے دوستی اور میل جول رکھنے کا حکم

سوال: کسی مرد غیر مذہب (انگریز جو اہل کتاب ہیں) کے ساتھ دوستی یعنی محبت پیار اچھا سلوک ہمدردی رکھنا کیسا ہے؟

### الجواب

کفار سے معاملات بیع وشراء اجارہ وغیرہ جائز اور ظاہری میل جول میں بھی مضائقہ نہیں اگر میل جول کے بغیر چارہ نہ ہو باقی بلا ضرورت

میل جول کرنا جائز نہیں اور رابطہ محبت و دوستی بھی جائز نہیں۔ باقی معاملات ہر حال میں جائز ہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون ۲۷ جمادی الاولیٰ [illegible]ھ

**مرتد سے معاملات تجارت رکھنے کا حکم**

سوال: مرتد سے معاملات تجارت وغیرہ رکھنا جائز ہے یا نہیں۔

## الجواب

دار الحرب کے مرتدین کا حکم حربی مسالم کا حکم ہے فقہاء نے جو مرتد کی ملکیت کے زوال کا حکم کیا ہے وہ دار الاسلام کے ساتھ خاص ہے کیونکہ علت زوال ملک کی بس کا حکم سبب ہوتا ہے۔ للأمر بقتله اور دار الحرب میں مرتد قتل نہیں ہوتا۔ لعدم الولاية للامام عليه فكانت كالمرأة إذا ارتدت قال في البحر وقيد في المرتد لأن المرتدة لا يزول ملكها عن مالها بلا خلاف فيجوز تصرفاتها بالاجماع لأنها لا تقتل فلم تكن ردتها سببا لزوال ملكها كذا في البدائع. وينبغي أن يلحق بها المرتد إذا لم يقتل من كان في إسلامه شبهة كما قدمناه بجامع عدم القتل ولم أره صريحا اهـ (ص ۱۳۹ ج ۵) وفيه أيضا لأنه باللحاق (بدار الحرب) صار من أهل الحرب۔

ان تمام جزئیات کا مقتضی یہی ہے کہ مرتدین دار الحرب کا وہی حکم ہے جو دوسرے حربیوں کا حکم ہے البتہ ان سے نفرت و کراہت زیادہ ظاہر کرنا چاہئے لکون کفرهم اشد باقی شراء و بیع ان کے ساتھ جائز ہے البتہ ان کی دعوت و ضیافت نہ قبول کی جائے نہ ان کے ساتھ مودت و ملاطفت کی جائے مگر یہ کرنا لیف قلب سے یا امید ہو کہ اسلام کی طرف عود کر آئے گا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ
۱۳ شوال [illegible]ھ

**نمائشی میلوں میں جانے اور خرید و فروخت کرنے کا حکم**

سوال: بلند شہر اور علی گڑھ کی نمائش میں چیزیں فروخت ہونے کے لئے آتی ہیں اور گھوڑے بھی

فروخت ہونے کے لئے آتے ہیں اور بعض چیزیں سستی بکتی ہیں اور بعض چیزیں قصبات اور دیہاتوں میں نہیں ملتی اور یہاں مل جاتی ہیں مگر جو چیزیں نمائش میں ملتی ہیں وہ بڑے شہروں میں بھی مل جاتی ہیں اگر کوئی شخص تماشہ نہ دیکھے صرف چیزیں خریدے یا مال فروخت کرنے یا گھوڑ دوڑ دیکھنے کو یا تفریح کو جائے تو درست ہے یا نہیں۔

## الجواب

نمائش میں جو گورنمنٹ کے انتظام سے جابجا ہوتے ہیں محض تجارتی میلے ہیں۔ کفار کے مذہبی میلے نہیں ہیں اس لئے ان نمائشوں میں تجارتی مال لے جانا یا وہاں سے مال خریدنا دونوں جائز ہے اور تفریحاً جانا بھی جائز ہے بشرطیکہ کان اور نگاہ کی حفاظت دشوار نہ ہو۔ اگر دشوار ہو تو اسی جگہ بلا ضرورت جانا جائز نہیں اور اہل علم اور مقتدا کو ایسے مقامات پر جانا مطلقاً ممنوع ہے کہ ان کے فعل سے عوام اس کی اباحت مطلقہ پر استدلال کریں گے اور حفاظت سمع اور بصر کو بھی ضروری نہ سمجھیں گے۔ ھذا ما عندی ولعل عند غیری احسن منہ۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۵ شوال ۱۳۵۳ھ

## کفار کی مذہبی دعوتوں میں شرکت جائز نہیں ہے

سوال: گزارش ہے کہ یہاں پر ایک ہندو اور اس کے رشتے نے اپنی مذہبی رسم (یعنی ایصال ثواب) میں اہل شہر مسلم اور ہندو سب کو دعوت دی۔ مسلمانوں کو اس دعوت میں شرکت کرنا اور دعوت قبول کرنا یا بغیر شرکت کے اگر وہ کھانا خود بخود بھیج دے تو شرعاً وہ کھانا جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

مسلمانوں کو اس دعوت میں شریک ہونا جائز نہیں کیونکہ یہ دعوت ہندوؤں کی مذہبی دعوت ہے اور کفار کی مذہبی دعوتوں میں شرکت جائز نہیں۔

ودلیلہ ما ذکرہ ابن تیمیۃ فی "الاقتضاء" ولقد سأل سعید الصنافری مالکا عن الطعام الذی تصنعہ النصاریٰ لموتاھم یتصدقون بہ عنھم أیأکل منہ المسلم فقال لا ینبغی أن یأخذ

منہم لأنہ انما یعمل تعظیماً للشرک فہو کالمذبح للاعیاد والکنائس اھ ص ۱۰۱۔ اگر یہ دعوت مذہبی نہیں بلکہ ویسے ہی خوشی کی دعوت ہے تو اس میں شرکت جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ، ۱۵ شوال ۵۳ھ

(نوٹ) چونکہ سوال میں اس کو مذہبی رسم لکھا ہے اس بناء پر جواب دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

# مسائل متفرقہ

ردی کاغذ کے استعمال کا حکم ؛ سوال : پراگندہ اوراق یا بوسیدہ قرآن مجید کو دفن یا دریا برد کیا جائے یا کس طرح نیز دیگر اوراق انگریزی اخبارات وغیرہ کی (جن میں بعض مواقع پر آیات اور انگریزی کتب یا اخبارات وغیرہ میں تصاویر بھی ہوتی ہیں) کس طرح تلف کیا جائے۔ الجواب

قال فی العالمگیریۃ۔ المصحف اذا صار خلقاً لا یقرأ منہ ویخاف ان یضیع یجعل فی خرقۃ طاھرۃ ویدفن ودفنہ اولی من وضعہ موضعاً یخاف ان یقع علیہ النجاسۃ اھ (ص ۲۱۹ ج ۱۹) وفیہ (۲۱۷) المصحف اذا صار خلقاً وتعذر القرأۃ منہ لا یحرق بالنار اشار الشیبانی الی ھذا وبہ نأخذ اھ۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو تو دفن کر دینا چاہیئے جلانا نہ چاہیئے باقی اوراق جن میں قرآن کی آیت یا خدا اور رسول کا نام ہو اس میں سے آیت اور خدا اور رسول کا نام نکال لینا چاہیئے۔ ان کو دفن کر دیا جائے اور باقی کو جلا دینا جائز ہے مگر قرآن اور خدا کے نام کو اس طرح دفن کیا جائے جس طرح بغلی قبر میں مردہ کو رکھا جاتا ہے تاکہ اس پر مٹی نہ پڑے۔ ویلحد لہ لانہ لو شق ودفن یحتاج الی اھالۃ التراب علیہ وفی ذالک نوع تحقیر الا اذا جعل فوقہ سقف بحیث لا یصل التراب علیہ فہو حسن ایضاً کذا فی الغرائب اھ

عالمگیریہ۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ
۲۶ ربیع الثانی سنہ ۵۲ھ

اپنا نام چندہ دینے والوں کی فہرست میں لکھوا دینا ایک قسم کا وعدہ ہے

سوال: زید نے ایک مدرسہ کی مسجد کی تعمیر میں کچھ چندہ دینے کے لئے اپنا نام لکھوا دیا جس کو غالباً سات برس کا زمانہ گزر گیا۔ ایک بوجہ ناداری اور دوسرے کم توجہی اور تیسرے مدرسہ کے مدرسین تیچری معلوم ہوتے ہیں اس خیال سے زید نے اب تک چندہ کا روپیہ مسجد میں نہ دیا۔ گو مدرسہ کی جانب سے تقاضہ بھی نہیں تو آیا یہ چندہ لکھوا کر کے وسعت ہوتے ہوئے بھی یا کسی اور عارض کی وجہ سے نہ دے تو عنداللہ زید ماخوذ ہوگا کہ نہیں۔

## الجواب

اگر کسی مدرسہ یا مسجد میں چندہ لکھوا دیا جائے تو اس کا حکم وعدہ کا ہے وعدہ کا ایفا کرنا بشرط قدرت واجب ہے اور بقول بعض سنت ہے اور اگر کوئی عذر ایفاء وعدہ سے مانع ہو جائے تو وعدہ خلافی کا گناہ نہ ہوگا اب وہ عذر خواہ چندہ لکھوانے والے کی جانب میں ہو کہ نادار ہو گیا یا چندہ لینے والوں کی جانب میں ہو کہ پہلے ان پر اعتماد تھا اب نہیں رہا۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۷ شوال سنہ ۵۲ھ

بکری کی رسی پر چلنا

سوال: بکری کی رسی پر قدم رکھنا اور اس کے اوپر سے چلنا جائز ہے کہ نہیں؟

## الجواب

بکری کی رسی پر قدم رکھنا اور اس پر چلنا اس میں شبہ کی کیا بات ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا۔ واللہ اعلم۔

اس شخص کے مال کا حکم جس کی غالب آمدنی حرام یا غالب آمدنی حلال ہے

سوال: حضرت گنگوہیؒ یہ فرماتے ہیں کہ کثرت وقلت کا اعتبار واں ہے کہ جہاں خاص کھانے کی نسبت پر تحقیق نہ

کہ یہ حلال ہے یا حرام اور جب اس بات کی تحقیق ہو کہ اس کھانے میں وہ دودھ مثلاً حرام کا ہے یا کچھ حرام کا ہے یا مثلاً حرام کی ہے تو کھانا کس طرح درست نہیں اس میں حرام گو کتنا ہی تھوڑا ہو۔ فقط از (فتاویٰ رشیدیہ جلد سوم ص ۱۲۶)

اور الاشباہ والنظائر میں "اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام" مستقل قاعدہ بیان کیا ہے اور اس بیان میں صفحہ میں ہے۔

اذا کان غالب مال المهدی حلالاً فلا بأس بقبول هديته واکل ماله مالم يتبين أنهٗ من حرام۔

مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی کے فتاویٰ جلد سوم ص ۱۱۰ میں ہے۔ اگر غالب مال حلال باشد قبول کردن دعوت جائز است مگر اینکہ متیقن شود کہ این دعوت از حرام است آن زمان جائز نیست اھ۔

ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دار و مدار اشتباہ اور تیقن پر ہے اور مولانا سہارنپوری مدظلہ نے فرمایا ہے کہ مخلوط بالیقین میں اگر غالب حرام ہے تو حرام اور اگر غالب حلال ہے تو مکروہ تحریمی ہے۔

## الجواب

قلت وذكر في الاشباه بعد قوله المذكور قال في القنية من الكراهة غلب على ظنه ان اكثر بياعات اهل السوق لا تخلو عن الفساد فان كان الغالب هو الحرام تنزه عن شرائه ولكن مع هذا لو اشتراه يطيب له قال الشارح و وجهه ان كون الغالب في السوق الحرام لا يستلزم كون المشترى حراماً فجواز كونه من الحلال المغلوب والاصل الحل اھ وفيه ايضاً واما مسئلة ما اذا اختلط الحلال بالحرام في البلد فانه يجوز الشراء والأخذ الا ان تقوم دلالة على

---

عہ: قلت وهذا يفيد جواز شراء البنج في ديارنا وان كان غالب بياعاته حرماً فافهم ۱۲ منه۔

انه من الحرام كذا فى الأصل اھ قال الشارح فى المترباشى فى باب المسائل المتفرقة من كتاب الكراهية ما نصّه لرجل مال حلال اختلطه مال من الربوا والرشاد او الغلول او السحت او من المال الغصب او السرقة او الجناية او من مال اليتيم فصار ماله كله شبهة ليس لأحد ان يشاركه او يبايعه او يستقرض منه او يقبل هدية او يأكل فى بيته وكذا اذا منع صدقاته وزكاته وعشره صار ماله شبهة لما فيه اخذه من مال الفقير وينبغى ان ترى الاشياء حلالا فى ايدى الناس فى ظاهر الحكم ما لم يتبين لك شئ مما وصفنا اھ ص ۹۲۔

وفى العالمگيرية من كتاب الكراهية ما نصّه اهدى الى رجل شيئا و اضافه ان كان غالب ماله من الحلال فلا بأس الا ان يعلم بانه حرام فان كان الغالب هو الحرام ينبغى ان لا يقبل الهدية ولا يأكل الطعام الا ان يخبره بانه حلال ورثه او استقرضه كذا فى الينابيع ولا يجوز قبول هدية امراء الجور لان الغالب فى مالهم الحرمة الا اذا علم ان اكثر ماله حلال بان كان صاحب تجارة وزرع لان اموال الناس لا يخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب وكذا أكل طعامهم قال الفقيه ابو الليث اختلف الناس فى اخذ الجائزة من السلطان قال بعضهم يجوز ما لم انه يعطيه من حرام قال محمدؒ وبه نأخذ ما لم نعرف شيئا حراما بعينه وهو قول ابى حنيفةؒ واصحابه كذا فى الظهيرية اھ (ج ۴/۲۲۰) وفيه ايضا اكل الربوا او كاسب حرام يهدى اليه او اضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل ما لم يخبره أن ذالك المال اصله حلال ورثه او استقرضه وان كان

عــہ قلت لعله جنى على الورع كما يظهر من قوله الاخير ۱۲ د

غالب ماله حلالاً لا بأس بقبول هديته والأكل منه كذا في الملتقط۔

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ جس شخص کی آمدنی حلال اور حرام سے مخلوط ہو اس میں غالب کا اعتبار ہے۔ غالب حلال ہے تو اس کا ہدیہ و ضیافت قبول کرنا جائز ہے لیکن اگر خاص ہدیہ یا طعام کی بابت یقیناً معلوم ہو جائے کہ اس میں کچھ حرام ملا ہوا ہے تو اس کا قبول کرنا حرام ہے اور کھانا بھی مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خلط استہلاک ہے اس لئے ان کے قول پر گنجائش ہے جیسا کہ بعض روایات سے ظاہر ہوگا اور اگر غالب آمدنی حرام ہے تو ہدیہ و ضیافت قبول کرنا حرام ہے ان اگر اس طعام و ہدیہ کی بابت اطلاع کردے کہ یہ حلال ہے تو جائز ہے اس کی تکذیب یا تفتیش کی ضرورت نہیں اور جائزہ سلطان کے مسئلہ میں محمدؒ کے قول سے ظاہراً یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس شخص کی غالب آمدنی حرام ہو تو ہدیہ قبول کرنا جائز ہے جب تک خاص اس شئی کی بابت حرام ہونے کا علم نہ ہو مگر یہ صحیح نہیں ہے بلکہ محمدؒ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی غالب آمدنی حلال ہو اور اس میں حرام مخلوط ہو اس وقت اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ مالم یعرف شیئاً حراما بعینہ کیونکہ امام محمدؒ کے زمانہ میں سلاطین کی غالب آمدنی حلال تھی۔ یدل علیه ما ذکر في العالمگيرية بعد ما نصه وفي فتاوى أهل سمرقند رجل دخل على السلطان فقدم عليه بشيء مأكول فان اشتراه بالثمن أو لم يشتر فالملك ولكن هذا الرجل لا يفهم أنه مغصوب بعينه حل له أكله هكذا ذكر والصحيح انه ينظر إلى مال السلطان ويبني الحكم عليه كذا في الذخيرة (ج ۹/ ۲۲۹) والله اعلم۔

۲۷ جمادی الاولی ۱۳۴۳ھ

وفي الفتاوى السلطان اذا قدم شيئا من المأكولات أن اشتراه يحل وان لم يشتر ولكن الرجل لا يعلم ان في الطعام شيئا مغصوبا بعينه يباح أكله (ج ۴/ ۳۵۸) قلت رقيود والفقه احتراز به فلو علمات فيه شيئا مغصوبا بعينه لا يحل

سواء کان غالباً او مغلوباً یدل علی ذالک قولہ شیئاً بالتنکیر۔ وقال العلامہ عبدالحیؒ فی حکم المال المشکوک ما نصّہ واگر بدین وجہ مشکوک گردیدہ کہ مال حلال ومال حرام جمع کردہ شد وامتیازے باقی نماندہ پس اورا تصدق باید کرد۔ طحطاوی در حاشیہ درمختار می آورد والذی فی البزازیۃ انہ ان علم مال الحرام بعینہ لا یحل لہ اخذہ وان لم یعلم بعینہ اخذہ حکما واما فی الدیانۃ فانہ یتصدق افادہ الحموی اھ (مجموعہ فتاویٰ ج ۴ ص ۳۴۶ مع خلاصہ) وقال فی موضع آخر ودر رسالہ حفظ الاصغرین نوشتہ فان قلت کیف ساغ للفقیر تناول ما فیہ خبث قلت محلہ عدم علمہ بحقیقۃ الحال وان علم بہ فھو لغیرہ لا یحل لہ اھ (ج ۴/ ص ۳۵۰) قلت وقد علم من البزازیۃ ان المخلوط من الحلال والحرام اذا لم یتمیز یجب التصدق بہ دیانۃ وعلم بھذا ان الفقیر لو علم بذالک ای بان فیہ خبثاً لا یحل التناول ایضاً وھذا یعم القلیل والکثیر واعتبار الغلبۃ انما ھو حیث یعلم من حال الرجل انہ کاسب للحرام والحلال جمیعاً ولا یعلم ان ما اھداہ الی بعینہ مخلوط من الحلال والحرام جمیعاً فلو علم یحرم علیہ التناول۔

واللہ اعلم۔ ھذا کلہ مبنی علی قول ابی یوسفؒ ومحمدؒ واما علی قول ابی حنیفۃؒ فالمخلوط من الحلال والحرام حلال قلیلاً کان الحرام او کثیراً لان الخلط سبب الملک عندہٗ قال فی فتاوی قاضیخان واذا مات عامل من عمال السلطان واوصی ان یعطی الحنطۃ للفقراء۔ (۱)

**قدم چومنے کا حکم**

سوال: تقبیل القدم ماں اور باپ اور پیر اور استاد اور خسر اور ساس کے اس کی کون اصل ہے؟ ہمارے اطراف میں بعض بہیئت رکوع اور بعض بیٹھ کر قدم مس کرکے

(۱) مکمل عبارت ملاحظہ ہو فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیۃ (ج ۳/ ص ۴۰۴) انظر

پیشانی پر لگاتے ہیں۔ آیا یہ طریقہ حسن ہے یا بدعت؟

## الجواب

قال الطحطاوی فی حاشیۃ علی مراقی الفلاح و ورد فی احادیث ذکرھا العینیؒ ما یفید ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبل یدہ ورجلہ الی قولہ ثم قال العینی فعلم عن مجموع ما ذکرنا اباحۃ تقبیل الید والرجل والکشح والرأس والجبھۃ والشفتین وبین العینین ولکن کل ذالک اذا کان علی وجہ المبرۃ والاکرام واما اذا کان علی وجہ الشھوۃ فلا یجوز الا فی حق الزوجین اھ والسید وامتہ اھ (ص ۱۸۶)

ان نصوص سے معلوم ہوا اپنے مربیوں یا علماء و اساتذہ کے پیروں کو بوسہ دینا جبکہ بطریق مبرت و اکرام ہو جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

مگر تقبیل رجل میں صورت رکوع و سجود سے احتراز ضروری ہے، بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر مربی کے پیروں سے اپنے ہاتھ مس کر دے۔ فقط۔

حررہ الاحقر ظفر احمد بامر سیدی حکیم الامت دام مجدہم

۱۰ / رجب ۱۳۴۷ھ

---

دولہا کا پالکی پر سوار ہونا اور عمدہ کپڑے پہننا جائز ہے

سوال: ہمارے اس ضلع نواکھالی میں مسئلہ مرقومہ ذیل کی بابت بین العلماء اختلاف واقع ہوا۔ اس واسطے حضور والا کو تکلیف دی جاتی ہے کہ فیصلہ کن تجویز سے سرفراز فرمائیں۔ مسئلہ معروضہ یہ ہے کہ نکاح کے دن نوشہ (دولہا) کا باپ بھائی وغیرہ مربیان صاحبان اس کو پالکی یا گاڑی پر سوار کر کے بغیر کسی ممنوع شرعی مثل ریاء و سمعہ اور تفاخر اور بدون طواف اور گشت نو راہ سے سنت نبوی نکاح کے ارادہ سے لے جا کر بعد عقد شرعی کے اسی طرح اپنے مکان میں لاتے ہیں اور چونکہ ہمارے اس ضلع میں خصوصاً پیر و مرشد

جناب مولانا کرامت علی صاحب مرحوم کی ہدایت سے بفضلہ تعالیٰ ممنوعات مرقومہ سے (جتنیں سبب سے بھی ہوں) مسلمان سب مامون ہیں اور وہ سواری مجرد زینت و تجمل مثل لباس احسن اور ماکولات و مشروبات تکلفانہ شادی کے دن کی نیت سے ہیں سو یہ سواری اس کے لئے درست ہے یا نہ۔ اور حال یہ کہ مولانا ممدوح کی حسین حیات میں اس کے متعلق کچھ بھی تنازع نہ تھا۔ اور اب بھی ہمارے اطراف کے کسی حصے میں نہیں۔ الّا اس گاؤں کے چند علماء کہ ان کے درمیان اختلاف ہو رہا ہے بعض اس کو ریا اور بے ادبی مرجیان کے سبب حرام کہتے ہیں اور اکثر علماء ہند و بنگلہ خصوصاً مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرسین و محصلین اس کو بدعت مباحہ کہتے ہیں اور ایسا ہی مولانا عبدالحیٔ مرحوم کے مجموعہ فتاویٰ میں اس کو از قبیل بدعات مباحہ فرمایا۔ اور مدارک میں آیۃ من حرّم زینۃ اللّٰہ الخ کی تفسیر میں رکوب اور ماکولات اور مشروبات اور لباس احسن کو زینت و تجمل میں داخل کر کے اور فتاویٰ عالمگیریہ میں لا بأس للانسان ان یذھب راکبا حیث شاء و ایضاً فیہ کتاب الکراھیۃ میں چند روایات اظہار النعم اللہ یہ بنا کر کے جائز کہتے ہیں لیکن بہشتی زیور کے رسومات کے بیان میں اس کا کچھ پتہ نہ ملا۔ اس لئے حضور کی خدمت میں معروض ہے کہ حضور رائے عالی سے شرف صدور فرمائیں طرفین رائے عالی کے منتظر ہیں۔

## الجواب

فی الحدیث الصحیح عن عائشۃ رضی اللّٰہ عنہا ان نساء الانصار کن یستعرن منہا قمیصًا یجلون بہ العروس رواہ البخاری۔ وقال فی العالمگیریۃ و روی عن ابی یوسف انہ قال کما یعجبنی ان تتزین لی یعجبہا ان اتزین لہا قلت فیجوز للرجل ایضًا ان یلبس احسن ثیابہ وقت البناء باھلہ۔ و فیہا ایضًا وعن ھذا قلنا لا بأس للانسان ان یذھب راکبا حیث شاء و علامہ یذھب معہ اھ (۲۳۸/۱۲ ج)

وفيها ايضاً لبس الثياب الجميلة مباح اذا لم يتكبر وتفسيره ان يكون معها كما كان قبلها (ج ۶/۲۲۲) وفي الحديث انه صلى الله عليه وسلم كان يتجمل للوفود ترجم به البخاري. وفي شرح الجامع الصغير للعزيزي كان صلى الله عليه وسلم اذا قدم عليه الوفد لبس احسن ثيابه وأمر علية أصحابه بذلك البغوي عن جندب الخ. قال الشارح وفيه طلب التجمل في بعض الاحيان فلا ينافي خبر البذاذة من الايمان (ص ۱۳۳: ج ۳)

قلت ويلحق به التجمل للنكاح ايضاً اظهار البشاشه والسرور وتوقيا عن امتهانه في عيون اصهاره وقد ورد في الحديث عن عبدالرحمن بن عوف قال راى على رسول الله صلى الله عليه وسلم اثر الصفرة فقال مهيم هل تزوجت متفق عليه قال الحافظ في الفتح ان هذه الصفرة لعلها من كونه تطيب بطيب اهله. وقد ورد في الحديث الصحيح انه صلى الله عليه وسلم ودع معاذا حين ارسلهٗ إلى اليمن واوصاهٗ ومعاذ راكب ورسول الله صلى الله عليه وسلم يمشي معه تحت راحلة فلما فرغ قال يا معاذ انك عسى ان لا تلقاني بعد عامي هذا فبكى معاذ جشعا الحديث رواه احمد في مسنده (ج ۵/۲۳۵) وفي الحديث انه صلى الله عليه وسلم كان يقدم اصحابه ويمشي ورائهم ويقول اتركوا ظهري للملائكة.

قال الطحطاوي في حاشية على مراقي الفلاح بعد ما ذكر قصة الامام أنهٗ صلى خلف أبي يوسف وذكر فوائد هاما نصّهٗ منها ان تعظيم الاستاذ في طاعة لا فيها يطعنه لأنه تقدم بأمر الامام كما هو القاعدة المشهورة ان الامتثال خير من الادب. (ص ۳۱۴)

صورت مسئولہ میں دولہا کا پالکی یا گھوڑے پر سوار ہونا اور عمدہ لباس پہننا جائز ہے۔ سنت سے اس کی اصل موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفود کے لئے تجمل فرمایا کرتے تھے۔ اور نکاح کے وقت بھی واقدین کا ہجوم ہوتا ہے۔ دوسرے عورت خود ایک اجنبی ہے جس کے پاس دولہا جاتا ہے۔ اس کے لئے تزین کرنا خود مشروع ہے۔ جیسا کہ عورت کو مرد کے لئے تزین کرنا مشروع ہے۔ رہا یہ کہ دولہا اس حالت میں سوار ہوتا ہے کہ اس کے اکابر پیادہ ہوتے ہیں سو اس کا مضائقہ نہیں جبکہ یہ امر اکابر اور مربیوں کی خوشی اور مسرت اور اذن سے ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رخصت کرتے ہوئے نصیحت فرمائی۔ در انحالیکہ حضرت معاذؓ سوار تھے اور حضورؐ پیادہ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی اسی میں تھی اس لئے اس کو بے ادبی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ پس نفس تجمل و تزین رکوب فی المحمل وقت نکاح کے بالکل جائز ہے۔ سنت سے ان امور کی اصل نکلتی ہے۔ باقی اس کے علاوہ اگر کوئی رسم رسوم منکرہ سے ہوتی ہو تو اس سے احتراز لازم ہے۔ واللہ اعلم حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ بامر سیدی حکیم الامت دام مجدہم۔ ۱۱ رجب ۱۳۴۶ھ

**زوجہ سے مجامعت کا حکم جبکہ بچہ برابر میں سو رہا ہو۔**

سوال: میاں بیوی ایک پلنگ پر سوتے ہوں اور اس پر نابالغ بچہ سمجھدار خواہ شیرخوار بھی سویا ہو تو بیوی سے صحبت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

اگر بچہ ایسا بے خبر سوتا ہو کہ اسے سونے کے بعد کچھ خبر نہ ہوتی ہو تو ایسے پلنگ پر مجامعت جائز ہے اور اگر اس کی نیند ہوشیار ہو کہ حرکت سے بیدار ہو جاتا ہو تو اس پلنگ پر مجامعت ناجائز ہے۔ بشرطیکہ بچہ سمجھدار ہو جو اس فعل کو سمجھتا ہو۔ قال فی الخلاصۃ وفی کراھۃ فضل بن فانہ یجامع الرجل امرأتہ ومعہ ناس نیام اذا علم انہم لا یعلمون (ج ۴/ ۳۶۷) واذا بلغ الصبی او الصبیۃ عشر سنین یجب التفریق بینہما وبین اخیہ واختہ۔ وامہ وابیہ فی المضجع لقولہ

علیہ السلام و فرّقوا بینھم فی المضاجع وھم ابناء عشر و
فی لنتف اذا بلغوا ستا قال الشامی خصوصًا فی ابناء ھذا الزمان
فانھم یعرفون الفسق اکثر من الکبار و امّا قولہ وامہ
وابیہ بان لا یترکاہ ینام معھما فی فراشھما لانہ ربما
یطلع علی ما یقع بینھما بخلاف ما اذا کان قائما وحدہ
اومع ابیہ وحدہ او البنت مع امھا وحدھا اھ (ج ۵/ ۳۷۰)
واللہ اعلم حررہ الاحقر

ظفر احمد عفی عنہ ۳ ا رجب ۱۳۴۱ھ

**نامحرم عورت کو پڑھانا**

سوال: زید کے روبرو نامحرم عورت کے آنے سے دل میں بدخیالات پیدا نہ ہوتے ہوں اور فتنہ فساد کا کچھ اندیشہ نہ ہو تو زید کو اپنی رشتہ دار نامحرم عورتوں کو کتاب تعلیم الدین بہشتی زیور و اصلاح الرسوم پڑھانا یا سنانا جائز ہے یا کہ بدعت ہے۔

الجواب

نامحرم عورت کو کتاب پڑھانے کے لئے عورت ہی بہتر ہے مرد کو نہ پڑھانی چاہئے اور اگر مجبوری ہو تو خلوت میں ہرگز نہ پڑھائے بلکہ عورت کے عزیزوں کے سامنے پڑھائے اور پڑھنے والی پردہ میں ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم

۲۶ رجب ۱۳۴۱ھ

**عورت کا نامحرم مرد کے ساتھ سفر کرنا**

سوال: زید اگر شریعت کا پابند ہو اور فتنہ فساد کا کچھ اندیشہ نہ ہو تو نامحرم عورت کو زید کے ساتھ دس میل سفر کرنا یا ہزار میل ریل کا سفر کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب

نامحرم کے ساتھ مسافت سفر سے کم سفر جائز ہے مگر فساد زمان کی وجہ سے فقہاء نے اس کو بھی منع کیا ہے پس اگر زید نہایت متقی اور دیندار ہو تو اجازت دی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

۲۶ رجب ۱۳۴۱ھ

### قطب ستارہ کی طرف پاؤں پھیلانا جائز ہے

سوال: ۵ صفر ۱۳۴۲ھ کو ایک سوال کیا تھا کہ سوتے میں قطب ستارہ کی طرف پاؤں کرنا جائز ہے یا نہیں تو آنجناب نے جواب دیا تھا کہ جائز ہے۔ حوالہ لکھنے کی فرصت نہیں مگر یہاں کے نیم ملاں خدا ان سے پناہ میں رکھے بڑے ضدی ہیں تو جناب اگر کوئی دلیل ہو تو روانہ فرمائیں۔

## الجواب

اس کے جائز ہونے کی یہی دلیل ہے کہ اس کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں جو شخص عدم جواز کا دعویٰ کرے وہ دلیل پیش کرے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۱ شعبان ۱۳۴۲ھ

### جبراً چندہ وصول کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسجد کی مرمت اور خرچ و اخراجات کے لئے اور بیوہ یتیم بچوں کے ختنہ وغیرہ کے لئے اور غریب غرباء کی شادیوں کے لئے اور پیش امام اور حافظ وغیرہ کی تنخواہوں کے لئے جبراً چندہ وصول کرنا یعنی کوئی شخص چار روپے دینے پہ بخوشی آمادہ ہے، اس سے زیادہ جبراً وصول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہ۔

## الجواب

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل مال امرء مسلم الا عن طیب نفس منہ (او کما قال) مسلمان کا مال بدون اس کی طیب قلب کے لینا جائز نہیں۔ پس جو لوگ چندہ میں جبر کرتے ہیں وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اور حکماً غاصب ہیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۵ شعبان ۱۳۴۲ھ

### تالاب کو شرقاً غرباً طویل کرنا درست ہے

سوال: دستور ہے کہ مشرق کی طرف مسجد کے سامنے ایک تالاب کھودواتے ہیں جس میں رفع حوائج ضروریہ کر سکیں اور تالاب کو مغرب اور مشرق کی جانب باوجود گنجائش ہونے

کے ممنوع شرعاً یا عرفاً سمجھ کر لمبا نہیں کرتے بلکہ جہاں تک ممکن ہو تالاب کی لمبائی جنوب و شمال کی طرف کرتے ہیں، آیا شرعاً ممنوع ہے یا نہیں؟

الجواب

شرعاً اس خیال کی کوئی اصل نہیں۔ تالاب کو شرقاً غرباً طویل کرنا درست ہے۔ واللہ اعلم حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ
۲ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ

نومسلم بالغ کے ختنہ کا حکم

سوال: چالیس سالہ ہندو اگر مسلمان ہو تو اس کو ختنہ کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ زید کہتا ہے کہ بے ستری حرام ہے لہٰذا ترک ضروری ہے۔

الجواب

قال قاضیخان وللقابلة ان تنظر إلى فرج المرأة عند اخذ الولد لمكان الضرورة وكذا الحجام ان ينظر الى فرج البالغ عند الختان. (ج ۴/ ۳۶۰)

اس سے معلوم ہوا کہ بالغ کو ختنہ کرا لینا اور اس ضرورت سے حجام کے سامنے بدن کھولنا جائز ہے۔

ويؤيده ما رواه البخاری عن ابن عباس انه سئل مثل من انت حين قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم قال أنا يومئذ مختون وكانوا لا يختنون الرجل حتى يدرك (نيل الاوطار ص ۱۱۰ ج ۱)

قتادة قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأمر من اسلم ان يختتن وان كان ابن ثمانين سنة (رواه الطبرانی فی الكبير. ورجاله ثقات، مجمع الزوائد ص ۱۱۰ ج ۱)

قلت ولا يمكن ذالك بدون الحجام عادة والله اعلم۔

پس زید کا قول غلط ہے مگر ایسے نومسلم کو جسے ختنہ کرانے کی ہمت نہ ہوتی ہو تو اسے ختنہ پر مجبور نہ کیا جائے اگر وہ خوشی سے اس کی ہمت کرے

تو بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۳ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ

**ریلوے کے مال کی چوری کا حکم**

سوال: ریلوے کا سامان مثلاً لوہے کا سامان یا لکڑی کا یا پتھر وغیرہ جو ریلوے لائن میں لگائے جاتے ہیں اس کو چوری کرکے لے جاکر اپنے استعمال میں لانا کیسا ہے۔

## الجواب

مطلقاً حرام ہے۔ چوری کا مال کسی طرح حلال نہیں خواہ کافر ہی کی چوری ہو۔ واللہ اعلم۔
ظفر احمد

**ریلوے کا مسروقہ مال خریدنے کا حکم**

سوال: ریلوے کے ذریعے جو مال کپڑا، اناج وغیرہ سوداگر لوگ روانہ کرتے ہیں راستہ میں وہ اگر چوری ہو جائے تو ریلوے والے اس کا تاوان دے دیتے ہیں۔ اب یہ چوری شدہ مال چور سے خریدنے کا کیا حکم ہے۔

## الجواب

درست نہیں یہ مال چوری کا ہے بیچنے والے کے لئے بھی حرام ہے اور جس کو وہ دے اس کو بھی حرام ہے۔ ریلوے کو کسی طرح واپس کر دینا واجب ہے۔ واللہ اعلم

**جنگل کے درختوں کی چوری کا حکم جن پر حکومت نے قبضہ کر رکھا ہو**

سوال: ہمارے ملک میں انگریز حکومت نے جنگل پر ملازم رکھے ہیں اور لکڑی کاٹنے کی پابندی ہے اگر کوئی کاٹ لے تو جرمانہ وسزا دی جاتی ہے۔ اب اس جنگل کی لکڑی وغیرہ چوری چھپے لے جانا یا ملازم کو رشوت دے کر اس کی اجازت سے لے جانا کیسا ہے۔

## الجواب

مطلقاً حرام ہے۔ استیلاء کافر سے وہ سب درخت حکومت کے ملک ہو گئے ہیں۔ ان میں سے چوری کرکے لینا درست نہیں نہ رشوت سے نہ بغیر رشوت کے۔

ظفر احمد

### اس جنگل کی لکڑی کاٹنے کا حکم جس پر حکومت نے قبضہ نہیں کیا مگر ممانعت کر رکھی ہے

سوال: بعض جنگلات پر کوئی محافظ نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ صرف لکڑی کاٹنے پر پابندی ہے اور پٹواری وغیرہ کو یہ کہا گیا ہے کہ کوئی آدمی اس جنگل سے سامان لے جائے تو اس کو گرفتار کرکے مقدمہ چلایا جائے اور قید یا جرمانے کی سزا دی جائے۔ اس جنگل کی لکڑی کو کاٹنا کیسا ہے؟

## الجواب

اگر اس جنگل پر کسی خاص صورت سے جس کو عرفاً قبضہ کہا جاسکے گورنمنٹ کا قبضہ ہوگیا تو بدون اجازت یا خرید کے اس جنگل کی لکڑی کاٹنا درست نہیں اور اگر قبضہ نہیں ہوا ویسے ہی ممانعت ہے تو اگر زمین کسی کی مملوک نہیں اور درخت بھی خودرو ہیں تو ان کی لکڑی کاٹ لینا درست ہے مگر چونکہ اس میں مقدمہ قائم ہونے کا اندیشہ ہے جس میں ذلت ہوگی اور مسلمان کو ذلت سے بچنا واجب ہے۔ اس لئے اس صورت میں بھی چوری سے بچنا چاہئے۔ ہاں پٹواری کی اجازت سے سامان لے سکتے ہیں۔ اور اگر زمین مملوک ہے یا درخت خودرو نہیں بلکہ لگائے ہوئے ہیں تو درست نہیں۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد

۱۶ ذی الحجہ سنہ ۴۲ھ

### کتب ناول اور ایسی کتابوں کی تجارت کا حکم جو موضوع روایات پر اور شراب بنانے کی تجاویز پر مشتمل ہوں

سوال: تجارت کتب ناول و قصہ کہانیاں جو اکثر غلط واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان کتابوں کی تجارت جن میں روایات و احادیث موضوعہ ہوتی ہیں اور ان کتابوں کی تجارت جن میں صنعت اور ادویہ وغیرہ درج ہوتے ہیں اور بعض نسخہ جات شراب وغیرہ کی آمیزش کے بھی ہوتے ہیں، ایسی کتابوں کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں۔ مزید برآں بعض کتب پر تصاویر بھی ہوتی ہیں۔

## الجواب

کتب ناول اور جھوٹے قصے کی کتابیں بیچنا (بشرطیکہ ان جھوٹے قصوں میں خدا اور رسولؐ پر جھوٹ نہ بولا گیا ہو) جائز تو ہے مگر اچھا نہیں۔

ووجه الجواز عدم تعلق الحرمة بالبيع مباشرة على نية معصية مطالعه فمن طالعه لغرض حسن مثلاً تعلم الادب ونحوه فلا بأس كالمقامات الحريرية وكليلة ودمنة والف ليلة ومن طالعه لتهييج الشهوة وتعلق القلب به فلا يجوز۔

جن کتابوں میں موضوع روایات و احادیث ہیں ان کا بیع کرنا جائز نہیں۔ ہاں اس طرح جائز ہے کہ کتاب کے سرورق پر جلی قلم سے لکھ دیا جائے کہ اس کتاب میں روایات و احادیث موضوع و غلط ہیں۔ فان روایة الموضوع تجوز ببیان حالها فکذا البیع۔ واللہ اعلم۔ اور جن کتابوں میں صنعت وادویہ کا بیان ہے، ان کا بیچنا جائز ہے۔ گو اس کی بعض دواؤں میں شراب خمر بھی داخل ہو۔ لعدم تعلق الحرمة بالبیع بل علی استعمال المستعمل ان استعمله من غیر حاجة شدیدة فکان کبیع الامرد ممن یلوط به ونحوه فقط۔ اور تصویر پر کاغذ چسپاں کر دینا چاہئے۔ اور اگر ایسا نہ بھی کیا گیا تو چونکہ مقصود کتاب کی بیع ہے نہ کہ تصویر کی اس لئے بیع درست ہے مگر کراہت سے خالی نہیں۔ واللہ اعلم

ظفر احمد

**غیر مسلم آقا اگر مسلمان ملازم کو جانور کا گلا گھونٹنے پر مجبور کرے تو اس کو ایسا کرنا جائز نہیں**

سوال: زید ایک انگریز کے پاس ملازم ہے اور اس کو کھانا پکا کر کھلاتا ہے اور وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ ہم کو مرغ یا پرندے یا بکرے کو ذبح کر کے مت کھلاؤ بلکہ گلا گھونٹ کر کھلاؤ کیونکہ ذبح کرنے سے خون نکل کر قوت زائل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں زید کو جو مسلمان ہے اس کے حکم کی تعمیل کرنا شریعت کے خلاف تو نہ ہوگا اور زید کو ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب

صورت مسئولہ میں اس خانساماں کو جانور کا گلا گھونٹنا جائز نہیں بلکہ حرام ہے اور گلا گھونٹ کر جانور کا پکانا اور کسی کو کھلانا بھی جائز نہیں۔ اس کو انگریز سے عذر کر دینا چاہئے کہ میرا مذہب مجھ کو اس فعل سے منع کرتا ہے اس لئے میں ایسا نہیں

کرسکتا. قال تعالیٰ: حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقة والموقوذة والمتردیة الآیة

وفی الحنق تحریم الحلال وذالک لایجوز وفی

حاشیة البخاری عن العینی قولہ ھل یؤجر الرجل نفسہ من مشرک فی ارض الحرب اورد فیہ حدیث خباب وھو اذ ذاک مسلم فی عملہ للعاص بن وائل وھو مشرک وکان ذالک بمکة وھی اذ ذاک دار الحرب واطلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ذالک واقرہ قال المہلب کرہ اھل العلم ذالک الا لضرورة بشرطین احدھما ان یکون یعمل فیما یحل للمسلم فعلہ والآخر ان لا یعینہ علی ما یعود ضررہ علی المسلمین اھ (ج ۱/ ۳۰۲) قلت والحنق حرام لا یفعلہ مسلم ولا لہ ذالک کما مر. واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون۔

**ادائے قرض کے واسطے صاحب جائیداد کو سوال کرنا جائز نہیں اگرچہ جائیداد اپنی حوائج کے لئے بھی کافی نہ ہو۔**

سوال: اگر کوئی شخص مبتلاء قرض ہو اور قرض بھی سودی اور وہ شخص خود نوکری کرتا ہو اور کسی قدر جائیداد بھی رکھتا ہو لیکن آمدنی نوکری و جائیداد سے اس کے خانگی اخراجات نہیں چلتے چہ جائے کہ قرض ادا کرے تو ایسی صورت میں اس شخص کو ادائے قرض کے واسطے سوال کرنا جائز ہے یا نہیں اور وہ شخص سوال کرنے کو برا جانتا ہے اور نیز سوال کے بارے میں جو وعید حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے وہ بھی مد نظر ہے چونکہ اس شخص کو قرض کے بارے میں طمینان قلب میسر نہیں۔ لہٰذا عبادت میں خشوع وغیرہ حاصل نہیں ہوتا اور سود لینے دینے کی بابت حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے اس سے ہمیشہ دل بے قرار رہتا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ کسی صورت میں اس قرض سے خلاصی ہو۔

## الجواب

اس شخص کو ابھی سوال جائز نہیں۔ اول اپنی جائیداد کو فروخت کرکے قرض ادا کردے اور نفقہ عیال کے لئے نوکری یا تجارت کرے البتہ اگر جائیداد فروخت کرکے بھی قرض پورا ادا نہ ہو تو بقیہ قرض کے لئے سوال جائز ہے یا بعد بیع جائیداد کے نوکری وغیرہ اخراجات اہل وعیال کو کافی نہ ہو تو قوت کے علاوہ دیگر ضروریات کے لئے سوال کرسکتا ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس صورت میں بھی عام لوگوں سے سوال نہ کرے بلکہ خاص اعزہ واحباب سے سوال کرے۔

فی الدر مع للشامیة: ولا یحل ان یسئل شیئا من القوت من له قوت یومه بالفعل او بالقوة کالصحیح المکتسب ویأثم معطیه ان علم بحاله لاعانته علی المحرم ولو سأل للکسوة او لاشتغاله عن الکسب بالجهاد او طلب العلم جاز لو محتاجا اھ (ج۲)

قلت والسوال لاداء القرض ملحق بالسوال للکسوة: وفی الشامیة واذا کان له دار یسکنها ولا یقدر علی الکسب قال ظهیر الدین لا یحل له السوال اذا کان یکفیه ما دونها معراج، ثم نقل ما یدل علی الجواز وقال وهو اوسع وبه یفتی اھ قلت وهذا فی الدار لکونها من الحوائج الاصلیة واما العقار فلیس ملحقا بها لکونه من الزوائد فلا یحل السوال ما دام باقیا واللہ اعلم

### جس طالب علم کو مسجد سے کھانا ملتا ہو اس کو مدرسے کا وظیفہ لینا اور مسجد کی آمدنی کا اخفا کیسا ہے

سوال: زید مدرسہ عربیہ میں تعلیم پاتا ہے اور خوراک مدرسہ سے اس قدر ملتی ہے کہ اس کو کافی نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ مقروض ہوگیا۔ زید نے ایک مسجد کا رہنا قبول کیا وہاں سے کھانا وغیرہ کا کافی انتظام ہوگیا لیکن اسے مدرسہ دونوں کے تعلق و واسطے سے مسجد نہیں ملی بلکہ خود اپنی کوشش سے حاصل کی۔ اب اگر مدرسہ والوں کو معلوم ہو جائے کہ زید مسجد میں رہتا ہے تو خوراک بند کردیں۔ اگر زید مدرسے سے برابر خوراک حاصل کرے اور فروخت کرکے اپنا قرض سابقہ ادا کردے اور بعد ادائے قرض کے مدرسہ

سے خوراک لے سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس رقم سے اسے قرضہ ادا کرنا کیسا ہے۔

## الجواب

جب یہ بات معلوم ہے کہ اگر مدرسہ والوں کو خبر ہو جائے کہ زید مسجد میں رہتا ہے اور محلہ سے کھانا پاتا ہے تو وہ وظیفہ بند کر دیں گے تو معلوم ہوا کہ زید قاعدہ مدرسہ سے اس حالت میں وظیفہ کا مستحق نہیں اور وہ اس حالت میں بدون استحقاق کے وظیفہ لیتا ہے۔ لہٰذا مسجد سے کھانا پاتے ہوئے اس کو مدرسہ سے وظیفہ لینا جائز نہیں۔ نہ اس سے قرض ادا کرنا جائز ہے نہ بعد ادائے قرض کے وظیفہ لینا جائز ہے۔ اس کی آسان صورت یہ تھی کہ زید اہل مدرسہ کو اطلاع کرتا کہ مجھے وظیفہ مدرسہ کا کافی نہیں ہوتا اور میں مقروض ہو گیا ہوں مجھے اجازت دی جائے کہ میں وظیفہ کے ساتھ کسی مسجد میں اپنے کھانے کا انتظام کر لوں اگر وہ اس کی اجازت دے دیتے تو پھر یہ جائز تھا۔

وفی الحدیث من غشنا فلیس منا۔ وقال الفقہاء بلزوم العمل باحکام الواقف وشروطہ وکذا باحکام المتولی وشروطہ فی الاوقاف واللہ تعالیٰ اعلم

ظفر احمد از تھانہ بھون

۲ جمادی الثانیہ ۴۸ھ

**جو لوگ عمل کے ذریعہ مدفون کنواں کا پتہ دیتے ہیں ان سے کنواں دریافت کرانا اور انہیں انعام دینا کیسا ہے؟**

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ سیالکوٹ کے ہندو برہمن بت پرست ضلع لائلپور کی آبادی جدیدہ میں ہیں وہ اپنے کسی فن کے ذریعہ سے جو غالباً سحر ہی معلوم ہوتا ہے قدیمی چاہ زمین دوز کا جا بجا پتہ نشان بتلاتے ہیں۔ پانچ سات ہاتھ کھودنے پر ان کے بتلانے ہوئے کے موافق چاہ کے نشانات معلوم ہو جاتے ہیں جب چاہ برآمد ہو جاتا ہے تب وہ دو سو روپیہ انعام کا بوجہ بتلانے چاہ کے لیتے ہیں۔ جا بجا چاہ زمین دوز برآمد ہو رہے ہیں اور وہ یہی بتلاتے ہیں ہمارے علم میں چاہ معکوس ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ بے کار ہو یا کار آمد سالم ہو یا خراب سب امور وہ پہلے ہی بتلا دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد یا آپ

وہ باقاعدہ آبادی رہ چکی ہے (الحاصل) اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگرچہ نیم لوگ ہر چند ان کو غیب داں نہیں جانتے۔ عوام بھی ان کو عجوبہ کار جانتے ہیں مگر ان سے نشان چاہ دریافت کرنا اور ان کے کہنے کے موافق عمل کرنا زمین کھودنا اور پھر یہ انعام دینا تصدیق کاہن میں داخل ہو کر کفر ہے یا گناہ کبیرہ اس کا مرتکب فاسق ہے یا کیا حکم ہے۔

## الجواب

اس صورت کو کہانت اور سحر سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا کہ اکثر تو زمین کو سونگھ کر جاننے والے بتلا دیتے ہیں کہ یہاں پانی ہے یہاں نہیں ہے اور بعض کو مسمریزم کے عمل سے یہ علم ہو سکتا ہے۔ پس جب تک کہ تیقن کہانت وسحر نہ ہو جائے اس وقت تک اس قسم کے لوگوں کے ذریعے سے کنواں دریافت کرنے اور ان کو اس کا انعام دینے اور اجرت دینے کو حرام نہیں کہا جا سکتا البتہ احتیاط کا امر کیا جائے گا۔ دع ما یریبك الی مالا یریبك۔ واللہ اعلم۔

قال فی الدر: ان دلنی علی کذا فلہ کذا فدلہ فلہ أجر مثلہ ان مشی لأجلہ اھ قال الشامی: وفی البزازیۃ والولوالجیۃ رجل ضل لہ شیئ فقال من دلنی علی کذا فھو علی وجھین ان قال ذالک علی سبیل العموم بان قال من دلنی فالاجارۃ باطلۃ لان الدلالۃ والاشارۃ لیس بعمل یستحق بہ الأجر وان قال علی سبیل الخصوص بان قال لرجل بعینہ ان دللتنی علی کذا فلک کذا ان مشی لہ فدلہ فلہ اجر المثل وان دلہ بغیر مشی فھو والاول سواء۔ قال فی السیر الکبیر قال امیر السریۃ من دلنا علی موضع کذا فلہ کذا یصح ویتعین الأجر فیجب الأجر اھ (ج ۵/ ۸۸)

پس صورت مسئولہ میں بھی کنواں بتلانے والا چونکہ اس کے لئے محنت اور عمل کرتا ہے اس کو کنواں بتلانے اور نکل آنے کے بعد اس عمل کا اجر مثل

دینا لازم ہے اور اجر مثل وہ ہے جو عرفاً اس کام کی اجرت ہو۔ یعنی جو اجرت معین کی ہے۔ وہ واجب نہیں بلکہ جس کنویں کی تلاش میں کم محنت ہوئی اس کی اجرت کم دی جائے اور جس میں زیادہ مشقت ہوگی اس کی اجرت زیادہ دی جائے گی۔

واللہ اعلم۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۴ جمادی الثانیہ ۱۳۴۶ھ

**جوان نامحرم عورت کو پڑھانے کا حکم**

سوال: جوان مرد کا جوان عورت کو پڑھانا کیسا ہے۔ قرآن شریف یا دینی کتابیں پردے میں پڑھائے تو یہ درست ہے یا نہیں اور نابالغ لڑکی کا پڑھانا کیسا ہے؟

## الجواب

ایک طرح درست ہے کہ پڑھانے کے وقت لڑکی یا عورت پردہ میں ہو اور ایک محرم لڑکی کا تعلیم کے وقت ان دونوں کے پاس ہو۔ یہ دونوں تنہا نہ ہوں۔ اگر دونوں تنہا ہوں گے تو جائز نہ ہوگا۔ گو لڑکی پردہ ہی میں ہو۔ لخوف الفتنة و فساد الزمان وقد وقع الفساد فی الخلوة مع الحجاب ایضاً کثیراً فلا یجوز لان مقدمة الحرام حرام۔ اور نابالغ لڑکی اگر حد شہوت میں نہ ہو یعنی اس کی طرف میلان نہ ہوتا ہو تو پردہ اور محرم کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۴ جمادی الثانیہ ۱۳۴۶ھ

**نابالغ لڑکا اگر مچھلی پکڑ کر گھر لائے تو گھر والوں کیلئے اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں**

سوال: زید کا نابالغ لڑکا تالاب سے سیر دو سیر کے قریب مچھلیاں پکڑ کر لاتا ہے جس کو زید اور گھر کے سب لوگ مل کر کھاتے ہیں تو یہ کھانا جائز ہے یا ناجائز۔ اگر ناجائز ہے تو پھر کیسے کھاویں کیونکہ یہ بات میرے اور بھی اکثر ہوا کرتی ہے۔

## الجواب

مباح مچھلیاں پکڑنے والے کی ملک ہو جاتی ہیں اس لئے نابالغ نے جو مچھلیاں پکڑی ہیں وہ اس کی ملک ہوگئیں اگر اس کے والدین غریب ہیں تو ان کو کھانا

بالاتفاق جائز ہے اور اگر والدین امیر ہیں تب بھی امام محمدؒ کے قول کے موافق حلال ہے بناءً علی التعامل. فی الشامیة (ج ۵/ ۲۳۴) ولو أمر صبیًا أبوه او امه باتیان الماء من الوادی او الحوض فی کوز فجاء به لا یحل لابویه ان شربا من ذلک الماء اذا لم یکونا فقیرین لان الماء صار ملکه ولا یحل لهما الاکل من ماله بغیر حاجة وعن محمد یحل لهما ولو غنیین للعرف والعادة حموی عن الدرایة وفی هذین الفرعین حرج عظیم اه قلت والحرج مدفوع ویتائید قول محمدؒ بان نفقة الصبی علی الوالدین انما اذا کان لا یملک شیئًا فاذا ملک شیئًا سقط النفقة عنهما بقدره فما زاد من السمک یأکله الوالدان بعوض ما یأکله الصبی من مالهما والله اعلم. والاحوط أن یؤدیا الیه القیمة او شیئًا بعوضه ثم یأکلان. فقط

کتبہ
عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا عنہ

## تتمہ

وقال العلامة العینی فی العمدة تحت حدیث انس کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا خرج لحاجة اجیٔ انا وغلام معنا اداوة من ماء یعنی یستنجی به الخ ما نصه الثانی فیه استخدام الرجل الصالح الفاضل بعض اتباعه الاحرار خصوصًا اذا رصدوا لذلک والاستعانة فی مثل هذا فیحصل لهم اشرف بذلک وقد صرح الرویانی من الشافعیه بانه یجوز ان یعیر ولده الصغیر لیخدمه من یتعلم منه وخالف صاحب العدة فقال لیس للأب ان یعیر ولده الصغیر لمن یخدمه لان ذلک هبة لمنافعه فاشبه اعارة ماله وا وّله النووی فی الروضة فقال هذا محمول علی خدمة تقابل باجرة اما ما کان لا یقابل

بها فالظاهر والذي يقتضيه اقوال السلف أن لا منع منه وقال غيره من المتأخرين ينبغي تقييد المنع بما اذا انتفت المصلحة اما اذا وجدت كما لو قال لولده الصغير اخدم هذا الرجل فى كذا متمرّن على التواضع ومكارم الاخلاق فلا منع منه وهو حسنٌ اه (ج ۱۵/ ۲۰) قلت فلمّا جازت الخدمة المتقومة اذا كان فيها مصلحة جاز أكل ما يأتيه الصبي من السمك لوالديه وفى الدرو يباح لوالديه أن يأكلا من مأكول وهب له وقيل لا انتهى. وان غير الماكول لا يباح لهما الا لحاجة.

قال الشامي: قال فى التاتارخانية روى عن محمد نصًا انه يباح اه (ج ۴/ ۸۲) قلت والاوسع قول محمدؒ والأحوط الاحتراز عنه مثل ذلك والله الموفق وهو اعلم وعلمهٗ اتمّ واحكم۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ نابالغ جو مچھلیاں پکڑ کر لائے ان کا کھانا ولی کو محمدؒ کے قول پر مباح ہے اور غیر ولی کو بھی مباح ہے۔ اگر ولی نے نابالغ سے اس قسم کی خدمت لینے کی اس کو اجازت دے رکھی ہو۔ باقی احوط یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے کیونکہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ

جو پرندہ پالنے سے مانوس نہیں ہوتا اس کو قفس میں رکھنا کیسا ہے اگر کسی نے ایسا کر لیا ہو تو اس پرندہ کو آزاد کرنا کیسا ہے؟

سوال: ایک شخص نے ایک پرندہ پالا ہوا ہے جو اپنی ذات سے وحشی ہے اور پالنے سے مانوس بھی نہیں ہوتا جیسے طوطا۔ اس کو جنگل میں چھوڑنا جائز ہے یا نہیں اور یہ تسییب میں داخل تو نہیں اور ایسے پرندے جو پالنے سے مانوس نہیں ہوتے قفس میں مقید کرنا جائز ہے یا نہیں اضاعت تو نہیں۔

الجواب

قال فى غنية الناسك فى كراهة مختارات النوازل سيب

دابة فاخذها آخر فاصلحها فلا سبيل للمالك عليها ان قال عند تسييبها هى لمن اخذها وان قال لاحاجة لى بها فلة اخذه والقول لهٗ بيمينه درا رسال الصيد ليس بمندوب كتسييب الدابة بل هو حرام الّا ان يبيح للناس اخذهٗ وقيل حرام مطلقًا لانهٗ وان اباحهٗ فالاغلب ان لّايقع فى يد احد فيبقى سائبةً وفيه تضييع للمال. اللقطة ان كانت شيئًا يعلم ان صاحبها لايطلبها كالنواة وقشر الرّمان يكون القاءهٗ اباحة حتى جاز الانتفاع به من غير تعريف ثم بالاباحة لا يخرج عن ملكه قبل ان يأخذهٗ أحد فان أخذه بعد الاباحة ملكهٗ وقيل لايخرج مطلقًا لان التمليك لمجهول لا يصح مطلقًا الا لقوم معلومين فائدة اباحة حل الانتفاع به مع بقاءه على ملك المالك لقطة التاترخانية، ترك دابة لاقيمة لها من الهزال ولم يصحبها وقت الترك واخذ رجل واصلحها فالقياس ان تكون للآخذ كقشور الرمان المطروحة وفى الاستحسان يكون لصاحبها قال محمد لانا نجوز ذلك فى الحيوان لجوزنا فى الجارية ترى بالارض مريضة لاقيمة لها فيأخذها رجل وينفق عليها فيطؤها من غير شراء ولا هبة ولا ارث ولا صدقة او يعتقها من غير ان يملكها وهذا امرٌ قبيح وحاصلهٗ ان غير الحيوان يكون طرحهٗ اباحة درالمختار ملخصًا اھ ص ۸ ۱۵) وفى الشامية نقلًا عن الظهيرية ارسال الصيد ليس بمندوب كتسييب الدّابة بل هو حرام الّا ان مرسلهٗ للعلف اويبيح للناس اخذهٗ اھ وعلّله بان فيه تضييعًا للمالك (ج ۲/ ۳۶۱) وقال فى تحرير المختار نقلًا عن السندى لا يخفى ان الحرمة لاتثبت الّا اذا سيبها بلا سبب شرعى واما اذا دخل الحرم فالصيد فى يده او كان صيد الحرم ابتداءً

فقد وجب علیہ اطلاقہ کما فی المبسوط والمحیط وغیرھما الوجوب الامن لہ بالنص والامن لا یتحقق الا بالارسال المطلق وما ذکرہ فی جامع الفتاوی (من حرمۃ التسییب) مفروض فی غیرہ (ای غیر مالہ سبب شرعی) (ج ۱۴۷/۲) قلت فیہ دلالۃ ان التسییب لیس بحرام مطلقا بل قد یجب بسبب شرعی کما فی صید الحرم ولا یبعد ان یقال انہ قد یستحب لسبب شرعی کما اذا کان فی حبسہ تفریق بین الام وولدھا او تضجیعھا وقد ورد فی الحدیث من فرق بین والدۃ وولدھا فرق اللہ بینہ وبین احبتہ یوم القیامۃ رواہ الترمذی وحسنہ (عزیزی ج ۳/ ۳۵۰) وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم. ردوھا فجعھا فی افراخھا قالہ لرجل اخذ افراخ حمرۃ فجعلت تدور علی رأسہ فالظاھر ان الارسال یستحب لاجل ذالک واللہ تعالیٰ اعلم و بل یلتحق بذلک ما اذا تضجع الرجل لکون الطیر محبوسا فی القفص واراد الارسال لا لحاق المسرۃ الیہ فالظاھر نعم ولم ارہ صریحا واللہ اعلم.

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الاولی ۵۴ھ

**ماں یتیم کے مال میں تجارت کرسکتی ہے یا نہیں؟**

سوال: مسماۃ مریم بیوہ کے دو نابالغ لڑکوں کو متوفی باپ کے ترکے سے پانچ سو سے زائد پیسہ ملا تھا۔ وہ روپیہ ان کی ماں مریم کی سپردگی میں دیا گیا تو مریم نے یہ خیال کیا کہ اگر یہ روپیہ تجارت میں دے دیا جائے تو کچھ فائدہ ہی ہوگا ورنہ بلا تجارت جلدی ختم ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر پانچ سو روپیہ اپنے داماد زید کو دیا کہ اس کو تجارت میں لگائے جو کچھ نفع ہوگا اس میں سے باہم نصف نصف تقسیم کر لیا جائے گا تو زید نے پانچ سو روپیہ مریم سے لے کر خود کوئی مال نہیں خریدا بلکہ بکر کو دے دیا تو بکر نے پانچ سو روپے کا مال خرید کر فروخت کیا تقریباً اسی ۸۰ روپے یا کچھ کم و بیش نفع ہوا

تو بکر نے اس منافع میں سے چالیس روپیہ خود لے لیا اور چالیس روپے زید کے حوالے کر دیئے۔ زید نے اس نفع کو لے کر اپنی ساس مریم کو دے دیا اور کہا کہ پانچ سو روپے کا مال بکر نے خرید کر بیچا ہے تو جس قدر نفع ہوا اس کا یہ نصف چالیس روپے ملا ہے اس کو تم لے لو تو مریم نے صرف بیس روپے لے لیا اور بیس روپے اپنے داماد زید کو دیا اور کہا کہ تم کو کچھ نہیں ملا تم بیس روپے اس میں سے لے لو میں اپنی خوشی سے دیتی ہوں اور تم اس پانچ سو روپے کے ذمہ دار ہو اور آئندہ بھی منافع کی کوشش کرتے رہو گے لیکن زید کو بیس روپے لینے میں تامل ہے۔ صورت مذکورہ بالا میں بموجب خوشی و رضامندی مریم کے زید لے سکتا ہے یا نہیں۔

## الجواب

قال فی حاشیة الهداية نقلاً عن الزيلعی ومن هذا النوع ما هو متردد يحتمل ان يكون ضررًا كالاجارة والبيع لاسترباح لا يملكه الا الأب والجد ووصيهما سواء كان فی ايديهما اولا اه (ج ۴/۲۶ باب الشكر اهية).

اس سے معلوم ہوا کہ غیر اب وجد و وصیہما کو ( اور ماں میں ان اور حاضنہ بھی ہے ) یتیم کے مال میں تجارت کرنا جائز نہیں ہے مگر جو منافع ہوگا وہ سب یتیم کا ہوگا۔ پس صورت مسئولہ میں ماں کو یتیموں کے مال میں تجارت کرنا جائز نہیں اور وہ اس فعل سے گنہگار رہے اور جتنا منافع اس تجارت میں ہوگا وہ سب یتیموں کا حق ہے۔ پس صورت مسئولہ میں ملغ ۲۰ روپیہ جو یتیموں کے حصے میں آئے اس میں سے ملغ ۲۰ روپیہ ساس کا داماد کو دینا درست نہیں اور داماد کو بھی لینا درست نہیں۔ ہاں اگر ساس اپنی طرف سے یہ رقم دے اور یتیموں کی رقم ۴۰ روپے پوری ان کو دے دے تو کچھ حرج نہیں اور بکر کو اس صورت میں اجر مثل عمل ملے گا۔ مستحق نہ ملے گا اگر اُس کو معلوم تھا کہ یہ مال یتیم کا ہے۔ پس اگر اجر مثل عمل ۴۰ روپے سے کم ہو تو اس کو زیادت کا واپس کرنا لازم ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۲۳ رجب ۱۳۵۳ھ

**بھنگی اور چمار کے گھر کا پکا ہوا کھانا مکروہ ہے**

سوال: ایک قوم خاکروب اور چمار جن کا پیشہ شب و روز اکثر اوقات مردار استعمال کرنے کا ہے اور سوائے اس کے ناپاک اور پلید چیزیں بھی استعمال کرتے ہیں بلکہ اہل اسلام کا جانور بھی جب مرجاتا ہے تو ان کو کھانے کو دیتے ہیں۔ غرض اکثر اوقات مردار اور پلید چیزیں کھاتے ہیں۔ آیا ان کے گھر کا پکا ہوا انہیں کے برتنوں میں مسلمانوں کے لئے جائز ہے یا مکروہ وغیرہ ہے۔ ایک فتویٰ سہارنپور دار العلوم اسلامیہ سے منگوایا تھا اس میں مکروہ تحریمی تحریر ہے۔

الجواب

ہاں دار العلوم کا فتویٰ صحیح ہے۔ ان لوگوں کے گھر کا پکا ہوا کھانا مکروہ ہے اور ان کے برتنوں کو جب تک خود پاک نہ کیا جائے ہرگز استعمال نہ کیا جائے کما فی الحدیث الذی رواہ ابوداؤد ان صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن آنیة اھل الکتاب الذین یطبخون المیتة و یشربون الخمر فیھا فقال ان وجدتم غیرھا فلا تأکلوا فیھا والا فارحضوھا بالماء وکلوا فیھا الحدیث او کما قال وقد اخرجہٗ فی الاستدراک الحسن واللہ اعلم والغالب علی الاقوام الذین سئل عنھم النجاسة۔ حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

۱۹ صفر ۱۳۴۸ھ

**قانون ریلوے سے زائد سامان ریلوے ملازم کے معرفت بھیجنے کا حکم**

سوال: بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ ریل گاڑی پر بلا کرایہ چڑھنا گناہ ہے اور قاعدہ کے موافق جو بوجھ سامان لے جانا درست ہے اس سے زیادہ لے جانا گناہ ہے۔ قیامت کے دن بجائے روپیہ کے نیک عمل دینا پڑے گا۔ اس لئے ہمارا یہ سوال ہے کہ اگر ملازم ریلوے کے معرفت زائد سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ ملازم گنہگار ہوگا یا مسافر؟

الجواب

ملازمان ریلوے نوکر ہیں۔ ریلوے کے مالک نہیں اس لئے دوسروں کی

چیز خلاف مرضی مالک مراعات فراہم کرنے کا ان کو کچھ حق نہیں پس جتنا سامان ساتھ رکھنے کا ملازم کو قانون ریلوے سے حق دیا گیا ہو اس میں تو ملازم گنہگار رہے نہ مسافر اور اس سے زائد رکھنے میں دونوں گنہگار رہیں گے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

جعلی سکہ بنانے کا حکم | سوال: رائج الوقت سکہ مثلاً چونی دوانی بنا کر کام میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں خصوصاً جب کہ وہ اس دھات کی بھی نہ ہو جس سے حکومت سکے بناتی ہے۔ جو شخص اس میں مبتلا ہو اس کا کیا حکم ہے بظاہر اصلی و نقلی میں کوئی فرق بھی نہیں۔

## الجواب

جائز نہیں لما هی فیه من الغدر والغرار۔ واللہ اعلم۔

ہارمونیم، گراموفون وغیرہ کی مرمت کا پیشہ اختیار کرنا کیسا ہے۔ | سوال: ہارمونیم، گراموفون اور باجوں وغیرہ کی مرمت سے جو آمدنی ہو اس کا کیا حکم اور اس پیشہ کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

## الجواب

یہ آمدنی علی الاختلاف جائز تو ہے مگر کراہت سے خالی نہیں اس لئے یہ پیشہ نہ اختیار کرنا اولیٰ ہے۔

وبناء الجواز علی بیع العصیر ممن یتخذ ہٗ خمراً ونحو ذالك فان الحرمة إذا لم تقم بالعین بالفعل فلا بأس بثمن العین کما فی الدر وغیرہ۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ ۴ جمادی الثانیہ ۱۳۴۶ھ

ریلوے کا ٹکٹ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا اور اس کو اپنی جگہ سوار کرنا جبکہ قانون ریلوے کی رو سے اس کی اجازت نہیں | سوال: ریلوے کا قانون ہے کہ جو ٹکٹ ایک شخص نے خرید لیا ہو اس کے لئے جائز نہیں کہ اس ٹکٹ کو

دوسرے کے ہاتھ فروخت کرکے اس کو اپنی جگہ سوار کر دے شرعاً ایسا کرنا کیسا ہے۔ نیز بعض ایام میں واپسی ٹکٹ خاص رعایت سے ملتا ہے تو اگر کوئی شخص واپسی ٹکٹ خرید کر ایک جانب سے دوسرے کو ٹکٹ فروخت کرکے واپس بھیج دے تو شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں۔

## الجواب

قال فی اجارات الدر وان قید براکب اولابس فخالف ضمن (لانه صار متعدیا لان الرکوب واللبس مما یتفاوت فیه الناس فرب خفیف جاهل اضر علی الدابة من ثقیل عالم ۱۲ شامی) ومثله فی الحکم ما یختلف بالمستعمل کالفسطاط (وقال فی الدر حتی لو استأجر فدفعه الی غیره اجارة او اعارة فنصبه وسکن فیه ضمن عند ابی یوسف لتفاوت الناس فی نصبه واختیار مکانه وضرب اوتاده وعند محمد لا یضمن لانه للسکنی فصار کالدار اھ شامی) وفیما لا یختلف فیه بطل تقییده به کما لو شرط سکنی واحد له ان یسکن غیره لما مر ان التقیید غیر مفید اھ (ج ۵/۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ شئ مستاجر میں اگر استعمال مختلف نہ ہو تو مستاجر کو جائز ہے کہ دوسرے کو عاریت یا اجارةً دے دے اور مختلف ہو تو جائز نہیں اور ظاہر یہ ہے کہ ریل میں استعمال مستعمل متفاوت نہیں۔ ۱۲

لہذا شرعاً ریل کا ٹکٹ دوسرے کو فروخت کرکے اس کو اپنی جگہ بھیج دینا جائز ہے مگر زیادہ داموں میں فروخت نہ کرے بلکہ مثل اجرت یا اس سے کم میں فروخت کرے اور واپسی کے ٹکٹ کے فروخت کرنے میں تردد ہے۔ چند وجوہات سے (۱) یہ کہ اس صورت میں استعمال مختلف ہے کیونکہ اگر دوسرا شخص خود کرایہ کرتا تو اس کو زیادہ کرایہ دینا پڑتا اور واپسی والے کے ساتھ کرایہ میں خاص رعایت کی گئی ہے اور اس کے لئے مخصوص ہے۔ لہذا اس رعایت کو متعدی کرنا بظاہر جائز نہیں الا باالاذن (۲) یہ کہ واپسی والا جس ٹرین کا ٹکٹ لے رہا ہے اس میں واپس

نہیں ہوتا بلکہ دوسری ٹرین میں واپس ہوتا ہے اور ریلوے کی طرف سے یہ اذن عام ہے کہ اس ٹکٹ سے جس ٹرین میں چاہو واپس آجاؤ اسی شخص کے ساتھ مخصوص ہے دوسروں کو اس تعمیم سے اس ٹکٹ میں منتفع کرنا بلا رضا کے جائز معلوم نہیں ہوتا۔

(۳) یہ کہ اگر اس ٹکٹ کو واپسی کے وقت زیادہ داموں میں فروخت کیا گیا تو یہ زیادۃ کسی شئی کے عوض میں نہیں لہذا زیادت جائز نہیں۔

قال فی الدر: ولو آجر المستاجر باکثر تصدق بالفضل الا فی المسئلتین اذا آجرها بخلاف الجنس او اصلح فیها شیئا اھ بان جصصها او فعل فیها مسناۃ وکذا کل عمل قائم لان الزیادہ بمقابلۃ ما زاد من عندہ حملا لامرہ علی الصلاح کما فی المبسوط وکنس لیس باصلاح ان کری النہر قال الفقیہ تطیب و قال ابو علی النسفی اصحابنا متردد دون اھ (ج ۵/۲۷) (۱) ما بالجملہ فالمعتبر الزیادۃ بعمل قائم دون غیرہ۔ واللہ اعلم۔

حررہ ظفر احمد عفا عنہ

۲۰ ذالحجہ ۴۸ھ

**بلا اجازت کسی کی زمین سے استنجا کے لئے ڈھیلے لے کر استعمال کرنے کا حکم**

میں نے خادم سے استنجا کے لئے ڈھیلے منگوائے وہ قریبی زمینداروں کی زمین سے کھودی ہوئی مٹی کے ڈھیلے لے آیا مجھے معلوم نہ تھا معلوم کرنے پر اس نے بتایا میرا خیال ہے کہ اگر وہ کم مٹی ہو کہ مالک اٹھانے سے منع نہ کرے تو گنجائش ہوگی اور اگر مالک اٹھانے سے منع کرے تو جائز نہ ہوگی۔

حضرت والا میرے خیال کی تصحیح فرمائیں۔

## الجواب

صحیح خیال ہے مقدار کثیر سے تو کھیت والے بھی منع کرتے ہیں۔ اور دو تین ڈھیلے سے عادۃً کوئی نہیں روکتا فلا باس بہ۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ ۱۳ رجب ۴۸ھ

(۱) (ج: ۶/۲۹) باب ما یجوز من الاجارۃ۔ شامی ایچ۔ ایم سعید: مرتب

**باپ اور معلّم نابالغ بچوں کو کس حد تک مار سکتے ہیں اس کے متعلق چند سوالات**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین مسائل ذیل میں (۱) کیا معلم کو جائز ہے کہ وہ اپنے نابالغ شاگرد کو چھڑی سے مارے اگر چھڑی سے نہیں تو کیا ہاتھ سے مار سکتا ہے اور کتنی ضرب مارنے کی اجازت ہے۔

(۲) کس صورت میں معلم اپنے شاگرد کو مارنے سے ضامن ہوتا ہے اور کس صورت میں ضامن نہیں ہوتا۔

(۳) باپ اپنے بالغ لڑکے اور معلم اپنے بالغ شاگرد کو مار سکتا ہے یا نہیں۔

## الجواب

(۱) معلم کے لئے جائز نہیں کہ اپنے نابالغ شاگرد کو چھڑی سے مارے البتہ ہاتھ سے مار سکتا ہے اور وہ بھی تین ضرب سے زیادہ نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرداس معلم سے فرمایا کہ تین ضرب سے زیادہ مت مارو اگر تم تین ضرب سے زیادہ مارو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے قصاص لے گا۔

وان وجب ضرب ابن عشر علیها بید لا بخشبة (در مختار علی هامشه الشامی ج ۱/ ۲۰۵ کتاب الصلوٰة. قال الشامی تعلیقاً علی قوله (بید) ای ولا یجاوز الثلاث وکذالك المعلم لیس له ان یجاوزها قال علیه الصلوٰة والسلام لمرداس المعلم ایاك ان تضرب فوق الثلاث فانك اذا ضربت فوق الثلث اقتص الله منك وما کونه لا بخشبة فان الضرب بها ورد فی جنایة المکلف (شامی ج ۱/ ۲۵۰)

(۲) معتاد ضرب سے زیادہ خواہ کیفاً خواہ کماً خواہ محلاً (جیسے چہرہ پر) مارنے سے ضمان واجب ہوتا ہے۔ ومحله فی الضرب المعتاد ای کماً وکیفاً ومحلاً فلو ضربه علی الوجه او علی المذاکیر یجب الضمان بلا خوف ولو سوطاً واحداً لانه اتلاف (الشامی ج ۵/ ۴۰۰ کتاب الجنایات۔ (۱)

(۱) شامی ۱۰/ ۵۹۹ - ایچ ایم سعید. مرتب (وعد شامیة ج ۱/ ۳۵۲)

اگر معلم اپنے شاگرد کو اس کے باپ یا وصی کی اجازت کے بغیر مارے تب بھی معلم ضامن ہوگا۔

ضرب الأب او الوصی او المعلم باذن الاب تعلیماً فمات لاضمان (ص مذکورہ)

قال الشامی تعلیقاً علی قولہ (باذن الأب) ای او باذن الوصی ولو ضرب بغیر اذنهما یضمن۔ اھ

اور اگر معلم اپنے شاگرد کو اس کے باپ یا وصی کی اجازت سے تعلیماً مارے تو ضامن نہ ہوگا مگر ضرب معتاد سے زیادہ نہ مارے ورنہ ضامن ہوگا جیسا کہ معلوم ہو چکا۔

(۳) بالغ لڑکا باپ کے لئے مثل اجنبی کے ہے۔ باپ اس کو تعزیر نہیں کر سکتا تو معلم کے لئے بطریق اولیٰ جائز نہیں کہ اپنے بالغ شاگرد کو تعلیم کی رو سے مارے۔

والأب یعزر الابن علیہ ای علی ترک الصلوٰۃ مثلها الصوم وان المراد بالابن الصغیر بقرینۃ مابعدہ اما الکبیر فکالاجنبی (شامی ج ۳/ ۲۰۰) باب التعزیر۔ ان متاخرین نے کہا ہے کہ ہر شخص دوسرے کو معصیت کے ارتکاب پر تعزیر کر سکتا ہے۔ اس بنا پر اگر بالغ لڑکا یا بالغ شاگرد معصیت کا ارتکاب کرے تو باپ یا معلم اس کو مار سکتا ہے۔

وزاد بعض المتاخرین ان الحد مختص بالامام والتعزیر بفعلہ الزوج والمولیٰ فکل من رای احدا یباشر المعصیۃ (شامی: ج ۳/ ۱۹۴) ج ۳/ ۱۹۴) باب التعزیر۔)

حررہ الاحقر محمد ابراہیم احمد آبادی غفرلہٗ
سرکھ مسجد گھوگول پلٹنہ۔

## الجواب من جامع امداد الاحکام

نابالغ بچوں کو چھڑی سے مارنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ آج کل معلم حد سے گزر جاتے ہیں اور ہاتھ سے مارنے میں حد سے گزرنا دشوار ہے کیونکہ خود اس کے بھی چوٹ لگے گی۔ عالمگیری میں بھی غالباً اسی کے مثل ہے اور ت

میں سے جو سمجھا گیا کہ بالغ کو چھڑی سے مارنا جائز نہیں۔ یہ صحیح نہیں بلکہ اس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ باپ کو اولاد کبار کی تعزیر کا حق نہیں مگر جبکہ اس معصیت کا صدور ہو۔ اس سے یہ سمجھنا کہ معلم کو بھی حق نہیں غلط ہے کیونکہ جب بالغ ولد طالب علمی کے لئے معلم کے پاس آتا ہے اور اس سے علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو حالاً و عملاً اس نے اپنے آپ کو معلم کے سپرد کر دیا ہے اور بالغ کا یہ فعل معتبر ہے لہٰذا معلم اس کو سزا بید دے سکتا ہے کیونکہ متعلم بالغ خود اس پر راضی ہے البتہ اگر کوئی متعلم بالغ سزا بید وغیرہ پر راضی نہ ہو تو اس کو ایسی سزا دینا جائز نہیں لفوت الاذن والتفویض مگر ایسے شخص کو پڑھانا کیا ضروری ہے معلم کو بھی حق ہے کہ جو سزا پر راضی نہ ہو اس کو نہ پڑھائے اور اولاد کبار اگر اپنے کو بلوغ کے بعد بھی باپ کے سپرد کر دے کہ ہماری اصلاح و تربیت کے لئے جو تصرف چاہو کرو خواہ قولاً یا حالاً تو اس صورت میں اولاد کبار کو بھی تعلیم وغیرہ پر والدین سزائے ضرب بالخشب وغیرہ دے سکتے ہیں اور یہی حکم اجنبی کا ہے جبکہ وہ اپنے کو کسی کے سپرد کر دے فالتشبیہ بالاجنبی لا یدل علی عدم جواز التعزیر مطلقا بل علی جوازہ باذنہ وعدمہ بغیر الاذن فافہم۔ اور ارتکاب بالمعصیۃ میں صفحہ بہ اس زمانے کے لئے متقدمین کا قول ہے کہ امام کے سوا اجنبی پر تعزیر جاری کرنے کا کسی کو حق نہیں کیونکہ اس میں فتنہ و فساد ہے۔ ہاں زوجہ پر اور والد ولد پر شیخ مرید پر معلم متعلم پر ارتکاب معصیت کے وقت تعزیر جاری کر سکتا ہے (شامی ۲۱/۵ ۲) کیونکہ اس میں غالب فساد نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ محرم ۱۳۴۲ھ

**قبل از طعام کلی کرنے اور ہاتھ دھو کر پونچھنے کا حکم**

سوال: قبل از طعام ہاتھ دھو کر پونچھنے اور کلی کرنے کے متعلق شرعی احکام کیا ہیں؟

## الجواب

فی العالمگیریہ (ج ۴/ ۲۲۵) ولا یمسح یدہ قبل الطعام بالمندیل لیکون اثر الغسل باقیا وقت الاکل ویمسحہا بعدہ لیزال

اثرالطعام بالكلية كذا فى خزانة المفتين. وفى اليتيمة سئل والدى عن غسل الفم عند الاكل هل هو سنة كغسل اليد قال كذا فى التاتارخانية وفيه ايضاً بعد سطور ويكره للجنب رجلاً كان او امرأة ان ياكل طعاما او يشرب قبل غسل اليدين والفم ولا يكره ذالك للحائض والمستحب تطهير الفم فى جميع المواضع كذا فى فتاوى قاضيخان.

اس سے معلوم ہوا کہ ادب یہ ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر کپڑے سے صاف نہ کئے جاویں اور کھانے کے بعد صاف کر لئے جائیں اور کلی کرنا کھانے سے پہلے سنت نہیں ہے لیکن بدون سنت سمجھے کرے تو جائز ہے. لعدم الدليل على منعه، اور اگر حالت جنابت میں ہو تو بدون کلی کئے کھانا مکروہ ہے. والظاهران الكراهة تنزهية لقوله صلى الله عليه وسلم لاقى هريرة وكان جنباً ان المؤمن لا ينجس.

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲ جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ

الجواب صحیح

ظفر احمد عفا عنہ ۳ جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ

بالغ کے ختنہ کا حکم

سوال: ختنہ کے واسطے جو کہ سنت ہے ستر عورت جو فرض ہے ترک کرنا کیسا ہے؟ یعنی اگر کسی بالغ کا ختنہ نہ ہوا ہو تو کیا بلوغ کے بعد ختنہ کے لئے ستر کھول سکتا ہے.

## الجواب

یہ قاعدہ کلیہ تو نہیں ہے مگر ختنہ کے متعلق فقہاء نے تصریح کی ہے کہ بالغ کا ختنہ کرنا اور بقدر ضرورت بدن کا دیکھنا چھونا جائز ہے البتہ ضرورت سے زائد بے پردگی جائز نہیں. اس واسطے ختان کے سوا کوئی نہ دیکھے اور باقی بدن کو ختان سے بھی چھپائے رہے اور ختنہ صرف سنت ہی نہیں بلکہ شعائر اسلام سے بھی ہے.

کتبہ الاحقر

عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح۔ وما تضمنه کلام السائل من ان الحرام لا یباح الا لأمر واجب غیر مسلم فان الفطر فی رمضان حرام ومع ذالک یباح لأمر جائز کسفر کذا فی فتح الباری (ج ۱/ ۲۹۱) قلت ولا اصل فیه ما قاله فقهائنا قد یفتقر ضمناً مالا یفتقر قصداً (الاشباہ ص ۹۹) واللّٰہ اعلم۔

ظفر احمد عفا عنہ

۲۷ جمادی الاولیٰ ۵۳ھ

**معلم کس حد تک بچوں کو مار سکتا ہے** سوال: معلم کے لئے متعلموں کو تنبیہاً لہو و لعب سے باز رکھنے کے لئے ضرب شدید لگانا جائز ہے یا نہیں۔ اگر جائز ہے تو کس حد تک اور کس طریقہ پر اگر نا جائز ہے تو کس طریقہ پر ان کو تعلیم دی جائے۔

## الجواب

فی الدر المختار: رادعت علی زوجها ضربا فاحشاً وثبت ذالک علیه عزر کما لو ضرب المعلم الصبی ضربا فاحشا) فانه یعزر وفی رد المحتار (قوله ضربا فاحشا) قید به لانه لیس له ان یضربها فی التادیب ضربا فاحشا وهو الذی یکسر العظم او یخرق الجلد او یسوده کما فی التاتارخانیة قال فی البحر وصرحوا بانه اذا ضربها بغیر حق وجب علیه التعزیر اه ای وان لم یکن فاحشاً (ج ۳/ ۲۹۳) (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ بلا قصور مارنا تو بالکل جائز نہیں ہے اور قصور پر قصور کی کمیت و کیفیت کا لحاظ کرکے اس کے مناسب مارنا جائز ہے لیکن اس وقت بھی حد سے زیادہ مارنا ممنوع ہے اور حد یہ ہے کہ نہ کوئی ہڈی ٹوٹے نہ کھال اکھڑے نہ کھال سیاہ ہو پس اگر اتنا مارا کہ کھال سیاہ ہو گئی یا کھال اکھڑ گئی یا ہڈی ٹوٹ گئی تو سخت گناہ ہوا اس حالت میں خود یہ معلم سزا پانے کے قابل ہے اور قول درمختار۔ له اکراه طفله علی تعلیم القرآن وادب وعلم سے معلوم ہوتا ہے کہ بے تمیزی کرنا اور سبق میں کوتاہی کرنا

(۱) شامی ایچ۔ ایم سعید کمپنی (ج ۴/ ۷۹) انتقاء۔

دونوں قصور ہیں جن کی وجہ سے بچوں کو سزا دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم
کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
یکم شعبان ۵۸ھ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفا عنہ ۵ شعبان ۵۸ھ

**ختنہ کے لئے نصف سے زائد حشفہ کا ظاہر ہونا ضروری ہے**

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں زید کی عمر تقریباً بیس سال ہے معروف نصف رسولیہ ہے یعنی عضو تناسل کی نصف سپاری کھال سے پوشیدہ ہے اب اس کو ختنہ کرانا واجب ہے یا نہیں۔ کیونکہ جس وقت والدین نے بچپن میں اس کا ختنہ کرانے کا ارادہ کیا تو حجام وغیرہ اور دیگر حضرات نے ان کو روک دیا کہ یہ رسولیہ ہے۔ اس کے ختنہ کرانے کی ضرورت نہیں وہ رک گئے۔ اب بعض کہتے ہیں کہ اس کا ختنہ کرانا ضروری ہے اگرچہ سالم رسولیہ ہو اور جو نصف رسولیا ہو اس کا تو ختنہ بدرجہ اولیٰ ضروری ہے۔

## الجواب

فی العالمگیریہ (ص ۲۳۷ ج ۴) غلام ختن فلم تقطع الجلدة کلها فان قطع اکثر من النصف یکون ختانا وان کان نصفا او دونه فلا کذا فی خزانة المفتین وفی صلوٰة النوازل الصبی اذا لم یختن ولا یمکن ان یمد جلده لیقطع الا بتشدید وحشفته ظاهرة فاذا رآه انسان یراه کانه اختتن ینظر الیه الثقات واهل البصر من الحجامین فان قالوا هو علی خلاف ما یمکن الاختتان فانه لا یشدد علیه ویترک کذا فی الذخیرة۔

اس سے معلوم ہوا کہ نصف حشفہ کا ظاہر ہونا ختنہ کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس واسطے اس لڑکے کا ختنہ کرنا چاہیئے البتہ اگر حجام یوں کہے کہ اب کھال کا کاٹنا ممکن نہیں یا کھال کو ختنہ کے واسطے کھینچنے میں سخت تکلیف ہوتی ہو تو

پھر ختنہ معاف ہے۔ فقط واللہ اعلم

احقر عبد الکریم عفی عنہ از تھانہ بھون ۱۰ صفر ۱۳۵۶ھ

جانوروں کی گردن میں گھونگرو وغیرہ ڈالنے کا حکم | سوال: بیلوں یا گھوڑوں وغیرہ کی گردن میں گھونگرو یا پائل ڈالنا کیسا ہے؟

## الجواب

اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے حدیث نہی عن الجرس کو ظاہر پر رکھ کر مطلقاً منع فرمایا ہے اور احتیاط اسی میں ہے اور بعض نے نہی کو حالت غزوہ کے ساتھ مخصوص قرار دے کر دوسرے حالات میں اس کی اجازت دی ہے اور جواز حدی سے اس کی تائید کی ہے اور اس پر عمل کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون ۲۱ محرم ۱۳۵۸ھ

علم نجوم نیز جھوٹے نجومی و حکیم اور فرضی عامل اور ان کی آمدنی کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم | سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص فرضی نجومی، فرضی حکیم و فرضی عامل و بزرگ بن کر لوگوں کو گزشتہ و آئندہ کے حالات بتاتا ہے۔ فرضی دوائی دیتا ہے اور تکلیف، گردش، جادو، بیماری وغیرہ کے رفع کرنے کی فرضی ترکیب بتا کر فرضی تعویذ دیتا ہے اور ان سب کاموں کے بدلے لوگوں سے رقم وصول کرتا ہے اس کی آمدنی حلال ہے یا حرام یہ دھوکہ ہے یا نہیں؟

(۲) اس کی اس آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں۔ یہ حق العباد ہے یا حق اللہ اگر حق العباد ہے تو اس کا ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں۔

(۳) اب وہ اس کام سے توبہ کرتا ہے۔ کوئی دوسرا کام وہ نہیں جانتا۔ اسی پرانی آمدنی کا مال اس کے پاس ہے۔ اگر اس روپے سے وہ کوئی تجارت کرے تو آئندہ آمدنی حلال متصور ہوگی یا نہیں۔ اگر سب روپیہ وہ ادائیگی حق العباد میں دے دے تب بھی تو ساری عمر کے کمائے ہوئے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ نیز وہ خالی ہاتھ ہو جائے گا اور بال بچوں کی پرورش کا بندوبست وہ کسی طرح نہیں کر سکتا۔ اس کی کیا شرعی صورت ہو سکتی ہے کہ گزارہ اور بچوں کی پرورش بھی ہوتی رہے اور حق العباد

بھی ادا ہوتا جائے۔ ایسی آمدنی سے صدقہ خیرات کرنا کیسا ہے۔
(۴) اور جو شخص فن نجوم جانتا ہے اس سے لوگوں کو غیب کی باتیں بتاتا ہو اس کا کیا حکم ہے۔ اس کی آمدنی کیسی ہے۔

## الجواب

(۱) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث من سحت حلوان الکاھن و مھر الزانیۃ۔ الحدیث: پس اس شخص کی آمدنی حرام ہے اور دھوکہ ہے۔

(۲) زکوٰۃ واجب نہیں۔ بلکہ یہ حق العباد ہے جس کا واپس کرنا واجب ہے۔

(۳) توبہ کا طریق یہ ہے کہ جن لوگوں سے یہ رقم لی ہے ان کو واپس کرے یا ان سے معاف کرائے اگر کسی کا پتہ نہ لگے تو اس کی طرف سے خیرات کرے اگر یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کس کی رقم کتنی ہے تو اپنی پوری کمائی کا اندازہ کرکے اس کے برابر رقم خیرات کرے اور کہتا رہے کہ جس کا جتنا حق ہو اس کو اس کا ثواب اس کے حق کے برابر پہنچا دیا جائے۔ اگر ایک دم کل رقم خیرات نہ کرسکے تو جتنی گنجائش ہوتی جائے ادا کرتے رہے۔

اور اس رقم سے تجارت کرنا اس صورت میں جائز ہے جبکہ کسی اور صورت سے بال بچوں کی پرورش نہ کرسکے اگر ملازمت یا مزدوری سے بال بچوں کی پرورش کرسکے تو یہ کل رقم خیرات کردے اور ملازمت یا مزدوری سے گھر کا کام چلائے۔ ورنہ اگر کوئی صورت میسر نہ ہو تو اس آمدنی سے تجارت کرسکتا ہے اور اس کے منافع سے ضروری خرچ نکال کر بقیہ کو خیرات کرتا رہے۔ یہاں تک کہ دل گواہی دے دے کہ حق العباد ادا ہوگیا ہوگا۔ اگر یہ شخص اس طرح ادائیگی میں لگ گیا اور حق العباد پورا کرنے سے پہلے مرگیا تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی توبہ کو کامل کردیں گے اور اہل حقوق کے حقوق ادا فرمادیں گے۔

(۴) جو شخص فن نجوم جانتا ہو اس کا بھی اس رقم کی بابت وہی حکم ہے جو نمبر ۱ میں مذکور ہوا پس اس شخص کو دھوکہ دہی کا گناہ نہ ہوگا مگر فن نجوم سے کام لینے کا گناہ ہوگا اور اس کی آمدنی بھی حرام ہے۔ واللہ اعلم۔

قال ابن القیم فی زاد المعاد وھذا یبتنی علی قاعدۃ عظیمۃ من قواعد الاسلام وھی ان من قبض مالیس لہ قبضہ شرعًا ثم اراد التخلص منہ فان المقبوض قد اخذ بغیر رضا صاحبہ ولا استوفی عوضہ ردہ علیہ فان تعذر قضی بہ دینا یعلمہ علیہ فان تعذر ردہ علی ورثتہ وان کان المقبوض برضا صاحبہ وقد استوفی عوضہ المحرم فلا یجوز ان یجمع لہ بین العوض والمعوض (ص ۴۳۳ ج ۲) قلت وھھنا الذی یستوفی الدافع عوضہ فعلی القابض رد ما قبضہ الی الدافع بالطریق الذی مر ذکرھا۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا عنہ

۸ / رجب ۴۶ھ

**نابالغ کے مال میں اس کے لئے تجارت کا حکم**

سوال: ہمارے چچا مرحوم کی نابالغ اولاد ہے بچی کا خیال ہے کہ مرحوم کا ترکہ جو بچوں کے حصے میں ہے وہ تجارت میں لگا دیا جائے اس کے متعلق ارشاد ہو کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

اگر مرحوم نے کسی کو وصی بنایا تھا یعنی اپنے ترکہ کے متعلق کسی قسم کی بھی وصیت کا نفاذ کسی کے سپرد کیا تھا تب تو اس وصی کو اختیار ہے کہ ان بچوں کا مال تجارت میں لگا دے گو مرحوم نے اس وصیت میں تجارت میں لگانے کی صراحۃً اجازت بھی نہ دی ہو بشرطیکہ صراحتًا منع نہ کیا ہو۔

فی فتاوی قاضیخان مریض قال لغیرہ اقض دینی فی یصیر وصیًا فی قول ابی حنیفۃ لان قضاء الدین من اعمال الوصیۃ والوصایا لایحتمل التخصیص اذا کان من المیت وقال محمد لایصیر وصیا بھذا القدر مالم یقل اقض دینی وانفذ وصایای۔ (ج ۴/ ۴۳۴) وفی الصفحۃ الاٰتیۃ منہ قال الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل اذا جعل الرجل رجلا وصیًا علی ابنہ وجعل رجلًا آخر وصیًا علی ابنۃ اوجعل احدھما

وصیا فی مالہ الحاضر وجعل رجلاً آخر وصیاً فی مالہ الغائب فان کان فی شرطان لایکون کل واحد منہما وصیا فی ما اوصی الی الآخر یکون الامر علی ماشرط عند الکل وان لم یکن شرط ذالک نحینئذ یکون المسئلۃ علی الاختلاف والفتوی علی قول ابی حنیفۃ وفیہ ایضا ذکر شمس الائمۃ الحلوانی فی شرح الادب القاضی اذا نصب القاضی وصیاً فی ذالک النوع خاصۃ بخلاف الوصی الاب لہ کان وصی القاضی بمنزلۃ وصی الاب، اذا جعلہ القاضی وصیاً فی الانواع کلہا فان جعلہ وصیا فی نوع واحد کان وصیاً فی ذالک النوع خاصۃ بخلاف وصی الاب فانہ لا یقبل التخصیص اذا اوصی الی رجل فی نوع کان وصیاً فی الانواع کلہا (ج: ۴/ ۴۳۷)

اور اگر مرحوم نے بالکل ہی وصی نہ بنایا تھا تو تجارت میں مال لگانا بدون اذن قاضی جائز نہیں اور جج مجسٹریٹ وغیرہ کوئی اگر مسلمان حاکم علاقہ ہو اور گورنمنٹ کی طرف سے اسے ایسے امور کا اختیار بھی ہو تو وہ قاضی کے قائم مقام ہے اور اس کی اجازت سے یتیم کا مال تجارت میں لگانا جائز ہے۔ وھذا کلہ ظاہر۔

کتبہ الاحقر

عبدالکریم عفی عنہ

۲۲ رجب ۵۳ھ

# الفرار عن الطاعونؑ (ای الاثم) بالفرار فی الطاعون

سوال: ایک بہت ہی ضروری مسئلہ جس میں حضرت والا کی تحقیق سے مستفیض ہونے کی بہت ضرورت ہے اس لحاظ سے بھی اس مسئلہ کی تحقیق ضروری ہے کہ طاعون میں جو پریشانیاں ہوتی ہیں وہ حضرت والا پر روشن ہیں۔ سب کے دل حضرت ابوعبیدہؓ کے دل کی طرح نہیں ہوتے باوجود عماری روک تھام کے ہزار میں ایک دو کا بھی فرار عن الطاعون سے بچنا مشکل ہے۔ اس عموم بلویٰ میں اس امت مرحومہ کی دستگیری آپ جیسے حضرات کے لئے ضروری ہو جاتی ہے۔ اس لئے نہایت عاجزی سے عرض پرداز ہوں کہ میں نے بہت ساری کتابوں کو خاص اس مسئلہ کے لئے دیکھا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ مثل اور مسائل کے فرار عن الطاعون کا مسئلہ بھی قدیم سے مختلف فیہ ہے۔

امام نووی نے شرح مسلم میں اس اختلاف کو تفصیل سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ ام المومنین اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرامؓ فرار عن الطاعون کو ناجائز فرماتے ہیں۔ اس کی تائید میں وہ احادیث پیش کرتے ہیں جو مشہور ہیں مثلاً امام احمد کی روایت جو مشکوٰۃ شریف میں مرفوعاً مروی ہے۔ للفار من الطاعون کالفار من الزحف۔

امام نووی جو شافعی المسلک ہیں اس کے بعد کہتے ہیں کہ هذا مذهبنا و مذهب الجمهور۔ یہاں جمہور سے مراد حنفیوں کے سوا ہیں اس لئے کہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ: منهم من جوز القدوم علیه والخروج عنه فرارا قال وروی هذا عن عمر ابن الخطاب وعن ابی موسی الاشعری والمسروق والاسود بن هلال انهم

---

ؑ یعنی الاثم تشبیها به فی التفیت والتشتیت

فرّوا من الطاعون وقال عمرو بن العاص فرّوا عن هذا الرّجز في الشعاب والاودية ودرس المُجتبٰى ملخصًا ۔

اور امام طحاوی اور ابن عساکر و سفیان ابن عینیہ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مشہور واقعہ کو اس طرح روایت کیا ہے کہ جب شام میں طاعون شروع ہوا تو عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار شام کو بایں مضمون فرمان لکھا ۔

اذا اتاك كتابي هذا فاني اعزم عليك ان اتاك مصبحًا لا تمسي حتى تركب وان اتاك ممسيًا لا تصبح حتى تركب الي فقد عرضت لي اليك حاجة لا غناء عنك فيها ۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمان پڑھ کر فرمایا کہ امیر المومنین چاہتے ہیں کہ جو باقی رہنے والا نہیں اس کو باقی رکھیں ۔ اس فرمان کا یہ جواب لکھا کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر میں ہٹ نہیں سکتا وہ مجھ کو معلوم ہے ۔ جب یہ جواب پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے ۔ لوگوں نے کہا ابو عبیدہؓ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے فرمایا نہیں پھر یہ فرمان لکھا کہ ان الاردن ارض عمقة وان الجابية ارض نزهة فانهض بالمسلمين الى الجابية ۔ اس فرمان کی تعمیل شروع کی تھی اسی اثناء میں مبتلا طاعون ہو کر انتقال فرمایا ۔

امام طحاوی جو حنفی ہیں اس کے بعد لکھتے ہیں ۔

فهذا عمر رضي الله تعالےٰ عنه قد أمر الناس ان يخرجوا من الطاعون ووافقه على ذالك اصحاب رسول صلى الله عليه وسلم ۔ اس عبارت کے ملاحظہ سے ظاہر ہو گا کہ امام طحاوی اس سے اجماع صحابہ کو ثابت کر رہے ہیں ۔

اس کے بعد امام طحاوی لکھتے ہیں ۔

وروى عبد الرحمٰن بن عوفؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم

---

عہ مگر ان میں حنفیہ کا نام کہیں بھی نہیں ۱۲ منہ

مایوافق ماذھب الیہ من ذالك ۔ امام طحاوی کی اس تحقیق سے معلوم ہوا فرار عن الطاعون کا جواز حنفی مذہب میں ہے ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت کے سوا فرار عن الطاعون کے جواز میں حنفی علماء ابوداؤد شریف کی ان دو روایتوں کو تائید میں پیش کرتے ہیں ۔

عن انسؓ قال قال رجل یارسول اللہ انا کنا فی دار کثیر فیھا عددنا و اموالنا فتحولنا الی دار قل فیھا عددنا و اموالنا فقال صلی اللہ علیہ وسلم ذروھا ذمیمۃ ۔

اور ابوداؤد شریف کی روایت میں یحییٰ بن عبداللہؓ سے مروی ہے کسی نے کہا کہ یارسول اللہ ہمارے پاس وبائی زمین ہے ۔ فقال دعھا عنك ۔ اس کے متعلق روایات حنفیہ حسب ذیل ہیں ۔ درمختار کے مسائل شتی میں ہے ۔

اذا خرج من بلدۃ بھا الطاعون فان علم ان کل شیٔ بقدر اللہ تعالیٰ فلا بأس بان یخرج و یدخل وان کان عندہ لو خرج نجی ولو دخل ابتلی بہ کرہ لہٗ ذالك فلا یدخل ولا یخرج صیانۃ لاعتقاد و علیہ حمل النھی فی الحدیث الشریف مجمع الفتاوی انتھی ۔

اور اشباہ والنظائر میں لکھا ہے :

وفی البزازیۃ اذا تزلزلت الارض وھو فی بیتہ یستحب الفرار الی الصحراء لقولہ تعالیٰ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ وفیہ قبل الفرار مما لا یطاق من سنن المرسلین ۔

بزازیہ کی یہ عبارت نقل کرکے اشباہ والنظائر میں ہے ۔ فیفید جواز الفرار من الطاعون اذا نزل ببلدۃ ۔ جب فرار عن الطاعون کا جواز حنفی مذہب میں ہے اور اس کی صاف اور صریح روایات موجود ہیں تو کم از کم حنفیوں کو فرار عن الطاعون کا فتویٰ دینا چاہئے تاکہ مسلمانوں کے جم غفیر کو پریشانی سے نجات ملے ۔ اس سلسلے میں حضرت والا کی تحقیق ورائے مبارک سے سننے کے منتظر ہیں ۔

(ف) یہ عرض دینا بھی قابلِ لحاظ ہے کہ فقہی روایات اور اکثر آثار مطلق ہیں۔ جو فناء شہر اور دوسری بستی میں جانے کو شامل ہیں اور بعض آثار سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا حضرت ابو عبیدہؓ کو شام سے مدینہ منورہ کو بلانا اور فوجوں کو اردن سے جابیہ منتقل کرنے کے لئے حکم فرمایا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرار عن الطاعون کے بعد خواہ فناء شہر میں ٹھہرے یا دوسری بستی میں ٹھہرے یہ دونوں جائز ہے۔ فقط

ابو الحسنات سید عبد الشہد کان اللہ لہٗ۔

# الجواب

اوّلاً چند مقدمات ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

(۱) حفاظتِ اعتقاد سب سے ضروری ہے۔

(۲) اہلِ اسلام میں خصوصاً اہلِ سنت و جماعت میں کوئی فریق خدا کے سوا کسی شئی کو مؤثر بالذات نہیں کہتا۔

(۳) عدوی کے متعلق جو علماء میں اختلاف ہے تو باوجود اختلاف کے اس پر سب متفق ہیں کہ طبعاً ولزوماً کوئی مرض متعدی نہیں۔ لزوم تعدیہ کے قائل اہلِ جاہلیت تھے۔ جیسا کہ آج کل اہلِ سائنس ہیں۔

(۴) اگر کوئی مباح مفضی الی المعصیۃ ہو جائے تو حرام ہو جائے گا۔

(۵) اختلاف سے بہت کم مسائل خالی ہیں۔ دیکھنا یہ ضروری ہے کہ اہلِ اختلاف میں ہر ایک کے پاس دلیل قوی ہے یا کسی کی دلیل ضعیف بیّن ہے۔ اگر کسی کی دلیل ضعیف بیّن ہو تو اس کو اختیار کرنا جائز نہیں۔

(۶) نص قولِ مرفوع افعالِ صحابہؓ سے مقدم ہے۔ افعالِ صحابہؓ اگر نص مرفوع کے خلاف ہوں تو خود افعالِ صحابہ میں تاویل کی جائے گی۔ نص میں تاویل نہ کی جائے گی۔

وھذا اذا کان المخالف غیر من روی الحدیث فان کان المخالف ھو الراوی فمذھبنا ان مخالفۃ عمل الراوی لمرویہ جرح فیہ فتنبہ۔

اس کے بعد معروض ہے کہ سائل نے مذہب حنفی کی تدبر سے کام نہیں لیا مذہب حنفی اس مسئلہ میں یہ ہے کہ دخول وخروج من الطاعون اس شخص کے لیے جائز ہے جس کے نزدیک دخول وخروج دونوں بدرجہ مساوی ہوں؛ ورنہ اگر موضع طاعون میں دخول کو مضر اور خروج کو نافع سمجھتا ہو تو ایسے شخص کے لئے مذہب حنفی میں خروج من مقام الطاعون ودخول فی موضع خارج کی اجازت نہیں بلکہ مکروہ تحریمی ہے۔ الا لحاجة شديدة لابد منها فان الحرج مدفوع بالنص۔

سائل نے عبارت طحاوی سے مذہب طحاوی کے سمجھنے میں عجلت سے کام لیا کہ ان کی پوری عبارت نہیں دیکھی بلکہ درمیان ہی سے ان کا مذہب اخذ کر لیا۔ امام طحاوی نے اس مسئلہ میں دو جماعتوں کے اقوال نقل کئے ہیں اولاً مجوزین فرار کے اور ان کی عادت یہ ہے کہ۔ اول اپنے مخالفین کا قول مع دلائل کے نقل کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنا قول مع دلائل کے بیان کرتے ہیں۔ لیکون الآخر ناسخا للاول۔ چنانچہ جو عبارت سائل نے طحاوی سے نقل کی ہے۔ یہ طائفہ اولی مخالفہ کا قول ہے۔

ونصه قالوا عمر رضي الله عنه قد امر الناس ان يخرجوا من الطاعون ووافقه على ذالك اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ

یہ عبارت صاف بتلا رہی ہے کہ یہ قول طحاوی خود نہیں بلکہ دوسروں کا ہے۔ امام طحاوی نے اپنا قول اس کے بعد ص ۳۳۳ ج ۲ پر بعد ذکر خلاصہ قول جماعة الاولی بلفظ فان الذي امر رسول الله صلى الله عليه وسلم في هذا الآثار من ان لا يقدم على الطاعون وذالك للخوف منه الخ کے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

قيل لهم ما في هذا دليل على ما ذكرتم لانه لو كان امره بترك القدوم للخوف منه لكان يبيح لاهل الموضع الذي وقع الطاعون فيه ايضا الخروج منه لان الخوف عليهم منه كالخوف على غيرهم فلما منع اهل الموضع الذي وقع

فيه الطاعون من الخروج منه ثبت ان المعنى الذي من اجله
منعهم من القدوم غير المعنى الذي ذهبتم اليه . فان قال
قائل فما معنى ذلك المعنى قيل له هو عندنا والله اعلم ان
لا يقدم عليه رجل فيصيبه بتقدير الله عزوجلّ عليه ان
يصيبه فيقول لولا انى قدّمت هذه الارض ما اصابنى هذا الوجع
ولعله لو اقام في الموضع الذي خرج منه لاصابه فامر ان لا
يقدمها خوفاً من هذا القول وكذلك امر ان لا يخرج
من الارض التي نزل بها لئلا يسلم فيقول لو اقمت في
تلك الارض لاصابنى ما اصاب اهلها ولعله لو كان اقام بها
ما اصابه من ذلك شيء فامر بترك القدوم على الطاعون
للمعنى الذي وصفنا وبترك الخروج عنه للمعنى الذي ذكرنا اهـ

یہ ہے طحاوی کا مذہب جو بعینہ درمختار میں مذکور ہے اور اس میں یہ بات
قابل تنبیہ ہے کہ فان علم ان کل شئ بقدر اللہ تعالیٰ سے مجرد
اعتقاد تقدیر مراد نہیں بلکہ غلبہ استحضار اعتقاد مراد ہے ۔ دلیل اس کی یہ ہے
کہ نفی علم بالقدر سے نہیں کیا گیا بلکہ ان کان عندہ انہ لو خرج نجا ولو
دخل ابتلی بہ ۔ سے کیا گیا ہے جو اعتقاد تقدیر کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے
کما لا یخفی پس لازم ہے کہ اس کے مقابل میں علم بالقدر سے وہ درجہ مراد ہو جو
اس درجہ سے اعلیٰ ہو ۔ وھو ما قلنا ۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حنفیہ کے نزدیک قدوم وخروج من الطاعون کی اجازت صرف
ان لوگوں کو ہے جن کے نزدیک موضع طاعون میں رہنا اور نہ رہنا مساوی ہو خروج
کو نافع و منجی اور قیام کو مضر و مہلک نہ سمجھتا ہو اور اس کا نام فرار نہیں ۔ پس یوں
کہنا چاہئے کہ حنفیہ فرار کی اجازت نہیں دیتے بلکہ صرف راسخ الاعتقاد کو دخول و
خروج کی اجازت دیتے ہیں اور جب یہ ہے تو بتلائیں کہ ان لوگوں کا فرار حنفیہ کے
نزدیک کیونکر جائز ہو سکتا ہے جن کی پریشانی کا ذکر خود سوال میں ہے کہ باوجود علماء کی
روک تھام کے ہزاروں میں سے ایک دو کا بھی فرار عن الطاعون سے بچنا دشوار ہے کیونکہ

یہ لوگ یقیناً فرار کو نافع و منجی اور قیام کو مضر و مہلک سمجھتے ہیں اور ایسی حالت میں یقیناً حنفیہ فرار کو حرام کہیں گے بلکہ جن صحابہ نے فرار کو جائز کہا ہے وہ بھی اس اعتقاد کے ساتھ فرار کو منع کرتے ہیں۔ چنانچہ سائل نے ابو موسیٰ اشعریؓ کا نام مجوزین فرار میں نووی سے نقل کیا ہے۔ ان کا قول طحاوی میں بسند صحیح اس طرح مذکور ہے۔

ان هذا الطاعون قد وقع باهلی فمن شاء منكم ان يتنزه فليتنزه واحذروا اثنتين ان يقول قائل خرج خارج فسلم وجلس جالس فاصيب لو كنت خرجت لسلمت كما سلم آل فلان او لو كنت جلست لاصبت كما اصيب آل فلان اھ (ج ۲ ص ۳۰۶)

اب غور کیجئے کہ آج کل معدودے چند افراد کے کون ایسا ہے جو فرار من الطاعون میں اس امر سے بچ سکے جس سے ابو موسیٰ اشعریؓ منع فرماتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فرار کو نافع و منجی اور قیام کو مضر و مہلک سمجھنے کے ساتھ مجوزین فرار بھی اس سے منع کرتے ہیں۔ یعنی جبکہ فرار کو نافع اور قیام کو مضر بہ جبر لزوم میں سمجھے اور آج کل عموماً لوگوں کا یہی خیال ہے کیونکہ ڈاکٹروں اور سائنس دانوں نے تعدیہ طاعون بدرجہ لزوم کا اعتقاد عام طور پر لوگوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے اور یہ اعتقاد باطل ہے۔

بحديث لا عدوى ولا طيرة وهو حديث صحيح من رواية يزيد بن السائب وانس ابن مالك اخرجه مسلم عنهما وبرواية ابی هريرة اخرجه مسلم ايضاً ولكن اختلف فيه عليه كذا في العزيزي (ج ۳ / ۴۳۹) والطحاوی (ج ۲ / ۳۰۵)

رہا اشباہ والنظائر کا عبارت یعنی یہ " فيستفيد جواز الفرار من الطاعون " کہنا اول تو یہ کوئی روایت صاحب مذہب سے نہیں بلکہ محض استنباط ہے اور استنباط اشباہ کے ہم مقلد نہیں جبکہ مذہب کے خلاف ہو۔ " والمذهب في الطاعون ما ذكره الطحاوي ومثله في الدر " اور ظاہر یہ ہے کہ صاحب اشباہ کی مراد فرار سے فرار مقید بالقيد الذي ذكره في الدر والطحاوی ہے کیونکہ فرار مطلق تو کسی

کے نزدیک بھی جائز نہیں. صاحب استشباہ کے کلام میں مطلق کا مراد لینا صحیح نہیں.

رہا حضرت عمرؓ کا واقعہ تو طحاوی نے دو واقعے بیان کئے ہیں. ایک سرغ سے واپس لوٹ جانے کا اس میں تو فرار من الطاعون ہرگز نہ تھا کیونکہ طاعون شام میں تھا سرغ میں نہ تھا. یہاں سے رجوع کو امتناع من الدخول علی موضع الطاعون کہہ سکتے ہیں. فرار یا خروج من موضع الطاعون نہیں کہہ سکتے. دلیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا سرغ سے رجوع حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی اس حدیث کے سننے کے بعد ہوا۔

قال ان عندی من ھذا علما انی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اذا سمعتم بہ بارض فلا تقدموا علیہ واذا وقع بارض وانتم بھا فلا تخرجوا فرارا منہ قال فحمد اللّٰہ عمر وانصرف (ج ۲/ ۳۴۵) و سندہ صحیح.

اگر حضرت عمرؓ کا یہ رجوع خروج من موضع الطاعون تھا تو یہ تو حدیث کے خلاف ہوتا اور پھر حمد کے ساتھ انصراف کے کیا معنی بلکہ یقیناً قدوم علی الطاعون سے امتناع تھا.

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہؓ کو اردن سے جابیہ کی طرف منتقل ہونے کا امر کیا تھا اور بظاہر یہ واقعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیث معلوم کر لینے کے بعد حضرت عمرؓ سے صادر ہوا کیونکہ ظہور حدیث کے وقت حضرت ابو عبیدہؓ حیات تھے اور حضرت عمرؓ شام کی طرف جا رہے تھے اور اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ سے حضرت عمرؓ کی گفتگو زبانی ہوئی تھی اور اس دوسرے واقعہ میں حضرت عمرؓ نے خط لکھا ہے اور خط کی تعمیل سے پہلے حضرت ابو عبیدہؓ مطعون ہو کر شہید ہو گئے کما ذکرہ الطحاوی بسند حسن (ج ۲/ ۳۴۹)

پس یقیناً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیث کو سن کر پھر بھی اس کے خلاف حکم دیا. پس لازم ہے کہ اس واقعہ کی تاویل اس حدیث کے خلاف نہ کی جائے۔ اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) ممکن ہے حضرت عمرؓ کو یہ خبر پہنچی ہو کہ اردن میں طاعون شروع ہو گیا ہے اور لشکر شہر سے فاصلہ پر تھا خود لشکر میں طاعون نہ آیا تھا. حضرت عمرؓ نے لشکر

کے وہاں سے منتقل کرنے کا حکم دیا اور یہ فرار یا خروج من موضع الطاعون نہیں۔

(۲) ممکن ہے حضرت عمرؓ نے حدیث میں اذا کنتم بارض سے بلد یا قریہ غرض ارض عمران " مراد لی ہو۔ وھو الظاہر اور لشکر شہر سے باہر جنگل میں رہتا ہے اور جنگل میں اگر طاعون شروع ہوجائے تو جنگل کے آدمیوں کو وہاں سے منتقل ہوجانا جائز ہے کیونکہ جنگل میں علاج معالجہ تیمار داری وغیرہ کا انتظام دشوار ہوتا ہے۔ نیز جنگل والوں کا قیام کسی جگہ مستقل نہیں ہوتا۔ ان کے خروج کو فرار نہیں کہہ سکتے بلکہ انتقال من موضع الی موضع کہا جائے گا۔ فرار یہ ہے کہ انسان اپنے مستقر سے بلا وجہ چلا جائے۔

رہا یہ کہ فقہی روایات اور آثار مطلق ہیں جو فنار شہر کو بھی شامل ہیں الخ اس میں کلام ہے اس لئے کہ احادیث وفقہ میں ارض وبلد کا لفظ وارد ہے۔ اب اگر اس سے گھر مراد ہے تو چاہیے کہ طاعون کے زمانہ میں گھر سے باہر نکلنا بھی جائز نہ ہو۔ اور اس کا کوئی قائل نہیں بلکہ ارض و بلد سے مراد وہ جائے آبادی ہے جہاں طاعون آیا ہے اور ملحقات آبادی کو فقہاء کرام نے بہت سے احکام میں اس آبادی کے حکم میں کیا ہے کجواز الجمعۃ فی فناء المصر وصلوٰۃ العیدین ونحوھما۔ پس اگر کوئی یوں کہے کہ فناء بلد اسی کے حکم میں ہے اس لئے فنار میں نکل آنا خروج من ارض الطاعون یا فرار من بلد الطاعون نہیں تو یہ قول فقہ سے بعید نہیں۔

رہا یہ کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو شام سے مدینہ بلایا تھا الخ سو اس واقعہ کا جو محمل ہے جس کو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اس کے مصداق کو ہندوستان سے مکہ بھی چلے جانے کی اجازت ہے مثلاً علاقہ حیدرآباد میں طاعون شروع ہوا۔ مگر سائل کے شہر یا قصبہ میں ابھی تک نہیں آیا تو سائل کو جائز ہے کہ وہ اسی وقت علاقہ حیدرآباد کو چھوڑ کر مکہ یا مدینہ چلا جائے کیونکہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو ہمارے نزدیک ایسی ہی حالت میں بلایا تھا جبکہ ان کو صرف علاقہ میں ظہور طاعون کی خبر ملی تھی خود معسکر میں دخول طاعون کی خبر نہ ہوئی تھی ورنہ وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیث کے خلاف ہرگز نہ کرتے۔ وعن ادعی غیرہ فلیأت ببرھان۔ یا اگر لشکر میں دخول طاعون کی اطلاع بھی مل گئی تھی تو لشکر معاذہ د

صحرا میں مقیم ہوگا اور اہل صحرا کو جو قریہ اور بلد کے اندر مقیم نہ ہوں انتقال وارتحال جائز ہے
لما ذکرناہ مفصلاً کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرار من الطاعون کو ہرگز جائز نہ سمجھتے
تھے۔ کما روی الطحاوی، حدثنا ابن ابی داؤد ثنا علی بن عباس الحمصی
ثنا شعیب بن ابی حمزہ عن زید بن اسلم عن ابیہ قال قال عمر بن
الخطاب اللّٰھم ان الناس ینحلون ثلاث خصال وانا ابرأ الیک
منھن زعموا انی فررت من الطاعون وانا ابرأ الیک من ذالک
الحدیث۔ (ج ۲ ص ۳۸۰)

یہ تو تفصیلی جواب تھا اور اجمالی جواب مقدمات مذکورہ کی روشنی میں یہ ہے کہ:

(۱) ساری پریشانیوں کے انتظام سے مقدم حفاظت اعتقاد ہے اور فرار
من الطاعون کے جائز کرنے میں حفاظت اعتقاد فوت ہوتی ہے لوگ طاعون کو
متعدی اور مؤثر بالذات سمجھیں گے اور شریعت اس اعتقاد کا ابطال چاہتی ہے
اور حضرات صحابہؓ نے جن کو فرار کی اجازت دی ہے ان پر ان کو اعتماد تھا کہ وہ ماہم
بضارین بہ من احد الا باذن اللہ پر جمے ہوئے ہیں اور درحقیقت ایسے
راسخ الاعتقاد صحیح الیقین کو ہم بھی اجازت دیتے ہیں کما قالہ الحنفیۃ لیکن
دوسرے صحابہ نے سدًّا للذریعہ ایسے اقویاء کے لئے بھی خروج من الطاعون کو گوارا
نہیں کیا اور یہ سمجھا کہ گو یہ اس وقت راسخ الاعتقاد ہیں مگر فرار وخروج کے بعد ممکن ہے
کہ ایسے واقعات رونما ہوں جن سے اعتقاد متزلزل ہو جائیں اور زمانہ موجودہ کے
مسلمانوں کا رسوخ اعتقاد جیسا ہے معلوم ہے۔ ان کے لئے جواز فرار کی گنجائش کسی قول
پر نہیں معلوم ہوتی اور ابوداؤد کی حدیثوں سے استنباط صحیح نہیں کیونکہ ان کا مطلب
تو یہ ہے کہ جو جگہ آب وہوا کے لحاظ سے خراب ہو اس کو چھوڑ دو یعنی اس کے بجائے
دوسری جگہ کو وطن بنالو۔ یہ مطلب نہیں کہ بیماری کے زمانہ میں بھاگ جایا کرو اس کے
بعد پھر واپس آرہا کرو بس ان محمل تداوی وتدبیر بتبدیل وطن ہے اس کو فرار
سے کچھ مس نہیں، خصوصًا فرار عن الطاعون سے کیونکہ طاعون کا منشا رشارع کے
نزدیک خرابی آب وہوا نہیں بلکہ وخز الجن ہے۔ کما صرح بہ غیر ما حدیث۔
علاوہ ازیں جبکہ فرار عن الطاعون میں نہی صریح بلفظ خاص وارد ہے تو عمومات

احادیث اخریٰ سے اس کا معارضہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ فان الخاص قاضی علی العام و المفسر علی المجمل فافہم۔

علاوہ ازیں قرار فنیا سے کے بعد غرباء کی جو فرار پر قادر نہیں ہوتے شہر میں جیسی بری گت بنتی ہے اس کو اسلام کیوں کر گوارا کر سکتا ہے بلکہ بعض ظالم تو اپنی اولاد واقرباء کو بھی مبتلا بطاعون دیکھ کر ان کو چھوڑ کر شہر سے بھاگ گئے اور دوسروں نے ان کی تجہیز وتکفین کی۔ پس مقدمہ (۲ و۳ و۴) کی بناء پر بھی فرار من الطاعون جائز نہیں کیونکہ یہ مفضی الی ضعف الاعتقاد وارتکاب المعاصی کترک التعاصد بالمسلمین واختیار التقاطع بالاقربین ہے اور بناء بر مقدمہ (عث) غرض یہ ہے کہ اس مسئلہ میں جو اختلاف ہے۔ وہ محض نزاع لفظی ہے۔ حنفیہ نے ان کے اقوال میں تاویل کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ راسخ الاعتقاد کو جس کے نزدیک فرار وقرار بدرجہ مساوی ہے دخول وخروج جائز ہے اور ضعیف الاعتقاد کو یا جس پر خروج سے ضعف اعتقاد کا اندیشہ ہو جائز نہیں۔ اگر کوئی اس کو خلاف حقیقت سمجھے تو ہم کہیں گے کہ مجوزین فرار کے پاس کوئی دلیل نہیں ان کے استدلالات سب ضعیف ہیں۔ چنانچہ طحاوی نے سب کا جواب نہایت خوبی سے دے دیا ہے اور مانعین فرار کے پاس ایک تو حدیث مرفوع جابرؓ کی ہے۔ الفار من الطاعون کالفار من الزحف، ذکرہ الحافظ فی الفتح وحسنہ اخرجہ عبد بن حمید۔

دوسری حدیث عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی مرفوع ہے جس کو طحاوی نے حضرت سعد بن ابی وقاص واسامۃ بن زید وعکرمۃ بن خالد مخزومی رضی اللہ عنہم سے بطرق عدیدہ روایت کیا ہے اور یہ دونوں حدیثیں قولی مرفوع ہیں جن میں سے ایک میں مقام طاعون سے خروج کو منع کیا گیا ہے۔ دوسری میں اس کو فرار من الزحف کے مثل کہا گیا ہے جو اکبر الکبائر ہے۔ ایسی حالت میں اس حدیث سے بالکل قطع نظر کر لینا اور محض لفظ اختلاف کو کتابوں میں دیکھ کر جواز کی گنجائش نکال لینا مومن خائف کا کام نہیں، بلکہ لازم ہے کہ مجوزین کے قول کو یا اس پر محمول کیا جائے کہ ان کو احادیث نہیں پہنچیں، یا انہوں نے راسخ الاعتقاد لوگوں کو اجازت دی تھی۔

امید ہے کہ اس تحریر سے سب اشکالات حل ہو گئے ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ

اعلم و علمہ اتم و احکم۔

حررہ الاحقر

ظفر احمد عفا عنہ از خانقاہ امدادیہ

۶ رمضان ۱۳۴۶ھ

تتمہ: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مسائل طاعون کے متعلق ایک مبسوط تقریر فتح الباری میں درج فرمائی ہے جو غایت درجہ مفید و مستحسن ہے۔ اس کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتا ہوں۔

# تحقیق معنی الطاعون واسبابہ

قال الحافظ فی الفتح وقال جماعة من الاطباء منهم ابو علی سینا الطاعون مادة سمیة تحدث ورمًا قتالًا یحدث فی المواضع الرخوة والمغابن من البدن واغلب ما تکون تحت الابط او خلف الاذن او عند الارنبة قال وسببه دم ردی مائل الی العفونة والفساد یستحیل الی جوهر سمی یفسد العضو ویغیر ما یلیه ویؤدی الی القلب کیفیة ردیة فیحدث القیٔ والغثیان والغشی والخفقان وهو لرداءته لا یقبل من الاعضاء الا ما کان اضعف بالطبع واردؤه ما یقع فی الاعضاء الرئیسة والاسود منه قل من یسلم فیه واسلمه الاحمر ثم الاصفر والطواعین تکثر عند الوباء فی البلاد الوبیئة ومن ثم اطلق علی الطاعون وباء واما الوباء فهو فساد جوهر الهواء الذی هو مادة الروح ومدده۔

قلت فهذا ما بلغنا من کلام اهل اللغة واهل الفقه والاطباء فی تعریفه[ع] والحاصل ان حقیقته ورم ینشاء عن هیجان الدم او انصباب الدم الی عضو فیفسده وان غیر ذلک

---

ع۔ قلت وقد ذکر کلام اهل اللغة والفقه قبل ۱۲ ظ

من الامراض العامة الناشئة عن فساد الهواء يسمّى طاعوناً بطريق المجاز لاشتراكهما فى عموم المرض به او كثرة الموت والدليل على ان الطاعون يغاير الوباء ما سيأتى فى رابع احاديث الباب ان الطاعون لا يدخل المدينة وقد سبق فى حديث عائشة قدمنا الى المدينة وهى اوبأ ارض الله وفيه قول بلال اخرجونا الى ارض الوباء وما سبق فى الجنائز فى حديث ابى الاسود قدمت المدينة فى خلافة عمر وهم يموتون موتا ذريعا وما سبق فى حديث العرنيين انهم استوخموا المدينة وفى لفظ انهم قالوا انها ارض وبئة فكل ذلك يدل على ان الوباء كان موجودا بالمدينة وقد صرح الحديث الاول بانه لا يدخلها فدلّ على ان الوباء غير الطاعون وان من اطلق على كل وباء طاعونا فبطريق المجاز والذى يفترق به الطاعون من الوباء اصل الطاعون الذى لم يتعرض له الاطباء والاكثر من تكلم فى تعريف الطاعون وهو كونه من طعن الجن ولا يخالف ذلك ما قال الاطباء من كون الطاعون ينشاء من هيجان الدم او انصبابه لانه يجوز ان يكون ذلك يحدث عن الطعنة الباطنة فتحدث منها المادة السمية ويهيج الدم بسببها او ينصب وانما لم يتعرض الاطباء لكونه من طعن الجن لانه امر لا يدركه العقل وانما يعرف من الشارع فتكلموا فى ذلك على ما اقتضته قواعدهم۔

المؤيدات لكون الطاعون من وخز الجن

ومما يؤيد ان الطاعون انما يكون من طعن الجن وقوعه غالباً فى اعدل الفصول وفى اصح البلاد هواء واطيبها ماء ولانه لو كان بسبب فساد الهواء الدائم فى الارض

لان الهواء يفسد تارة ويصح اخرى وهذا يذهب احيانا ويجيئ احيانا على غير قياس ولا تجربة فربما جاء سنة على سنة وربما ابطأ سنين وبانه لو كان كذالك لعم الناس والحيوان والموجود بالمشاهدة انه يصيب الكثير ولا يصيب من هم بجانبهم مما هو فى مثل مزاجهم ولو كان كذالك لعم جميع البدن وهذا يختص بموضع من الجسد ولا يتجاوزه ولان فساد الهواء يقتضى تغيير الاخلاط وكثرة الاسقام وهذا فى الغالب يقتل بلا مرض او قال شيخنا ولان فساد الهواء لا يختص فى بلدة واحدة بمحلة منها ولا يبدو من محلة الى محلة المشاهد فى الطاعون دورانه وجولانه من مكان الى مكان ومن محلة منها الى محلة حتى ان فى محلة حريق من الطاعون كحريق السعير ومحلة اخرى مطمئنة لا تشعر بشئ من ذالك ثم يمشى وينتقل هكذا من مكان الى مكان كان له جولة بجولة العسكرى من الاعداء ... فدل على انه من طعن الجن كما ثبت فى الاحاديث .

| | |
|---|---|
| تحقيق حديث الطاعون من وخز الجن | منها حديث ابى موسى فناء امتى بالطعن والطاعون قيل يارسول الله هذا طعن قد عرفناه فما الطاعون |

قال وخز اعداء كم من الجن وكل فى شهادة اخرجه احمد ثم ذكر له الحافظ طرقا عديدة وقال فالحديث صحيح بهذا الاعتبار وقد صححه ابن خزيمة والحاكم واخرجاه واحمد والطبرانى من وجه آخر عن ابى بكر بن ابى موسى الاشعرى قال سئلت عنه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال هو وخز اعدائكم من الجن وهو لكم شهادة ورجاله رجال الصحيح الا ابا بلج واسمه يحى وثقه ابن معين والنسائى وجماعة

وضعفه جماعة بسبب التشيع وذلك لا يقدح فی قبول روایة عند الجمهور وله طریق ثالثة اخرجها الطبرانی ورجاله رجال الصحیح الا کریبا وایاه وکریب وثقه ابن حبان. وله حدیث آخر فی الطاعون اخرجه احمد وصححه الحاکم من روایة عاصم الاحول عن کریب بن الحرث عن ابی بردة بن قیس اخی ابی موسی الاشعری رفعه اللهم اجعل فناء امتی قتلا فی سبیلك بالطعن والطاعون قال العلماء اراد صلی الله علیه وسلم ان یحصل لامته ارفع انواع الشهادة وهو القتل فی سبیل الله بایدی اعدائهم اما من الانس واما من الجن (تنبیه) یقع فی الالسنة بلفظ وخز اخوانکم ولم اره بلفظ اخوانکم بعد التتبع الطویل البالغ فی شیء من طرق الحدیث اھ (ج ۱۰/۱۰۱، ۱۰۲)

تحقیق الفرار عن الطاعون والقدوم ببلدة حولها | اخرج البخاری فی صحیحه عن عبد الرحمن بن عوف سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول اذا سمعتم بالطاعون بارض فلا تقدموا علیه واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا فرارا منه اھ قال الحافظ وقد اخرج الطحاوی بسند صحیح عن انس ان عمر اتی الشام فاستقبله ابو طلحة وابو عبیدة فقال یا امیر المؤمنین ان معك وجوه الصحابة وخیارهم وانا ترکنا بعدنا مثل حریق النار فارجع العام فرجع وفی هذا الحدیث جواز رجوع من اراد

ع قلت وبهذا زال ما یختلج فی صدور بعض العوام لاجل موت المسلمین بالطاعون اکثر من موت المشرکین به فلیعلموا بان ذالك لطلب نبیهم صلی الله علیه وسلم فناءهم بالطعن والطاعون لکن یفوزوا بدرجات الشهادة العالیة ۱۲ جامع.

دخول بلدة قد علم أن بها الطاعون وأن ذلك ليس من
الطيرة وإنما هي من منع الإلقاء إلى التهلكة أو سد الذريعة
لئلا يعتقد من يدخل إلى الأرض التي وقع بها أن لو دخلها
وطعن العدوى المنهي عنه وقد زعم قوم أن النهي عن
ذلك إنما هو للتنزيه وأنه يجوز الإقدام عليه لمن قوي
توكله وصح يقينه وتمسكوا بما جاء عن عمر أنه ندم على رجوعه
من سرغ[1] كما أخرجه ابن أبي شيبة بسند جيد عن القاسم بن
محمد عن ابن عمر قال جئت عمر حين قدم فوجدته قائلا في
خبائه فانتظرته في ظل الخباء فسمعته يقول حين تضرع
اللهم اغفر لي رجوعي من سرغ وأخرج الطحاوي بسند صحيح
عن زيد بن أسلم عن أبيه قال قال عمر اللهم إن الناس
قد نحلوني ثلاثا أنا أبرأ إليك منهن زعموا أني فررت من الطاعون
وأنا أبرأ إليك من ذلك وذكر الطلاء والمكس وقد ورد عن
غير عمر التصريح بالعمل في ذلك بمحض التوكل فأخرج ابن
خزيمة بسند صحيح عن هشام بن عروة عن أبيه أن الزبير
بن العوام خرج غازيا نحو مصر فكتب إليه أمراء مصر أن الطاعون
قد وقع فقال إنما خرجنا للطعن والطاعون فدخلها فلقي
طعنا في جبهته ثم سلم وفي الحديث أيضا منع من وقع
الطاعون ببلد هو فيها من الخروج منها وقد اختلف
الصحابة في ذلك وقد أخرج أحمد بسند صحيح إلى أبي منيب
أن عمرو بن العاص قال في الطاعون إن هذا رجس مثل
السيل من تنكبه أخطأه ومثل النار من أقام أحرقته
فقال شرحبيل بن حسنة إن هذا رحمة ربكم ودعوة

---

[1] موضع بالشام ١٢

نبیکم وقبض الصالحین قبلکم و فی معظم الطرق ان عمرو بن العاص صدق شرحبیل وغیرہ علی ذالک ونقل عیاض جواز الخروج من الارض التی یقع بہا الطاعون عن جماعۃ من الصحابۃ منہم ابوموسیٰ الاشعری والمغیرۃ بن شعبۃ ومن التابعین منہم الاسود بن ہلال ومسروق ومنہم من قال النہی فیہ للتنزیہ فیکرہ ولا یحرم وخالفہم جماعۃ فقالوا یحرم الخروج منہا لظاہر النہی الثابت فی الاحادیث الماضیۃ وہذا ہو الراجح عند الشافعیۃ وغیرہم (کالحنفیۃ ۱۲) ویؤید ثبوت الوعید علی ذالک فاخرج احمد وابن خزیمۃ من حدیث عائشۃ فی اثناء حدیث بسند حسن قلت یارسول اللہ فما الطاعون قال غدۃ کغدۃ الابل المقیم فیہا کالشہید والفار منہا کالفار من الزحف ولہ شاہد من حدیث جابر رفعہ الفار من الطاعون کالفار من الزحف والصابر فیہ کالصابر فی الزحف اخرجہ احمد ایضًا وابن خزیمۃ وسندہ صالح للمتابعات وقال الطحاوی والذی یظہر واللہ اعلم ان حکمۃ النہی عن القدوم علیہ لئلا یصیب من قدم علیہ بتقدیر اللہ فیقول لولا انی قدمت ہذہ الارض لما اصابنی ولعلہ لو اقام فی الموضع الذی کان فیہ لاصابہ فامران لا یقدم علیہ حسما للمادۃ ونہی من وقع وہو بہا ان یخرج من الارض التی نزل بہا لئلا یسلم فیقول مثلًا لو اقمت فی تلک الارض لاصابنی ما اصاب اہلہا ولعلہ لو کان اقام بہا ما اصابہ من ذالک شئ اھ ویؤیدہ ما اخرجہ الہیثم بن کلیب والطحاوی والبیہقی بسند حسن عن ابی موسیٰ انہ قال ان ہذا الطاعون قد وقع فمن اراد ان یتنزہ عنہ فلیفعل واحذروا ثنتین ان یقول قائل خرج خارج فسلم وجلس جالس فاصیب لکن ابوموسیٰ حمل النہی علی من قصد الفرار محضًا

ولا شک ان الصور ثلث من خرج بقصد الفرار محضا فهذا یتناوله النهی لا محالة ومن خرج لحاجة متمحضة لا لقصد الفرار اصلاً ویتصور ذالک فیمن تهیأ للرحیل من بلد کان به الی بلد اقامتهٖ مثلاً فاتفق وقوع الطاعون فی اثناء تجهیزه فهذا لم یقصد الفرار اصلاً فلا یدخل فی النهی والثالث من عرضت له حاجة فاراد الخروج الیها وانضم الی ذالک انه قصد الراحة من الاقامة فی البلد التی وقع بها الطاعون (ولو لم یقصد الراحة بل اراد الرجوع الی هذا الموضع فهو من اهل الصورة الثانیة کما لا یخفی ۱۲ جامع) فهذا محل النزاع فمن منع نظر الی صورة الفرار فی الجملة ومن اجاز نظر الی انه مستثنی من عموم الخروج فرارا لانه لم یتمحض للفرار وانما هو لقصد التداوی وعلی ذالک یحمل ما وقع فی اثر ابی موسی المذکور ان عمر کتب الی ابی عبیدہ ان لی الیک حاجة فلا تضع کتابی من یدک حتی تقبل الیّ فکتب الیه انی قد عرفت حاجتک وانی فی جند من المسلمین لا اجد بنفسی رغبة عنهم فکتب الیه اما بعد فانک نزلت بالمسلمین ارضا عمیقة فارفعهم الی ارض نزهة فدعا ابو عبیدة فقال اخرج فارتد للمسلمین منزلاً حتی انتقل بهم فذکر القصه وانه نزل بالناس فی مکان آخر فارتفع الطاعون

¹ فیه دلیل جواز ما افتی به مشائخنا من خروج اهل المصر الی الفناء لتبدیل الهواء فان ذالک لیس من الفرار بل من باب التداوی ۱۲ جامع

² قلت فیه تصریح بان الفرار لقصد الفرار لیس بمختلف فیه بین العلماء ولا بین الصحابة بل هو ممنوع وحرام اتفاقا وانما النزاع فی الخروج لا بقصد الفرار بل لحاجة اخری والجمهور فیه علی المنع واجازت الحنفیة الخروج فیها لمن کان الخروج والفرار عنده سواء ای کان راسخ الاعتقاد بقوله تعالٰی وما هم بضارین به من احد الا باذن الله فافهم ۱۲ ظ

وقوله عميقة اى قريبة من المياه والنزور وذلك مما يفسد غالبا به الهواء لفساد المياه والنزهة الفسيحة البعيدة عن الوخم فهذا يدل على ان عمر رأى ان النهي عن الخروج انما هو لمن قصد الفرار متمحضا وقد كان امر عمر لابي عبيدة بذلك بعد سماعه الحديث المذكور من عبد الرحمن بن عوف فتأول فيه عمر ما تأول وقال الطحاوي ليس في هذا اثبات العدوى وانما هو من باب التداوي فان استصلاح الاهوية من انفع الاشياء في تصحيح الابدان وبالعكس وقد ذكر العلماء في النهي عن الخروج حكما منها انه لو شرع الخروج فخرج الاقوياء لكان في ذلك كسر قلوب الضعفاء وقد قالوا ان حكمة الوعيد في الفرار من الزحف لما فيه من كسر قلب من لم يفر وادخال الرعب عليهم ومنها ما ذكره بعض الاطبا ان المكان الذي يقع به الوباء تتكيف امزجة اهله بهواء تلك البقعة وتألفها وتصير لهم كالاهوية الصحيحة لغيرهم فلو انتقلوا الى الاماكن الصحيحة لم توافقهم بل ربما اذا استنشقوا هواءها استصحب معه الى القلب من الابخرة الردية التي حصل تكيف بدنه بها فافسدته فمنع من الخروج لهذه النكتة وقال الشيخ ابن دقيق العيد الذي يترجح عندي في الجمع بينهما ان في الاقدام عليه تعريض النفس للبلاء ولعلها لا تصبر عليه وربما كان فيه ضرب من الدعوى لمقام الصبر او التوكل فمنع ذلك حذرا من اغترار النفس ودعواها ما لا تثبت عليه عند الاختبار واما الفرار فقد يكون داخلا في التوغل في الاسباب بصورة من يحاول النجاة بما قدر عليه فامرنا الشارع بترك التكلف في الحالتين ومن هذه المادة قوله صلى الله عليه وسلم لا تتمنوا لقاء العدو واذا لقيتموهم

فاصبروا فامر بترك التمني لما فيه من التعرض للبلاء وخوف اغترار النفس اذ لا يؤمن غدرها عند الوقوع ثم امرهم بالصبر عند الوقوع تسليماً لامر الله تعالى اھ (ص۱۸۲ ج۱۰)

ترجمہ[1]: حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتح الباری میں فرمایا ہے کہ اطباء کی ایک جماعت جس میں ابو علی سینا بھی ہیں یہ کہتی ہے کہ طاعون ایک زہریلا مادہ ہے جو انتہائی مہلک ورم پیدا کرتا ہے۔ یہ مادہ بدن کے نازک اور پوشیدہ حصوں میں پیدا ہوتا ہے اور اکثر بغل کے نیچے یا کان کے نیچے یا ناک کے بانسے کے پاس ہوتا ہے۔ اس کا سبب عفونت و فساد کی طرف مائل خراب خون ہوتا ہے جو ایک زہریلے مادے میں بدل کر کسی عضو اور اس کے آس پاس کی جگہوں کو فاسد کر دیتا ہے اور دل میں ایک ایسی خراب کرنے والی کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے قے، متلی، بے ہوشی اور خفقان کی نوبت آجاتی ہے۔ یہ مادہ چونکہ گندا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے اعضاء کو نشانہ بناتا ہے جو طبعاً کمزور ہوتے ہیں۔ طاعون کی سب سے مہلک قسم اعضائے رئیسہ میں ہونے والا طاعون ہے اور کالا طاعون سے مریض بہت کم ہی بچ پاتا ہے۔ سب سے ہلکی قسم سرخ طاعون ہے اس کے بعد زرد طاعون۔ طاعون کی یہ قسمیں زیادہ تر وبا زدہ علاقوں میں وبا کے وقت ہوتی ہیں اسی وجہ سے طاعون کو وبا بھی کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ در حقیقت ہوا اس جوہر میں فساد واقع ہونے کو کہتے ہیں جو مادۂ روح ہے (میں کہتا ہوں) یہ وہ باتیں ہیں جو طاعون کی تعریف کے سلسلے میں اہل لغت، فقہاء اور اطباء سے ہمیں معلوم ہوتی ہیں (اہل لغت اور فقہاء کی عبارتیں پیچھے ذکر کی جا چکی ہیں) اور حاصل ان سب کا یہ ہے کہ طاعون کی حقیقت خون کے دباؤ اور عضو کی طرف اس کے بہاؤ سے پیدا ہونے والا ورم ہے جو اس عضو کو فاسد کر دیتا ہے اگرچہ اس کے علاوہ ہوا کے فساد کی وجہ سے پیدا ہونے والے عام

---

[1] قدیم مسودہ میں صرف عربی عبارات نقل کی گئی تھیں اور ایک نوٹ تحریر تھا کہ "وقت طباعت ان عبارات کا ترجمہ کرا لیا جائے" لہٰذا ان عبارات کا ترجمہ کر کے شامل اشاعت کر لیا گیا ہے۔ افتخار

امراض کو بھی مجازاً طاعون کہہ دیا جاتا ہے اس لئے کہ طاعون اور آب و ہوا کے
فساد دونوں ہی صورتوں میں مرض عام ہوتا ہے اور کثرت سے موت واقع ہوتی
ہے طاعون اور وبا الگ الگ چیزیں ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ اس باب کی چوتھی
حدیث میں آرہا ہے کہ طاعون مدینہ میں داخل نہیں ہوگا حالانکہ حضرت عائشہ
رضی اللہ عنہا کی حدیث میں یہ بات گذر چکی ہے کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہ سب
سے زیادہ وبا زدہ علاقہ تھا اسی سلسلہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے
کہ آپ نے فرمایا کہ کفار نے ہمیں وبا زدہ زمین میں بسنے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح
جنائز میں ابو الاسود کی حدیث گذر چکی ہے کہ میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ
میں مدینہ آیا تو وہاں متواتر اموات ہو رہی تھیں اور عرنیین کی حدیث میں بھی
گذرا ہے کہ انہیں مدینہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی اس کا بھی ذکر آیا ہے کہ مدینہ کی
سرزمین وبا زدہ تھی۔ یہ تمام باتیں اس پر شاہد ہیں کہ مدینہ میں وبا موجود تھی حالانکہ
پہلی حدیث یہ بتلا رہی ہے کہ طاعون مدینہ میں داخل نہیں ہوگا۔ تو یہ معلوم ہوا کہ
وبا اور چیز ہے طاعون اور چیز ہے اور اگر کسی نے ہر وبا کو طاعون کہا ہے تو مجازاً
کہا ہے۔ وبا اور طاعون میں فرق طاعون کی اصل حقیقت سے ہوتا ہے جس سے
اطبائے بحث نہیں کی طاعون کی تعریف کے سلسلے میں کلام کرنے والے اکثر حضرات
نے اپنے قواعد کے مطابق کلام کیا ہے کہ طاعون جن کے کچوکا لگانے سے ہوتا ہے
اطباء نے جو بات کہی ہے کہ طاعون خون کے دباؤ اور بہاؤ سے ہوتا ہے یہ تعریف
اس کے منافی نہیں ہے اس لئے یہ ممکن ہے کہ اصل سبب تو وہی باطنی کچوکا ہو اور
اس سے زہریلا مادہ اور اس زہریلے مادے سے خون کا دباؤ اور بہاؤ پیدا ہو جاتا
ہو لیکن اطبائے اس اصل سبب سے اس لئے بحث نہیں کی کہ کسی جن کے طاعون
کا سبب ہونا عقل سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے یہ تو شارع ہی سے معلوم
ہو سکتی ہے۔

طاعون کے جن کے کچوکا لگانے سے ہونے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عام طور
پر اس کا وقوع انتہائی مناسب موسم میں جو کسی وباء کا وقت نہیں ہوتا ہے اور بہترین
آب و ہوا والے علاقوں میں بھی ہو جاتا ہے اور پھر اگر آب و ہوا کا فساد ہی اس

کا سبب ہوتا تو طاعون مسلسل کہیں نہ کہیں پایا جاتا اس لئے کہ ہوا تو بگڑتی درست ہوتی رہتی ہے حالانکہ طاعون کا ظہور کبھی کبھی ہوتا ہے اور وہ بھی اچانک بغیر کسی پیشگی اندازے یا تجربے کے چنانچہ یہ تو سال بسال ہوتا ہے اور کبھی یہ بہا برس کا وقفہ ہوجاتا ہے نیز اگر کسی موسمی اثر کے ماتحت ہوتا تو انسان حیوان سب اس سے متاثر ہوتے لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور ان کے آس پاس ان کے ہم مزاج لوگ متاثر نہیں ہوتے اور پھر اگر ہوا کی خرابی ہی سبب ہوتی تو پورے بدن میں بیماری پھیلنی چاہیئے تھی حالانکہ یہ جسم کے کسی ایک ہی مقام کے ساتھ مخصوص رہتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھتی مزید یہ کہ فساد ہوا کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جسم کے اخلاط میں تبدیلی واقع ہوتی اور کثرت سے امراض پھیلتے جبکہ طاعون عام طور پر بغیر کسی اندرونی مرض کے بھی باعث ہلاکت ہوجاتا ہے۔ (ہمارے شیخ نے فرمایا کہ وبا کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ وہ کسی شہر کے ایک محلہ کے ساتھ مخصوص رہے یا محلہ محلہ چکر لگائے جبکہ طاعون میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک محلہ سے دوسرے محلہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک محلہ تو طاعون کی شدید لپیٹ میں ہوتا ہے اور دوسرا محلہ بالکل پرسکون ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ محض موسمی اثرات سے پھیلنے والی وبا نہیں)

اس کے منتقل ہونے کا یہی سلسلہ جاری رہتا ہے گویا دشمن کی سپاہ گھومتی پھر رہی ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنات کے زیر اثر ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

| | |
|---|---|
| اس حدیث کی تحقیق کہ طاعون جن کے کچوکا لگانے سے ہوتا ہے۔ | حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ میری امت میں طعن (یعنی جب دشمن تیر لگنے) سے اور طاعون سے ہلاکت ہوگی۔ |

عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ یہ طعن تو سمجھ میں آگیا لیکن طاعون کیا ہے؟ فرمایا یہ تمہارے دشمن جنوں کی شرارت ہے اور دونوں سے ہونے والی موت شہادت ہے (اخرجہ احمد)

اس کے بعد حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے مختلف طرق ذکر کئے ہیں اور فرمایا ہے کہ ان طرق کے پیش نظر حدیث صحیح ہے اور ابن خزیمہ اور حاکم نے بھی اس

کو صحیح قرار دیا ہے اور اس کے علاوہ احمد اور طبرانی نے بھی ایک دوسرے طریق سے اس کی تخریج کی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابو بکر نے ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کی بابت دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ تمہارے دشمن جنوں کی شرارت ہے اور تمہارے لئے شہادت ہے۔ اس روایت کے تمام رجال سوائے ابو بلج کے معتبر ہیں۔ ابو بلج کا نام یحییٰ ہے۔ ابن معین نسائی اور ایک جماعت نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے جبکہ دوسری جماعت نے شیعہ ہونے کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے لیکن جمہور کے نزدیک صرف یہ بات روایت کے غیر معتبر ہونے کی وجہ نہیں۔ اس روایت کا ایک تیسرا طریق وہ بھی ہے جو طبرانی نے ذکر کیا ہے اور اس کے رجال سوائے کریب اور اس کے والد کے صحیح ہیں البتہ ابن حبان نے کریب کی توثیق کی ہے۔ کریب کی طاعون کے بارے میں ایک اور حدیث ہے جس کی تخریج امام احمد بن حنبلؒ کی ہے اور حاکم نے اسے عاصم عن کریب بن الحارث عن ابی بردۃ بن قیس اخی ابی موسیٰ الاشعری رفعہ) کی سند نقل کرکے صحیح قرار دیا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اے اللہ میری امت میں قتال (جہاد) اور طاعون کے ذریعے اپنی راہ میں قتل ہوکر کمی فرما دیجیے۔ علمائے فرمایا کہ اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے سب سے اعلیٰ درجہ کی شہادت طلب فرمائی ہے اور وہ یہ کہ راہ خدا میں انسان یا جنات دشمنوں کے ہاتھوں قتل کیے جائیں۔

(تنبیہ) وخز اخوانکم (تمہارے بھائیوں کی شرارت) کے الفاظ زبان زد عام ہیں لیکن بہت تلاش کے باوجود کسی بھی طریق میں مجھے یہ الفاظ نہیں مل سکے۔

**طاعون سے بھاگنے یا طاعون والی جگہ جانے کی تحقیق**

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم سنو کہ کسی جگہ طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر تم کہیں ہو اور وہاں طاعون آجائے تو اس سے بچنے کی خاطر وہاں سے نہ نکلو۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام طحاوی نے حضرت انس کے حوالے سے سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں حضرت ابو طلحہؓ و حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کا استقبال کیا اور عرض کی کہ امیر المومنین آپ کے ہمراہ معزز صحابہ کرام ہیں ہم پیچھے رشام میں آگ کی مثل طاعون چھوڑ کر آ رہے ہیں لہٰذا اس سال آپ وہاں تشریف نہ لے جائیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ واپس تشریف لے آئے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی علاقے میں جانے کا ارادہ رکھتا ہو، وہ اس کو یہ علم ہو کہ وہاں طاعون ہے تو اس کے لئے لوٹ جانا جائز ہے اور یہ کوئی بدفالی نہیں بلکہ محض اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانا ہے۔ سد ذریعہ ہے اس لئے کہ اگر کوئی اس طاعون والی جگہ چلا جائے اور طاعون کا شکار ہو جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ یہ اعتقاد کر بیٹھے کہ یہ مرض مجھے چھوت کی وجہ سے لگ گیا جبکہ یہ (اعتقاد) غلط ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی جگہ جانے سے روکنا احتیاطاً ہے۔ اگر کوئی مضبوط توکل اور یقین رکھتا ہو تو اس کے لئے جانا جائز ہے۔ یہ حضرات اس موقف کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرغ (شام کا وہ مقام جہاں سے حضرت لوٹ گئے تھے) سے واپسی پر افسوس کا اظہار فرمایا۔ جیسا کہ ابن ابی شیبہ نے ایک درست سند (قاسم بن محمد عن ابن عمر) کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب حضرت عمرؓ واپس تشریف لائے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو اپنے خیمے میں کچھ کہتے ہوئے سنا۔ میں خیمہ کے سامنے ہی رک کر انتظار کرنے لگا۔ تو میں نے سنا کہ دعا فرما رہے ہیں اے اللہ میرے سرغ سے واپس لوٹ آنے کو معاف فرما دے۔

اور امام طحاوی نے سند صحیح (عن زید بن اسلم عن ابیہ) سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ لوگ میرے بارے میں تین باتوں کا گمان کرتے ہیں میں آپ کے حضور ان سب سے براءت ظاہر کرتا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں طاعون کے خوف سے بھاگ آیا ہوں میں اس سے بھی براءت پیش کرتا ہوں۔ اسی طرح دو اور چیزوں (شیرے اور ٹیکس) کا

ذکر فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ بھی اور صحابہ کرام سے مروی ہے کہ اس سلسلے میں خالص توکل سے کام لینا چاہیئے چنانچہ ابن خزیمہ نے سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے کہ زبیر ابن عوام رضی اللہ عنہ مصر کی جانب جہاد پر روانہ ہوئے تو مصر کے امراء نے انہیں لکھا کہ یہاں طاعون آچکا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا ہم طعن (جہاد) اور طاعون دونوں ہی کے لئے نکلے چنانچہ مصر میں داخل ہو گئے اور ان کی پیشانی پر ایک تیر بھی لگا لیکن محفوظ رہے۔ اور حدیث میں اس شہر سے نکلنے سے منع بھی کیا گیا ہے جہاں طاعون ہو، اس میں صحابہ کرام کا اختلاف اوپر گزر چکا ہے۔ حضرت امام احمد نے ابو منیب کی طرف نسبت کرتے ہوئے ایک سند صحیح سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے طاعون کے بارے میں فرمایا کہ یہ سیلاب کی مانند ایک عذاب ہے جو اس سے الگ ہو جائے گا یہ اس کو چھوڑ جائے گا اور آگ کی طرح ہے جو اس کے پاس کھڑا رہے گا اس کو جلا ڈالے گی۔ اور شرحبیل بن حسنہ نے کہا یہ تمہارے رب کی رحمت اور تمہارے نبی کی دعا کا اثر ہے اور تم سے پہلے اس نے بہت سے نیک لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ اکثر طرق میں یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے شرحبیل وغیرہ کی اس بات کی تصدیق فرمائی اور عیاضؒ نے طاعون والی زمین سے نکلنے کے جواز کو صحابہ کرام کی ایک جماعت جن میں ابو موسیٰ اشعریؓ، مغیرہ ابن شعبہؓ جیسے صحابہؓ ہیں اور تابعین کی ایک جماعت جن میں ابوالاسود بن ہلال اور مسروقؒ وغیرہ ہیں سے نقل کیا ہے اور انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس نہی کو تنزیہ پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک نکلنا مکروہ ہے حرام نہیں جبکہ ایک دوسری جماعت ان کی مخالفت کرتی ہے اور طاعون والی بستی سے نکلنے کو حرام قرار دیتی ہے اس لئے کہ گزشتہ احادیث میں وارد ہونے والی نہی سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ شافعیہ وغیرہ (یعنی حنفیہ) کے نزدیک یہی رائے راجح ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ایسی جگہ سے نکلنے پر وعید آئی ہے۔

چنانچہ احمد و ابن خزیمہ نے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث سند صحیح کے ساتھ نقل کی ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ طاعون کیا ہے؟ تو فرمایا کہ اونٹ کے غدود کی طرح ایک غدود ہوتا ہے اور جو طاعون والی جگہ میں ٹھہرا رہے

اور طاعون سے اس کی موت واقع ہو جائے وہ مثل شہید ہے اور جو وہاں سے بھاگ نکلے وہ ایسا ہے جیسے جہاد سے بھاگ کھڑا ہونے والا اس حدیث کی تائید حضرت جابرؓ کی ایک مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاعون سے بھاگنے والا ایسا ہے جیسے میدان جنگ سے بھاگنے والا اور اس میں صبر کرنے والا ایسا ہے جیسے میدان جنگ میں جما رہنے والا۔

احمد و ابن خزیمہ نے سند صحیح کے ساتھ اس کے کچھ مزید متابعات بھی ذکر کئے ہیں۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ مجھے جو بات سمجھ میں آئی ہے واللہ اعلم وہ یہ ہے کہ طاعون والی جگہ جانے سے منع کرنے کی حکمت غریبہ ہے کہ جو وہاں جائے گا اگر اسے بتقدیر الٰہی طاعون لاحق ہو جائے تو وہ یہ کہے گا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو یہ مرض نہ ہوتا حالانکہ مرض تو وہاں بھی لاحق ہو سکتا تھا جہاں پہلے تھا لہٰذا بد اعتقادی کی اس جڑ ہی کو ختم کرنے کے لئے جو کہیں اور ہے اسے حکم دیا کہ وہاں نہ جائے جہاں طاعون ہے اور جو طاعون والی جگہ ہے اسے منع کر دیا کہ وہاں سے نکلے نہیں اس لئے کہ اگر یہ باہر چلا گیا اور بچا رہا تو کہے گا کہ بہت اچھا ہوا یہاں آ گیا، وہیں رہتا تو مجھے بھی وہی مرض ہو جاتا جو وہاں والوں کو ہوا۔ حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ طاعون والی جگہ ہی میں رہتا اور پھر بھی مرض نہ ہوتا اور بد اعتقادی بھی پیدا نہ ہوتی ہے۔ امام طحاوی کی اس تحقیق کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو ہیثم بن کلیب طحاوی اور بیہقی نے ابو موسیٰؓ سے سند صحیح کے ساتھ نقل کی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا دیکھو طاعون آ چکا ہے جو اس سے بچنا چاہتا ہے بچ جائے لیکن دو باتوں سے احتیاط کرنا ایک یہ کہ کوئی یہ کہے فلاں باہر چلا گیا اس لئے محفوظ رہا کوئی یوں کہے کہ فلاں یہیں رہا لہٰذا مبتلا ہو گیا (اگر وہ بھی چلا جاتا تو محفوظ رہتا یا اگر یہیں رہتا تو مبتلا ہو جاتا) حضرت موسیٰؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طاعون والی جگہ جانے سے منع کرنے کا یہ مطلب لیا ہے کہ کوئی محض طاعون سے بھاگنے کی خاطر جاتے اس میں شک نہیں کہ یہاں تین صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ کوئی طاعون والی جگہ سے نکلے محض طاعون سے بچنے کی خاطر یہ تو بہرحال حدیث کی رو سے منع ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بالکل دوسری ضرورت سے نکلے طاعون سے

چھٹکارا پانا مقصود نہ ہو مثلاً ایک شخص پہلے سے دوسری جگہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اتنے میں وہاں طاعون پھیل گیا تو اس کے لئے جانا جائز ہے اس لئے کہ اس کی نیت طاعون سے فرار حاصل کرنا نہیں ہے چنانچہ یہ ممانعت میں داخل نہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کو کسی ضرورت سے جانا تھا لیکن ساتھ میں یہ بھی نیت ہے کہ طاعون والی جگہ رہنا نہ پڑے تو اس میں اختلاف ہے بعض لوگوں نے یہ دیکھ کر بہر حال کسی درجہ میں طاعون سے بچنے کی نیت ہے اس صورت کو ناجائز قرار دیا ہے اور بعض لوگوں نے اس دلیل کی بنیاد پر اسے جائز قرار دیا ہے کہ فرار کی نیت سے نکلنا منع ہے اور اس کا ارادہ صرف فرار حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ ضرورت بھی ہے اور اس تیسری صورت سے متعلق سمجھا گیا ہے حضرت ابوموسیٰ کے اس اثر کو جس میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو خط لکھا کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے آپ اس خط کو رکھنے سے پہلے ہی میری طرف چل پڑیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے جواب لکھا کہ میں آپ کی ضرورت خوب سمجھ گیا ہوں میں مسلمانوں کے لشکر میں ہوں ان سے جدا ہونے کی مجھے کوئی خواہش نہیں۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ لکھ بھیجا کہ آپ نے مسلمانوں کو پانی کے قریب زمین میں ٹھہرایا ہے ان کو لے کر کسی نزہ فضا زمین میں چلے جائیے۔ تو یہ سن کر حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بلایا اور کہا کہ جا کر مسلمانوں کے لئے کوئی اور جگہ تلاش کیجئے تاکہ ان کو وہاں منتقل کر دوں پھر اس کے بعد آگے واقعہ یہ ہے اور اس میں یہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ مسلمانوں کو لے کر کسی دوسری جگہ تشریف لے گئے اور طاعون دور ہو گیا۔

غمقہ ایسی زمین کو کہتے ہیں جو پانی سے قریب ہو اور پانی سے قریب ہونے کی وجہ سے عام طور پر آب و ہوا خراب ہو جاتی ہے اور "نزہۃ" کھلی پرفضا جگہ کو کہتے ہیں جو مضر صحت اثرات سے خالی ہو۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ سمجھا کہ طاعون والی جگہ سے باہر جانا اس شخص کے لئے منع ہے جو صرف فرار حاصل کرنا چاہتا ہو۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے مذکورہ حدیث سن کر حضرت ابوعبیدہؓ کو حکم فرما دیا کہ اس زمین سے باہر چلے جائیں اور حدیث کا وہی مطلب لیا جو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے لیا۔ خطابی فرماتے

ہیں اس واقعیت بیماری کے متعدی ہونے کا نظریہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا یہ محض علاج معالجے کے زمرے میں آئے گا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تبدیلی آب و ہوا کو صحت اور مرض میں بڑا دخل ہے۔ علماء نے جو ان حضرات کے طاعون زدہ زمین سے نکلنے کو منع کرنے کی روایت کی ہے وہ بھی اپنی جگہ درست ہے اس لئے کہ اگر علی الاطلاق نکلنا جائز ہو جائے تو جو لوگ صحت مند ہیں وہ نکل جائیں گے (خواہ درست عقیدہ کے ساتھ نکلیں) لیکن اس سے کمزوروں کی دل شکنی ہوگی۔ چنانچہ بعض حضرات نے میدان جنگ سے بھاگنے پر وعید کا بھی یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ اس سے ان لوگوں کی ہمت شکنی ہوگی جو بھاگ نہیں سکے اور وہ مرعوب ہو جائیں گے۔ بعض اطباء نے یہ بھی حکمت بیان کی ہے کہ جس جگہ وباء آتی ہے وہاں لوگوں کے مزاج اس آب و ہوا سے مانوس ہو جاتے ہیں اور ان کے لئے وہ آب و ہوا عام صحیح آب و ہوا کی طرح ہو جاتی ہے۔ اگر اب وہ اس جگہ سے دوسری ایسی جگہ جائیں گے جہاں یہ وبا نہیں ہے تو وہاں کی آب و ہوا انہیں موافق نہیں آئے گی بلکہ بہت ممکن ہے کہ جب وہ اس نئی آب و ہوا میں سانس لیں تو ان کی سانسوں کے ساتھ وہ خراب بخارات بھی باہر آجائیں جس کے لئے وہ عادی ہو چکے ہیں اور یہ بخارات یہاں کی آب و ہوا کو خراب کر دیں لہٰذا اس لئے وباء زدہ علاقے سے نکلنا منع ہے۔ شیخ ابن دقیق العید یہ فرماتے ہیں کہ دونوں طرح کے دلائل میں تطبیق دینے کی یہ صورت مجھے زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی زمین میں آنے سے تو اس لئے روک دیا گیا کہ اپنے آپ کو ایسی مصیبت میں ڈالنا ہے جس کا شاید بعد میں تحمل نہ ہو سکے اور یہ گویا ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ مجھے مقام صبر و توکل حاصل ہے۔ لہٰذا یہ تو منع فرمادیا گیا تاکہ نفس دھوکہ میں مبتلا نہ ہو اور ایسے دعویٰ سے بچے جو امتحان کے وقت ثابت نہ کیا جاسکے اور اس زمین سے نکلنے سے اس لئے منع کیا گیا کہ یہ اسباب میں غلو سے کام لینے اور تقدیر سے بچنے کی کوشش میں داخل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ شارع علیہ السلام نے ہمیں دونوں صورتوں (باہر سے اندر آنے

اور اندر سے باہر جانے اور بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی قسم کا ایک حکم یہ بھی ہے کہ دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو ہاں اگر مقابلہ کی نوبت آجائے تو ڈٹ جاؤ۔ چونکہ دشمن سے مقابلہ کی تمنا بھی اپنے آپ کو مصیبت کے لئے پیش کرنا ہے اور اس میں نفس کے دھوکہ کھانے کا بھی اندیشہ ہے کہ جب اصل موقع آئے تو بھاگ کھڑے ہوں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تمنا کرنے سے منع فرمادیا اور حکم دیا کہ اگر واقعی مقابلے کی نوبت آجائے تو تقدیر کا فیصلہ سمجھتے ہوئے اللہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرکے ڈٹ جاؤ۔

# کتاب المتفرقات

**کفار کے اس خزانہ کا حکم جو کسی کی زمین سے نکل آئے**

السوال ۱۔ حضرت ایک مسئلہ میں احقر متردد ہے اس کا جواب عطا فرما کر رفع خدشہ فرماویں وہ یہ کہ ایک زمین جس کا مالک اصلی سرکار بہادر ہے اس کے تحت ایک بڑا زمیندار ہے شیر علی خان اور اس کے ماتحت ایک رعیت ہے زید اب زید نے اس کی زمین کو عمرو کے ہاتھ فروخت کیا۔ اب عمرو نے اس زمین کو بیجا کرنے کے لئے چند مزدوروں سے کھودنا شروع کیا اور ان کا شاہرہ بھی مقرر کیا۔ ان مزدوروں نے جب اس زمین کو کچھ کھودا تو کچھ چیز نمودار ہوئی، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب سونا ہے۔ دو سو برس قبل جو قوم مغ یہاں کے باشندہ تھے بوقت فرار از خوف سلطان مسلم دفن کر گئے۔ اس زمانے میں سونا بار ہا لوگ پاتے رہے۔ اب مغوں کا پتا ملنا بڑا دشوار ہے، وہ سونا اس وقت جو پایا ہے وہ پچیس۲۵، تیس۳۰ ہزار روپے کی قیمت کا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا حقدار کون ٹھہرے گا؟ اس کا مصرف کون ہے؟ اگر مزدور اپنے تصرف میں لائیں تو جائز ہوگا یا نہیں۔

**تنقیح** یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ احتمال نہیں کہ اس قوم کے بعد جو مسلمان آئے۔ انہوں نے وہاں دفن کیا ہو۔

**جواب تنقیح** پہلے سوال کے متعلق عرض یہ ہے کہ وہ سونا جو پایا گیا ہے اس میں زیورات بھی بہت سے ہیں جو مغوں کے طرز کے مطابق بنے ہوئے ہیں، اس صورت کا زیور مسلمان نہیں بناتے۔

۲۔ اور لوگوں میں نہایت شہرت کے ساتھ مشہور ہے کہ وہ مغوں کا مدفونہ ہے نہ کہ مسلمانوں کا کوئی مسلمانوں کا دفن کیا ہوا نہیں کہتا ہے۔

سوال: یہاں کے فرار شدہ مغ اس وقت ملک اکیاب میں بستے ہیں۔ وہاں جانے والوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگ بہت سے مال وہاں دفن کر آئے ہیں اور اس کا نام ونشان بھی رکھتے ہیں۔ بعض ان کے خاندان میں سے ان کے ہمراہ آکر وہ دفینہ اٹھا کر لے بھی جانے رہیں اور بعضوں کو پتا لکھا ہوا دیتا ہے وہ یہاں آکر اس پتہ کے مطابق کھود کر مال پاتا ہے اب بھی جو ان کے مکانات میں وہاں دفینہ ہونے کی شہرت ہے۔ مگر لوگ خوف سے اس کو کھود کر نہیں دیکھتے یہ جو مکان کھودا گیا تھا ان مغوں کا مکان تھا ان سب وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خزانہ مسلمانوں کا نہیں مجھے اس سے زیادہ کا علم نہیں۔

# الجواب

قال فی الدر المختار: وما علیه سمة الکفر خمس ای سواء کان فی ارضه او ارض غیره او ارض مباحة کفایة۔

قال قاضیخان: وھذا بلا خلاف لان الکنز لیس من اجزاء الدار فامکن ایجاب الخمس فیه بخلاف المعدن۔

شامی: وباقیه للمالک اول الفتح او لوارثه لو حیا والا فلبیت المال علی الاوجه (وذلک لما فی البحر من ان الکنز مودع فی الارض فلما ملکها الاول ملک ما فیها ولا یخرج ما فیها عن ملکه ببیعها کالسمکة فی جوفها درة انتھی شامی) وھذا ان ملکت ارضه والا فللواجد اھ ج ۲ ص۶۲۔

جب قرائن سے غالب یہ ہے کہ سونا کفار کا دفن کیا ہوا ہے تو اس کا پانچواں حصہ پانے والے کا ہے اگر صاحب زکوٰۃ نہ ہو اور باقی اس مسلمان کا ہے جس کا قبضہ مالکانہ اس زمین پر کفار کے بعد سب سے پہلے ہوا ہے۔ اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کے ورثاء کو دیا جائے صورت مسئولہ میں سرکار کی ملکیت تو بظاہر ملک تصرف ہے جو قبضہ مالکانہ کا اثر ہے۔ پہلا مالک مسلمان اس زمین کا شاید موجودہ زمیندار شیر علی خان کا کوئی مورث اعلیٰ ہے تحقیق کر لی جائے بہر حال وہ بھی یا اور کوئی جو مسلمان مالک اول ہو بقیہ چار حصے اس کے ورثاء کا حق ہے۔

عہ ا۔ دلیله فی الدر: للواجد صرف الخمس لنفسه واصله وفرعه واجنبی بشرط الفقر ج ۲، ص۶۲ ظفر احمد عفی عنه

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی اللہ عنہ
۵ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

**قیامت کے دن لوگ ماں کے نام سے پکارے جائیں گے یا باپ کے نام سے**

السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ قیامت کے روز خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور طواغین کی اولاد کے باپ کے نام سے پکارے گا اور دو اشخاص مذکورہ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور اولاد طواغف کو ماں کے نام سے پکارے گا۔ اور ساتھ ہی صحاح ستہ کا حوالہ بھی دیتا ہے اور عمرو کہتا ہے کہ ایسا نہیں تم غلط کہتے ہو۔ آپ فرمائیے کہ دونوں میں سے کون صادق اور کون کاذب ہے۔

دوسرے اس مسئلہ کے بابت آپ اپنا خیال ظاہر فرمائیے کہ آیا قیامت کے دن خداوند تعالیٰ بندوں کو پکارے گا یا نہیں۔ اگر پکارے گا تو کس صورت میں۔ ساتھ ہی اگر کتاب اور باب کا حوالہ ہو تو بہت اچھا، ورنہ خیر۔ بینوا توجروا۔

# الجواب

أخرجه ابوداؤد فی سننه عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم انکم تدعون یوم القیامة باسمائکم واسماء آبائکم فاحسنوا اسمائکم۔ رجاله ثقات الا انه منقطع کما نبه علیه، ابوداؤد ج ۴ ص ۴۴۲ مع عون المعبود۔

قال فی العون وروی الطبرانی بسند ضعیف کما قوله ابن القیم فی حاشیة السنن : عن ابن عباس ان اللہ یدعوا الناس یوم القیامة بأمهاتهم سترا منه علی عباده قال العلقمی ویمکن الجمع بان حدیث الباب فمن هو صحیح النسب وحدیث الطبرانی فی غیره اویقال تدعی طائفة باسماء الآباء وطائفة باسماء الامهات۔ اھ

وفی قوله تعالیٰ (واذ قال اللہ یعیسی ابن مریم) قولان ان ذلک کان اذ رفعه وقال بعضهم یکون ذلک یوم القیامة ذکرها السیوطی فی در منثور۔ اھ

ج ۲/ ، ص ۳۴۹

بعض احادیث میں یہ ہے کہ سب آدمی ماؤں کے نام سے پکارے جاویں گے۔ اور بعض میں یہ ہے کہ باپوں کی طرف نسبت کر کے پکارے جاویں گے۔ اور غالباً پکارنے والے ملائکہ ہوں گے، باقی اولاد طوائف کی خصوصیت حدیث سے معلوم نہیں ہوتی، بعض علماء کا قول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ماں کی طرف منسوب ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ غالباً اس طرح حشر میں پکارے جائیں۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۶ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

**عورتوں کے باہم سلام کا طریقہ اور انحناء کا حکم کیا ہے۔**

السوال: زنان طریقہ سلام چگونہ است آیا شاہد بیان آمدہ یا نہ در بعض دیار مروج است زنان بجور کوع سر نگوں کردہ بدست اشارہ نمودہ۔ علی الانفراد جمیع حاضرین را بلا آواز خفیہ سلام میدہند بایں طریق سلام کردن موافق شرع جائز است یا نہ۔ بر تقدیر عدم جواز مرتکب ایں فعل گنہگار باشد یا نہ، بینوا توجروا۔

المستفتی

محمد شمس الحق عفا اللہ عنہ

از سہانپور مدرسہ مخزن العلوم

# الجواب

عورتوں کے لئے بھی باہم سلام کا طریقہ وہی ہے جو مردوں کے لئے ہے۔ جو طریقہ عورتوں کے سلام کا سوال میں مذکور ہے یہ بدعت ہے اور گناہ ہے سلام میں جھکنا نہیں چاہئے۔ البتہ شابہ کو مکروہ ہے کہ وہ نامحرم مرد کو سلام کرے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون

۳ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

کیا شبہ کا جواب کہ قرآن میں پورا کلمہ ایک جگہ کیوں نہیں

السوال :۔ ایک اہل ہنود یہ سوال کرتا ہے کہ کلمہ طیب قرآن شریف میں مع محمد رسول اللہ کے ایک جگہ لکھا نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ اسی کلمہ کو پڑھ کر ہر شخص مسلمان ہوتا ہے۔ صاف طور سے سمجھا کر تحریر فرماویں۔ کئی جگہ اس مسئلہ کو دریافت کیا مگر صاف طور پر حل نہیں ہوا۔

المستفتی

آپ کا خادم محمد حنیف رامپور

## الجواب

پورا کلمہ ایک جگہ لکھا ہونے کی کیا ضرورت ہے کافر کا مسلمان ہونا اس پر موقوف نہیں ہے کہ وہ پورے کلمہ کا ایک ساتھ اقرار کرے بلکہ اگر ایک شخص لا الہ الا اللہ کا آج اقرار کرے اور محمد رسول اللہ کا کل اقرار کرے تو اس طرح بھی وہ مسلمان ہوجائے گا۔ اگر مسلمان ہونے کے لئے دونوں کا ایک ساتھ جمع کرنا ضروری ہوتا تب تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ قرآن میں ایک جگہ لکھا کیوں نہیں۔ اور جب مسلمان ہونا کلمہ کی تفریق کے ساتھ بھی درست ہے تو اب قرآن میں کلمہ کی تفریق پر کیا شبہ ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵ ربیع الثانی سنہ ۴۵ھ

طالب علم کے لئے اس کے عزیز کا گاؤں والوں سے سوال کرنا جائز نہیں ہے

السوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید مدرسہ عربیہ میں علم حاصل کررہا ہے۔ اور اس کے والد، رشتہ دار چونکہ اپنی حالت اچھی نہیں رکھتے، لہٰذا لوگوں سے مانگ کر روپیہ پیسہ لے کر زید کا خرچہ بھیجتے ہیں اس صورت میں ان عزیزوں کے لئے سوال کرنا جائز ہے یا نہیں۔ نیز یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ خود اگر زید لوگوں کے پاس اپنی ضروریات کے لئے روپیہ مانگے اور والد اور دیگر عزیزان کا مذکورہ طریقے سے وصول کیا ہوا روپیہ لے لے تو جائز ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

المستفتی

محمد حبیب اللہ یحییٰ سنگی
متصل سفید مسجد دیوبند
۱۲ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۵ھ

## الجواب

صورت مسئولہ میں زید کو سوال کرنا جائز نہیں ہے اور اس کے مریدوں کو بھی زید کے واسطے سوال جائز نہیں ہے۔ اور زید کو اپنے مریدوں سے سوال کا روپیہ وصول کیا ہو لینا بھی جائز نہیں ہے۔ اور در مختار وغیرہ میں جو طالب علم و غازی کے لئے سوال جائز کہا ہے اس سے مراد وہ طالب علم ہے جو بقدر ضرورت طلب علم میں مشغول ہو جس کا حاصل کرنا فرض ہے۔ اور علم بقدر فرض تحصیل علوم عربیہ پر موقوف نہیں۔ بلکہ اردو فارسی رسائل پڑھنے سے بھی بقدر فرض علم حاصل ہو جاتا ہے پس جو طلباء مدارس عربیہ میں علم حاصل کرتے ہیں وہ بقدر فرض سے زائد میں مشغول ہیں ان کو سوال جائز نہیں۔ نہ ان کے مریدوں کے واسطے سوال جائز ہے۔ فقط واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ
۱۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۵ھ

---

ف فان قيل تحصيل العلوم العربية فرض على الكفاية في كل مسافة قصر على اهلها فينبغي جواز السؤال للطالب لكونه مشتغلا بفرض الكفاية كالغازي يجوز له السؤال مطلقا سواء كان الغزو فرضا عليه عينا او على الكفاية يدل عليه اطلاقهم في الغازي قلنا نعم ولكن بشروط احدها ان لا يكون في بلاد الطالب عالم بالعلوم الشرعية الى مسافة القصر وثانيها ان لا يكون طالب غيره مشتغلا بتحصيلها۔ وثالثها ان يكون هذا الطالب ممن يرجى استغناء اهل بلاده بعلمه بان يكون صحيح الاستعداد سليم الطبع متوقد الاذهن الوج الطبع ويعتبر في ذلك قول معلميه ۱۲ منه

اقول وعلم منه ان الغازي لا يجوز له السؤال ايضا اذ لحصل الكفاية بدونه فافهم ۱۲ احقر عبد الكريم عفي عنه

سرکاری ملازم کو سیکنڈ یا انٹر کلاس کا کرایہ ملے تو وہ تیسرے درجہ میں سفر کر کے بقیہ رقم کو اپنے مصرف میں لا سکتا ہے۔

السوال:۔ فدوی دست بستہ جناب حضرت مولانا مد فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ بندہ عرض گذار ہے کہ آنجناب مسائل مندرجہ ذیل کا جواب از روئے شریعت مطہرہ ارقام فرما دیں

اور احقر کو مرہون و ممنون فرما دیں۔ اور عند اللہ ماجور ہوں۔

مـ۱ سائل کو گورنمنٹ سے یا کورٹ آف وارڈس سے ریل کا سفر سیکنڈ یا ڈیوڑھ درجہ کا ملتا ہے۔ ایسی حالت میں سائل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ تھرڈ درجہ میں سفر کرے اور اپنی کفایت شعاری سے کچھ بچائے اور پھر اپنے ذاتی مصارف میں بچی ہوئی رقم کو خرچ کر دے اس صرفہ کی بازپرس کچھ نہیں ہوتی ہے اور نہ آج تک کسی سے واپس ہوئی ہے۔

مـ۲: اگر بچی ہوئی رقم اپنے ذاتی مصارف میں لانا جائز نہ ہو تو ایسی حالت میں کفایت شعاری سے کام لینا تو واجب نہ ہوگا۔

مـ۳: جو مدارس اردو ڈسٹرکٹ، میونسپل بورڈ سے جاری و قائم ہیں۔ ان میں افسر مدرسین کو کچھ رقم تنخواہ کے ساتھ اس لئے دی جاتی ہے کہ قلم دوات کاغذ روشنائی وغیرہ کس طرح مصارف میں خرچ کی جائے۔ چنانچہ اکثر رقم مقررہ سے کچھ بچ رہتی ہے جس کو افسر مدرس اپنے ذاتی صرف میں لے آتے ہیں کسی سے واپس نہیں لی جاتی۔ اور سال بھر میں کے گر کسی مہینے میں اگر کچھ زیادہ صرف ہو جائے تو نہیں دی جاتی مثل ٹھیکہ کے ہے اگر رقم مقررہ کم ہو جائے جو کافی نہ ہو تو افسر مدرس کی رپورٹ کرنے پر تحقیقات مناسب کے بعد کچھ رقم دی جاتی ہے مستقلاً: منافرہ کے تو ایسی حالت میں افسر مدرس جو رقم بچ رہتی ہے اس کو اپنی ملکیت سمجھ کر اپنے صرف میں لا سکتا ہے یا نہیں۔ فقط والسلام

## الجواب

مـ۱ :۔ ہمیں ملازمین سے تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ رقم گورنمنٹ یا محکمہ کورٹ کی طرف سے ملازمین کی ملک کر دی جاتی ہے اس لئے باوجود اس علم کے کہ فلاں شخص سیکنڈ یا انٹر میں سفر نہیں کرتا اس پر کوئی جرم تو نہیں ہوتا نہ اس علم کے بعد گورنمنٹ اس کو سیکنڈ و انٹر کے کرایہ سے محروم کر دیتی ہے بلکہ بدستور اسی قاعدہ سے کرایہ دیتی ہے۔ اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو سائل کو تھرڈ درجہ میں سفر کرنا اور بقیہ رقم کو اپنے ذاتی مصارف میں صرف کرنا جائز ہے۔ اس پر کفایت شعاری کر کے

اس رقم کو بچانا واجب نہیں بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ جس درجہ کا کرایہ دیا جاتا ہے اسی درجہ میں سفر کرے۔

ٹ ۲۔ اس میں بھی ہم کو یہی تحقیق ہوئی ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ رقم مدرسان کو بطور تملیک اور ٹھیکہ کے دی جاتی ہے۔ گورنمنٹ کی نیت واپسی کی نہیں ہوتی، جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے متعلق افسر مدرس وغیرہ کسی سے حساب کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ اور جو پیشگی رقم ملتوی طور پر دی جاتی ہے تملیکاً نہیں دی جاتی۔ اس میں حساب کا مطالبہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ بجٹ وغیرہ کی رقم کا قاعدہ ہے پس اگر تحقیق صحیح ہے تو اس صورت میں بھی جو رقم مصارف دوات و قلم وغیرہ سے بچے اس کو اپنے تصرف میں افسر مدرس لا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۵ھ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

# رسالۃ التدقیق

## الاقوام فی تحقیق السواد الاعظم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السوال :- باہم علماء میں جب اختلاف ہو کر علماء کی کثیر جماعت کسی مسئلہ میں ایک طرف ہو اور معدودے چند علماء اس سے اختلاف رکھتے ہوں اور ہر ایک اپنے مسلک کی صحت پر دلائل شرعیہ قائم کرتا ہو ایسی صورت میں مسلمانوں کو جماعت کثیرہ کا اتباع کرنا واجب ہے یا جماعت قلیلہ کا اتباع بھی جائز ہے۔ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ جماعت کثیرہ کا اتباع واجب ہے اور دلیل میں یہ احادیث پیش کرتے ہیں۔

۱:- عن علیؓ قال قلت : یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نھی فما تامرنی قال تشاوروا الفقہاء والعابدین ولا تمضوا فیہ رأی خاصۃ رواہ طبرانی فی الاوسط ورجالہ موثقون من اہل الصحیح مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۸۔

۲:- انس بن مالک یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان امتی لا تجمع علی ضلالۃ فاذا رأیتم اختلافاً فعلیکم بالسواد الاعظم ابن ماجہ ص ۲۹۳ و ص ۲۳۳ وفی العزیزی قال الشیخ حدیث صحیح ج ۱ ص ۳۵۵۔

۳:- علیکم بالجماعۃ وایاکم والفرقۃ فان الشیطان مع الواحد وھو من الاثنین ابعد من اراد بحبوحۃ الجنۃ فلیلزم الجماعۃ رواہ الترمذی عن عمر مرفوعاً وقال الحدیث صحیح حسن غریب ج ۲ ، ص ۳۹۔

ان احادیث سے جماعت کثیرہ کا اتباع لازم اور فقہاء وعابدین سے مشورہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کی رائے کا اتباع کرنے سے حدیث اول منع کرتی ہے، پس حدیث و فقہ سے یہ بتلا دیا جائے کہ مسائل شرعیہ میں جب علماء اختلاف کریں تو کیا واحد کی رائے صحیح ہو سکتی

ہے اور اس کا اتباع جائز ہے۔ بینوا توجروا۔ (سائل ایک مسلمان)

# الجواب واللہ الموفق للصواب

علماء میں جب اختلاف ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں یا وہ اختلاف احکام شرعیہ و مسائل دینیہ میں ہے یا امور انتظامیہ میں شق اول میں یا وہ اختلاف اعتقادیات میں ہے یا فروع میں اسی طرح شق ثانی کی بھی دو صورتیں ہیں یا مسلمانوں کا کوئی امام ہو یا امام نہ ہو صورت اولیٰ کی دوسری قسم میں یعنی جبکہ اختلاف مسائل شرعیہ فرعیہ میں ہو جماعت کثیرہ کا اتباع لازم نہیں جب جماعت قلیلہ یا عالم واحد کی رائے جمہور کے خلاف بھی ہو تب بھی اس میں احتمال صواب کا اسی طرح ہے جس طرح جمہور کی رائے میں احتمال صواب کا ہے۔

ملا:- علماء امت کا زمانہ صحابہ سے اس وقت تک تعامل چلا آرہا ہے کہ انہوں نے مسائل مختلف فیہا میں کسی امام کے قول کو اس وجہ سے ترک نہیں کیا کہ یہ قول جمہور کے خلاف ہے اور شخص واحد یا جماعت قلیلہ کا قول ہے۔

قال ابن القیم فی زاد المعاد واما المقام الثانی وھو ان الجمھور علی ھذا القول فوجدنا فی الادلۃ الشرعیۃ نقول الجمھور حجۃ مضافۃ الی کتاب اللہ وسنۃ رسولہ واجماع امتہ ومن تأمل مذاھب العلماء قدیما وحدیثا من عھد الصحابۃ رض الی الآن واستقرا احوالھم وجدھم مجمعین علی تسویغ خلاف الجمھور ووجد لکل منھم اقوالا عدیدۃ انفرد بھا عن الجمھور ولا یستثنی من ذلک احد قط ولکن مستقل ومستکثر فمن شئتم سمیتموہ من الائمۃ ثم تتبعوا ما لہ من الاقوال

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں فرمایا ہے رہا دوسرا مقام وہ یہ کہ جمہور کا قول یہی ہے تو اس سے بھی کچھ نہیں ہوتا) ہم نے دلائل شرعیہ میں (کہیں) یہ بات پائی نہیں کہ قول جمہور بھی کوئی ایسی حجت ہے جو کتاب اللہ وسنت رسول و اجماع امت کے ساتھ ملحق ہو اور جس نے مذاہب علماء میں تامل کیا ہے خواہ وہ متقدمین ہوں یا متاخرین صحابہ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک (جتنے بھی علماء ہوئے ہیں) اور ان کے احوال کا تتبع کیا ہے وہ ان سب کو جمہور کی مخالفت کے جواز پر مجتمع کئے ہوئے پائے گا اور ہر ایک کے متعدد اقوال اس کو ایسے ملیں گے جن میں وہ جمہور سے الگ ہے اور اس کلیے سے ہرگز کوئی بھی مستثنیٰ

التی خالف فیھا الجمھور ولو تتبعنا ذلک وعددناہ لطال الکتاب جداً وتحس نحیلکم علی الکتاب المتضمنۃ مذاھب العلماء واختلافھم اھ (ج ۲، ص ۲۵۱)

نہیں ہے ہاں بعضے جمہور کی مخالفت کم کرتے ہیں اور بعض زیادہ کرتے ہیں (بس اتنا ہی فرق ہے اس سے زیادہ نہیں) پس تم ائمہ میں سے جس کا امام چاہو لے لو پھر اس کے ان اقوال کا تتبع کرو جن میں اس نے جمہور کی مخالفت کی ہے (تو تم کو ایسے اقوال ہر امام کے پاس ملیں گے) اور اگر ہم ان کا تلاش کرنا اور گننا شروع کریں تو کتاب بہت زیادہ طویل ہو جائے گی اور ہم تم کو ان کتابوں کے حوالہ کرتے ہیں جن میں مذاہب علماء اور ان کے اختلافات کا ذکر موجود ہے۔

علامہ ابن القیم کی یہ عبارت صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ مسائل فرعیہ میں مخالفت جمہور کے جواز پر علماء امت کا صحابہ سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں اجماع رہا ہے اور کوئی امام مخالفت جمہور سے بچا ہوا نہیں ہر امام کے متعدد اقوال جمہور علماء کے خلاف موجود ہیں جن کو اس کے مقلدین نے مخالفت جماعت کثیرہ کی وجہ سے ہرگز رد نہیں کیا اور حنفیہ کے تو بہت سے مسائل اس شان کے ہیں جن میں امام ابو حنیفہ جمہور امت سے متفرد ہیں جیسے نفاذ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً وجواز ربوٰ فی دار الحرب وقول بالمثلین فی وقت الظہر وغیرہ اور ان اقوال کو حنفیہ نے اس عذر کی وجہ سے کبھی رد نہیں کیا کہ امام صاحب ان میں متفرد ہیں۔

۲؎ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یزال طائفۃ من امتی علی الحق منصورین لا یضرھم من خالفھم حتی یأتی امر اللہ۔ رواہ مسلم وغیرہ

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گی جس کی حق پر مدد کی جاوے گی ان کو وہ لوگ ضرر نہ دے سکیں گے جو ان کے مخالف ہوں گے یہاں تک کہ خدا کا حکم یعنی قیامت آ جاوے۔ (بخاری و مسلم)

عہ طائفۃ من الشیٔ قطعہ شی کا ہوتا ہے جو قلت پر دلالت کرتا ہے پس حضور پر نور عالم صلی اللہ علیہ

عہ: اس حدیث کی تقریر براھین قاطعہ مصنف قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہ میں قابل ملاحظہ ہے۔ ۱۲ منہ۔

وسلم کا خود ارشاد ہے کہ طائفہ قلیلہ خواہ رجل واحد ہی کیوں نہ ہو حق پر ہو سکتا ہے اور اس کے مخالف تمام دنیا بھی ہو تو اس کا قول باطل ہوگا۔

قال في مجمع البحار الطائفة الجماعة من الناس ويقع على الواحد كانه اراد نفسا طائفة ابن راهويه هي دون الالف وسيبلغ هذا الامر الى ان يكون عدد المتمسكين بما كان عليه النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه الفا يسلي بذلك ان لا يعجبهم كثرة اهل الباطل اه (ج ۱ ص [illegible])

مجمع البحار میں کہا ہے کہ طائفہ آدمیوں کی ایک جماعت کو کہتے ہیں اور شخص واحد پر بھی اس کا اطلاق آتا ہے (ابن راہویہ) طائفہ ایک ہزار سے کم کو کہتے ہیں۔ اور عنقریب یہ دین اس حالت کو پہنچ جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے اصحاب کے طریقہ کے ساتھ تمسک کرنے والے ہزار کے قریب رہ جائیں گے اس حدیث سے آپ نے ان لوگوں کو تسلی دی ہے کہ وہ اہل باطل کی کثرت سے تعجب کریں۔ اھ

اس میں صاف تصریح ہے کہ اہل حق قلیل اور اہل باطل کثیر ہو سکتے ہیں۔ پس کسی کی طرف مسئلہ شرعیہ میں جماعت کثیرہ کا ہونا اس کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

۲: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من احيا سنة من سنتي قد اميتت بعدي فان له من الاجر مثل اجور من عمل بها الحديث قال الترمذي حسن مشكوة مع التنقيح ج ۱ ص [illegible]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری سنتوں میں سے کسی سنت کو زندہ کرے جو میرے بعد مردہ کر دی گئی تھی اس کے لئے اس قدر ثواب ہے جتنا اس سنت پر سب عمل کرنے والوں کو ملے گا یعنی اس کو تنہا سب کی مجموعی مقدار کے برابر ثواب ملے گا۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

من احیا عام ہے جو کہ واحد کو بھی شامل ہے بلکہ آئندہ کلام میں ضمیر واحد کا اس کی طرف راجع ہونا ارادۂ واحد کو مرجح ہے نیز سنت کی اماتت کے معنی یہی ہیں کہ عام طور سے اس پر عمل متروک ہوگیا ہو اس حالت میں اس کا احیاء کرنے والا شخص واحد یا جماعت قلیلہ ہی ہوگی۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں متبع سنت قلیل اور مخالف سنت کثیر ہوں گے لہٰذا کسی طرف جماعت کثیرہ کا ہونا اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

۳: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری

من تمسك بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهید۔ رواہ مشکوٰۃ وفی التنقیح رواہ ایضاً الطبرانی باسناد حسن ج ۱ ص ۴۲۔

امت کی حالت خراب ہونے کے وقت میرے طریقہ پر جارہے اس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ تنقیح الرواۃ میں کہ اس حدیث کو طبرانی نے بھی اسناد حسن سے روایت کیا ہے۔ اھ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ میں اکثر امت فساد میں مبتلا ہوجائے گی اور متبع سنت بہت کم ہوجائیں گے۔ اس لئے ان کی اس درجہ فضیلت ہے لہٰذا ایسے زمانہ میں کسی جانب علماء کی کثرت ہرگز حقانیت کی دلیل نہ ہوگی کیونکہ اس وقت علماء کا بھی زیادہ حصہ فساد میں مبتلا ہوگا۔ ان میں متبع سنت کم ہوں گے۔ کما ھو مشاھد

۵:۔ قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من اکل طیباً وعمل فی سنة وامن الناس بوائقه دخل الجنة فقال رجل یا رسول اللّٰه: ان هذا الیوم لکثیر من الناس قال: وسیکون فی قرون بعدی رواہ الترمذی مشکوٰۃ وفی تنقیح الرواۃ بعد الفحص انه احتجاج واخرجه ایضاً الحاکم واسناده صحیح ج ۱ ص ۴۲۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص حلال روزی کھاتا ہے اور سنت کے موافق عمل کرتا ہے اور لوگ اس کی آفات سے محفوظ رہیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آج کل تو ایسے لوگ تو بہت ہیں۔ آپ نے فرمایا عنقریب میرے بعد قرنوں میں ایسا آدمی ہوا کرے گا۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ) تنقیح الرواۃ میں اس کے رجال پر بحث کرکے کہا ہے کہ حدیث احتجاج کے قابل ہے اور اس کو حاکم نے بھی تخریج کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح ہیں۔ اھ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ متبع سنت قرون مابعد میں قلیل ہوں گے اس کی تائید حدیث خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم یفشو الکذب سے بھی ہوتی ہے پس ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں کثرت اہل باطل ہی کی ہوگی، اہل حق قلیل ہوں گے۔ لہٰذا کسی طرح جماعت کثیرہ کا ہونا اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے۔

۶:۔ عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال سیأتی علیکم زمان لا یکون فیه شیء اعز من ثلث۔ درهم حلال او

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عنقریب تم پر ایسا زمانہ آئے گا جس میں تین چیزوں سے زیادہ کوئی چیز نایاب نہ ہوگی،

أخ يستأنس به او سنة يعمل بها رواه الطبراني في الأوسط وفيه روح بن صلاح ضعفه ابن عدي وقال الحاكم ثقة مأمون وذكره ابن حبان في الثقات وبقية رجاله موثوقون مجمع الزوائد ج ۱، ص ۶۹

(ایک) درہم حلال (دوسرے) یا ایسا بھائی جس سے انس حاصل کیا جاوے (تیسرے) یا ایسی سنت جس پر عمل کیا جاوے اس کو طبرانی نے معجم الاوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی) روح ابن صلاح ہے جس کو ابن عدی نے ضعیف کہا ہے اور حاکم نے ثقہ و مامون کہا ہے اور ابن حبان نے بھی اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور بقیہ رجال سب ثقات ہیں۔ مجمع الزوائد

اس حدیث میں جس زمانہ کی خبر دی گئی ہے کوئی صاحب بصیرت شک نہیں کر سکتا کہ یہ زمانہ اس کا مصداق ہے اور حدیث میں تصریح ہے کہ اس وقت عمل بالسنۃ بہت نادر ہوگا۔ لہٰذا ایسے زمانہ میں اہل باطل ہی کی کثرت ہوگی پس کثرت و قلت حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

ک۔ عن ابن عباس رضي الله عنهما ما اتى على الناس عام الا احدثوا فيه بدعة واماتوا فيه سنة حتى تحي البدع وتموت السنن رواه الطبراني في الكبير باسناد رجاله موثوقون۔ ص۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں پر کوئی سال نہیں گزرتا مگر وہ اس میں ایک بدعت ایجاد کر لیتے ہیں اور ایک سنت کو مردہ کر دیتے ہیں یہاں تک کہ بدعت ہی زندہ رہے گی۔ اور سنتیں سب مردہ ہو جائیں گی۔ اس کو طبرانی نے ایسی سند سے روایت کیا ہے جس کے رجال ثقات ہیں۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ زمانہ نبوت سے جس قدر بعد ہوتا جائے گا۔ بدعت کی کثرت اور سنت کی قلت ہوتی جائے گی اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کسی جانب میں اکثر کا ہونا ہرگز دلیل حقانیت نہیں ہو سکتی۔

ل۔ عن ابن عمر رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما اختلفت امة بعد نبيها الا ظهر اهل باطلها على اهل حقها

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی امت نے اپنے نبی کے بعد اختلاف نہیں کیا مگر ان کے اہل باطل اہل حق پر غالب ہوتے (یعنی کثرت وغیرہ میں)

رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه موسی بن اس کی طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے

عبيدة وهو ضعيف اه مجمع الزوائد ج۷ ص۳۲۲۔ قلت وثقه ابن سعد و حدث عنه وكيع وقال كان ثقة كذا في التهذيب ج۱۰ ص ۳۵۹ والاختلاف فی التوثيق لا يضر۔

اور اس میں موسی بن عبیدہ کو ابن سعد نے ثقہ کہا ہے کہ وہ ثقہ تھے۔ اور تہذیب التہذیب میں اسی طرح ہے۔ اور توثیق میں اختلاف مضر نہیں ہوتا۔ اھ

اس حدیث میں تصریح ہے کہ جب امت میں اختلاف ہوگا تو اہل باطل اہل حق پر کثرت میں غالب ہوں گے۔ لہٰذا کثرت قائلین حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی

۹۔ عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوشك أن یأتی علی الناس زمان لا یبقی من الاسلام الا اسمه ولا یبقی من القرآن الا رسمه مساجدهم عامرة وهی خراب من الهدی علماءهم شر من تحت أدیم السماء من عندهم تخرج الفتنة وفیهم تعود رواه البیهقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ وقال فی تنقیح الرواۃ وله شاهد عند الحاكم فی المستدرك عن انس باسناد حسن وعند ابی داؤد واحمد والحاکم عن ابن عمر وعند الدیلمی عن معاذ وتعدد الطرق یشد بعضها بعضاً ثم قال صدق اللہ وصدق رسوله صلی اللہ علیہ وسلم کل ما هو فی الحدیث رأیناه فی زماننا هذا والی اللہ المشتکی اه ص۳۸

اس حدیث میں تصریح ہے کہ ایک زمانہ میں علماء کی حالت عام طور پر خراب ہوگی اور اس سے مراد اکثر علماء ہیں کیونکہ ہر زمانہ میں ایک طائفہ کا حق پر ہونا دوسری حدیث سے ثابت ہے اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اکثر علماء کا کسی مسئلہ میں ایک طرف ہونا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

۱۰۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یعش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ الحدیث، قال الترمذی حسن صحیح ورواه ایضاً ابن حبان فی صحیحه والحاکم وقال صحیح علی شرطهما ولیس له علة

ورجالہ احمد رجال الحسن اھ۔ تنقیح الرواۃ۔ ج ۱۔ ص ۲۰۔

وفیہ ایضاً: قال بعض العلماء ھم الخلفاء الاربعۃ بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم الخلافۃ بعدی ثلثون سنۃ اھ۔

اس حدیث میں تصریح ہے کہ جب امت میں اختلاف پیدا ہو تو سنت نبوی اور سنت خلفاء الراشدین کا اتباع واجب ہے کثرت جماعت وقلت جماعت کا اعتبار ہرگز نہیں کیا جاوے گا۔ اگر ایک شخص متبع سنت ہو تو عالم دنیا کا افتراق اس کو مضر نہ ہوگا۔ باقی جن احادیث کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے۔ ان کا مطلب عنقریب واضح ہو جائے گا۔

ﷺ۔ عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین بعثہ الی الیمن فقال کیف تصنع ان عرض لک قضاء قال اقضی بما فی کتاب اللہ قال فان لم یکن فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم یکن فی سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اجتھد برأیی لا آلو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدری ثم قال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رواہ الترمذی وغیرھما ورجالہ ثقات الحرث بن عمرو ابن اخی المغیرۃ بن شعبۃ مختلف فیہ ذکرہ ابن حبان فی الثقات وضعفہ آخرون کما یظھر من التھذیب ج ۲، ص ۱۰۲۔ والحدیث منقطع ایضاً والانقطاع لا یضر عندنا

---

ﷺ: قلت یؤیدہ ما فی فتح الباری وعمر ھو الذی کتب الی شریح القض ما تبین لک من کتاب اللہ فلا تسئل عنہ احداً فان لم تبین لک من کتاب اللہ فاتبع فیہ سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما لم تبین لک من السنۃ فاجتھد فیہ رأیک واخرج ابن ابی شیبۃ بسند صحیح عن ابن مسعود نحو حدیث عمر من روایۃ الشیبانی وقال فی آخرہ فان جاءہ ما لیس فی ذلک فلیجتھد رأیہ فان الحلال بین والحرام بین فدع ما یریبک الی ما لا یریبک اھ ملخصاً ج ۱۳، ص ۲۴۳ واللہ اعلم

اس حدیث میں تصریح ہے کہ اگر کوئی حکم کتاب اللہ و سنت رسول اللہ میں نہ ملے تو مشورہ کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنا ہر مجتہد کو جائز ہے اگر اس صورت میں مشورہ کرنا واجب ہوتا جیسا کہ حدیث مذکور مندرجہ سوال سے معلوم ہوتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ضرور حکم فرماتے کہ اپنے رفقاء ابو موسیٰ اشعری معاذ بن جبل[ف] وعلی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے ان امور میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کریں مگر آپ نے ایسا نہیں فرمایا پس ہر عالم کو جب مسئلہ کتاب و سنت میں مصرح نہ ہو تو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا اس حدیث سے جائز ہوا گو دوسرے علماء اس کے خلاف ہوں۔

عـ۱۲۱ ۔ روی العسکری عن سلیم بن العامری قال سأل ابن الکواء علیا عن السنة والبدعة والجماعة والفرقة فقال یا ابن الکواء حفظت المسألة فافهم الجواب السنة واللہ سنة محمد صلی اللہ علیہ وسلم والبدعة ما فارقها۔ والجماعة واللہ مجامعة اهل الحق وان قلوا والفرقة مجامعة اهل الباطل وان کثروا (کذا فی منتخب العمال ج ۱ ص ۱۰۹) قال الذهبی فی المیزان عبد اللہ ابن الکواء من رؤس الخوارج اهـ وفی لسان المیزان انه قد رجع عن مذهب الخوارج وعاود صحبة علی وباقی رواته لم اعرف وعلی تراجمهم لم اقف وانما ذکرت الحدیث متابعة[مـ] وقال الحافظ فی الفتح تحت حدیث ابن عباس فی قصة وفاة النبی صلی اللہ علیہ وسلم وخطبة ابی بکر من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات الخ ما نصه فیؤخذ منه ان الاقل عددا فی الاجتهاد قد یصیب ویخطئ الاکثر فلا یتعین الترجیح بالاکثر ولاسیما ان ظهر ان بعضهم قلد بعضا ج ۸ ص ۱۱۲۔

اس حدیث میں صاف تصریح ہے کہ اہل حق گو قلیل ہوں ان کے ساتھ رہنا جماعت کے

---

ف ۔ یمن میں یہ حضرت بھی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور بعض ان کے پیچھے کچھ ایام کے فاصلہ سے بھیجے گئے تھے۔ واللہ اعلم۔ ۱۲ منہ۔

مـ : قلت وله شاهد صحیح من قوله صلی اللہ علیہ وسلم لا یزال طائفة من امتی علی الحق منصورین۔ فالجماعة واللہ مجامعتهم وان قلوا والحدیث یدل بصراحته علی قلتهم فافهم ۱۲ منه

ساتھ رہنا ہے اور باطل خواہ کثیر لوگوں کے ساتھ رہنا جماعت سے فرقت ہے پس کسی مسئلہ میں جس کی دلیل کتاب وسنت و اقوال فقہاء سے زیادہ قریب ہوگی وہ حق پر ہوگا خواہ وہ شخص واحد ہی ہو اور جو لوگ دلائل سے فیصلہ نہ کر سکیں وہ یہ دیکھیں کہ تقویٰ اور علم و محبت دین و خوف حق و دیانت و رجحان عقل میں کون زیادہ ہے پس جو شخص ان کے اعتقاد میں ان اوصاف میں دوسروں سے ممتاز ہو اس کا اتباع کریں کیونکہ ایسا شخص سنت نبویہ کا زیادہ متبع ہوگا۔

قال فی العالمگیریۃ: واذا کان المفتی فقیہا له رأی فاستفتی فقیہا آخر فافتاہ بخلاف رأیہ یعمل برأی نفسہ واذا کان المفتی جاہلا فانہ یأخذ بفتوی افضل الرجال عند عامۃ الفقہاء ج ۳، ص ۱۸۲

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ (۱) جب انسان خود فقیہ ہو تو مسئلہ نازلہ میں اس کو اپنی رائے پر عمل کرنا واجب ہے۔ دوسرے فقہاء کی رائے اگر اس کے خلاف ہو اس پر اس کو عمل جائز نہیں ہے۔ (گو وہ تعداد میں کتنے ہی ہوں یدل علیہ اطلاق الجواب)
(۲) عام لوگوں کو مسئلہ نازلہ میں اس شخص کے فتویٰ پر عمل کرنا واجب ہے جو ان کے اعتقاد میں سب سے افضل ہو۔ اور اس میں یہ حکم نہیں بتایا گیا کہ جدھر زیادہ ہوں ادھر ہونا چاہئے بلکہ صاف تصریح ہے کہ عالم افضل کے فتویٰ پر عمل کرنا چاہئے جو ان کے اعتقاد میں سب سے افضل ہو۔

(۳) وفی المنار ونور الانوار فی تعریف الاجماع هو اتفاق مجتہدین من امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی عصر واحد امر قولی او فعلی وخلاف الواحد مانع كخلاف الاکثر اھ

وقال فی کشاف اصطلاحات الفنون واحترز بلفظ المجتہدین بلام الاستغراق عن اتفاق بعضہم وعن اتفاق غیرہم من العوام والمقلدین فان موافقتہم ومخالفتہم لایعبأ بہا اھ ج ۲، ص ۲۳۸۔

نور الانوار کی عبارت میں اس کی تصریح ہے کہ خلاف واحد بھی اسی طرح مانع انعقاد اجماع ہے جس طرح خلاف اکثر اس سے معلوم ہوا کہ مخالفت جمہور کی صورت میں شخص واحد کا قول بھی اسی طرح محتمل صواب ہے جس طرح قول جمہور کی مخالفت ناجائز ہوتی۔ اور اختلاف

کے وقت مشورہ کرنا مسائل شرعیہ میں واجب ہوتا ہے اور جمہور کے خلاف قول ہمیشہ باطل ہوا کرتا تو خلاف واحد ہرگز قادح اجماع نہ ہوتا بلکہ اس کو موافقت جمہور پر مجبور کیا جاتا حالانکہ یہ کسی کا مذہب نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جمہور سے خلاف شخص واحد کا قول صحیح ہو سکتا ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کل کے علماء اگر کسی مسئلہ شرعیہ میں اتفاق کرلیں تو اس کو اجماع شرعی نہ کہیں گے کیونکہ وہ مقلدین کا اجماع ہوگا جو کہ غیر معتبر ہے پس چار سو یا تین سو علماء کے اتفاق کو اجماع کہنا تو کسی طرح بھی درست نہ ہوگا۔ جبکہ ان کے خلاف بھی علماء کی ایک جماعت موجود ہے۔ گو وہ ان کے زعم میں قلیل ہی ہوں۔

فان قلت، قال البیری تحت قاعدۃ الاصل الحقیقۃ ما نصہ متی اختلف فی المسئلۃ فالعبرۃ بما قولہ الاکثر۔ فتاوی حامدیہ ج ۲/۲۔

قلت ھذا متعلق بباب النقل دون الفھم والاستنباط والعمل بقول الاکثر فی باب النقل متعین فان الخبر المشھور مقدم علی الآحاد والمتواتر مقدم علی کلیھما ودلیل ھذا التقیید ما ذکرہ فی ھذہ الفتاوی ج ۲ ص ۳۲۲

بما نصہ وما نقلہ الشرنبلالی عن العینی فی استنباط الاحکام من جواز لبس الاحمر من الحدیث الشریف فذاک من حیث الاستنباط لا من حیث نقل المذھب والا فقد نقل الکراھۃ کثیرون اکثر والقیاس ان یعمل بما علیہ الاکثر الی ان قال علی ان الذی یجب علی المقلد اتباع مذھب امامہ والظاھر ان ما نقلہ ھؤلاء الائمۃ ھو مذھب الامام اھ

ولا یخفی ان اختلاف علماء زماننا فی مسئلۃ لیس من باب النقل عن الامام بل انما ھو من باب الاختلاف فی الفھم ولا عبرۃ فیہ للکثرۃ۔

یہ گفتگو تو صورت اولیٰ کی قسم اول میں تھی، رہی دوسری قسم یعنی جبکہ مسائل شرعیہ اعتقادیہ میں اختلاف ہو تو اس صورت میں اکثر کا اتباع کرنا چاہئے یعنی خیر القرون میں جس طرف زیادہ علماء ہوں اس کا اتباع واجب ہے کیونکہ اعتقادیات زمانہ خیر القرون میں مکمل ہو چکے ہیں۔ نیز اس وقت عام طور پر خیر اور حق کا غلبہ تھا اس زمانہ میں اعتقادیات میں جس طرف زیادہ جماعت ہوتی تھی اس طرف غلبہ خیر کا ہوتا تھا اور اعتقادیات کا مدار محض نقل و سماع پر ہے اجتہاد سے اعتقادیات کا ثبوت نہیں ہو سکتا اور علوم نقلیہ کی تکمیل خیر القرون میں ہو چکی ہے اب اعتقادیات میں کسی مسئلہ کا

باضافہ نہیں ہو سکتا خیر القرون کے بعد اعتقادات میں بھی کثرت و قلت کا اعتبار نہیں کیونکہ ان میں غلبہ خیر نہیں رہا اور چونکہ اعتقادیات کی تکمیل زمانہ صحابہ و تابعین میں ہو چکی ہے اس لئے ان کے خلاف جو قول ہوگا۔ مردود ہوگا۔ گو قائلین کتنے ہی زیادہ ہوں۔

فی المرقات: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتبعوا السواد الاعظم یعبر بہ عن الجماعۃ الکثیرۃ والمراد ما علیہ اکثر المسلمین قیل وھذا فی اصول الاعتقاد کارکان الاسلام واما الفروع کبطلان الوضوء بالمس مثلاً فلا حاجۃ فیہ الی الاجماع بل یجوز اتباع کل واحد من المجتہدین کالائمۃ الاربعۃ ج ۱ ص ۲۰۵۔

اس عبارت سے پہلے جواب کی بھی تائید ہو گئی کہ مسائل فرعیہ میں اکثر کا اتباع ضروری نہیں بلکہ کسی ایک مجتہد کا اتباع بھی جائز ہے۔ گو اس کا قول اکثر کے خلاف ہو واللہ اعلم۔

رہی شق ثانی یعنی جبکہ امور متشابہ میں اختلاف ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی امام ہو اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی اطاعت کر چکی ہو تو امام کا اتباع اور اس جماعت کی موافقت واجب ہے ان سے امور انتظامیہ میں الگ ہونا اور اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔ البتہ اگر وہ احکام شرعیہ کی خلاف ورزی کریں تو ایسے کاموں میں ان کی موافقت نہ کی جاوے لانہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق بلکہ خیر خواہی کے ساتھ ایسے امور میں بقدر استطاعت ان کی مخالفت کی جاوے لیکن اس طور پر ان کی مخالفت نہ کی جاوے کہ امام کا مقابلہ کر کے مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ منتشر کیا جاوے ہاں اگر امام اور اس کی جماعت سے کفر صریح کا صدور ہو تو پھر اس کا مقابلہ کرنا اور اس کی جمعیت کو منتشر کرنا بھی جائز ہے۔ بلکہ بقدر استطاعت واجب ہے اور اگر مسلمانوں کا کوئی امام نہ ہو تو فقہاء و ماہرین و مسلمین صالحین کے مشورہ سے کسی کا امام مقرر کرنا واجب ہے اس صورت میں رائے خاصہ پر عمل جائز نہیں ہے بلکہ جماعت علماء صالحین و جمہور مسلمین جس شخص پر اتفاق کریں اسی کو امام بنانا واجب ہے کیونکہ امامت اشراف و اعیان و جماعت مسلمین کی بیعت کر لینے سے ثابت ہوتی ہے۔ ایک دو شخص کی بیعت سے کوئی امام نہیں بن سکتا لہٰذا اس معاملہ میں اہل حل و عقد کی جماعت کے اکثر افراد کا اتفاق معتبر ہے شخص واحد کی رائے معتبر نہیں بلکہ شخص واحد کو جماعت سے اختلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر جماعت علماء و جمہور مسلمین کسی شخص واحد کی رائے پر اس معاملہ کو چھوڑ دیں تو اس صورت میں رائے خاصہ پر عمل جائز ہوگا۔ کیونکہ وہ شخص جماعت مسلمین کا وکیل ہے اس کی رائے گویا سب کی رائے ہوگی۔ اسی طرح اگر خلیفہ سابق اپنے بعد کے لئے کسی خاص شخص کو خلیفہ

بنا جا دے تو اس صورت میں بھی اس کی رائے کا اتباع جائز بلکہ ضروری ہے۔ بشرطیکہ جس کو نامزد کیا گیا ہے نا اہل نہ ہو۔

پس اگر شورہ وغیرہ سے کسی ایک امام پر اتفاق ہو گیا تب تو اس کے احکام وہی ہیں جو شق اول کے احکام ہیں کہ پھر امام اور جماعت مسلمین کی مخالفت امور انتظامیہ میں کسی کو جائز نہیں بتفصیل الذی ذکرناہ آنفا۔ اور اگر شورہ سے کسی ایک امام پر اتفاق نہ ہوا بلکہ اختلاف پیدا ہو گیا تو ان سب جماعتوں سے الگ ہو جانا چاہیے اس صورت میں کسی جماعت کا اتباع واجب نہیں، عزلت بہتر ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من رأی من امیرہ شیئاً یکرھہ فلیصبر علیہ۔ فانہ من فارق الجماعۃ شبراً فمات الامات میتۃ جاھلیۃً رواہ البخاری فتح الباری ج ۱۳، ص ۵

وفی الفتح۔ قال ابن بطال فی الحدیث حجۃ فی ترک الخروج علی السلطان ولو جار وقد اجمع الفقھاء علی وجوب طاعۃ السلطان المتغلب والجھاد معہ و ان طاعتہ خیر من الخروج علیہ لما فی ذلک من حقن الدماء وتسکین الدھماء وحجتھم ھذا الخبر وغیرہ مما یساعدہ ولم یستثنوا من ذالک الا اذا وقع من السلطان الکفر الصریح فلا تجوز طاعتہ فی ذلک الوقت بل تجب مجاھدتہ لمن قدر علیھا، ج ۱۳، ص ۵

وعن عبادۃ بن الصامت قال دعانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ فقال فیما اخذ علینا ان بایعنا علی السمع والطاعۃ (الی ان قال) وان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان اھ مختصرا رواہ البخاری کذا فی الفتح ج ۱۳، ص ۶۰۔

وفی الفتح عن عبادۃ مرفوعاً سیکون علیکم امراء یامرونکم بما لا تعرفون و یفعلون ما تنکرون فلیس لاولئک علیکم طاعۃ اھ قال الحافظ والذی یظھر حمل روایۃ الکفر علی ما اذا کانت المنازعۃ فی الولایۃ فلا ینازعہ بما یقدح فی الولایۃ الا اذا ارتکب الکفر وحمل روایۃ المعصیۃ علی ما اذا کانت المنازعۃ فیما عدا الولایۃ فاذا لم یقدح فی الولایۃ نازعہ فی المعصیۃ بان ینکر علیہ برفق ویتوصل الی

تثبت الحق له بغیر عنف ومحل ذلك اذا كان قادرًا، والله اعلم

ونقل ابن التین من الداؤد قال الذی علیه العلماء فی امراء الجور انه ان قدر علی خلعه بغیر فتنة ولاظلم وجب والا فالواجب الصبر وعن بعضهم لایجوز عقد الولایة لفاسق ابتداء فان احدث جورًا بعد ما كان عدلا فاختلفوا فی جواز الخروج علیه والصحیح المنع الا ان یکفر فیجب الخروج علیه، اھ

ج ۱۳، ص ۶۔

وعن حذیفة فی حدیث طویل قلت: فهل بعد ذلك الخیر من شر قال نعم دعاة علی ابواب جهنم من اجابهم الیها قذفوه فیها قلت یارسول الله صفهم لنا قال هم من جلدتنا ویتکلمون بالسنتنا قلت فما تأمرنی ان ادرکنی ذلك قال تلزم جماعة المسلمین وامامهم قلت فان لم یکن لهم جماعة ولا امام قال: فاعتزل تلك الفرق کلها ولو ان تعض باصل شجرة حتی یدرکك الموت وانت علی ذلك رواه البخاری وفی الفتح قال الطبری اختلف فی هذا الامر وفی الجماعة فقال قوم هو للوجوب والجماعة السواد الاعظم وقال قوم المراد بالجماعة الصحابة دون من بعدهم وقال قوم المراد بهم اهل العلم لان الله جعلهم حجة علی الخلق والناس تبع لهم فی امر الدین قال الطبری والصواب ان المراد من الخبر لزوم الجماعة الذین فی طاعة من اجتمعوا علی تامیره فمن نکث بیعته خرج عن الجماعة قال وفی الحدیث انه متی لم یکن للناس امام فتفرق الناس احزابا فلا یتبع احدا فی الفرقة ویعتزل الجمیع ان استطاع ذلك خشیة من الوقوع فی الشر اھ ج ۱۳، ص ۳۷۔

واخرج الطبری وصححه ابن حبان عن ابی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کیف بك یا عبد الله بن عمرو اذا بقیت فی حثالة من الناس وقد مرجت عهودهم وامانتهم واختلفوا فصاروا هکذا وشبك بین اصابعه قال فما تامرنی قال علیك بخاصتك ودع عنك عوامهم فتح الباری

ج ۱۳، ص ۳۲۔

اس تمام گفتگو کے بعد ان احادیث کا مطلب سمجھنا چاہیئے جو سائل نے بیان کی ہیں حدیث

اول تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے اور مجمع الزوائد میں مذکور ہے، وہ ہمارے نزدیک ان مسائل شرعیہ پر جن کا حکم کتاب وسنت یا اجماع امت یا قیاس سے معلوم ہو چکا ہے محمول نہیں۔ بلکہ امور انتظامیہ اور وہ امور مسکوت عنہا فی الشرع کے متعلق ہے، پس مسائل حاضرہ میں اس حدیث سے استدلال کر کے مشورہ کو واجب کہنا اور جماعت کثیرہ کے مشورہ پر عمل کو لازم کہنا اس پر موقوف ہے کہ اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ شریعت میں مسائل حاضرہ کے احکام موجود نہیں اس لئے ان میں مشورہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کو ہرگز کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ہر فریق اپنے مسلک کو دلائل شرعیہ سے ثابت کر رہا ہے۔ یا یہ مان لیا جاوے کہ مسائل حاضرہ کا تعلق محض امور انتظامیہ سے ہے مسائل شرعیہ کی قسم سے نہیں ہے۔ مگر سائل اس کو بھی تسلیم نہیں کرتا اگر اس کو تسلیم کر لیا جاوے تو پھر ان علماء کی فضیلت یقیناً تسلیم کرنا پڑے گی جو ان تحریکات سے علیحدہ رہنے والی جماعت کو فاسق وغیرہ کا خطاب دیتے ہیں کیونکہ امور انتظامیہ جو محل مشورہ ہیں ان میں مشورہ پر عمل کرنا اس وقت واجب ہے۔ جبکہ مسلمانوں کا کوئی امام مسلم ہو اور مشورہ کی جانب اس کی رائے کی موافقت سے مؤید ہو چکی ہو اور اگر امام نہ ہو تو امور انتظامیہ میں بھی کسی کے مشورہ پر عمل کرنا واجب نہیں۔ کیونکہ وجوب وفرضیت کا ثبوت دلائل شرعیہ سے ہی ہو سکتا ہے اور دلائل شرعیہ۔ کتاب وسنت اجماع امت وقیاس میں منحصر ہیں۔ مشورہ کو کسی نے دلائل شرعیہ سے بیان نہیں کیا۔ جس سے وجوب عمل کو ثابت کیا جاوے۔ وسیأتی ذالک مفصلاً۔

پس حدیث مجمع الزوائد کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت کسی کو خلیفہ یا امام بنایا جاوے یا امور حرب درپیش ہوں یا کسی امر میں نصوص سے جانب فعل یا ترک کو ترجیح نہ ہو، اس میں فقہاء وعابدین سے مشورہ کیا جائے، کسی شخص واحد کی رائے اس میں نافذ نہ کی جائے، اور اس پر چند قرائن ہیں۔

اول تو خود اس میں لفظ ترشد اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ حکم ایسے امر کے متعلق ہے جو محل مشورہ ہے اور محل مشورہ مسائل شرعیہ نہیں۔ اور ایسے امور محل مشورہ کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ نص صریح موجود ہے۔ الیوم اکملت لکم دینکم۔ وما فرطنا فی الکتاب من شیء۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے دین کے متعلق کوئی بات کتاب میں نہیں چھوڑی اور یہ ظاہر ہے کہ صراحۃً تمام جزئیات کے احکام قرآن میں نہیں اس سے معلوم ہوا کہ بعض احکام صراحۃً ہیں اور بعض دلالۃً واشارۃً جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

بعد علماء و مجتہدین نے کچھ اور نقلیں بیان کیں جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم جس میں علماء کو قیاس کی اجازت دی گئی ہے الغرض مسائل شرعیہ کے احکام باسرہا شریعت میں موجود ہیں وہ ہرگز محتاج مشورہ نہیں ہیں۔ اور اگر کسی مسئلہ مسائل شرعیہ میں مشورہ ثابت ہو تو وہ محض تطییب قلب یا استمداد کے طور پر تھا ضرورت کے درجہ میں نہ تھی بلکہ محل مشورہ امور دنیوی ہیں یا امور انتظامیہ متعلق امامت وخلافت وجہاد وغیرہ بشرطیکہ حکم شرعی اس کے متعلق دلائل شرعیہ سے معلوم نہ ہو۔ یعنی وہ امور ہیں جن سے شریعت میں سکوت ہے۔ اور قیاس سے کسی جانب کو ترجیح معلوم نہیں ہوئی نہ ترک کو اور نہ فعل کو اگر معلوم ہو جائے تو پھر وہ بھی محل مشورہ نہیں۔

قال الحافظ في الفتح وقد اختلف في متعلق المشاورة فقيل في كل شيء ليس فيه نص وقيل في الامر الدنيوي فقط. وقال الداودي انما كان صلى الله عليه وسلم يشاورهم في امر الحرب مما ليس فيه حكم لان معرفة الحكم انما تلتمس منه قال ومن زعم انه كان يشاورهم في الاحكام فقد غفل غفلة عظيمة واما في غير الاحكام فربما رأى غيره او سمع ما لم يسمعه او يراه كما كان يستصحب الدليل في الطريق اھ ج ۱۳، ص ۲۸۳۔

وقال البخاري رحمه الله في صحيحه: وكانت الائمة بعد النبي صلى الله عليه وسلم يستشيرون الامناء من اهل العلم في الامور المباحة ليأخذوا بأسهلها فاذا وضح الكتاب او السنة لم يتعدوه الى غيره اقتداء بالنبي صلى الله عليه وسلم ورأى ابوبكر قتال من منع الزكوة فقال عمر كيف تقاتل وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أمرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا الحديث فقال ابوبكر والله لاقاتلن من فرق بين ما جمع رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم تابعه بعد عمر فلم يلتفت ابوبكر الى مشورة اذ كان عنده حكم رسول الله صلى الله عليه وسلم في الذين فرقوا بين الصلوة والزكوة وارادوا تبديل الدين واحكامه وقال النبي صلى الله عليه وسلم من بدل دينه فاقتلوه اھ فتح الباري ج ۱۳، ص ۲۸۶۔

وقال الحافظ في شرح قوله في الامور المباحة ليأخذوا بأسهلها اذا لم يكن

فیما نص بحکم معین وکانت علی اصل الاباحۃ فمرادہ ما احتمل الفعل والترک احتمالا واحداً واما ما عرف وجہ الحکم فیہ فلا۔ اھ ج/۱۳، ص/۲۹۵۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسائل شرعیہ جبکہ ان کا حکم کتاب وسنت اجماع یا قیاس سے معلوم ہو چکا ہو محل مشورہ ہرگز نہیں ہاں وہ امور جو بوجہ سکوت شارع کے بظاہر اباحت اصلیہ پر ہوں اور ان میں فعل اور ترک دونوں کا احتمال مساوی ہو وہ محل مشورہ ہیں۔ اور اگر ان میں بھی ایک جانب کا حکم دلیل شرعی سے معلوم ہو جائے تو پھر وہ بھی محل مشورہ نہیں۔ لہذا مجمع الزوائد کی حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ جب علماء میں کسی مسئلہ شرعی میں اختلاف ہو تو اہل مشورہ اور جماعت کثیرہ کا قول واجب الاتباع ہے اور جماعت قلیلہ یا شخص واحد کا قول قابل ترک ہے کسی طرح تام نہیں ہو سکتا پھر ہم بطریق تنزل کہتے ہیں اس حدیث کو عموم پر ہی رکھا جائے اور مسائل شرعیہ کو بھی محل مشورہ مان لیا جائے پھر بھی مستدل کو یہ ثابت کرنا لازم ہے کہ مشورہ کرنا اور مشورہ میں جس طرف کثرت رائے ہو اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ حالانکہ وہ اس کو ہرگز ثابت نہیں کر سکتا، محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ مشورہ کا امر آیت قرآنیہ وشاورھم فی الأمر وأمرھم شوریٰ بینھم میں استحباب اور ندب کے لیے ہے۔ پھر اس حدیث کو استحباب پر کیوں محمول نہ کیا جائے۔ رہی یہ بات کہ مشورہ میں جس طرف زیادہ جماعت ہو اس پر عمل کرنا واجب ہے یہ بھی غلط ہے بلکہ اگر کسی عالم کا اجتہاد سب کے خلاف ہو تو اس کو دوسروں کا اتباع جائز نہیں کیونکہ مشورہ دلائل شرعیہ سے مثل اجماع وقیاس کے نہیں ہے۔ بلکہ محض معین کے درجہ میں ہے۔

قال الحافظ فی الفتح وعد کثیر من الشافعیۃ المشاورۃ من الخصائص واختلفوا فی وجوبھا فنقل البیہقی فی المعرفۃ الاستحباب عن النص وبہ جزم ابو نصر القشیری فی تفسیرہ وھو المرجح ج/۱۳، ص/۲۸۳

وفیہ ایضاً: قال الشافعی انما یؤمر الحاکم بالمشورۃ لکون المشیر ینبھہ علی ما یغفل عنہ ویدلہ علی ما لا یحضرہ من الدلیل لا لیقلد المشیر فیما یقولہ فان اللہ لم یجعل ھذا لاحد بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھ ج/۱۳، ص/۲۸۵

عہ اس رسالہ میں شافعیہ کے جو اقوال لکھے گئے ہیں وہ تو امر حنفیہ کے موافق ہیں۔ ۱۲ منہ

وفیہ ایضاً عن الشافعی واذا قاس من لہ القیاس فاختلفوا وسع کلاً ان یقول بمبلغ اجتہادہ ولم یسعہ اتباع غیرہ فیما اداہ الیہ اجتہادہ اھ ج ۱۳، ص ۲۵۲

اور اگر تھوڑی دیر کے لئے امر مشورہ کو وجوب پر ہی محمول کیا جائے تو پھر سب کو یہ بتلانا چاہئے کہ مشورہ کرنا صرف علماء حاضرین سے واجب ہے یا غائبین سے بھی یقیناً وہ دوسری شق کو ثابت نہیں کرسکتا۔ اور مسائل حاضرہ میں جو متعدد علماء جمہور سے الگ ہیں ان کی بابت یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے ان مسائل میں ان علماء سے بھی مشورہ نہیں کیا جو ان کے پاس حاضر تھے ہم کو خوب معلوم ہے کہ انہوں نے ان مسائل میں جو رائے قائم کی ہے وہ علماء حاضرین سے مشورہ کے بعد ہی قائم کی ہے۔ اور دنیا بھر کے علماء کے مشورہ کا وجوب کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ لہٰذا ان کو حدیث شذ الی النار سے کسی طرح مخالف نہیں کہا جاسکتا۔

رہی دوسری حدیث جو ابن ماجہ نے بروایت انس بن مالکؓ سوال میں مذکور ہے یعنی فاذا رأیتم اختلافاً فعلیکم بالسواد الاعظم اور جس کو عزیزی میں ابن ماجہ کے رمز سے نقل کرکے حدیث صحیح کہا ہے اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ حدیث بروایت ابن ماجہ صحیح نہیں ہے۔ اور عزیزی کا ابن ماجہ کے حوالہ سے نقل کرکے اس کو صحیح کہنا غایت تساہل ہے کیونکہ ابن ماجہ کی سند میں ایک راوی ابوخلف اعمیٰ موجود ہے جس کو ابوحاتم نے منکر الحدیث اور ابن معین نے کذاب کہا ہے۔

ففی تہذیب التہذیب: فی ترجمتہ قال ابوحاتم منکر الحدیث لیس بقوی الی ان قال فنقل ابن الجوزی عن ابن معین انہ قال فی الاعمی عن انس حازم بن عطاء وانہ تفرد بہ حدیث الذی اخرجہ ابن ماجہ اھ ج ۱۲، ص ۸۷، ۸۸

مشکوٰۃ میں اس حدیث کو ابن عمرؓ کی طرف منسوب کرکے دوسرے الفاظ سے نقل کیا ہے لیکن کسی کتاب کا حوالہ نہیں لکھا بلکہ بیاض چھوڑ دی۔ میرک شاہ نے اس میں رواہ ابن ماجہ عن انس ملحق کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث بروایت ابن عمرؓ ان کو نہیں ملی اور حدیث انس کا ضعیف ہونا معلوم ہوچکا ہے۔ لہٰذا یہ بھی کچھ مفید نہ ہوئی۔ لیکن مقاصد حسنہ میں حدیث لایجمع امتی علی ضلالۃ کے طرق جمع کرتے ہوئے حافظ سخاوی نے فرمایا ہے۔

وابونعیم فی الحلیۃ والحاکم فی مستدرکہ واللفظ لہ واللالکائی فی السنۃ وابن مندۃ ومن طریقہ ایضاً فی المختارۃ عن ابن عمر رفعہ ان اللہ لایجمع ہذہ الامۃ

علی ضلالۃ ابداً وان ید اللّٰہ مع الجماعۃ فاتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار وھکذا ھو عند الترمذی ولکن بلفظ ھذہ الامۃ او قال امتی اھ ص۳۱۵

اس سے معلوم ہوا کہ ابن عمر سے اس حدیث کو ضیاء مقدسی نے بھی مختارہ میں نقل کیا ہے اور اس کے الفاظ قریب قریب مشکوٰۃ ہی کے الفاظ ہیں۔ لیکن اس پر کلام یہ ہے کہ ترمذی نے ابن عمر سے جس سند کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے اس میں ایک راوی سلیمان بن سفیان متفق علیہ ضعیف و منکر الحدیث ہے۔ تہذیب میں کسی سے بھی اس کی توثیق نقل نہیں کی بجز ان قال وذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال کان یخطئ۔ اور عبداللہ بن دینار سے تو اس کی روایت خصوصیت سے بہت منکر ہے۔ قال ابو زرعۃ منکر الحدیث روی عن عبداللہ بن دینار ثلثۃ احادیث کلھا یعنی مناکیر اھ (ج ۴، ص ۱۹۳) ترمذی نے حدیث بیان کرکے کہا ہے کہ ھذا حدیث غریب من ھذا الوجہ وسلیمان المدینی ھو عندی سلیمان بن سفیان اھ (ج ۲، ص ۳۹)

پس اگر ضیاء مقدسی نے بھی مختارہ میں اسی سند سے حدیث کو روایت کیا ہے تب تو وہ ہرگز قابل احتجاج نہیں اور اگر دوسری سند سے نقل کیا ہے تو یہ معلوم نہیں کہ ضیاء مقدسی کے الفاظ کیا ہیں کیونکہ اصحاب اطراف وجامعین طرق کی عادت ہے کہ وہ فی الجملہ اشتراک معنی سے ایک حدیث کو متعدد مخرجین کی طرف منسوب کردیتے ہیں حالانکہ الفاظ ہر ایک کے جداجدا ہوتے ہیں۔

چنانچہ اسی جگہ حافظ سخاوی نے اس حدیث کو ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ ترمذی میں فاتبعوا السواد الاعظم کا لفظ نہیں ہے۔ مگر چونکہ یہ لفظ لا یجمع امتی علی ضلالۃ کے طریق کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون ترمذی میں تھا اس لئے اس حدیث کو ترمذی کی طرف منسوب کردیا تو ممکن ہے کہ اسی طرح ضیاء فی المختارہ نے بھی لا یجمع امتی علی ضلالۃ کے مضمون کو بدون لفظ فاتبعوا السواد الاعظم کے روایت کیا ہو۔ اس لئے ضیاء مقدسی کے مختارہ کی طرف اس حدیث کا منسوب ہونا بلفظ مذکور اس کی صحت کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ اور اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ حافظ سخاوی نے حدیث ابن عمر کو ان الفاظ سے نقل کیا ہے ضیاء مختارہ کے بھی الفاظ ہیں تب بھی یہ حدیث سائل کو مفید نہیں کیونکہ اس میں اختلاف کا ذکر نہیں جس سے یہ مضمون مستنبط کیا جائے کہ اختلاف علماء کے وقت سواد اعظم کا اتباع واجب بلکہ اس سے سواد اعظم کا

---

ــہ لیس عند الترمذی قولہ فاتبعوا السواد الاعظم ۱۲ منہ

وجوب بطریق اطلاق ثابت ہوتا ہے جو ہمارے نزدیک حالت اتفاق پر محمول ہے یعنی جب سواد اعظم یعنی جمیع علماء امت کسی مسئلہ پر اتفاق کرلیں تو اس کا اتباع واجب ہے اور اس سے اجماع کی حجیت ثابت ہوتی ہے نہ کہ اختلاف علماء کے وقت قول جمہور کی حجیت۔ اختلاف کے وقت سواد اعظم کا اتباع ہونا صرف ابن ماجہ کی حدیث سے معلوم ہو رہا ہے۔ جس کا ضعیف ہونا اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ اور حافظ سخاوی نے ابن ماجہ کے ساتھ مسند عبد کی طرف بھی ان الفاظ کو منسوب کیا ہے۔ مگر مسند عبد کی سند معلوم نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ مسند عبد میں بھی یہ حدیث بروایت انس ہے جس سے ظاہر یہ ہے کہ اس میں بھی ابو خلف اعمیٰ موجود ہے کیونکہ دارقطنی نے حدیث انس مذکور فی ابن ماجہ کو افراد ابی خلف سے بتایا ہے۔ لہٰذا ان الفاظ پہ حدیث حجت نہیں ہو سکتی۔ اور بعد تسلیم کے ہم یہ کہتے ہیں کہ حدیث ابن ماجہ سے بھی سائل کا مدعی حاصل نہیں کیونکہ اس میں بھی یہ تصریح نہیں کہ جب علماء میں اختلاف ہو تو علماء کی جماعت کثیرہ کا اتباع لازم ہے بلکہ اس کا مضمون اس قدر ہے کہ میری امت ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی پس جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کا اتباع کرو۔

ہمارے نزدیک سواد اعظم سے صرف علماء مراد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب جہلاء امت علماء سے اختلاف کریں تو علماء کا اتباع واجب ہے۔ یہ مطلب کہاں سے نہیں نکلتا کہ علماء میں اختلاف ہو تو ان کی جماعت کثیرہ کا اتباع لازم ہے۔ بلکہ علماء میں سے ہر واحد کا اتباع جائز ہے خواہ وہ واحد ہو یا جماعت کثیرہ۔ کیونکہ ہم اس سے پہلے زاد المعاد کی عبارت نقل کر چکے ہیں کہ صحابہ کے وقت سے اس وقت تک مخالفت جمہور کے جواز پر اجماع ہو چکا ہے اور کسی نے کسی امام کا قول یہ کہہ کر رد نہیں کیا کہ یہ قول جمہور کے خلاف ہے اس لئے رد ہے۔ لہٰذا اس حدیث ضعیف کو اسی معنی پر محمول کرنا واجب ہے جو ہم نے بیان کئے ہیں تاکہ اجماع کی مخالفت لازم نہ آئے نیز اور علماء کا اختلاف مراد ہو تو اس میں اختلاف فی الفروع مراد نہیں بلکہ اختلاف فی الاصول الاعتقادیات مراد ہے جیسا کہ مرقات سے اس کی تفصیل ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ مرقاۃ میں اس کے بعد سواد اعظم کے چند معنی اور لکھے ہیں۔

وقیل المراد جمع المسلمین الذین هم فی طاعة الامام وهو سلطان الاعظم اھ۔

اس صورت میں اختلاف مذکور فی الحدیث سے امور انتظامیہ میں اختلاف مراد ہوگا نہ کہ

مسائل شرعیہ میں۔ اس کے بعد لکھا ہے۔

وقیل کل عالم عامل بالکتاب والسنۃ فی الازمنۃ اتبعوا السواد الاعظم یدل علی ان اعانتهم الناس العلماء ولم یعتد بالاکثر لان العوام والجہال اکثر عددا اھ

ج ر ۱ : ص ر ۲۰۶

اس سے یہ معلوم ہوا کہ سواد اعظم سے ہر وہ عالم مراد ہے جو کتاب وسنت پر عامل ہو نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کثرت قائلین معتبر نہیں کیونکہ کثرت تو جہال کی ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواد اعظم فرمایا۔ سواد اکثر نہیں فرمایا۔ اور بعض علماء نے سواد اعظم کی تفسیر صحابہ کے ساتھ فرمائی ہے۔ لہٰذا اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے یہ حدیث جس کی صحت پر بھی کلام ہے کس طرح سائل کو مفید نہیں ہو سکتی۔

رہی دوسری حدیث جو سائل نے ترمذی سے نقل کی ہے۔ علیکم بالجماعۃ وایاکم والفرقۃ اس سے اجماع علی نصب امام مراد ہے۔ یعنی جب ایک جماعت مسلمانوں کی کسی شخص کو امام تسلیم کرلے تو ان سے اختلاف مت کرو۔ اس سے بھی امور انتظامیہ میں اتباع جماعت کا امر معلوم ہوا بشرطیکہ مسلمانوں کا کوئی امام بھی ہو اور دلیل اس مراد کی بخاری کی یہ حدیث ہے۔

من رأی منکم من امیرہ شیئا یکرہہ فلیصبر علیہ فانہ من فارق الجماعۃ شبرا فمات الامات میتۃ الجاہلیۃ اھ ج ر ۱۳ : ص ر ۵ فتح الباری۔

اس حدیث میں مفارقت عن الجماعۃ کی وعید کو صبر علی الامام پر مرتب فرمانا صاف بتلاتا ہے کہ جس مفارقت جماعت کی ممانعت ہے وہ امام سے مفارقت ہے پس علیکم بالجماعۃ وایاکم والفرقۃ کا مطلب بھی واضح ہوگیا کہ موافقت امام کا امر ہے۔ اور اس کی مخالفت اور مفارقت سے ممانعت ہے ہم پہلے فتح الباری کے حوالہ سے بیان کرچکے ہیں کہ طبری نے علیکم بالجماعۃ کی اس تفسیر کو صواب قرار دیا ہے۔ اور بعض علماء نے جماعت سے خاص جماعت صحابہ کو مراد لیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی اس مضمون پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی کہ اختلاف علماء کے وقت جماعت کثیرہ کا اتباع واجب ہے اور جماعت قلیلہ یا عالم واحد کا اتباع جائز نہیں۔

اب میں چند واقعات پر اس بحث کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ کہ مسائل شرعیہ میں کثرت کی رائے پر حقانیت کا مدار نہیں رکھا گیا۔ بلکہ ہمیشہ قوت دلیل پر مدار رکھا گیا ہے۔ گو وہ شخص واحد کا قول ہو یا جماعت قلیلہ کا۔

مثال ۱: اسارئ بدر کے واقعے میں حضرت عمر و سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے تمام صحابہؓ کے خلاف تھی اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک بھی عام آراء کے ساتھ تھی مگر وحی سے حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق فیصلہ ہوا۔ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار نہیں کیا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی مفضول کی رائے فاضل کی رائے سے اصوب ہو سکتی ہے۔ گو اس کو بھی فاضل کا فضل شمار کیا جائے۔ حدیث پر نظر رکھنے والے اس واقعہ کو خوب جانتے ہیں۔

مثال ۲: جنگ اُحد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمیوں کو ایک مورچہ کی حفاظت کے لئے متعین فرمایا اور ان سے یہ فرمایا تھا کہ تم کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا خواہ ہم پر کچھ بھی حالت گزر جائے۔ جب مسلمانوں کا لشکر کفار پر غالب آگیا اور اہل مکہ بے تحاشا بھاگنے لگے تو ان پچاس آدمیوں میں اختلاف ہوا اکثر کی رائے یہ ہوئی کہ اب مورچہ پر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دشمن مغلوب ہو چکا ہے ہم کو بھی غنیمت کا مال لوٹنا چاہئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا بطور مبالغہ و تاکید کے تھا۔ اور مقصود یہ تھا کہ وقت ضرورت تک یہاں سے نہ ہٹنا۔ اب ضرورت نہیں رہی بعض کی رائے یہ ہوئی کہ نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ممانعت کے بعد ہمیں یہاں سے نہ ہٹنا چاہیئے۔ اس اختلاف کے بعد چالیس آدمیوں نے مورچہ چھوڑ دیا اور دس آدمی وہیں جمے رہے۔ وحی سے ان دس آدمیوں کی رائے صائب و درست قرار دی گئی اور چالیس کی رائے کو معصیت میں داخل کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف رائے کے وقت جماعت قلیلہ کی رائے بھی حق ہو سکتی ہے۔ بخاری و فتح الباری سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز عبداللہ بن جبیر کے جوان پچاس تیراندازوں کے افسر تھے اور سب کی یہی رائے ہوئی کہ ہم کو لشکر میں شامل ہو کر غنیمت لوٹنی چاہیے۔

مثال ۳: سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور دفن کے بعد سب سے پہلا کام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفۂ اول نے یہ کیا کہ لشکر اسامہؓ کو شام کی طرف بھیجنا چاہا جس میں مہاجرین اولین و اجل صحابہ شامل تھے تقریباً تمام صحابہ نے ان کی اس رائے سے مخالفت کی اور عرض یہ کیا کہ اس وقت قبائل عرب میں اختلاف و ارتداد کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔ آپ کو اس لشکر کے مدینہ میں رہنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ مگر حضرت صدیق اکبر نے یہ کہہ کر اُن کی رائے کو رد کر دیا۔

واللہ لا احل لواء عقدھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ۔

بخدا میں اس جھنڈے کو کبھی نہ کھولوں گا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے باندھا ہے۔ اور ابن اثیر نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

والذی نفسی بیدہ لو ظننت ان السباع تختطفنی لانفذت جیش اسامۃ کما امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھ ج۲، ص ۱۶۰۔

قسم اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اگر مجھ کو اس کا بھی یقین ہو جائے کہ اس لشکر کے بھیجنے کے بعد مجھ کو درندے پھاڑ ڈالیں گے جب بھی میں جیش اسامہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق بھیج کر رہوں گا۔ چنانچہ لشکر روانہ ہوا اور کسی صحابی نے حضرت صدیقؓ سے یہ کہنے کی جرأت نہ کی کہ یہ مسئلہ اختلافی ہو گیا ہے اس میں آپ کو تنہا اپنی رائے پر نہ اڑنا چاہیے۔ جماعت کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیے۔ بلکہ بعد میں سب کو اقرار کرنا پڑا کہ جیش اسامہ کے بھیجنے میں حضرت صدیقؓ کی رائے صحیح تھی۔

دیکھو کامل ابن الاثیر ج۲، ص ۱۶۳۔

مثال: اسی طرح حضرت صدیقؓ کی رائے وصال نبوی کے بعد یہ ہوئی کہ جن قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے ان پر جہاد کیا جائے۔ اس میں بھی تمام صحابہ کی رائے ان کے خلاف تھی کہ جب وہ لوگ کلمہ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہیں تو ان سے چند اونٹوں اور بکریوں کے لئے کیونکر جہاد کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی حضرت صدیقؓ کی رائے سے مخالفت کی اور یہ کہا کہ آپ کو اس معاملہ میں نرمی اور تالیف قلوب سے کام لینا چاہیے۔ جس کا جواب نہایت سختی کے ساتھ حضرت صدیقؓ نے ان لفظوں میں دیا۔

"أجبار فی الجاھلیۃ وخوار فی الاسلام انہ قد انقطع الوحی وتم الدین أینقص وانا حی۔ رواہ رزین مشکوٰۃ ج۱ ص ۵۵۷۔

اے عمر کیا کہ تم جاہلیت میں تو ایسے زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے۔ وحی منقطع ہو چکی ہے اور دین مکمل ہو چکا تو کیا میری زندگی ہی میں اس میں نقصان آ جائے گا۔ بالآخر صحابہ نے حضرت صدیقؓ کی رائے کے آگے گردنیں جھکا دیں۔ اور کسی نے جرأت کر کے یہ عرض نہ کیا کہ مسئلہ اختلافی ہو گیا ہے اس میں آپ کو جماعت کثیرہ کی رائے پر عمل کرنا چاہیے۔ تنہا اپنی رائے کو نہ چلانا چاہیے۔ بلکہ بعد میں صحابہ نے اس کا اقرار کیا کہ اگر اس وقت ابوبکرؓ نہ ہوتے تو ہم سب ہلاکت میں پڑ چکے تھے۔

قال عبد اللہ بن مسعود لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما کدنا ان نھلک فیہ لولا ان اللہ من علینا بابی بکر اجمعنا علی ان لانقاتل علی ابنۃ مخاض وابنۃ لبون ونعبد اللہ حتی یأتینا الیقین فعزم اللہ لابی بکر علی قتالھم

اخ۔ کامل ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۶۵۔

اس واقعہ سے قطع نظر کے اس قول کی تائید ہو گئی کہ خلاف واحد بھی قادح اجماع ہے کیونکہ اس وقت بجز صدیق اکبرؓ کے اور تمام صحابہ کی رائے تھی کہ مانعین زکوٰۃ سے قتال نہ کرنا چاہیے مگر سب کی رائے غلط تھی اور حضرت صدیق ہی کی رائے صواب تھی۔

نیز ان واقعات سے ان لوگوں کو بھی اپنی غلطی کی اصلاح کرنی چاہیے جو یوں کہتے ہیں کہ اسلام نے جمہوری حکومت کی تعلیم دی ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ ارسال جیش اسامہ و قتال اہل ردت کے معاملے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کس دلیری کے ساتھ اپنی شخصی رائے پر عمل کیا اور تمام صحابہ نے کس اخلاص کے ساتھ اُن کی رائے کا اتباع کیا۔ اسلام میں یہ تعلیم ضرور ہے کہ خلیفہ علماء جماعت مسلمین کے مشورہ سے مقرر ہونے چاہئیں۔ بشرطیکہ خلیفہ سابق نے کسی کو اپنی نیابت و خلافت کے لئے نامزد نہ کیا ہو۔ ورنہ پھر مشورہ کی ضرورت نہیں۔ بلکہ خلیفہ کا مقرر کردہ شخص اگر نااہل نہ ہو تو سب سے مقدم ہوگا۔ بعد خلیفہ مقرر ہو جانے کے تمام نظم و نسق سلطنت کا اس کی ذاتی رائے پر ہوگا۔ البتہ خلیفہ کو اصحاب علم و فہم سے مشورہ کرتے رہنا مستحب ہے لیکن مشورہ کا قبول کرنا اس کے ذمہ[ع] لازم نہیں اگر اس کی رائے مشیرین کی رائے سے موافقت کر جائے تو قبول کرے ورنہ اپنی رائے پر عمل کرنے کا اسے کامل اختیار ہے۔ اور مسلمانوں کو اس کا اتباع واجب ہے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی معصیت لازم نہ آتی ہو۔ لأنه لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق و من ذكره سابقاً فتدبر۔

مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو مشاجرات ہوتے ان میں تقریباً تمام صحابہ کی رائے تھی کہ صاحب حق کی اعانت کرنا چاہیے چنانچہ جس طرح ان کی ایک بڑی جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی، اسی طرح کثیر جماعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی تھی لیکن معدودے چند صحابہ کی یہ رائے تھی کہ دونوں سے الگ رہنا چاہیے، جیسے عبداللہ بن عمر، ابوموسیٰ اشعری، ابومسعود انصاری، ابوبکرہ اور احنف بن قیس مگر کہیں یہ بات ثابت نہیں کہ ان معدودے چند حضرات کو کسی نے مخالفت جمہور کی وجہ سے فاسق و فاجر یا بزدل کا خطاب دیا

---

[ع] یؤیدہ قولہ تعالیٰ: وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ لم یقل فاذا عزمتم فدل علی ان الامام یستبد فی العزم بعد الشوریٰ ولیس للمشیرین فی العزم نصیب ۱۲ منہ

ہو۔ معلوم ہوا کہ مسائل شرعیہ میں جمہور کا قول وفعل حجت ملزمہ نہیں ہے۔ ورنہ یہ معدودے چند صحابہ جمہور کی مخالفت نہ کرتے۔

نیز معلوم ہوا کہ اگر کسی عالم کا قول جمہور کے خلاف ہو تو وہ فاسق وغیرہ نہیں بن جاتا بلکہ ممکن ہے کہ اس کی رائے صواب ہو اور جمہور کی رائے غلط ہو۔

مثلؔ :۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد بجز عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وامام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے تمام صحابہ وتابعین نے یزید کی بیعت قبول کر لی تھی اور اجلہ صحابہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو یزید پر خروج کرنے سے بہت زور کے ساتھ منع بھی فرمایا تھا جیسا کہ تاریخ دیکھنے والوں سے یہ واقعہ مخفی نہیں۔ پس اگر کثرت رائے پر حق وباطل کا مدار کیا جائے اور مشورہ جماعت کثیرہ پر عمل کو واجب کیا جائے تو نعوذ باللہ حضرت امام سبط رسول کا باطل پر ہونا لازم آئے گا اور اس کو ہرگز کوئی مسلمان قبول نہیں کر سکتا معلوم ہوا کہ قول جمہور حجت ملزمہ شرعیہ نہیں بلکہ اس کی مخالفت جائز ہے۔ اور ممکن ہے کہ جمہور کے خلاف جماعت قلیلہ یا شخص واحد کی رائے صحیح ہو۔

مثلؔ :۔ مامون الرشید خلیفہ عباسی نے جس وقت خلق قرآن کے مسئلہ میں علماء وقت کا امتحان لیا تو بجز امام احمد رضی اللہ عنہ کے اور سب علماء نے طوعاً یا کرھاً یا توریۃً قرآن کو مخلوق کہہ دیا تھا۔ جب بجز امام کے اور سب رہا کر دیئے گئے اور حضرت امام ابن حنبلؒ کو سالہا سال حبس اور ضرب کی مصیبت جھیلنا پڑی۔ اگر کثرت رائے پر حق کا مدار ہو تو امام احمد بن حنبلؒ کا قول غلط ہونا چاہیے حالانکہ امت مابعد کا اجماع ہے کہ اس مسئلہ میں امام ہی کا قول صحیح ہے اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر امام بھی قرآن کو مخلوق کہہ دیتے تو ہمیشہ کے لئے ساری امت اسی غلط مسئلہ کی قائل ہو جاتی۔ معلوم ہوا کہ

---

ے قال القاضی الشوکانی فی النیل قال فی الفتح وقد اجمع الفقہاء علی وجوب طاعۃ السلطان المتغلب والجہاد معہ وان طاعتہ خیر من الخروج علیہ لما فی ذلک من حقن الدماء وتسکین الدہماء ولم یستثنوا من ذلک الا اذا وقع من السلطان الکفر الصریح فلا تجوز طاعتہ فی ذلک بل تجب مجاہدتہ لمن قدر علیہا کما فی الحدیث اہ ولکنہ لا ینبغی لمسلم ان یحط علی من خرج من السلف الصالح من العترۃ وغیرہم علی ائمۃ الجور فانہم فعلوا ذلک باجتہاد منہم وہم اتقی للہ واطوع لسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمن جاء بعدہم من اہل العلم اہ ج ۷ صـ ۸۳

جمہور کے خلاف قول شخص واحد صحیح ہوسکتا ہے۔

مثال: انوار ساطعہ میں عبد السمیع رامپوری نے جواز مولد نبوی بہیئت کذائیہ معتمدہ و استحسان قیام بوقت ذکر ولادت شریفہ نبویہ علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والتحیۃ پر علاوہ دیگر دلائل کے ایک دلیل یہ بھی لکھی تھی کہ اس پر جمہور علماء حرمین و مصر و عراق و شام و ہند کا اتفاق ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کی مخالفت اجماع کی مخالفت ہے۔ اس کے جواب میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہ نے علاوہ دیگر جوابات کے ایک یہ بات بھی لکھی ہے کہ جن علماء کے اتفاق کا انوار ساطعہ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری ان کے ہم عصر ہیں اور ان کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ اتفاق قابل اعتبار نہیں کیونکر خلاف عالم واحد بھی قادح اجماع ہے۔ ملاحظہ ہو براہین قاطعہ معلوم ہوا کہ جمہور علماء کا کسی مسئلہ میں اتفاق کرلینا جبکہ ایک عالم محقق بھی ان کے خلاف ہو حجت نہیں۔ اور شخص واحد کا قول بھی جمہور کے خلاف صحیح ہوسکتا ہے۔

مثال: روی البخاری عن عبد اللہ بن عمرو سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ لا ینزع العلم بعد ان اعطاکموہ انتزاعا ولکن ینتزعہ منھم مع قبض العلماء بعلمھم فیبقی الناس جھالا یستفتون فیفتون برائیھم فیضلون ویضلون اھ فتح الباری ج/۱۳ ص/۲۴۱۔

قال الحافظ فی شرحہ وقد اخرج ابن عبد البر فی کتاب العلم من طریق عبد اللہ بن وھب سمعت خلاد بن سلیمان الحضرمی یقول حدثنا دراج ابو السمع یقول یاتی علی الناس زمان یسمن الرجل راحلتہ حتی یسیر علیھا فی الامصار یلتمس من یفتیہ بسنۃ قد عمل بھا فلا یجد الا من یفتیہ بالظن فیحمل علی ان المراد الاغلب بالاکثر فی الحالین (ای فی حال وجود المجتہدین المقیدین وبقاء المقلدین الاقربین البلوغ درجۃ الاجتہاد المقید کما یفھم من کلامہ سابقا) وقد وجد ھذا مشاھدا ثم یجوز ان یقبض اھل تلک الصفۃ ولا یبقی الا المقلد الصرف وحینئذ یتصور خلو الزمان عن مجتھد حتی فی بعض الابواب بل فی بعض المسائل ولکن یبقی من لہ نسبۃ الی العلم فی الجملۃ ثم یزداد حینئذ غلبۃ الجھل وترئیس اھلہ ج/۱۳ ص/۲۴۲۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ میں علماء کم ہوجائیں گے اور جہلاء بہت زیادہ رہ جائیں گے۔ لوگ جہلاء کو سردار بنالیں گے۔ اور ان سے استفتاء کریں گے۔ وہ محض اپنی رائے سے

ان کو جواب دیں گے جس سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اور حافظ ابن حجر کے قول سے معلوم ہوا کہ یہ حالت اس زمانہ میں ہوگی جبکہ اجتہاد مطلق ختم ہو جائے گا اور اجتہاد مقید باقی رہ جائے گا۔ یا ایسے مقلدین رہ جائیں گے جن میں بعض اجتہاد مقید کے قریب ہوں گے۔ اس زمانہ میں غالب حالت یہی ہوگی جو حدیث مذکور میں ہے۔ گو بعضے سنت کے موافق جواب دینے والے بھی ہوں گے۔ پھر بھی ممکن ہے کہ یہ حالت بھی رہے۔ اور بعض ابواب بلکہ بعض مسائل میں بھی اجتہاد کرنے والے نہ رہیں گے بلکہ صرف خالص مقلدین رہ جائیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جن کو فی الجملہ علم سے نسبت ہوگی۔ اس وقت جہل کا غلبہ زیادہ ہو جائے گا۔ اور لوگ جہلاء کو ہی اپنا سردار بنا دیں گے۔ اھ

میں کہتا ہوں کہ صاحب بصیرت پر یہ بات مخفی نہیں کہ یہ زمانہ اسی حالت کا مصداق ہے جس کو حافظ رحمہ اللہ نے سب سے آخر میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ اجتہاد مقید کے درجہ پر کوئی نہیں بلکہ اس کے قریب بھی نہیں۔ پس اکثر علماء محض مقلد ہیں اور حافظ رحمہ اللہ کے قول کے موافق مشاہدہ ہو رہا ہے کہ آج کل جہلاء کو زیادہ تر سردار بنایا جا رہا ہے۔ جس نے درسیات ختم کر لیں۔ محض وعظ و تقریر کی مشق کر لی اس کو مولانا کا خطاب اور مقتدا کا لقب دے دیا گیا خواہ اس کو قرآن و حدیث کی فہم حاصل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ بڑا افسوس یہ ہے کہ آج کل تو بعض ان لوگوں کو بھی مقتدی بنایا جاتا ہے جن کو متنبی اور ابو نواس کی طرح عربی لکھنے اور بولنے کی مشق ہوگئی ہو اور ان کا تمام سرمایہ علم بجز عربی بولنے اور تاریخ لکھ لینے اور معقول و فلسفہ کی باتیں بیان کر دینے کے کچھ نہیں۔ جہلا تو درکنار افسوس ہے کہ اہل علم بھی ان کے تبحر و ہمہ دانی کے معتقد ہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث اور فقہ سے ان کو ذرا بھی مس نہیں۔ اور عمل کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک حالت یہ ہے کہ بعض لوگ جن کی ساری عمر انگریزی خوانی میں صرف ہوئی ہے۔ حدیث و فقہ اور تفسیر کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لیکن فطری طور پر ان کو بیان اور تقریر پر کسی قدر قدرت حاصل ہے۔ ان کو بھی آج کل مقتدی اور پیشوا مانا جاتا ہے عوام تو عوام حیرت یہ ہے کہ بعض اہل علم بھی ان کو فخر قوم، مولانا فلاں کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ اور اپنے قلم سے ان کو مولانا لکھ کر عامۃ المسلمین کو دھوکہ دیتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی

پس یقیناً یہی وہ زمانہ ہے جس کی نسبت حدیث میں پیشگوئی ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ جہلاء کو سردار بنائیں گے جو اپنی رائے سے مسائل شرعیہ کا جواب دیا کریں گے جس سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ ایسے زمانہ غلبۂ جہل میں کسی طرف علماء کی زیادہ تعداد

کا ہونا کیونکر حقانیت کی دلیل ہو سکتی ہے۔

۱۱:۔ قال الحافظ فی شرح البخاری تحت حدیث لا تزال طائفة من امتی الخ ناقلا عن النووی ولا یلزم ان یکونوا مجتمعین فی بلد واحد بل یجوز اجتماعهم فی قطر واحد وافتراقهم فی اقطار الارض ویجوز أن یجتمعوا فی البلد والواحد أن یکونوا فی بعض منه دون بعض ویجوز اخلاء الارض کلها من بعضهم اولا فاولی الی ان یبقی الا فرقة واحدة ببلد واحد اھ ج ۱۳، ص ۲۵۱۔

امام نووی کے قول سے معلوم ہوا کہ کسی وقت ایسا ممکن ہے کہ تمام زمین اہل حق سے خالی ہو جائے، اور بجز ایک فرقہ کے جو ایک شہر میں ہو کوئی حق پر نہ رہے۔

اہل انصاف غور فرمائیں کہ جب امت میں ایسی حالت کا ظہور بھی ممکن ہے تو اس وقت کسی طرف جماعت کثیرہ کا ہونا ان کی حقانیت کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے۔ پس حدیث اتبعوا السواد الاعظم کا اگر وہ مطلب بھی تسلیم کر لیا جاوے جو بعض لوگ بیان کرتے ہیں تو اس کو زمانہ خیر القرون پر محمول کرنا لازم ہے تاکہ دیگر حدیث سے معارضہ لازم نہ آئے۔

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ لا یاتی زمان الا والذی بعدہ شر منه حتی تلقوا ربکم سمعته من نبیکم صلی اللہ علیه وسلم۔ جو زمانہ آتا ہے اس سے اگلا زمانہ اس سے بدتر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تم خدا تعالیٰ سے ملاقات کرو، میں نے اس کو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ انتہی فتح الباری ج ۱۳، ص ۱۷۔

اس سے معلوم ہوا کہ زمانہ نبوت سے جس قدر بعد ہوتا جاتا ہے غلبہ شر ہوتا جاتا ہے پھر ایسی حالت میں جس طرف قائلین کی کثرت ہو اس طرف خیر و حقانیت ہونے کی کیا دلیل ہے۔ اور جماعت قلیلہ یا شخص واحد کے قول کو محض مخالفت جمہور کی بناء پر غلط کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ جب تک کوئی دلیل شرعی قطعی یا ظنی اس پر قائم نہ کی جاوے محض مخالفت جمہور غلطی کی دلیل نہیں ٹھہرتا۔

واللہ اعلم وعلمه اتم واحکم وھذا اخر ما اردت ایرادہ فی ھذہ العجالة وصلی اللہ علی سیدنا محمد خاتم نقص الرسالة وعلی آله واصحابه رجال الامانة ولیوث البسالة والحمد للہ اولا وآخراً وباطناً وظاهراً وانا العبد المفتقر الی رحمة الہ الصمد عبدہ المذنب۔

ظفر احمد وفقه اللہ لتزود لغدہ وغفر له و

لوالدیہ ومشائخہ واخوانہ واقربائہ واخلائہ یوم لایجزی والد عن ولدہ ولا یغنی احد عن احد فقط۔

تمت ۔ یکم ذی الحجۃ الحرام سنہ ۱۳۰۰ھ

**نقشہ نعل شریف کا شرعی حکم**

السوال :۔ نقشہ نعل مبارک جو کہ خدمت والا میں مرسل ہے ایک رنگون کے متمول سیٹھ صاحب نے مستقل طور پر کثیر تعداد میں چھپوا کر یہاں رنگون میں مسلمانوں میں تقسیم کیا اس غرض سے کہ اس کا ادب وتعظیم بجالا کر فوائد دارین حاصل کریں۔ غیر مقلدین اور بعض مقلدین نے یہ جو دیکھا کر بہت کچھ شور وشغب اور چھیڑ چھاڑ شروع کر دی بعضوں نے غلو کر کے یہاں تک کہہ دیا کہ ایک تو یونہی لوگوں کے ایمان میں کمزوری تھی صرف رائی برابر ایمان باقی رہ گیا تھا اب اس نقشہ مع قطعہ بالوان مختلفہ کی بدولت وہ رہا سہا رائی برابر ایمان بھی جاتا رہا اس کے علاوہ ان لوگوں نے اپنے اعتراضات کی تقریر بطور ذیل کی اس میں ہدایات بطور کے مطابق سروں پر رکھ کر بوسہ وغیرہ دینا اس سے زیادہ معظم ومکرم چیزیں بھی پڑی ہیں جیسی کہ قرآن پاک وکتب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے اس سے کہیں بڑھ کر آثار وعلامت کی وقعت وعظمت ان کے عمل درآمد سے نظر آنے لگے جو مسلمان ان کی جیسی تعظیم وتکریم بجا نہ لائے اس کو بنظر حقارت دیکھیں۔ اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کریں، اس کو بے ادب وگستاخ بتائیں۔

الالتزام مالا یلزم اور حدود شرعیہ سے تجاوز کا پورا منظر پیش نظر ہو جاتے پھر تعجب پر تعجب ہے کہ یہ لوگ جو کہ اپنے آپ کو متبع سنت اور اہل حق کہہ کر بہت سے امور کو جن کو اہل بدعت بدعات حسنہ یا شعائر اظہار محبت رسول وغیرہ قرار دیتے ہیں یہ صرف سد عینیہ کے ناجائز وحرام شرک وبدعت قبیحہ کہتے ہیں۔ اور نقشہ نعل مبارک کو باں آب وتاب چھپوا کر ذریعہ نجات بتاتے ہیں باوجودیکہ عوام کالانعام کی حالت اور اس کے صدہا امثال ونظائر میں ان کی افراط وتفریط خود بھی مشاہدہ کر چکے اور کر رہے ہیں۔

نقشہ مذکور کے گرد اگرد اشعار وعبارات فضائل وغیرہ ہوتے ہوتے یہ عذر کرنا کہ ہم نے نقشہ مذکور کے نیچے یہ بھی چھاپ دیا ہے مگر خلاف شرع غلو نہ کریں الخ یا لکل لچر ہے خواہشات نفسانیہ کا غلبہ ہوتے ہوتے اور رفع حاجات دنیوی کا محض تحفہ ہاتھ آتے ہوئے عوام کا حدود شرعیہ پر قائم رہنا قطعی خلاف بداہت ومشاہدہ ہے۔ اتنی عبارت کا لکھ دینا ہرگز کافی نہیں اور نہ اس کا شائع کنندہ مسلمانوں کو ایک نئے فتنے میں پھنسانے کی وجہ سے مواخذہ اخروی سے

فابلان بسیر وهما دسبیتان سبتوا شعرهما + وطولها شبر واصبعان + وعرضها مما یلی الکعبان + سبع اصابع وبطن القدم + خمس وفوق ذا فست فاعلم + وهذه مثال تلک النعل + ودورها اکرم بها من نعل + اه ملخصا من العزیزی شرح الجامع الصغیر للسیوطی ج ۳؍ ص ۱۴۲ ۔

قال الحافظ السیوطی فی حسن المحاضرة مترجما للعراقی هو الحافظ الامام الکبیر زین الدین ابو الفضل عبد الرحیم بن الحسین بن عبد الرحمن حافظ العصر عنی بالفن فبرع فیه وتقدم بحیث کان شیخ عصره بالغون فی الثناء علیه بالمعرفة کالسبکی والعلائی وابن الکثیر وغیرهم انتهی ملخصاً ۔ ج ۱؍ ص ۱۵۱ ۔

قلت وهو شیخ حافظ ابن حجرؒ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مثالِ نعالِ نبوی سے اکابر محدثین جو غایت متبع سنت تھے سلف عن الخلف شغف رکھتے آئے ہیں ۔ اور اس کو اپنے پاس رکھنا موجب برکت سمجھتے تھے اس لئے اس کے ساتھ تعظیم وتبرک کا معاملہ شرعاً جائز ہوگا ۔ بشرطیکہ حد شرعی میں ہو ۔ اس کی تقبیل بھی جائز ہے ۔ کیونکہ اس کا منشا محض محبت ہے ۔ رہا یہ شبہ کہ یہ تو تمثال ہے اصل نعل نہیں ہے تو اس کی تقبیل میں کیا محبت ہے ۔

میں کہتا ہوں کہ آخر یوم ولادتِ نبوی جو ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو آتا ہے کیا بعینہٖ وہ دن ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے ہیں ۔ ہرگز نہیں بلکہ محض مثال ہے ۔ مگر تمام مسلمان اس دن کو متبرک سمجھتے ہیں اسی طرح یہاں سمجھو اور تعزیہ وغیرہ کو اس پر قیاس کرنا غلط ہے یہی فرق کافی ہے کہ اس کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے علماء امت سے ثابت نہیں ۔ اور تمثال نعال کے ساتھ ۔ حافظ عراقی بہت بڑے محدث ہیں اور متبع سنت ان کا قول مجتہد کے قول کے مثل ہے ۔ حضرات صحابہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کے ساتھ عظمت ومحبت کا معاملہ بکثرت ثابت ہے ۔ نعالِ نبوی بھی انہیں میں داخل ہیں ۔ اس کے تصریح اور تخصیص کی کیا حاجت ہے ۔ اہل محبت جانتے ہیں کہ محبوب کی تصویر کا بھی دل پر وہی اثر ہوتا ہے جو اس کی ذات سے ہوتا ہے ۔ باقی اس نقشہ پر جوتی جوتا بنا کر استعمال کرنا گو شرعاً جائز ہے مگر ادب ومحبت کے خلاف ضرور ہے ۔ باقی ہر تعظیم وادب میں غلو سے بچنا اور حدود شرعیہ پر قائم رہنا ہر مسلمان پر لازم ہے ۔ اگر کسی جگہ نعل نبوی کے ساتھ عوام غلو کرنے لگیں تو ان کی اصلاح کے لئے خواص کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ ترک کر دیں جس کی یہ صورت نہیں کہ نعوذ باللہ بے

ادبی کریں۔ والسلام

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۳ رجب دی الثانی سنہ ۱۳۴۵ھ

**مسجد میں عورت کے وعظ کہنے کا حکم**

السوال:۔ محلہ کی مسجد میں ایسے اہتمام و انتظام سے کہ کوئی مرد داخل مسجد نہ ہو سکے عورتوں کو اجتماع کی جائے کہ ایک وعظ عورت کا کہنوایا جائے۔ اور عام اعلان کیا جائے کہ فلاں روز فلاں وقت واعظہ کا وعظ ہوگا۔ معترضین میں سے جو چاہیں اپنی مستورات کو استماع وعظ کی غرض سے بھیجیں یہ اجتماع و اعلان کیا ہے آیا منجملہ حسنات کے ہے یا سیئات کے فقط۔ بینوا توجروا۔

## الجواب

یہ صورت جائز نہیں گو کیسا ہی اہتمام کیا جائے۔ کسی زنانہ گھر میں وعظ کہنے کا مضائقہ نہیں بشرطیکہ واعظہ علوم شرعیہ سے واقف ہو اور نہ واقف ہونے کی صورت میں نہ مرد کو وعظ کہنے کی اجازت ہے اور نہ عورت کو۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۱۲ رجب المرجب سنہ ۱۳۴۵ھ

**تعمیر کے وقت معمار کے ہاتھ سے چیونٹیوں وغیرہ حیوانات کا مرنا موجب جرم نہیں۔**

السوال:۔ یکے از محبان کہ از اہل سلوک است کار معماری کنند سوائے ایں کار دیگر کار نمیدانند عیال می دارد خرچہ عیال ہمیں کسب حلال داشتہ است بوقت کندیدن اساس دیوار و پُر کردن آں اساس مورچہا و دیگر حیوان ذی روح مردہ میشوند، بسبب کثرت حیوان پرہیز ناممکن است و صاحب مکان را سوائے ایں مکان دیگر چارہ نیست و بوقت کہگل کردن صحن مکان و سقف مکان نیز مورچہا بسیار زیر کہگل می آیند و مردہ می شوند بسبب ایں ضرورت و عدم امکان صورت دیگر ایں جرم معاف است یا خود جرم نیست یا ازیں کسب توبہ کردہ ترک کردہ آید و عیال اطفال را در فاقہ گذارد مفصل تحریری جواب کتاب عنایت فرمائید۔ خادم محمد بخش از جون ضلع ڈیرہ غازی خان۔

# الجواب

قال فی الاشباہ: الضرورات تبیح المحظورات وفرع علیہا جواز الرمی الی کفار تترسوا بصبیان المسلمین اھ (۷۶) والعلة هی الضرورة ولا یخفی ان مراعاة النملة فی البناء لو کانت واجبة لتعطل البناء والحضر اصلاً فالظاهر الجواز نعم التقوی والورع ان لا یرتکب قتلها عمداً کما الیہ الاشارة فی قولہ تعالٰی لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ وهم لا یشعرون اخبر بانهم ما کانوا لیفعلوا ذلك عمداً وقد صرح فی العالمگیریة بجواز قتل النملة اذا ابتدأت بالاذی والا فیکرہ (باب الکراهة) وصرح ایضاً بجواز احراق القیلة بالشمس للضرورة فانها لا تقتل۔

صورتِ مسئولہ میں اس معمار کو مورچہ و دیگر حیوانات کی رعایت واجب نہیں۔ اگر حیوان کچل و عمارت سے مرتے ہیں تو اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوگا۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ

مردوں کے لئے چرخہ کاتنے کا حکم | **السوال:-** سررشتہ تعلیم کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ پاٹھشالا اور مکاتیب کے مدرسین چرخہ کی تعلیم حاصل کر کے پاٹھشالا اور مکاتیب میں بچوں کو تعلیم دیں۔ ہندو مدرسین کو اس میں کوئی عذر نہیں۔ مگر مسلمان مدرسین نے عذر کیا ہے کہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے کہ مسلمان مرد چرخہ کاتیں۔ اس پر افسر سررشتہ تعلیم نے اس امر کا ثبوت طلب کیا ہے۔ لہٰذا گذارش ہے کہ مہربانی فرما کر اس کی نسبت جو حکم شرعی ہو تحریر فرماویں۔

# الجواب

فی الدر المختار: غزل الرجل علی هیئة غزل المرأة یکرہ۔ قال الشامی تحت قولہ یکرہ: لما فیہ من التشبہ بالنساء وقد لعن علیہ الصلوٰۃ والسلام المتشبهین والمتشبهات کما قدمناہ۔ ج ۵، ص ۳۲۱۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کی طرح چرخہ کاتنے کا شغل کرنا مردوں کے لئے مکروہ ہے۔ اور

زمانۂ قدیم سے یہ کام عورتوں کے ساتھ مخصوص چلا آرہا ہے۔ اس لئے مردوں کا اسے اختیار کرنا تشبہ بالنساء ہے۔

البتہ چرخہ کے علاوہ کوئی اور آلہ ایجاد کیا جاوے جو چرخہ سے مشابہ نہ ہو تو اس میں مردوں کو سوت کاتنا بلا کراہت جائز ہوگا۔ کیونکہ اس میں تشبہ بالنساء نہ ہوگا۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

١٥ر جمادی الثانی ١٣٢٢ھ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو شب معراج میں عذاب میں مبتلا دیکھا تھا ان میں مسلمان بھی تھے یا نہیں۔ اور اس روایت کے منکر کا کیا حکم ہے

السوال:۔ کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ میں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کو بہشت و دوزخ کی سیر کی اور دوزخ میں رنگ برنگ عذاب میں لوگوں کو مبتلا دیکھا وہ لوگ اپنی امت کے تھے یا غیر۔ وہ عذاب وقتی تھا یا نمونہ۔

## الجواب

یہ عذاب عالم برزخ میں دیکھا جو عالم آخرت اور دنیا کے درمیان واسطہ ہے۔ اور یہ معذبین بعض اس امت کے بھی تھے اور پہلی امتوں کے بھی۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

١٦ر شعبان ١٣٤٣ھ

ان کارڈوں کا حکم جن میں مکتوب الیہ کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ بھی اس کی نقل دوسروں کو بھیجیں

السوال:۔ نہایت مؤدبانہ التماس ہے کہ مسئولہ پوسٹ کارڈ دو چار روز قبل بندہ کو موصول ہوا ہے۔ اور بندہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس قسم کے خطوط لوگوں میں عام طور پر مروج ہیں۔ مگر یہ پہلا موقع کا خط ہے کہ مجھے ایسا خط دیکھنے کا اتفاق ہوا یہ کس حد تک جائز ہے۔ یا ناجائز ہے۔ براہ مہربانی مفصل طور پر جواب تحریر فرمائیں۔ اور اگر ناجائز ہے تو بندہ کا ارادہ ہے کہ اس خط کو اور آنجناب کے جواب دونوں کو ایک دو اخباروں میں شائع کروایا جائے تاکہ مسلمانوں کے پیسے کم از کم اس نذر

حرج سے محفوظ رہیں۔ گناہ تو دور کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایاک نعبد وایاک نستعین۔ اهدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین

محترم بندہ

اگر ممکن ہو سکے تو آپ بھی چار عدد کارڈ اپنے دوست و احباب کو تحریر فرمادیں کیونکہ جیسے ذات ربی نے مجھے اپنی مہربانی و عنایت سے خوشیاں بخشی ہیں آپ کو بھی ویسے ہی راحت و خوشی نصیب ہو (آمین)

والسلام

الراقم بندہ شیر محمد سیکنڈ کلرک برٹش

قونصلیٹ استیان ڈاکخانہ میرجاوہ بلوچستان

# الجواب

کارڈ مرسلہ دیکھا شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں بلکہ بوجوہ چند ایسے کارڈ لکھنا جائز نہیں۔

۱: اس میں اعتقاد ہے اس امر کا کہ ایسے کارڈ لکھنے سے راحت و خوشی نصیب ہوگی اور یہ اعتقاد بے دلیل ہے۔ بے دلیل امر کا اعتقاد جائز نہیں۔

۲: بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کارڈ کی نقل اپنے احباب کے پاس نہ بھیجیں گے تو ہم کو کوئی ضرر پہنچے گا۔ کسی بات میں بلا وجہ ضرر کا اعتقاد ناجائز ہے۔

۳: اکثر لوگ اس کو تو دین کا کام سمجھتے ہیں۔ اور جو بات شریعت میں بے اصل ہو اس کو دین اور ثواب سمجھنا بدعت محرمہ ہے۔

۴: اس میں بلا وجہ کارڈوں کو صرف ہے جو داخل اسراف ہے اور اسراف شرعاً حرام ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۴ر شعبان سنہ [illegible]ھ

چولہے میں اسپرٹ جلانا جائز ہے

**السوال** : ما قولکم ایها العلماء رحمکم اللہ تعالیٰ فی هذه المسئلة۔ کہ یہ جو اسپرٹ برقی چولہے میں استعمال کیا جاتا ہے مشہور ہے کہ اس میں شراب کے ساتھ اور چیز بھی ملی ہوتی ہے۔ ضرورت کے مقام پر سہولت کی غرض سے اس کو استعمال کرتے ہیں۔ حسب شرع کوئی ناجائز عمل تو نہیں۔ بینوا توجروا۔

المستفتی
احقر محمود حسن ڈھاکوی
طالب علم مدرسہ دارالعلوم دیوبند ۱۵ شعبان

## الجواب

یہ اسپرٹ جو چولہے میں جلائی جاتی ہے گھٹیا قسم کی ہے[1]۔ جو خمور اربعہ کی روح ہرگز نہیں ان کے سوا کسی اور معمولی خمر کی روح ہوگی اور اس وقت عموم ابتلاء کی وجہ سے گھٹیا اسپرٹ کے استعمال کی اجازت پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ رنگ اور پڑیا بہت سی اشیاء میں اس کی آمیزش ہے۔ جس سے احتراز دشوار ہے۔ جب ابتلاء عام کی وجہ سے گھٹیا اسپرٹ کو مباح الاستعمال قرار دیا گیا تو ہر جگہ اس کے لئے حکم حلت واباحت وطہارت کا ہوگا۔

الشئ إذا ثبت تبت بلوازمه۔

البتہ بلا ضرورت استعمال سے جہاں تک ہو سکے بچنا اولیٰ وافضل ہے۔ پس اگر چولہے کی اسپرٹ میں شبہ اسپرٹ ہی کی وجہ سے تھا تو اس کا جواب تو ہو گیا اور اگر دوسری شئی کی وجہ سے شبہ ہے تو جب تک دوسری شئی کی حقیقت واضح نہ کی جاوے اس وقت تک جواب

[1] طبی جوہر مطبوعہ اشرف المطابع صفحہ ۱۶۰ جدید پر تصریح ہے کہ اسپرٹ کی تین قسمیں ہیں۔ اور ہندوستان میں گھٹیا قسم کی اسپرٹ بنتی ہے جو آلو۔ بھیرا۔ گیہوں۔ جو وغیرہ کی شراب سے بنتی ہے۔ اور اعلیٰ اسپرٹ ولایت میں بنتی ہے جیسے انگور، سیب، انار، منقی۔ کی شراب کی روح ہے اور اعلیٰ قسم کی اسپرٹ قیمتی ہے جو دواؤں میں ڈالی جاتی ہے ۱۲ منہ

نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ ؍ شعبان ۱۳۴۹ھ

استفتاء مشتمل بر چند سوالات مختلفہ

السوال :۔ جس وقت جناب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تھی تو راستہ میں ایک عورت کے گھر سے گزرے یعنی ام معبد بنت خالد کے مکان سے گزرے ان کی ایک بکری جو دودھ ہرگز نہ دیتی تھی آپؐ نے اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیر دیا۔ وہ دودھ سے بھر گئے۔ اس واسطے آنجناب سے گذارش ہے کہ آیا یہ حدیث صحیح ہے یا کہ نہیں۔ دیگر اونٹ کا بولنا۔ بھیڑیا کا جنگل میں بولنا۔ ابوجہل کے ہاتھ میں پتھروں کا بولنا۔ یہ حدیث صحیح بھی ہے۔ اور حضرتؐ سے مسکرانے سے بی بی حصہ کا سوتی پرولینا آیا حدیث ہائے صحیح ہیں یا کیونکر۔ جواب جلدی تحریر فرماویں۔

السائل

مستری حافظ احمد بخش ملتان شہر

اندرون حرم گیٹ۔ ملتان

# الجواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کے وقت خبا ام معبد پر گزرنا اور اس کی دودھ کی بکری کے تھنوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دودھ دوھنا حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے اور اس کو متواتر صحیح الاسناد کہا ہے۔ واما الذہبی فقد تکلم علی الاسانید من حیث الصحۃ ولم ینکر التواتر۔ (ج ر ۳، ص ر ۱۰)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹوں کا کلام کرنا خصائص کبریٰ ج ر ۲، ص ۵۶ تا ۵۸ میں طرق متعددہ سے مذکور ہے۔ پس یہ بھی بے اصل ہرگز نہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھیڑیے کا ایک شخص سے کلام کرنا اور اس کا مسلمان ہو جانا۔ نیز بھیڑیے کا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنا خصائص کبریٰ میں (ج ر ۲، ص ر ۶۲) بطرق متعددہ مذکورہ ہے۔ جس میں پہلے قصہ کی تصحیح بھی حاکم وبیہقی وغیرہ سے مذکور ہے۔ اور کنکریوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں بولنا پھر ان کو ابوبکر، عمر، عثمان کے ہاتھ میں رکھ دیا ان کے ہاتھوں میں بھی بولنا۔ چند طرق

خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۲۴۲ سطر ۲۴ میں مذکور ہے۔ اور ایک طریق کی بیہقی نے بھی تخریج کی ہے اور وہ موضوعات کی روایت بھی نہیں کرتے۔ فقد التزم ان لا یروی موضوعاً ذکرہ السیوطی فی اللآلی۔ الخ

اور آپ کے ہنسنے سے بیوی صاحبہ کا سوتی پروتیا زروایت میں نہیں ملا ہے ہاں ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے وقت تین دفعہ گھر میں نور کا روشن ہونا خصائص ج ۱ ص ۲ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۱۰ رمضان سنہ ۴۵ھ

کیا آیت تخییر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی زوجہ مطہرہ کو طلاق دی تھی۔

**السوال:** آیت تخییر کے بعد آیا سردار دوجہاں نے کسی عورت کو طلاق دی کسی روایت سے گو کان ضعیفاً سے اس کا پتہ چلتا ہے اگر نہیں تو جس کتاب میں یہ مسئلہ اس کے متعلق خیال عالی مطلع فرماویں۔

## الجواب

فی الدر المنثور: اخرج ابن سعد عن عمرو بن سعید عن ابیہ عن جدہ قال لما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نسائہ بدأ بعائشۃ رضی اللہ عنہا قال ان اللہ خیرک فقالت: اخترت اللہ ورسولہ ثم خیر حفصۃ فقلن جمیعاً اخترن اللہ ورسولہ غیر العامریۃ اختارت قومہا فکانت بعد تقول انا الشقیۃ وکانت تلتقط البعر تبیعہ وتستاذن علی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتقول: انا الشقیۃ

واخرج ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ قال: امر اللہ تعالیٰ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم أن یخیر نسائہ فی ہذہ الآیۃ فلم تختر واحدۃ منہن نفسہا غیر الحمیریۃ۔

واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم: عن قتادۃ والحسن رضی اللہ عنہما کان تحتہ یومئذ تسع نسوۃ خمس من قریش عائشۃ وحفصۃ وام حبیبۃ

وسودة بنت زمعة وأم سلمة وكانت تحته صفية بنت حيي الخيبرية وميمونة بنت
الحارث الهلالية وزينب بنت جحش الأسدية وجويرية بنت الحارث المصطلقية وبدأ
بعائشة رضي الله عنها فلما اختارت الله ورسوله والدار الآخرة،

رؤي الفرح في وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فتتابعن كلهن على ذلك
فلما خيرهن اخترن الله ورسوله والدار الآخرة، وشكرهن الله على ذلك ان قال
لا يحل لك النساء من بعد ولا أن تبدل بهن من ازواج ولو اعجبك حسنهن فقصره الله
تعالى عليهن وهن التسع اللاتي اخترن الله ورسوله اهـ (ج/٥ ص/٢٩٥)

وفي الصحيح عن عائشة بعد قولها ففي اى هذا استأمر ابوي فاني اريد الله
ورسوله والدار الآخرة قالت ثم فعل ازواج النبي صلى الله عليه وسلم مثل
ما فعلت اهـ

قال الحافظ في الفتح واستدل به بعضهم على ضعف ما جاء ان من الازواج
حينئذٍ من اختارت الدنيا فتزوجها وهي فاطمة بنت الضحاك لعموم قوله ثم
فعل الى آخره اهـ ج/٨ ص/٤٠٢۔

وفي الاصابة في ترجمة فاطمة بنت الضحاك الكلابية قال ابن اسحق تزوجها
رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد وفاة ابنته وخيرها حين نزلت الآية التخيير
فاختارت الدنيا۔ قال أبو عمر هذا عندنا غير صحيح لأن ابن شهاب يروي عن أبي
سلمة وعروة عن عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين خير ازواجه بدأ
بها فاختارت الله ورسوله وتتابع ازواج رسول الله صلى الله عليه وسلم كلهن
على ذلك۔ وقال قتادة وعكرمة كان عنده حين خيرهن تسع نسوة وهن اللاتي توفي
عنهن وكذا قال جماعة ان الاتي كانت تقول انا الشقية وهي التي استعاذت ولختلف
في المستعيذة اختلافاً كثيرة۔ وقد قيل ان الضحاك بن سفيان عرض عليه ابنته فاطمة
وقال انها لم تصدع قط فقال لا حاجة لي بها۔ قال الحافظ اخرجه في الصحيح
وقد قيل انه تزوجها سنة ثمان اهـ ج/٨ ص/١٤٢۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ بعض ضعیف روایات میں یہ آیا ہے کہ وقت نزول آیت تخییر کے
ایک بیوی نے جس کو بعض نے کلابیہ کہا ہے اور بعض عامریہ اور جمہور اور نام فاطمہ بنت ضحاک بیان

کیا ہے۔ دنیا کو اختیار کیا۔ اس لئے ان پر طلاق واقع ہو گئی۔ کما ھو الحکم فی تخییر الازواج انھن اذا اخترن انفسھن وقع علیھن تطلیقۃ بائنۃ۔ لیکن بعد میں پھر ان سے نکاح ہو گیا اور وہ ان ازواج کے علاوہ ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑ کر وصال فرمایا۔ پس اگر ان سے وہی نکاح ہوا تو ظاہر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا وصال ہو گیا ہو گا۔ مگر یہ روایت نہایت ضعیف ہے۔ صحیح روایت کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے قابل اعتماد نہیں صحیح یہ ہے کہ نزول تخییر کے وقت حضور کی وہی نو ازواج تھیں جن کو چھوڑ کر آپ نے وصال فرمایا ۔ اور ان میں سے کسی نے دنیا کو اختیار نہیں کیا اور نہ کسی پر تخییر کی وجہ سے طلاق واقع ہوگی۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۱ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۶ھ

التنبیہ علی الخطاء من : مصنف رحلت المصطفیٰ

السوال :۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
کتاب رحلت مصطفیٰ : مؤلف عبدالرزاق ملیح آبادی صفحہ ۹۰ میں مندرجہ ذیل عبارت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تقریر بحوالہ ابن سعد درج ہے۔ پھر کہا لوگوں نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح بگڑ جاتے گا جس طرح تمام آدمیوں کا بگڑ جاتا ہے۔ رسول اللہ بلاشک وفات پا چکے۔

۲ : صفحہ ۹۲ پورے ڈیڑھ دن اور ایک رات لاش رکھی رہی صحابہ کو آپ کی وفات میں شک تھا پھر احتیاط بھی اسی میں سمجھی گئی کہ دفن میں دیر کی جاوے تاکہ موت پوری طرح یقینی ہو جاوے نیز یہ بھی وجہ تھی کہ سب مومنین کو نماز جنازہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہو غرض کہ لاش رکھی رہی یہاں تک کہ شکم مبارک پھول گیا۔ اور چھنگلیا میں کجی دکھائی دی۔ ناخنوں کا رنگ تبدیل ہو کر سبز ہو گیا۔ بحوالہ ابن سعد۔

ان امور کے متعلق گذارش ہے کہ حضرت عباسؓ کا یہ خطبہ اور یہ الفاظ ابن سعد نے کہاں سے لئے۔ جبکہ حدیث صحیح میں اس کا ذکر نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کا رنگ متغیر ہونا اور شکم مبارک کا پھولنا احادیث کے مخالف ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں کتاب الصلوٰۃ میں ہے۔

حرام علی الارض ان یاکل اجساد الانبیاء وغیرہ وغیرہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی

تفسیر مظہری میں زیر آیت ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ الآیہ۔ کہ شہداء احد کے اجساد مبارک امیر معاویہ کے حکم سے چالیس سال بعد نکلوائے گئے جب کدال حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے پائے مبارک پر لگا تو خون بہنے لگا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کی نعش کو چھ ماہ بعد نکالا تو جسم بعینہ تر و تازہ پایا گیا جیسا کہ مشکوۃ میں ہے۔ اب گذارش یہ ہے حضور انور علیہ التحیۃ والتسلیم کے جسم مبارک میں کیوں تغیر پیدا ہوا۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جو ایسے الفاظ فرمائے کہ ہر دو۔ مرشاں تجوت۔ حیات نبی حدیث صحیح کے مخالف تو نہیں۔

فقط والسلام

احقر حکیم سید احمد حسن میونسپل کمشنر

۱۱ر نومبر ۱۳۴۷ھ

## جواب

اس مصنف کا سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے متعلق ایسی روایت جو حدیث صحیح کے خلاف ہے لکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت نہیں ہے۔ اور اگر سلف میں سے کسی نے اگر ایسا کیا ہے تو ان کا مقصود محض روایات کا بتمامہا جمع کرنا تھا۔ کیونکہ محدث کا منصب ہے کہ ہر بات مع تمام روایات صحاح و حسن و صحاف بلکہ بعض وضو موضوعات تک بیان کردیتا ہے پھر اس کا ضعف وغیرہ ظاہر کرتا ہے یا طالب علم کے فہم پر اعتماد کرکے سکوت کرتا ہے لیکن اس مصنف کا مقصود تو فن حدیث کی کتاب مدون کرنا نہ تھا بلکہ واقعہ رحلت لکھنا تھا تو اس کو لازم تھا کہ حدیث کی تحقیق کرکے لکھتا ورنہ صحیح کی روایت پر اکتفا کرتا۔ کیونکہ اس کی یہ کتاب عوام کے ہاتھ میں پہنچے گی۔ اور ایسی روایت سے ان کے عقائد میں تزلزل کا اندیشہ ہے۔ اس تمہید کے بعد جواب عرض ہے۔

۱: حدیث ۔ دل میں تو حدیث صحیح کی مخالفت کچھ بھی نہیں ہے ہاں اس مصنف کے ترجمہ سے مخالفت کا وہم ہو سکتا ہے۔ کنز العمال میں یہ روایت تخریج ابن سعد مذکور ہے حدیث طویل ہے جس میں سے صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا جاتا ہے۔

عن عکرمۃ      توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا انما عرج بروحہ کما عرج بروح موسی وکان عمر خطیبا یوعد المنافقین وقال ان رسول اللہ صلی اللہ

علیه وسلم لم یمت وانما عرج بروحه کما عرج بروح موسی ولم یزل عمر یتکلم حتی ازبد شدقاه فقال العباس ان رسول الله صلی الله علیه وسلم یأسن کما یأسن البشر وان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد مات فادفنوا صاحبکم أیمیت احدکم اماتة ویمیته اماتتین هو اکرم علی الله من ذلك. فان کان کما تقولون فلیس علی الله بعزیز ان یبحث عنه التراب فیخرجه ان شاء الله الحدیث ابن سعد

(ج ۲، ص ۵۳)

اس کا مطلب بیان کر دینے سے پہلے یہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ کہ اس روایت میں علت انقطاع تو ظاہر ہے کیونکہ عکرمہ نے حضرت عمر و حضرت عباس رضی اللہ عنہما وعنہم کو نہیں پایا۔ اور بقیہ سند کا حال بھی معلوم نہیں کہ اس کے بقیہ رواۃ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ اور آیا ابن سعد نے یہ روایت اپنے استاد واقدی کے ذریعہ سے روایت کی ہے۔ جو مجہول ہیں ضعفاء کے سب تو روایت کرنے میں متہم ہیں اور خود بھی مجروح و متکلم فیہ ہیں۔ یا کسی اور سے روایت کی ہے۔ جب تک سند معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک یہ روایت قابل اعتماد نہیں۔ اور علامہ سیوطی کا اس کو جمع الجوامع میں نقل کرنا اسی امر پر مبنی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ وظیفہ محدث یہ ہے کہ وہ تمام روایات کو جمع کر دے إلا ان یکون التزم الصحة فلا یخرج غیر الصحیح۔ اس کے بعد الفاظ پر گفتگو کرتا ہوں اس حدیث میں حضرت عباسؓ کا یہ قول ہے۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یأسن کما یأسن البشر وأن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد مات۔ جس کا ترجمہ مصنف مذکور نے یہ کیا ہے کہ ہو گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم بھی بگڑ جائے گا جس طرح تمام آدمیوں کا بگڑ جاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں اھ لیکن ہمیں اس ترجمہ میں کلام ہے۔ کیونکہ اسن کے معنی لغت میں دو ہیں۔ ایک دوران و غشی کے اور دوسرے تغیر کے ملاحظہ ہو مجمع البحار ج ۱، ص ۳۲۔ جس میں اول یہ معنی لکھے ہیں رمیت ظبیاً فأسن فمات ای اصابه دوار وهی الغشی اس کے بعد تغیر کے معنی بیان کئے ہیں پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں یأسن کا معنی اول ہے اور اس وقت یہ جملہ حضرت عمر کے اس قول کو تسلیم کر کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غشی ہو گئی ہے جملہ آئندہ کے لئے بمنزلہ تمہید کے ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ آدمی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے۔ اور تغیر کے معنی لئے جائیں

تو اس سے کہاں یہ لازم آتا ہے کہ آپ کا جسم بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اس کے لئے بلا وجہ حذف لفظ جسم کا قائل ہونا پڑتا ہے بلکہ مراد مطلق تغیر ہے مطلب یہ ہے جس طرح اور آدمیوں میں تغیرات ہوتے ہیں کہ آج حیات ہے کل ممات اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی متغیر ہو سکتے ہیں۔ اور چونکہ ان کی جو حالت بزمانہ حیات ہوتی ہے وہ ظاہر میں ارفع و اکمل ہے۔ اور حالت ممات اس کے اعتبار سے ایک تغیر عظیم ہے۔ اس لئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس کو اس سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور اگر یاسن کا معنی تغیر جسم کے لئے جائیں جیسا کہ مصنف نے لیا ہے۔ تو یہ روایت اس پر محمول کی جائے گی کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حدیث حرم اللہ اجساد الانبیاء علی الارض۔ اس وقت تک نہ پہنچی ہوگی۔ اس واسطے یہ بات ان کی زبان سے نکل گئی۔ اور چونکہ صحابہ اس وقت پریشان و صدمہ میں تھے۔ اس لئے کسی نے اس پر التفات نہ کیا کہ انکار کیا جاتا مگر تغیر جسم پر اس کو محمول کرنا بعید ہے۔ کیونکہ حضرت عباس پر اس حدیث کا مخفی رہنا زیادہ بعید نہیں کیونکہ ان کا اسلام متاخر ہے۔ مگر قدرے بعد سے خالی نہیں۔ دوسرے کنز العمال میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی مذکور ہے عن جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ ان علیا غسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم والعباس یصب الماء واسامۃ وشقران یحفظان الباب فلما فرغ قال العباس مخزنۃ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ادفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی التراب ولکن اعدلہ صندوقا واجعلہ فی بیتی فاذا اکربنی امر نظرت الیہ فقال علی عباس اما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدفن اولادہ ثم تلا ھذہ الآیۃ منھا خلقناکم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارۃ اخری۔ الحدیث وعزاہ الی ابن مخزونی۔ ج ۴، ص ۵۶

اگر حضرت عباس کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم دوسرے آدمیوں کی طرح بگڑنے والا ہوتا تو وہ صندوق میں رکھنے اور بوقت پریشانی دیدار و زیارت کرنے کا خیال ظاہر نہ فرماتے۔ مجھے اس دوسری حدیث کی سند بھی معلوم نہیں جس طرح ابن سعد کی روایت مذکور کی سند معلوم نہیں۔ اس لئے اس کا معارضہ اس سے کرنا درست ہے پس احتمال اول

اوپر آئی ہیں۔

ٹ : دوسری روایت کے متعلق عرض ہے کہ یہ حدیث صحیحہ کے خلاف ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

غسلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ فجعلت انظر ما یکون من المیت فلم ار شیئا وکان طیبا حیا ومیتا صلی اللہ علیہ وسلم اخرجہ الحاکم فی المستدرک وقال صحیح علی شرط شیخین واقرہ علی ذلک الذھبی فی تلخیصہ وقال علی شرح م (ج ۳، ص ۵۹)

وقال الملا علی القاری فی شرح ھذا الحدیث وقد روی عن علی کرم اللہ وجھہ انہ حین غسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسح بطنہ فلم یجد شیئا فقال طبت حیا ومیتا۔

وفی روایۃ ماح ریح المسک فی البیت کما فی بطنہ وقیل وانتشر فی المدینۃ قال وسطعت منہ ریح طیبۃ لم یجد مثلھا قط انتھی کذا فی شرح الشفاء واخرجہ فی کنز العمال نحوہ بمعناہ وعزاہ الی ابن سعد اھ (ج ۲، ص ۵۹)

پس ابن سعد کی روایت تو صحیح روایت کے موافق ہے اور جو روایت مصنف رحلت نے نقل کی ہے وہ ان روایات کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ذات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر میں تغیر آگیا تھا جو میت کے جسم میں مادۃً آجاتا ہے۔ نیز انتفاخ بطن کے بعد مادۃً خوشبودار ہوا کا نکلنا بعید ہے کیونکہ جسم کا تغیر ہوا کے تغیر کو بھی عادۃً مقتضی ہے حالانکہ علیؓ نے صحیح روایات میں اس کی بالکل نفی فرمائی ہے۔ لیکن ابن سعد کی یہ روایت جو مصنف رحلت نے نقل کی ہے۔ حدیث ان اللہ حرم اجساد الانبیاء علی الارض ان تاکلھا۔ کے منافی نہیں کیونکہ یہ تغیر بوجہ انتفاخ ریح وغیرہ کے ہوا کرتا ہے ارض کے فعل کو اس میں دخل نہیں۔ حدیث۔ ان اللہ حرم الخ کا مقتضی تو صرف اتنا ہے کہ زمین انبیاء کے اجسام کو نہیں کھا سکتی۔

رہا یہ کہ ہوا وغیرہ سے بھی تغیر نہیں ہوتا اس سے وہ حدیث ساکت ہے لیکن سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حاکم کی روایت اور ابن سعد کی وہ روایت جو کنز العمال سے ہم نے نقل کی ہے خاص طور پر یہ بتلاتی ہے کہ آپ کے جسم میں ہوا وغیرہ سے بھی کوئی تغیر نہیں

ہوا۔ اور آپ کے جسم میں معمولی مردوں کی طرح کوئی بات نہیں پائی گئی بلکہ اس کے خلاف ریح طیبہ کا مہکنا اور مشک کی خوشبو غسل کے وقت پھیلنا متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ پس ابن سعد کی یہ روایت انتفاخ بطن وغیرہ کا ذکر بزعم مصنف مذکور ہے ہرگز قابل التفات نہیں۔ اور ممکن ہے کہ اس میں بھی مصنف مذکور نے ترجمہ الفاظ حدیث میں غلطی کی ہو۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں وہ کرچکا ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون

۱۸ر جمادی الاول سنہ ۳۶ھ

**حرام و حلال مخلوط مال کا حکم**

السوال:۔ تین مہینے ہوتے کہ ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم آیا ہے۔ ہے تو غریب مگر اس کے پاس کچھ مال ہے بعض اس میں سے ایسا ہے کہ اس کا باپ جب زندہ تھا تو کہیں روپیہ رکھا تھا اور اس نے دو چار چرا لئے۔ اور بعض قبر زیارت وغیرہ کرکے جمع کر لیا۔ مالک نصاب ہونے کے بعد بھی زکوٰۃ و صدقات واجبہ لیتا رہا اور روپیہ پاس ہوتے ہوتے سوال کرکے بھی روپیہ جمع کیا۔ یہ جانتا تھا کہ یہ سب ذرائع ناجائز ہیں۔ اور کچھ روپیہ حلال مال میں سے بھی ہے۔ مگر حرام و حلال مخلوط ہوگیا ہے۔ ایسے روپیہ سے کتابیں بہت خریدیں۔ اور کپڑا وغیرہ بھی اس وقت نقد سو روپیہ ہے اب اس پر خوف خدا غالب ہوا ہے کہ اس سے رہائی اور نجات کی فکر ہوئی۔ اب پریشان ہے کہ ان اشیاء اور روپیہ کو کیا کروں وہ چاہتا ہے کہ سب کو صدقہ کردیں مگر ایک تردد یہ ہوا کہ پانچ بھائی ہیں اب وہ لوگ بھی اس کی کمائی میں شریک ہوں گے یعنی باپ کی کمائی میں صدقہ کرتے وقت اگر ان سے اجازت لے لے تو وہ اس پر راضی نہ ہوں گے۔ اور بے پوچھے کیسے تصرف کرے۔ البتہ زیادہ زور دینے پر مجبوراً راضی ہوں گے۔ نیز یہ کہ باپ سے کتنا روپیہ چرایا تھا وہ معلوم نہیں وہ تو ورثہ کو حصہ رسد تقسیم کرنا ہوگی مگر مقدار یاد پڑنے سے مشکل پڑا اور ایک قرآن مجید ۱۱ر روپے کا ہے آٹھ روپیہ ایک شخص نے دیا تھا اور تین روپیہ اپنی جیب سے دیا تھا۔ مگر وہ تین روپیہ بھی مال مشتبہ میں سے ہے اور روپے والے نے کہا کہ تم ہی پڑھنا کسی دوسرے کو نہ بیچنا۔ اب اس قرآن شریف کو کیا کروں۔ اب حضرت والا ارشاد فرماویں

کہ اس کی نجات کیسے ہوگی۔ جو اپنے کسب کا ہے اور مشترکہ ہے اس کا کیا کریں۔ اور جو باپ سے لیا تھا اس کو کیا کریں۔

السائل

اطہر علی مدرسہ جامعہ حنفیہ صدر کملا

# الجواب

حرام وحلال مخلوط ہونے سے یہ سب مال اس شخص کی ملک ہوگیا۔ مگر ملک خبیث ہے اس لئے اگر اہل حقوق کے حقوق کا بدل ادا کر دیا جائے تو یہ سب حلال ہو جائے گا جس کی صورت یہ ہے کہ باپ سے جتنا روپیہ چرایا تھا۔ اس کا تخمینہ سے اندازہ کریں۔ اور تخمینہ سے جو اندازہ ہو اس کو سب ورثاء کا حق سمجھیں اور اس میں سہام شرعیہ معلوم کر کے سب ورثاء کو اطلاع کر دیں کہ آپ کا میرے ذمہ اتنا اتنا روپیہ ہے یا معاف کر دو یا وصول کر لو۔ اگر معاف کر دیں بشرطیکہ وہ سب بالغ ہوں تو ان کے حقوق سے بری ہو جائے گا۔ اور نابالغ کی معافی لغو ہے۔ اس کا حق ادا کرنا لازم ہے۔ اگر وہ معاف نہ کریں تو ان کے حق کو ادا کر دے خواہ دفعتاً واحدۃً یا تدریجاً۔ اسی طرح اندازہ کر کے کہ زکوٰۃ وصدقات واجبہ کا کتنا مال لیا ہے۔ اور یاد کرے کہ کن کن لوگوں سے لیا ہے اگر وہ آدمی معلوم ہوں تو ان کو یہ مقدار ادا کر دے اگر معلوم نہ ہوں تو ان کی طرف سے بنیت زکوٰۃ یہ رقم فقراء پر تقسیم کر دے۔ خواہ دفعتاً اس کی استطاعت ہو یا تدریجاً ادا کرنے میں مشغول ہو جائے۔ اور جو مدن سوال کر کے حاصل ہوا ہے اور زیارت قبر سے حاصل کیا ہے وہ اس کی ملک ہوگیا ہے۔ مگر ملک خبیث ہے اس کا بھی اندازہ کر کے فقراء کو دیدے خواہ دفعتاً ہو یا تدریجاً۔ اگر اس وقت سے ادائے حقوق میں لگ جائے گا۔ اور جتنا ادا کر سکتا ہے ادا کرتا رہے گا تو اس مال مخلوط من الحلال والحرام سے انتفاع اس کو جائز ہوگا۔ اور اس قرآن میں تلاوت بھی جائز ہے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ اشرفیہ

۱۸ رجب ۱۳۴۶ھ

دو بالغ مرد ایک چارپائی پر ایک ہی لحاف میں سو سکتے ہیں یا نہیں؟

السوال:۔ دو بالغ مردوں کو ایک چارپائی پر ایک ہی لحاف اوڑھ کر بضرورت یا بلا ضرورت سونا کیسا ہے۔ بحوالہ کتاب ارشاد فرماویں۔

السائل۔

بندہ احمد حسن غفرلہ

متعلم مدرسہ کنز العلوم قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد

جمعہ ۳ شعبان ۱۳۴۶ھ

## الجواب

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مروا ابناءکم بالصلوٰۃ اذا بلغوا سبعا واضربوا علیہا اذا بلغوا عشرا وفرقوا بینہم فی المضاجع رواہ ابوداؤد والدارقطنی وغیرہما واسنادہ حسن کما فی الاملاء۔

اس سے معلوم ہوا کہ دس برس کے بعد ایک خوابگاہ میں دو لڑکے نہ سوئیں۔ جب مراہق کے واسطے یہ امر ہے تو بالغ لڑکوں کے واسطے یا مردوں کے واسطے کس طرح اس کی گنجائش ہوگی ولان فی ذلک فتنۃ ھیجان الشھوۃ والاحتراز منہ لازم ومقدمۃ الواجب واجبۃ

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ

۷ شعبان ۱۳۴۶ھ

عبد الستار نام رکھنے کا حکم

السوال:۔ حضرت میرا نام عبد الستار ہے اور لفظ ستار میں مجھے کچھ شک ہے یعنی دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا لفظ ستار عبد کے ساتھ درست ہے یا نہیں؟ بظاہر معنی تو یہ ہے کہ عبد الصبار یعنی صبر کا بندہ لہٰذا مجھے مطلع فرمایا جاوے کہ آیا یہ نام شرعی دائرہ میں ہے یا نہیں۔

نیز یہ کہ اگر اس نام میں نقص ہو تو دوسرا نام بدل کر رکھنا چاہئے یا نہیں۔ فقط

فقط محمد عبد الستار۔ گورنمنٹ ٹیکنیکل اسکول گورکھپور۔

# الجواب

قال القاری: فی شرح حدیث اسماء اللہ الحسنی قیل: ما من اسم من الاسماء التی فی ھذا الباب إلا وقد ورد بہ الکتاب والسنۃ الصحیحۃ غیر لفظ الصبور فانہ ما وجد الا فی ھذا الحدیث وفی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ما احد أصبر علی اذی یسمعہ من اللہ نحو الحدیث قال الترمذی غریب اھ ج ۲ ص ۲۲ مرقاۃ

علماء نے فرمایا ہے کہ اسماء الٰہیہ توقیفی ہیں ورصبار کا اطلاق حق تعالیٰ پر کہیں کتاب و سنت میں وارد نہیں صرف ایک حدیث میں صبور کا اطلاق وارد ہے اس لئے عبدالصبار نام اچھا نہیں ہے۔ عبدالصبور کردیا جاوے یا جو کچھ چاہے سماءِ حسنیٰ میں سے اختیار کرلیا جائے واحبہا الی اللہ عبد اللہ وعبد الرحمٰن۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۰ شعبان ۱۳۴۶ھ

**السوال:** مکڑی مارنا جائز ہے یا نہیں کیا مکڑی کا مارنا اس لئے ناجائز ہے کہ اس نے ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت غار کے منہ پر جالا تان کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تھی جیسا کہ مولانا ذوالفقار علی صاحب کی کتاب عطر الوردہ سے مفہوم ہوتا ہے۔

السائل۔
احمد عبدالحکیم۔ اشرف منزل کرنل گنج
کانپور۔ ۱۳ فروری ۱۹۲۸ء

# الجواب

ہاں عنکبوت کے لئے یہ فخر تو بے شک ہے کہ اس نے افضل خلق پر تسج کیا مگر اس سے نوعِ عنکبوت کا قتل حرام نہیں ہوتا۔ خاص وہی فرد مکرم ہوا اور اس کی نوع کو فی الجملہ فخر ہوا۔

وفی مراسیل ابوداؤد: أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان العنکبوت شیطان فاقتلوہ۔ وفی کامل ابن عدی: عن ابن عمر مرفوعاً وھو حدیث ضعیف

كذا فى حيوٰة الحيوان ج ۲ / ص ۱۲۳ ۔

واللّٰه اعلم

ظفر احمد عفا اللّٰه عنہ

۲۲ رشعبان سنہ ۱۳۳۶ھ

**استفتاء مکرر برائے تصحیح حوالہ استفتاء مذکورہ**

**السوال:-** میں نے حرمت عنکبوت کا حوالہ اشاعت اسلام مولفہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عم فیضہم سے دیا ہے جو کہ میری غلطی ہے براہ کرم اس عریضہ کی نقل کی گئی ہو تو اس میں تصحیح فرمادیجئے۔ اصل یہ ہے کہ مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ نے شرح قصیدہ بردہ (عطر الوردہ) کے صفحہ ۳۵ مطبوعہ مجتبائی پر تحریر فرمایا ہے کہتے ہیں کہ کبوتران حرم محترم اس جوڑے کی نسل سے ہیں برکت دعائے نبوی تا قیام قیامت صدمہ ستکاریاں سے محفوظ ہیں اور مکڑی کے مارنے کی بھی ممانعت ہوگئی ہے۔ انتہٰی بلفظہ۔ مولانا مغفور نے یہ مضمون بذیل شرح ظنوا الحمام وظنوا العنکبوت علی خیر البریۃ لم تنسج ولم تحم۔

وقایة اللّٰه اغنت عن مضاعفة من الدروع وعن عال من الاطم

خلاصہ قصہ ہجرت میں تحریر فرمایا ہے۔

السائل

احمد عبدالحلیم۔ مذکورہ۔

اس کا جواب مذکور نہیں بلکہ وہ پہلے والا ہی ہے۔

**کونسل و میونسپل بورڈ کمیٹی وغیرہ کے ممبروں کے فرائض اور اس میں کوتاہی کرنے کے متعلق چند سوالات**

**السوال:-** زید کتابوں کے انتخاب کی کمیٹی کا یا میونسپل بورڈ کا یا کونسل کا یا کسی اور کمیٹی کا ممبر ہے۔ اس کو گورنمنٹ نے یا قوم نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ نیک نیتی سے سچی رائے دے گا۔ اگر اس نے اپنے نفع کے خیال سے یا اپنے کسی عزیز یا دوست کے خیال سے یا کسی کی خاطر یا دباؤ سے بھی رائے نہ دی تو وہ گنہگار ہوگا یا نہیں۔

سؤال ۲: زید کسی کمیٹی کا صدر ہے وہ اپنے اثر سے اور ممبروں کو کسی معاملہ میں ناجائز طور پر اپنی رائے کے موافق بنانے کی کوشش کرے تو یہ اس کے لئے جائز ہے یا نہیں۔ اگر اس اثر سے کوئی کام ہو جائے جس سے اس کے کسی عزیز یا دوست کو یہ جائز نفع پہنچے تو ایسا نفع اس عزیز کو جائز ہوگا یا نہیں۔

سؤال ۳: جو لوگ کسی کمیٹی کے ممبر یا صدر ہوتے ہیں انھیں گورنمنٹ یا قوم امین سمجھ کر مقرر کرتی ہے۔ ان کی حیثیت شرعاً امین کی ہوتی ہے یا نہیں۔ ان کو نیک نیتی سے شرعاً اس کمیٹی کے قواعد کی پابندی لازم ہے یا نہیں اگر وہ اس کی پابندی نہ کریں تو شرعاً وہ گنہگار ہوں گے یا نہیں۔

سؤال ۴: خالد اپنے عزیز دوست زید سے جو کمیٹی کا ممبر یا صدر ہے اس بات کی خواہش کرتا ہے کہ وہ خلاف دیانت کسی معاملہ میں اس کے موافق رائے دیکر اس کو نفع پہنچائے خالد کو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر اس طریقہ سے خالد کو نفع پہنچا تو وہ نفع شرعاً اس کے لئے حلال ہوگا یا حرام۔

سؤال ۵: عمر ایک کمیٹی کا ممبر ہے اس نے زید کی خاطر سے جو رائے کمیٹی کا صدر ہے اپنی اصلی رائے کو چھپا کر غلط رائے دیکر زید کا ساتھ دیا تو عمر بھی گنہگار ہوگا یا نہیں۔

سؤال ۶: زید ایک کمیٹی کا ممبر ہے۔ اور اس کمیٹی کو کسی ایسے کام کے تجویز کرنے کا اختیار ہے۔ عام لوگ نفع حاصل کر سکیں اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر کسی شخص خاص کی کوئی عمدہ چیز ہو تو وہ سفارش کرے کہ یہی چیز استعمال کی جاوے۔ زید نے بغیر اس کے دوسری چیز اس کے مقابل کی اس کے سامنے کرے اور بغیر اس کے کہ وہ چیز اس تجویز کے مطابق ہو خالد کو اس سے ذاتی تعلق کی وجہ سے نفع پہنچانے کی غرض اس کی چیز لینے یا استعمال کرنے کی سفارش کرے دوسرے لوگوں کو اس کے جائز نفع سے محروم رکھے۔ ایسی صورت میں زید گنہگار ہوگا یا نہیں۔ اور خالد نے جو اس سے نفع حاصل کیا وہ اس کے لئے حلال ہوگا یا حرام۔

سؤال ۷: زید کمیٹی کا ممبر ہے اور اس کے اختیار میں ہے کہ چند چیزیں جو اس کے پاس آئیں۔ ان میں سے جو بہتر ہو اس کو منتخب کرکے اور ممبروں کے سامنے پیش کرے۔ زید اچھی چیز کو ممبروں کے سامنے پیش نہ کرے اور اپنے کسی دوست یا عزیز کی کسی خراب چیز کو اچھی ظاہر کرکے محض اس کو نفع پہنچانے کے لئے پیش کرے اور کمیٹی نے اس کو منظور کرے۔ اس صورت میں زید گنہگار ہوگا یا نہیں اور اس کا دوست یا عزیز خالد جس نے اس سے جو نفع حاصل کیا تو یہ نفع اس کے لئے جائز ہوگا یا نہیں۔

۸: زید کمیٹی کا صدر ہے۔ کمیٹی نے ایک تجویز کی جس سے عام لوگ نفع اٹھا سکتے تھے زید نے اپنے اثر سے خالد کو نفع پہنچانے کے لئے اور لوگوں کو نفع حاصل کرنے سے روکا اور لوگ اس خیال سے رک گئے کہ اگر ہم نے زید کے خلاف کیا تو وہ ہمارے اور کاموں میں رخنہ انداز ہو جائے گا اور کہیں نقصان پہنچے گا۔ اس حالت میں زید گنہگار ہوگا یا نہیں؟ اور خالد جو اس کے اس اختیار سے نفع حاصل کرتا ہے یہ نفع اس کیلئے جائز ہوگا یا نہیں۔

۹: زید جو کمیٹی کا ممبر ہے یا صدر ہے اس نے بکر سے کچھ روپیے اس غرض سے لئے کہ بکر اس کی فرمائش کے مطابق ایک کتاب تیار کرے اور وہ کمیٹی میں منظور کر دے گا۔ تو بکر نے اس کے کہنے کے مطابق تیار کیا۔ زید نے اس وجہ سے کہ ممبران کمیٹی کی خواہش کے مطابق تھی کمیٹی میں منظور کرا دی۔ اس صورت میں زید نے جو وہ روپیہ لیا اس کے حق میں رشوت ہوگا یا اپنی رائے دینے کا حق ہوگا۔ اگر وہ روپیہ رشوت ہے تو بکر بھی گنہگار ہوگا یا نہیں ایسی صورت میں بکر کو اس کتاب سے منتفع ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں۔

۱۰: زید نے بکر سے اس روپیہ کی بابت یہ کہا تھا کہ اس وقت ہمیں ضرورت ہے تم دیدو۔ تمھاری کتاب جو تم تیار کرو اگر وہ نہ منظور ہو تو اس روپیہ کو بطور قرض سمجھ میں اس کو ادا کر دوں گا ورنہ میری اس رائے کا معاوضہ ہوگا۔ بکر نے اس خیال سے یہ روپیہ دیدیا کہ اگر میں نہ دونگا تو زید دوسروں سے معاملہ کرے گا۔ اور مجھ سے ناخوش ہو کر مجھے اور بھی نقصان پہنچائے گا۔

۱۱: اگر سوال ۹، ۱۰ کے معاملہ میں زید اور بکر گنہگار ہیں تو اب ان کو کیا چارۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔ کہ مواخذۂ عقبیٰ سے بچیں۔ اگر زید خالد کے اضرار سے منع نہ کرے تو خالد کو اپنے مواخذۂ عقبیٰ سے بچنے کیلئے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ اور اگر زید روپیہ واپس نہ کر سکے اور مواخذۂ عقبیٰ سے بچنا چاہے تو اس کو کیا چارۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔ یہ سب معاملات جن اصل شرعی پر مبنی ہوں اُن کو ظاہر فرمایا جائے۔ اور کتاب و سنت اور فقہ سے پورے ثبوت کے ساتھ اس کا جواب تحریر فرما دیں۔ تا کہ تعلیم یافتہ حضرات کو چون و چرا کا موقع نہ ملے۔

السائل

جلال الدین جعفری از محلہ انوار احمدی الٰہ آباد

# الجواب

اول قاعدہ ملاحظہ ہو۔

علہ: جس کو کوئی منصب یا عہدہ دیا جاتا ہے اس کو اس کا اہل سمجھ کر دیا جاتا ہے پس اس عہدہ اور منصب کے حقوق کی رعایت شرعی حدود میں ہو کر اس کے ذمہ شرعاً واجب ہے۔ البتہ اگر عہدہ یا منصب کا کوئی حق خلاف شرع ہو تو اس کی رعایت لازم نہیں۔ بلکہ اپنی قدرت کے موافق اس کی مخالفت لازم ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ ولا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ ومن رأی منکراً فلیغیرہ بیدہ او بلسانہ او بقلبہ الحدیث۔

علہ: امین کو خیانت جائز نہیں وفی الحدیث فی علامات النفاق۔ واذا ائتمن خان۔

علہ: جس شخص کو صحیح رائے دینے کیلئے نمائندہ بنایا گیا ہو وہ شرعاً بھی امین ہے۔ لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام المستشار مؤتمن۔ اور اس پر لازم ہے کہ رائے دیتے ہوئے شرعی حدود کی رعایت کرے رائے دینے سے پہلے یہ سوچ لے کہ رائے خلاف شرع تو نہیں۔

علہ: جس شخص کو غلط رائے دینے سے اس کے کسی دوست کو نفع مالی پہنچے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دوست کو بلا معاوضہ نفع پہنچے دوسرا یہ کہ بعوض نفع پہنچے مثلاً اس شخص نے رائے دی کہ فلاں شخص کا مال اچھا ہے اور اس کی رائے کی وجہ سے دوست کا مال فروخت ہو گیا۔ اس صورت میں جو نفع دوست کو ہوا وہ مباح ہے مگر رائے دینے والا غلط رائے دینے کی وجہ سے گنہگار ہوا مگر اس کو عقد بیع میں داخل نہیں اس لئے عقد بیع موافق اصول شرعیہ ہوا اس لئے اس سے توبہ کرنا دونوں کو لازم ہے۔

## اب جوابات سوالات معروضہ میں

جواب اول: اس صورت میں صحیح رائے دینا واجب ہے۔ غلط رائے دینا حرام ہے۔ بشرطیکہ رائے شریعت کے موافق ہو۔ اور غلط رائے دینے سے

کسی عزیز یا دوست کو مالی نفع پہنچ جائے تو اس کے جواز و حرمت کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

عـ۲ : دوسرے ممبروں کو ناجائز طور پر غلط رائے کے موافق بنانا جائز نہیں ہے۔ اور عزیز یا دوست کو نفع پہنچنے کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

عـ۳ : ہاں یہ لوگ شرعاً امین ہیں ان کو نیک نیتی سے سچی رائے دینا اور کمیٹی کے قواعد کی پابندی کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہ قواعد شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ واللہ اعلم۔

عـ۴ : خالد کو ایسا کرنا جائز نہیں اور خالد کو جو نفع پہنچا اس کی تفصیل اوپر گذر چکی۔

عـ۵ : ہاں عمر بھی گنہگار ہوگا۔

عـ۶ : زید کا یہ فعل ناجائز ہے۔ جس سے اس کو گناہ ہوگا۔ اور خالد کو بھی ایسا کرنا جائز نہیں کہ اپنے خراب مال کو اچھا ظاہر کرے اور نفع کی بابت اوپر تفصیل گذر چکی ہے۔

عـ۷ : مکرر مثل جواب۔ عـ۸ یہاں بھی وہی حکم ہے۔

عـ۸ : زید کا یہ فعل ناجائز ہے۔ جس سے اس کو گناہ ہوگا۔ اور خالد کو بھی اس تحریک سے گناہ ہوگا۔ اور نفع کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

عـ۹ ۔ عـ۱۰ : رائے کا معاوضہ لینا حرام ہے۔ رائے کوئی مال متقوم نہیں جس کا معاوضہ لیا جائے اس لیئے زید کا بکر سے روپیہ لینا رشوت میں داخل ہے۔ جس کا بکر کو واپس کرنا واجب ہے۔ اور بکر کو بھی رشوت دینے کا گناہ ہوگا اگر تحصیل منفعت کیلئے رشوت دی ہو۔ اگر ضرر سے بچنے کی خاطر دی ہو اور ضرر شدید کا اندیشہ ہو جس کا تحمل نہ ہو سکے تو بکر کو گناہ نہ ہوگا۔

عـ۱۱ : بکر کے ذمہ صرف توبہ واجب ہے اگر اس نے تحصیل نفع کیلئے رشوت دی ہو اور زید کے ذمہ بکر کی رقم واپس کرنا واجب ہے اور توبہ کرنا بھی لازم ہے

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۔ ۱۰ شوال ۱۳۴۳ھ

کیا حضرت عائشہؓ اپنی اخیر عمر تک اسی کمرہ میں رہتی تھیں جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ مدفون ہیں یا اس کو چھوڑ دیا تھا اور کب چھوڑا

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایسا ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد تک حضرت بی بی عائشہؓ اپنی اخیر عمر تک اسی حجرہ میں رہتی تھیں جس میں حضرات ثلاثہ مذکورین مدفون ہیں یا وہ حجرہ چھوڑ کر کہیں اور قیام فرما لیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ نے جو اس حجرہ کی سقف مرمت فرمائی تھی اس وقت بھی بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا اسی حجرہ میں قیام فرماتی تھیں یا نہ۔

السائل

شیر محمد از گھوٹکی ضلع سکھر سندھ

## الجواب

قال العلامة السمهودي ولابن زبالة عن عائشة رضي الله عنها قالت: ما زلت أضع خماري وانفصل في ثيابي حتى دفن عمر رضي الله عنه فلم أزل متحفظة على ثيابي حتى بنيت بيني وبين القبر جدارا۔ وعن المطلب كانوا يأخذون من تراب القبر فأمرت عائشة رضي الله عنها بجدار فضرب عليهم وكانت في الجدار كوة فكانوا يأخذون منها فأمرت بالكوة فسدت۔

وفي طبقات ابن سعد: أخبرنا موسى بن داود، قال: سمعت مالك بن أنس يقول: قسم بيت عائشة باثنين قسم كان فيه القبر وقسم كان تكون فيه عائشة۔ وبينهما حائط وكانت عائشة ربما دخلت حيث القبر فضلا (أي في ثياب الفضل) فلما دفن عمر رضي الله عنه لم تدخله إلا وهي جامعة عليها ثيابها

(ص ۔ ۱۳۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عمرؓ کے دفن تک اور اس کے بعد بھی اسی حجرہ میں رہتی تھیں اور ان کے گھر کے دو حصے کر دیئے

گئے تھے۔ ایک حصہ میں قبریں تھیں اور ایک حصہ میں خود رستی تھیں اور دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ الاحقر عزیز الرحمٰن عفا اللہ عنہ

۱۵ رشوال سنہ ۱۳۴۶ھ

بورڈ کے منظور کردہ تخمینہ میں اگر مدرس بجائے ٹھیکیدار کے خود با کفایت کام کرواکر کچھ رقم منظور شدہ تخمینہ سے پس انداز کرلے تو یہ رقم اس کیلئے حلال ہے یا نہیں۔

السوال:- زید مدرسہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا صدر مدرس ہے اور مکان مدرسہ بھی بورڈ کا ہے بورڈ مکان مدرسہ کی مرمت مدرس کی معرفت کرانا چاہتا ہے اور زید بھی مرمت کا کام ٹھیکیدار کے مقابلہ میں اچھا اور کفایت سے کراتا ہے۔ تخمیناً منظور شدہ سے بعد کرانے کام کے جو رقم بچ جاتی ہے اس کو حق المحنت خیال کرکے اپنے صرف میں لاتا ہے تو کیا زید کے واسطے یہ جائز ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو یہ رقم بورڈ کی مد میں داخل کرنے سے ادائیگی ہو جائے گی یا نہیں۔

قاعدہ: مرمت کا یہ ہے کہ بورڈ اپنے قواعد کے موافق کام کا تخمینہ کرکے مدرس کو رقم اور تخمینہ پہنچا دیا جاتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ مدرس اس رقم سے اس کام کو کرادے۔ اگر تخمینہ سے زیادہ خرچ ہوتا ہے تو بورڈ یقین ہونے پر زیادہ رقم دیتا ہے۔ اور اگر بقیہ رقم مدرس بورڈ کو واپس کرنا چاہے تو بورڈ قبول کرلیتا ہے۔ اس طرح کام کرنے والے کو امان کا کام کہا جاتا ہے۔

سوال ۲: زید بورڈ کے مدرسہ کا مدرس ہے اور پونڈ بھی بورڈ کا ہے زید نے مدرسی کی حالت میں موافق حکم ڈسٹرکٹ بورڈ پونڈ کی انچارجی کرتے ہوئے راسان پونڈ کو خوراک نہیں دی یا کم خوراک دی اور خوراک پوری وصول کرکے اپنے صرف میں لایا کیا یہ بھی حق العباد ہے تو اس کی ادائیگی کی کیا سبیل ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ کون کون راسان کس کی تھی اور نہ یہ معلوم ہے کہ کس قدر کس خوراک میں ہوئی ہے اس کی ادائیگی یا معافی کی جو صورت توبہ و استغفار وغیرہ ہو تو ارقام فرماویں۔ فقط والسلام۔

مرتضیٰ علی۔ مدرس اسلامیہ ڈسٹرکٹ بورڈ سہارنپور

## الجواب

قاعدہ کے بیان کرنے سے معلوم ہوا کہ بورڈ اس رقم کو مدرسہ کی ملک نہیں کرتا بلکہ اپنی ہی ملک سمجھتا ہے۔ اور مدرس کو محض امین کے طور پر رقم کے صرف کرنے کا حق ہے۔ لہٰذا اس صورت میں باقی ماندہ رقم کا واپس کرنا لازم ہے۔ اور اس کو اپنے تصرف میں لانا جائز نہیں۔ اور جو صرف ہوئی ہے اس کو واپس بورڈ میں داخل کرنا لازم ہے۔

۲: ہاں یہ ہے حقوق العباد۔ راسان کی خوراک میں کمی کرنے کا گناہ توبہ و استغفار سے معاف ہو جاوے گا۔ اور بچی ہوئی رقم اندازہ کر کے اپنے ظن غالب سے بورڈ کو واپس کر دی جاوے۔ اور اندازہ ایسا لگایا جاوے جس سے دل گواہی دے دے۔ کہ بچی ہوئی رقم ادا ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ تعلم گناہوں سے توبہ و استغفار بھی کیا جائے۔ کیونکہ حقوق کے تلف کرنے میں حق کے تلف کرنے میں حق اللہ بھی تلف ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ شوال سنہ ۱۳۴۶ھ

### حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت متعلق نحوست پر شبہ کا جواب

**السوال:** حجۃ البالغہ میں شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ عورت، گھوڑا اور مکان میں نحوست ہے۔ حالانکہ اسلام میں کسی چیز میں نحوست کہنا شرک ہے۔ اگر نحوست کے معنی بد عادات ہیں تو یوں تو بد عادات، بد خصلت اور برائی ہر چیز میں ہو سکتی ہے۔ ہر سہ اشیاء مندرجہ بالا میں نحوست کی خصوصیت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

## الجواب

آپ نے حجۃ اللہ البالغہ کو سمجھا ہی نہیں۔ مہربانی کر کے اس کی عبارت مع حوالہ و جلد لکھ بھیجئے۔ پھر جواب دیا جاوے گا۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ ۱۱ ذی قعدہ سنہ ۱۳۴۶ھ

### خاوند کے حقوق اور بلا قصور بیوی کو طلاق دینے کے متعلق ایک استفتاء کا جواب

**السوال:** ایک حقیقی خالہ اپنے بھانجے کو اس کے والدین سے بھی زیادہ لاڈ و پیار

طریقہ سے پرورش کرتی رہی اس کی ناز برداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جوان ہونے پر اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بھی اس سے کردی یہ لڑکی بھی شوہر کی نہایت مطیع ہے۔ اور خالہ بھی دونوں کے اخراجات کی کفیل ہے۔ اور اس کی مادرانہ شفقتیں روز افزوں ہیں لیکن بھانجہ بجائے اس کے کہ بسر از خدمات سے حقوق مادری ادا کرتا انتہائی ایذا رسانی پہ کمربستہ ہے بلکہ وہ صورت اختیار کرنا چاہتا ہے کہ چشموں میں اس کی خالہ کی سخت توہین اور بے آبروئی ہو (یعنی طلاق دینے پر آمادہ ہے) حالانکہ بیوی اور خالہ کی طرف سے کوئی امر خلاف شرع و عقل بد شرافت سرزد نہیں ہوا۔ ایسے احسان فراموش مربی کش کیلئے شریعت کیا حکم دیتی ہے۔ اور واقفین حال کو اس کیساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔ بینوا توجروا۔

## الجواب

صحیح احادیث میں خالہ کو بمنزلہ ماں کے فرمایا گیا ہے۔ جو حقوق ماں کے ہیں وہ حقوق خالہ کے بھی ہیں خصوصاً جبکہ اس نے پرورش بھی کی ہو تو حق تربیت سے اس کے حقوق میں اور بھی اضافہ ہو جاوے گا۔ اور بلا وجہ بدون کسی خطا و قصور کے بیوی کو طلاق دینا۔ حق تعالیٰ کو سخت ناگوار اور بہت ہی مبغوض ہے پس جو شخص اپنی حقیقی خالہ کو ایذا دے اور اس کو ذلیل کرے وہ اس وعید کا مصداق ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ ومن لم یوقر کبیرنا فلیس منا۔ جس نے اپنے محسن کا احسان نہ مانا اس نے اللہ کا احسان نہ مانا یعنی وہ خدا کا ناشکرا ہے۔ اور جو اپنے بڑے اور بزرگ کی تعظیم نہ کرے وہ مسلمانوں میں شمار نہیں۔ یعنی اس کا یہ فعل مسلمانوں کے افعال میں سے نہیں یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور جو لوگ اس کے حال سے واقف ہیں وہ اس سے قطع تعلق کر دیں جب تک وہ توبہ نہ کرے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۹ رمضان ۱۳۴۷ھ

دوسرے آدمی کو بلا محصول ادا کئے مال لانے کو کہا وہ شخص پکڑا جائے تو مقدمہ کے اخراجات کس کے ذمہ ہوں گے یعنی ملزم یا آمر کے ذمہ

**السوال** :- عرض حال خدمت میں یہ ہے کہ ہماری دوکان پر ۲۰ عدد بوری مصری بلا محصول پکڑی گئی۔ ایک بوری مصری پر محصول کمیٹی مبلغ ۸ ہوتا تھا میں نے اپنے بھائی سے بوری بلا محصول لانے کو کہا اس نے یون میل سے کرایہ ایک روپیہ فی بوری کہا میں نے منظور کیا۔ اب کمیٹی کرنال نے میرے بھائی پر دعویٰ عدالت میں دائر کیا ہے اب خرچ موافق قانون شرع کے کس کے ذمہ ہوگا۔ نہایت مہربانی۔

جان محمد تیلی

۱۳ رمضان ۴۷ھ

## الجواب

قاعدہ سے مقدمہ کا خرچ اسی شخص پر ہے جس پر کمیٹی نے دعویٰ کیا ہے۔ صاحب مال پر خرچ نہیں ہے۔ مگر مروت کا مقتضی یہ ہے کہ صاحب مال اس صورت میں اپنے بھائی کی امداد کرے اور کچھ خرچ خود بھی برداشت کرے۔ کیونکہ یہ بلا اسی کے کہنے سے اس پر واقع ہوئی ہے۔ یہ اس کے ذمہ واجب تو نہیں مگر ایسا کرنا بہتر ہوگا کہ بھائی کی دلجوئی ہو۔

قلت و لیس ھذا مما یضمن فیہ المتسبب ایضا کالمباشر لکون الضمان بغیر حق من اصلہ و لکون المباشر قد رضی بالقاء نفسہ فی الخطرۃ باختیارہ الاجر و اللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۱۷ رمضان سنہ ۱۳۴۷ھ

دس مختلف سوالات پر مشتمل ایک استفتاء

**السوال** ۱:- نقرئی زیور کی زکوٰۃ دس تولہ چاندی ہوتی ہے جس کی قیمت آجکل ۱۲ ہے اگر روپیہ سے زکوٰۃ ادا کی جاوے تو عشرہ دینا چاہیں تو وہ دس تولہ ہیں یا ۱۲۔

۲ :- مسجد کا فرش خشب اور پتھر کا تھا۔ اس کو اکھڑوا کر ٹائل لگوا دیا گیا مسجد

ہیں ضرورت نہیں کہ کہیں اس طغریٰ کو لگایا جائے۔ خریدار خریدنے میں تامل کرتے ہیں کہ گھر میں لگوانے میں بے ادبی ہے اور جو ایسا کرے گا فلاح نہ پاوے گا۔ اب اس کو کیا کیا جاوے کہ نقصان بھی ہے۔ اور جگہ بھی گھری ہوئی ہے۔

س : ایک شخص سرکاری مطبع میں ملازم ہے جہاں اسٹامپ کے کاغذ طبع ہوتے ہیں اور اس میں چھوٹی چھوٹی تصویریں ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کو ان کا چھاپنا اور ایسی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

س : عورت کو ایام حیض ختم ہونے پر کرسف بے داغ معلوم ہوتا ہے۔ مگر فرج میں انگلی ڈالنے سے سرخی معلوم ہوتی ہے۔ گویا دم حیض اندر رک جاتا ہے جو دوسرے دن خارج ہوتا ہے۔ اس حالت کو حیض سمجھا جائے یا طہر۔

س : زید نے اپنے حج بدل کی وصیت کر کے انتقال کیا مگر ثلث میں صرف پچاس روپیہ نکلتے ہیں۔ باپ اس کا اپنے پاس سے پیسے دیکر حج بدل کراتا ہے تو کیا یہ حج فرض ہوگا اور تمام شرائط حج بدل کی پورا کرنی ہوں گی یا یہ حج نفل ہے ایصال ثواب کے درجہ میں۔ اور باپ حج بدل کرنے کیلئے قران یا تمتع کی اجازت دیدے تو صحیح ہے یا نہیں۔ نیز حج بدل کرنے والا روپیہ لینے کیلئے میت کے وطن گیا اور نیت سفر کرلی مگر اس کو اپنے گھر واپس آنا ضروری ہے تو گھر آنے سے سفر کی نیت باطل ہو جائے گی یا نہیں۔ اور کیا ضروری ہے وہیں سے سیدھا بمبئی کو روانہ ہو جائے۔

س : حاجی صاحب مال ہے کہ فرض ادا کر چکا ہے نفل کیلئے اپنے روپیہ سے جا سکتا ہے۔ اس کیلئے اپنے روپیہ سے حج کرنا افضل یا دوسرے کے پیسے سے حج بدل کرنا۔

س : اب تو حجاز میں بھی بغیر تصویر کے پاسپورٹ کہیں نہیں ملتا۔ پس کوئی شخص محض سیاحت کیلئے مصر جائے یا زیارت کیلئے مسجد اقصیٰ تو اس کو تصویر کھنچوانا جائز ہے یا نہیں۔

س : اشتہار میں ایک کتاب کی قیمت شائع کر دینے کے باوجود کیا مالک کو اختیار ہے کہ اس کتاب کی قیمت کسی سے زائد لے۔

ع۹ : غیر کیلئے غائبانہ سلام پہنچانا مثلاً کسی کا کہنا کہ مدینہ منورہ جاؤ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہو کر میرا سلام عرض کرنا۔ جائز ہے یا نہیں۔

ع۱۰ : سفر میں شیخ کے مزار پر حاضری کی نیت شامل کرنا صحیح ہے یا نہیں فقط۔

## جوابات

ع۱ : نقدی زیور کی زکوٰۃ روپیوں سے دی جائے تو دوسری جنس بھی ملا دی جائے تو صحیح ہے۔

ع۲ : نہیں بے ادبی کچھ نہیں بلکہ گھر میں برکت ہوگی۔ البتہ پاخانہ کے مقام پر نہ لگائیں۔

ع۳ : چھاپنے میں تو گنجائش ہے جب تصویر صغیر ہو۔ البتہ کتابت یا فوٹو لینا جائز نہیں کہ تصویر میں داخل ہے۔

ع۴ : اگر ادخال اصبع سے خون جاری ہو جائے تو حیض ہوگا۔ اگر دس دن کے اندر ہو اگر دس دن سے زیادہ ہو جائے تو استحاضہ ہے۔

ع۵ : جس قدر ثلث میں نکلا ہے اس کو الگ حج بدل کرنے والا محفوظ رکھے اور مکہ سے عرفات تک آمد و رفت اسی میں سے کرے۔ اس کا حکم تو حج فرض کا حکم ہے۔ باقی کا حکم تبرع کا حکم ہے۔ اس لئے مامور کو تمتع یا قران کی اجازت وارث نہیں دے سکتا۔ اگر باپ یہاں سے کسی کو نہ بھیجتا تو یہ واجب ہوتا کہ پچاس میں جہاں سے حج ہو سکے وہاں سے کرایا جائے۔ اور اس کا حکم بھی حج فرض کا ہوگا۔ اگر باپ یہاں سے بھیج دے یہ ادا چاہئے کہ اس میں میت کا حج بلا اختلاف ادا ہو جائے گا۔ رہا روپیہ لینے کیلئے میت کے وطن جانا تو اس میں احوط یہی ہے کہ مامور جب گھر سے بالکل جدا ہونا چاہے اس وقت آمر کے وطن جائے اور وہیں سے انشائے سفر کرے اور گنجائش صورت مسئولہ میں اس کی بھی ہے۔ کہ میت کے وطن سے انشاء سفر اس طرح کرے کہ اثناء سفر میں اپنے وطن سے دور تک بھی اجازت ہے۔

ع۶ : حج بدل کا ثواب اپنے حج سے سات گنا زیادہ ہے۔

---

ــہ مگر ادخال اصبع اس غرض کیلئے مکروہ ہے ۱۲ منہ

کما روی عن ابن عباس رضؓ وعلله بکون نفعه متعدیا او غیرها۔[۱۸۶]
مگر شرط یہ ہے کہ حقوق العباد میں گرفتار ہونے کا اندیشہ نہ ہو جس کی بہتر صورت یہ ہے کہ وارث میت سے اس مال کی اباحت حاصل کرے اذا لم یکن فیہم صغیراً او کان ولم یحجبوه بحصته کہ یہ مال سفر حج بدل کیلئے بطور اباحت کے تمھاری ملک کر دیا گیا ہے کہ جس قدر تم سفر میں خرچ کرتے جاؤ گے وہ تمھاری ملک ہوجائے گا۔ اور تملیک بطور اباحت مبطل حج بدل نہیں ہے۔ کیونکہ انفاق سے پہلے وہ رقم ملک آمر ہے۔ اور بعد انفاق کے وہ ملک مامور ہوگا فلا باس بہ اس صورت میں مامور پر بھی حق العبد کا مطالبہ بالکل نہ ہوگا۔ اور بلا اندیشہ حق العباد کی حالت میں اپنی ہی رقم سے حج کرنا اولیٰ ہے۔

ع۷: معمولی ضرورت مجوز تصویر کشی نہیں ہوسکتی۔

ع۸: ہاں جائز تو ہے مگر خریدار سے اس امر کو ظاہر کر دیا جائے کہ قیمت مشتہرہ سے زائد لے رہا ہوں۔ تاکہ وہ بائع سے بدظنی نہ کرے۔ کہ مجھکو ناواقف جان کر زیادہ دام لے لیئے۔ وفی الحدیث اتقوا مواضع التہم۔

ع۹: غیر نبی کو خطاب کر کے سلام نہ بھیجا جائے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے عرض کرے کہ اللھم بلغ روح شیخنا ھذا سلاماً من خادمہ فلان۔

ع۱۰: ہاں کچھ حرج نہیں۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ. والسلام مسك الختام۔ واللہ اعلم۔

۲۲ رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ

السوال: زید تعزیہ بناتا تھا اگر اس کے سامان تعزیہ میراث میں مل جائے تو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے ورثاء نے ترک کر دیا لیکن پہلے کے بعض سامانوں کو کسی حیلے سے کیا بلکہ ورثاء کے ایماء سے اس جگہ کے دوسرے تعزیہ داروں نے لے لیا اور ہمیشہ اس کو کام میں لایا کرتے ہیں ایسی صورت زید کے مورث پر اس کا گناہ بھی ہوگا یا نہیں۔ ان چیزوں کے لینے میں مقدمہ فوجداری

کا بھی احتمال ہے اس حالت میں ورثاء کو کیا کرنا چاہئے۔

## الجواب

یہ سامان تعزیہ بھی زید کی ملک تھا اس لئے اس کے سب ورثاء میں اس کی تقسیم کے بعد نقد قیمت کی تقسیم لازم تھی اگر بالغ وارثوں نے یہ سامان دوسرے کو دیدیا ہے اور اس میں نابالغوں کا بھی حق تھا تو نابالغوں کے حق کا ادا کرنا بالغوں کے ذمہ ہے اور سب ورثاء پر لازم تھا کہ اس سامان کو تعزیہ داری کے کام میں نہ خود لاتے اور نہ دوسروں کو اس کام کے واسطے دیتے۔ دوسروں کو تعزیہ بنانے کیلئے دینے کا گناہ تو زید کو نہیں ہوا۔ اگر اس نے وصیت نہ کی تھی۔ ہاں بالغ ورثاء کو ہوا پس اگر وہ واپس لے سکیں لے لیں۔ ورنہ اس گناہ سے توبہ واستغفار کریں۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون۔ ۲۳ ذی قعدہ ۵۲ھ

باپ بیٹے کو کس طرح پکارے **السوال**:۔ فقیر کے تین لڑکے ہیں مثلاً میں بلاتے وقت بڑا میاں۔ منجھا میاں، چھوٹا میاں کرکے بلاؤں یا اس کا نام لیکر عبداللہ وجیہ اللہ، محفوظ اللہ مثلاً خاص نام سے پکاروں۔ غرض صحیح بلانے کے دستور مطلوب ہیں۔ نیز بڑا مولوی۔ منجھا مولوی، چھوٹا مولوی۔

ک:۔ میاں کا لفظ ہمارے دیار میں اکثر نام کے پیچھے ہمارے لوگ استعمال کرتے ہیں یہ خلاف سنت ہے یا نہیں۔ عرضگذار

محمد ابراهیم۔ مدرس مدرسہ محمدیہ

## الجواب

باپ کو جائز ہے کہ لڑکے کو نام لیکر پکارے۔ یا بڑا میاں، چھوٹا میاں کرکے پکارے، اور میاں کا لفظ لگا دینا سنت کے خلاف بایں معنی نہیں کہ ممنوع نہیں۔ باقی سنت سے اس کا ثبوت بھی نہیں۔ غرض باپ بیٹے کو اس طرح پکارے کہ جس میں نہ اس کی تعظیم ہو اور نہ تذلیل ہو۔ نام لیکر پکارنے میں کچھ تذلیل نہیں ہاں تعظیم بھی نہیں۔ مگر باپ کے ذمہ اولاد کی تعظیم نہیں بلکہ اولاد کے ذمہ اس کی تعظیم ہے

البتہ اگر ولد عالم ہو اور باپ جاہل ہو تو اس صورت میں بھی باپ کے ذمہ اولاد کی تعظیم واجب نہیں مگر علم کا ادب بہتر ہے۔ واللہ اعلم

احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون۔ ۳۰ ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ

**پلیٹ فارم لئے بغیر اسٹیشن کے اندر جانا**

**السوال:۔** ریل گاڑی آنے کے وقت پلیٹ فارم پر جانے کیلئے ایک آنہ کا ٹکٹ لیکر جانے کا قانون ہے۔ اگر کوئی شخص بلا ٹکٹ پلیٹ فارم پر جاوے تو یہ درست ہے یا نہیں۔

## الجواب

اسٹیشن بابو سے دریافت کر کے جاوے تو جائز ہے۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۰ر محرم ۱۳۴۹ھ

ہندوؤں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اگر ہمارے بری چلنے کی کوشش کرو تو ہم تمہیں مسجد کیلئے زمین دیدیں گے اور بطور اطمینان چار سو روپیہ کی تحریر دیدی کہ بوقت انکار ہم سے وصول کر لو۔ مقدمہ میں مسلمانوں کی سعی سے بری ہونے کے بعد ہندو لوگ زمین دینے سے انکار کر دیں تو یہ روپیہ مسلمانوں کیلئے لینا جائز ہے یا نہیں؟

**السوال:۔** ایک موضع ضلع مظفر نگر میں ایک چبوترہ خام تھا۔ جس پر مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے مسلمانوں نے اس چبوترہ کو پختہ مسجد بنانا چاہا مگر زمینداروں نے جو غیر مسلم تھے مسلمانوں کے ساتھ مقدمہ لڑایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو تعمیر مسجد کی اس چبوترہ پر نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اور وہ چبوترہ غیر مسلموں نے توڑ دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اسی موضع میں ایک قطع زمین ایک غیر مسلم سے چار روپیہ میں خرید کیا۔ مسلمانوں نے اس اراضی پر تعمیر مسجد شروع کر دی۔ اس اراضی کے بائع کا ایک لڑکا تھا۔ دوسرے غیر مسلم باشندگان موضع نے اس لڑکے بہکا کر اس مضمون کا عدالت میں دعویٰ دائر کرا دیا کہ یہ اراضی ہمارا جدی ہے میرے باپ کو اس کی بیع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ (اصل ہنود میں اگر ایک شخص مرجائے تو اس کی اولاد ذکور اور اولاد ذکور کی اولاد ذکور کو وراثت

ایک دم ملتی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مقدمہ ہار گئے اور بیعنامہ منسوخ ہوگیا اور مسلمانوں پر مرجہ اور خرچہ کی ڈگری ہوگئی اس لڑکے نے یہ روپیہ مسلمانوں سے وصول کرلیا اس کے بعد مسلمان بالکل مجبور ہوگئے ۔ اتفاقاً باشندگان غیر مسلم اس موضع میں دو فریق ہوگئے اور آپس میں مقدمات فوجداری چل گئے ۔ ایک فریق کے آٹھ آدمیوں کو سزا ہونے کو تھی انہوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ تم کوشش ہمارے بری ہوجانے کی کرو تو ہم تمہیں زمین مسجد کے واسطے دیدیں گے ۔ اور تم اگر ہم سے مطمئن نہ ہو تو ایک رقعہ چار سو روپیہ کا ہم تم مسلمانوں کو تحریر کرکے حوالہ کرتے ہیں ۔ اگر ہم اس وعدہ سے پھر جائیں تو تم چار سو روپیہ ہم سے وصول کرلو ۔ چنانچہ مسلمانوں نے کوشش کی وہ لوگ بری ہوگئے ۔ اور اس کوشش میں مسلمانوں کے ستر روپے خرچ میں آئے ۔ اس کے بعد جب مسلمانوں نے ان لوگوں کو ایفاء عہد کا کہا تو انہوں نے انکار کردیا اور سب باشندگان جن میں یہ تنازع ہوا تھا سب متفق ہوگئے ۔ اور جس فریق نے یہ رقعہ تحریر کیا تھا یہ فریق ان میں سے نہیں ہے جس نے پہلے زمین مسلمانوں کو چار سو روپے میں فروخت کی تھی ۔ اور یہ روپیہ بھی مسلمانوں کا وصول نہیں ہوا ۔ خلاصہ یہ کہ رقعہ کا روپیہ مسلمان وصول کرسکتے ہیں یا نہیں ۔ اور اس لڑکے نے جس نے مسلمانوں سے مقدمہ لڑایا تھا اس میں تمام باشندگان غیر مسلم نے چندہ دیا تھا ۔

## الجواب صحیح

قال فی الخلاصة عن النوازل ، رجل قال لدلال بع ضیعتی علی ان لک من الاجر کذا فلم یقدر هو علی الاتمام فباعها دلال آخر لیس للاول شیء وبه اخذ الفقیه ابو اللیث قال فی المحیط ؛ والاستحسان وعلیه الفتوی ۔ وفی النوادر ابن سماعه : رجل ضل [illegible] شیئ فقال للانسان بعینه ان دللتنی علیه فلک درهم فان دله من غیر مشی معه لا یستحق الاجر وان مشی معه فله اجر مثله ۔

رجل بیع شیئاً فی السوق فاستعان من اهل السوق فاعانه

عليه ثم طلب منه الاجر المعتبر فى ذلك عادة بل السوق فان كانوا
لا يعملون الا باجر يجب اجر المثل ، وان كانوا يعملون فى مثل
ذلك بغير الاجر لا شئ عليه قلت : انما ورد فى الجواب لعرض
المسئلة فيما اذا استعان ولم يبين الاجر ج ۳ ، ص ۱۲۶

رجل دفع جاريته مريضة الى طبيب وقال له عالجها بمالك
وما يزداد قيمتها بالصحة فالزيادة لك فبرأت يجب اجر المثل
وثمن الادوية والنفقة والكسوة ان اعطاها اهـ ج ۳ ، ص ۱۲۹

قلت هذا كله من باب الاستيجار على العمل والاستصناع
ويقال له الجعالة وللاجر الجعل فى عرف اهل الحجاز قال
الموفق فى المغنى : ان الجعالة فى رد الضالة والآبق وغيرهما
(كخياطة الثوب وبناء الحائط ومداواة المريض وبيع الضيعة
والوكالة بالخصومة ونحوها) جائزة وهذا قول ابى حنيفة
ومالك والشافعى ولا نعلم فيه مخالفاً . والاصل فى ذلك قول
الله عز وجل ولمن جاء به حمل بعير وانا به زعيم . وروى
ابو سعيد : ان رجلا من الصحابة رقى لابقا من احياء العرب على
قطيع شياه رضى به النبي ﷺ ولان الحاجة تدعو الى ذلك فان
العمل قد يكون مجهولاً كرد الآبق والضالة ونحو ذلك . ولا
تنعقد الاجارة فيه والحاجة داعية الى ردهما وقد لا يجد
من يتبرع به فدعت الحاجة الى اباحة بذل الجعل فيه مع
جهالة العمل لانها اى الجعالة غير لازمة لكل واحد منهما
الرجوع فيه قبل حصول العمل لكن ان رجع الجاعل قبل التلبس
بالعمل فلا شئ عليه وان رجع بعد التلبس به فيه فللعامل اجرة
مثله لانه انما عمل بعوض وان فسخ العامل قبل اتمام العمل
فلا شئ له لانه اسقط حق نفسه ويصير كعامل المضاربة اذا
فسخ قبل ظهور الربح »

بخلاف الاجارة الا ترى ان الاجارة لما كانت لازمة افتقرت الى تقدير مدة والعقود الجائزة كالشركة والوكالة لا يجب تقدير مدتها ولان الجائزة من العقود لكل واحد منهما تركها فلا يؤدي الى ان يلزمه مجهول عنده بخلاف اللازمة قال ولا بد ان يكون العوض معلوما لان الحاجة تدعو الى كون العمل مجهولا ولا حاجة الى جهالة العوض ولان العمل لا يصير لازما فلم يجب كونه معلوما والعوض يصير لازما باتمام العمل فوجب كونه معلوما قالوا اذا جعل الامير جعلا لمن يدله على       او طريق سهل وكان الجعل من مال الكفار جاز ان يكون مجهولا كجارية بعينها للعامل اه ملخصا ج ۶ ص ۳۵۰ - ۳۵۱

وبالجملة فقد اتفقوا على جواز الاستيجار على العمل مع جهالته وفرقوا بين الجعالة والاجارة وفي الصورة المسئولة لم يرض المسلمون بالعمل مجانا وانما بذلوا جهدهم واموالهم لاستخلاص القوم على جعل معلوم فالعقد صحيح ويجب على القوم الاجر المسمى ويجوز للمسلمين اخذه منهم والله تعالى اعلم

| صح الجواب | حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ |
| --- | --- |
| اشرف علی ۲۵ ج ۱ ۱۳۵۵ھ | ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ |

# النفع المبرزة

## فی تحقیق قطع الشجرۃ

شجرۃ الرضوان کے بارے میں اخبار منادی دہلی میں شائع شدہ ایک مضمون کے جواب میں۔

## الجواب المجمل

شجرۃ الرضوان کے متعلق طبقات ابن سعد میں جو نافع کا ایک اثر وارد ہے

قال کان الناس یأتون الشجرۃ التی یقال لہا شجرۃ الرضوان فیصلون عندہا قال فبلغ ذلک عمر بن الخطاب فاوعدہم فیہا وامر بہا فقطعت اھ

اس سے بعض علماء نے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ جب حضرت عمر نے اس متبرک درخت کو خوف فتنہ کی وجہ سے کہ عوام اس درخت کی تعظیم میں حد سے بڑھنے لگیں گے کٹوا دیا تو ان مآثر و مزارات اور قبوں کو کیوں نہ ڈھایا اور مٹایا جائے جو اصل سے ہی خلاف شرع بنائے گئے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے اور ان پر عمارت بنانے سے منع فرمایا۔ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تجصیص القبور وان یکتب علیہا وان یبنی علیہا۔ رواہ مسلم وابو داؤد وترمذی وزاد ان توطا مراقی الفلاح والطحاوی ص۳۵۱۔ ولعن اللہ الیہود والنصاری اتخذوا قبور انبیائہم مساجد۔ متفق علیہ۔

اور بعض مآثر تو بالکل ہی مخترع ہیں۔ تاریخ صحیح اور حدیث معتبر سے ان کی کچھ اصل نہیں ملتی۔ گو فی نفسہٖ کچھ اصل ہو۔ مگر اُن کی وجہ سے عوام میں فتنے برپا ہو رہے ہیں۔ کہ اُن پر مجاور رہنے لگے اور اس پر غلاف اور نذریں

---

سے سئل ابو عبد اللہ (احمد بن حنبل) عن الرجل یأتی ھذہ (باقی صفحہ ۔۔۔ پر

چڑھاتے حالانکہ ابوداؤد کی حدیث میں جس کی اسناد حسن ہیں لا تتخذوا قبری عیداً۔ اور بعض طرق میں لا تتخذوا قبری و بیتی عیداً بھی ہے۔ جو کثرت مخارج کی وجہ درجہ حسن میں ہے ملاحظہ ہو اقتضاء صراط المستقیم ص۱۵۴، ص۱۵۵۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان و قبر کو عید بنانا ممنوع ہے تو دوسرے مآثر کا حکم اس سے ظاہر ہے۔ پس ان علماء کا مقصود کچھ اثر نافع پر موقوف نہیں تھا کیونکہ انہوں نے ان شرکیات و بدعات کی تردید میں آیات الہیہ اور صحیح احادیث صحیحہ و اقوال ائمہ اربعہ سے استدلال کیا ہے اور محض تائید کے درجہ میں اثر نافع کو بھی بیان کر دیا ہے۔ مگر بعض مضمون نگاروں نے ایک رئیس المبتدعین کے اخبار میں تمام دلائل کو چھوڑ کر اور آیات الہیہ و احادیث صحیحہ و اقوال ائمہ اربعہ سے منہ موڑ کر صرف اثر نافع کی تردید پر سارا زور ختم کر دیا۔ اور ان لوگوں کو جو اس اثر کو محض تائید کے درجہ میں پیش کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناپاک اتہام لگانے والا اور ملاحدہ و جہال کا لقب دیا اور یہ کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے وسیع الخیال و حکیم امت کو پست خیال ثابت کرنے کی کوشش کرتے اور اُن کے دامن عدل پر دھبہ لگاتے ہیں۔

گو مضمون نگار نے ظاہر میں اپنا مخاطب فرقہ نجدیہ یا سرداران نجد یا جماعت غیر مقلدین کو بنایا ہے مگر درحقیقت اس میں علماء حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ اور حضرات محدثین بالخصوص اثر کے راوی حضرت نافع اور ان کے بعد والے رواۃ سب کو ملحد و جہال کا لقب دیا ہے۔ اور سب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناپاک اتہام لگانے کا مجرم بنایا ہے۔ کیونکہ نافع کے اس اثر کو محض نجدیوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) المشاهد التی بالمدینة وغیرها بدعة، لیس فی شیء ذلک قال علی حدیث ابن ام مکتوم انه سأل النبی صلی اللہ علیه ان یصلی فی بیته حتی یتخذ ذلک مصلی وعلی ما کان یفعله ابن عمر یتتبع مواضع النبی صلی اللہ علیه وسلم واثره فلیس بذلک بأس أن یأتی لاجل المشاهد الا ان الناس قد افرطوا فی هذا جدا واکثروا فیه اھ (من الاقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیه ص۱۸۳)

دل قوله الا ان الناس قد شرطوا الخ علی المنع منه اذا ترتب علیه فتنة ۱۲۔

سرداران نجدیہ پیش نہیں کرتے بلکہ جملہ مذاہب اربعہ کے علماء اور محدثین نے اس کو پیش کیا اور نقل کیا ہے اور صحیح مانا ہے۔

علماء شافعیہ میں سے خاتمۃ الحفاظ المحدثین حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس اثر کو نقل کرتے ہوئے اس کی تصحیح کی ہے۔ قال ثم وجدت ابن سعد باسناد صحیح عن نافع ان عمر بلغہ ان قوما یاتون الشجرۃ الخ (ملاحظہ ہو ص۳۴۸)

اور علماء حنفیہ میں سے خاتمۃ المحققین علامہ عینی نے شرح بخاری میں اس اثر کو نقل کرتے ہوئے صحیح مانا ہے۔ قال وفی روایۃ ابن سعد باسناد صحیح عن نافع ان عمر بلغہ الخ (ج ۲ ص ۲۸۴)

اور علماء مالکیہ میں سے امام محمد بن وضاح نے جو حافظ حدیث ہونے کے علاوہ محدث الاندلس کے لقب سے ممتاز ہیں۔ اپنی کتاب میں سند صحیح سے اس اثر کو بیان فرمایا ہے ملاحظہ ہو (اغاثۃ اللھفان لابن القیم ص۲۱۱)

اور علماء حنابلہ میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ حرانی اور حافظ ابن القیم نے اس اثر کو بیان کر کے اس سے احتجاج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب اقتضاء الصراط المستقیم ص۱۵۱ لابن تیمیہ۔

اور اغاثۃ اللھفان لابن القیم ص۔۔۔ مذکور۔

پس اگر اس اثر کو بیان کرنا اور اس کو صحیح ماننا اور اس کو استدلال میں پیش کرنا الحاد اور جہل ہے۔ اور حضرت عمرؓ پر ناپاک اتہام لگانا اور ان کے دامن عدل پر دھبہ لگانا ہے۔ تو اس کے مجرم صرف جماعت نجدیہ یا سرداران نجدیہ ہی نہیں بلکہ ایک طرف سے تمام اھل سنت والجماعت اور جملہ مذاہب اربعہ اس جرم کے مرتکب ہوں گے نعوذ باللہ منہ۔

کیونکہ اس مبتدع مضمون نگار کے اس مضمون سے تمام اھل سنت کے دامن عصمت پر ایک غلیظ الزام اور بدنما داغ لگتا تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ مختصراً اس کا جواب دیدیا جائے۔ تاکہ عوام غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

مضمون نگار نے اولاً بخاری کی روایات سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ درخت بیعت رضوان کے اگلے ہی سال تمام صحابہ کی نظروں سے غائب ہوگیا تھا

اور اس کیلئے حضرت عبد اللہ بن عمر کا قول رجعنا من العام المقبل فی اجتمع منا اثنان علی الشجرة التی بایعنا تحتہا کانت رحمۃ. اھ

اور حضرت مسیب بن حزن کے قول فلما خرجنا من العام المقبل نسیناھا فلم نقدر علیہا سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ صیغہ جمع متکلم کا استعمال عموم کو بتلاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عدم عرفانِ شجرہ اور اس کو بھول جانا فقط عبد اللہ بن عمر۔ و مسیب بن الحزن کیلئے خاص نہ تھا۔

مگر اس سے کوئی پوچھے کہ صیغہ جمع متکلم کا عموم پر دلالت کرنا یہ کون سا قاعدہ معانی و اصول سے ثابت ہے۔ صیغہ جمع متکلم حقیقت کے اعتبار سے ایک سے زائد پر دلالت کرتا ہے کیونکہ عربی زبان میں دو کے واسطے بھی جمع متکلم کا صیغہ ہی وضع کیا گیا ہے۔ جو میزان پڑھنے والے بھی جانتے ہیں۔

پس مسیب بن الحزن کے قول میں دو سے زیادہ پر دلالت کی کوئی دلیل بیان کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے کلام میں کوئی قرینہ ارادۂ تثنیہ یا جمع پر قائم نہیں بلکہ قتادہ کی روایت میں مسیبؓ کا قول نسیناھا فلم اعرفہا یہ بتلاتا ہے کہ وہاں جمع سے واحد ہی مراد ہے۔ کیونکہ مجازاً کبھی واحد کو بھی جمع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے قرآن میں جا بجا حق تعالیٰ نے اپنے لیے صیغہ جمع ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہ محاورہ ہر زبان میں شائع ہے۔

پس مضمون نگار کو اس مجاز کے مراد نہ ہونے پر بھی دلیل قائم کرنا چاہیئے جس کا قرینہ دوسری روایت میں موجود ہے اور ابن عمرؓ کے قول میں ارادہ معنی جمع پر گو قرینہ ہے۔ مگر اس میں بھی عموم و استغراق پر کوئی دلیل نہیں۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ تمام صحابہ اس درخت کو بھول گئے اور اس کی تعیین سے عاجز تھے۔ پھر ابن عمرؓ اور مسیبؓ کے قول سے آپ کا عدم عرفان و نسیان ہی مفہوم ہوتا ہے۔ نظروں سے گم ہو جانا جس سے غیبی طور پر اس کا اخفاء و ارتفاع مفہوم ہو رہا ہے کس لفظ سے سمجھا گیا۔ کیا کسی چیز کو نہ پہچاننا اور بھول جانا اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ نظروں سے گم ہو جائے۔ ہرگز نہیں۔

اگر مضمون نگار اس بات کا مدعی ہے تو دلیل قائم کرے اور اگر اس نے

اس روایت کے تمام طرق کو جمع کیا ہوتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت مسیب رضی اللہ عنہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ درخت ہی اصل سے مخفی و غائب ہو گیا۔ بلکہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ وہ درخت موجود تھا مگر ہم کو اس کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا۔ چنانچہ عثمان کی روایت میں حضرت مسیب رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں فعمی علینا مکانہا۔

(فتح الباری فی شرح البخاری۔ ج ۷، ص ۳۴۲)

اور حضرت عبد اللہ بن عمر کے الفاظ تو بہت صاف ہیں کہ وہ تو اتنا ہی فرماتے ہیں کہ ہم میں سے دو آدمی بھی اس درخت پر اتفاق نہ کر سکے۔ جس سے صراحۃً یہی معلوم ہو رہا ہے کہ وہ صرف اپنا تعیین نہ کر سکنا بتلا رہے ہیں۔ نہ کہ درخت نظروں سے غائب اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مضمون نگار نے حضرت مسیب رضی اللہ عنہ کے قول إن اصحاب محمد لم یعلموها وعلمتموها فانتم اعلم سے استدلال کیا ہے۔ کہ جمع مضاف بقاعدۂ معانی و اصول مفید استغراق ہے پس حاصل یہ ہوا کہ عموماً اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے یہ درخت علی سبیل التعیین غائب ہو گیا تھا۔ اس مضمون نگار نے جمع مضاف کے مفید استغراق ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اور اس کو قاعدۂ معانی و اصول بتلایا ہے۔ مگر اس سے کوئی پوچھے کہ یہ قاعدہ کہاں لکھا ہے ذرا وہ عبارت کتاب مع حوالہ صفحہ و باب نقل کرے پھر یہ بھی ثابت کرے کہ جمع معرف باللام یا جمع مضاف کا استغراق کیلئے ہونا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ یا مختلف فیہ اگر اس نے نور الانوار ہی پڑھی ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ عموم کیلئے استغراق کا لازم ہونا مختلف فیہ ہے چنانچہ فخر اسلام عموم استغراق کو شرط نہیں کرتے اور اہل معانی نے جمع معرف باللام کا مفید استغراق ہونا ضرور بیان کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کی دو قسمیں بھی کی ہیں۔ استغراق حقیقی اور استغراق عرفی اور استغراق

پس اس لفظ سے بھی کسی طرح مضمون نگار یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ صحابہ اس درخت کو بھول گئے اور اس کے پہچاننے سے عاجز تھے اور اس کا غائب ہوجانا تو کسی لفظ سے بھی مفہوم نہیں ہوتا اور یہ ایسی بات ہے جس کا غلط ہونا خود مضمون نگار کے ضمیر کو معلوم ہے مگر وہ دیدہ و دانستہ سعید بن المسیبؒ کے قول میں اصحاب محمدؐ کو استغراق حقیقی پر محمول کرنے کی غلط کوشش کررہا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بخاری میں حضرت جابرؓ کا یہ قول بھی موجود ہے۔ لو کنت ابصر الیوم لاریتکم مکان الشجرۃ۔ اگر میں آج بینا ہوتا تو تمہیں درخت کی جگہ بتلا دیتا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ کو مکانِ شجرہ کا علی سبیل التعین علم تھا۔ اور جب وہ درخت غیبی طور پر دنیا سے اٹھایا نہیں گیا تو یقیناً جب تک وہ اپنی جگہ پر قائم رہا اس وقت تک وہ درخت کو پہچانتے تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ تمام صحابہ اس درخت کو اور اس کی جگہ کو نہ بھولے تھے

مگر مضمون نگار دیدہ و دانستہ اس حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور نہایت جرأت سے کہتا ہے کہ حضرت جابرؓ نے مکان الشجرہ فرمایا ہے بعینہ الشجرہ نہ فرمایا۔ جبکہ ظاہر ہے کہ اصل درخت کی شناخت اور ہے اور اس جگہ کی پہچان اور ہے الخ۔

جس شخص کے سر میں دماغ اور دماغ میں شعور ہے وہ جانتا ہے کہ جو شخص کسی درخت کو یا کسی مکان کی جگہ کو پہچانتا ہوگا وہ یقیناً اس درخت اور مکان کے بقاء تک کو پہچانے گا اور مکان بھی ضرور پہچان لے گا۔

اور یہی وہ بات ہے جس کو حافظ ابن حجرؒ نے حضرت جابرؓ کے قول سے سمجھا ہے۔
مگر مضمون نگار حافظؒ کی سیدھی اور صحیح بات کو ایک احتمالِ رقیق کہہ کر اڑا
دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور محض مکابرہ

اس کا جواب اوپر کی تقریر سے ناظرین نے سمجھ لیا ہوگا کہ ان حضرات کے اقوال
سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ درخت نگاہوں سے غائب اور آنکھوں سے
اوجھل ہو گیا تھا۔ بلکہ وہ صرف اپنا نہ پہچاننا اور جگہ کا یاد نہ رہنا اور اس
درخت کا دوسرے درختوں سے مشتبہ ہونا بتلاتے ہیں۔ اس سے یہ سمجھنا کہ
کرامت کے طور پر درخت دنیا سے اٹھا لیا گیا یا آنکھوں سے غائب اور اوجھل
کر دیا گیا محض مضمون نگار کا خیال آفرینی ہے۔ اور اپنی طرف سے ایک نئی
بات کا اختراع ہے۔

حضرات صحابہ نے ہرگز ان باتوں کا دعویٰ نہیں کیا تھا اگر کسی کو دعویٰ
ہے تو اس پر صریح دلیل قائم کرے۔ جب تک اس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو اس
وقت تک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی بات کا رد کرنا آفتاب پر تھوکا اپنے منہ پہ
لینا ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ بعض صحابہ اس درخت کو اور اس کے تباہ ہونے کے
بعد اس کی جگہ کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

اب تو بخاری کی روایت سے یہ ثابت ہو گیا کہ سعید بن المسیبؒ کے قول
میں اصحاب محمد میں جمع مضاف عموم اور استغراق کیلئے نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو
اصحاب عرفی مراد ہے نہ کہ حقیقی۔ اس کے بعد مضمون نگار کہتا ہے کہ اگر حضرت
جابرؓ کی روایت کو عبداللہ بن عمر اور مسیبؓ کی روایت سے تعارض ہوتا بھی تو حضرت

عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کو بہر صورت ترجیح و تقدیم ہوتی۔ اس لیئے کہ وہ آثارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت جویان تھے اور اُن مقامات کی حضوری سے برکت حاصل کرتے تھے۔ الخ

مگر یہ ایسی بات ہے جو اسی شخص کی زبان سے نکل سکتی ہے جس کو علم سے ذرا مس نہ ہو کیونکہ سب حدیث پڑھنے والے اس قاعدہ کو جانتے ہیں کہ جاننے والا نہ جاننے والے پر مقدم ہے اور مثبت نافی پر مقدم ہے۔ پس اس قاعدہ سے حضرت جابرؓ کے قول کو ترجیح ہے۔ اور جو وجہ ترجیح مضمون نگار نے بیان کی ہے اس کو علماء حدیث و فقہ نے اسبابِ ترجیح میں شمار نہیں کیا۔ دوسرے یہ مانا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ آثارِ رسول اللہ کے بہت جویان تھے مگر حدیث پڑھنے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صغارِ صحابہ میں یعنی کمسن اور تھوڑی عمر والے تھے۔ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کا علم بلا واسطہ کم ہوتا تھا۔ وہ بہت سے آثار کو اجل صحابہ کرام سے دریافت کر کے معلوم کرتے تھے۔

چنانچہ دخولِ بیت اللہ اور اس میں نماز پڑھنے کی کیفیت ابن عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے معلوم کی۔ (بخاری جلد ۱، ص ۲۱۶)

اسی طرح قباء میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور وہاں کی مسجد میں آپ نے نماز پڑھی اور انصار حالتِ نماز میں آپ کو سلام کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ سے اُن کو جواب دیتے تھے۔ یہ کیفیت بھی اُن کو حضرت بلال سے معلوم ہوئی تھی۔ (ابو داؤد ج ۲، ص ۹۰)

پھر باوجود اس قدر تتبع آثار کے عبداللہ بن عمر بعض دفعہ کسی بات کو بھول بھی جاتے تھے چنانچہ بخاری میں موجود ہے کہ ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمرہ ماہ رجب میں بیان کیا جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انکار فرمایا اور کہا کہ عبداللہ بن عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر عمرہ میں تھے لیکن رجب میں آپ نے کوئی عمرہ نہیں فرمایا۔ (بخاری ج ۱، ص ۲۳۹)

کیا بعید ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر شجرۂ رضوان کو بھی بھول گئے ہوں

پھر کیا وجہ ہے کہ اُن کی نسیان وعدم معرفت کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علم ومعرفت پر ترجیح دی جائے۔ یہ نیا طریقہ ترجیح مضمون نگار کے دماغ نے ایجاد کیا ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے عمدۃ القاری کی عبارت کا حوالہ دیکر کہا ہے کہ علامہ عینی محدث نے بھی اس درخت کا بعید استتار واخفاء کا ذکر کیا ہے جیسا کہ ہم نے عبارت نقل سے سمجھا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ عینی محدث نے اس کے باوجود اثر نافع کو بھی صحیح کہا ہے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اور اس اثر کو قول ابن عمر و مسیب وسعید کے خلاف سمجھ کر رد نہیں کیا جیسا مضمون نگار نے کیا ہے۔ اور نہ اس کو حضرت عمر پر ناپاک اتہام کہا نہ اس کے راویوں اور ماننے والوں کو ملاحدہ وجہال کہا۔ لیکن مضمون نگار کے نزدیک اس اثر کو ماننے والے اور پیش کرنے والے سب ملاحدہ وجہال ہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناپاک اتہام لگانے والے جن میں خود علامہ عینی محدث بھی داخل ہوگئے۔ اول تو مضمون نگار اس الزام سے علامہ عینی محدث کو بری کرے اور اپنے خود ساختہ جرم کو اُن پر سے دفع کرے پھر ہم بھی اُن کے قول کا مطلب حل کر دیں گے۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتاوی کا حوالہ دیا گیا ہے۔ کیا انہوں نے اس میں یہی فرمایا ہے اور حافظ ابن حجر کی اس دقیق توجیہ پر نہایت تعجب فرمایا اس کے متعلق اولاً صحیح سند کا مطالبہ ہے کہ مضمون نگار سند صحیح متصل اس فتاوی مطبوعہ کا شاہ صاحب کا فتاوی ہونا ثابت کرے اور بتلائے کہ اس کو شاہ صاحب نے جمع کیا ہے یا کسی اور نے اور جامع ثقہ ہیں یا نہیں اور آجکل کے مطابع کا کسی کتاب کو طبع کرکے کسی کے طرف منسوب کر دینا حجت نہیں۔ اس فتاوی کو جس کسی عالم نے بھی دیکھا ہوگا وہ جانتا ہوگا کہ اس میں کس قدر رطب ویابس کو بھرا گیا ہے۔ اور اگر بالفرض یہ فتاوی شاہ صاحب کا ہی ہے تو اب حافظ ابن حجر اور شاہ صاحب کی جلالت شان کا موازنہ کرکے اہل علم سے فیصلہ کروا لیا جائے کہ حدیث کے علم میں حافظ کا مرتبہ عالی ہے یا شاہ صاحب کا۔ پس یہ دلیل بھی لغو ہوئی۔

اس کے بعد مضمون نگار بہت جرأت سے دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا شجرۂ رضوان کو کٹوا دینا بالکل بے سروپا افسانہ ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ بخاری کی روایتِ صحیح کے خلاف ہے اس سے تو اس کا اخفاء و استتار ثابت ہوتا ہے، پھر قطع و برید کے کیا معنی ہونگے۔ الخ

اس کا جواب ہماری تقریر بالا سے بالکل ظاہر ہو چکا ہے کہ یہ روایت صحیح بخاری سے درخت کا نظروں سے اوجھل ہو جانا اور غائب ہو جانا اور نہ پہچان سکنا اور جگہ میں اشتباہ ہو جانا ثابت ہے۔ اور قول سعید بن المسیب کو استغراق عرفی پر محمول کیا جائے تو بہت سے بہت مدینہ کے اکثر صحابہ کا بھول جانا اور نہ پہچاننا ثابت ہو جائے گا۔ اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ عام طور پر تمام صحابہ خصوصاً مکہ اور حدیبیہ اور حرم کے رہنے والے صحابہ بھی اس درخت کو بھول گئے۔ اور پہچان نہ سکتے تھے۔ یا وہ درخت ہی دنیا سے غائب ہو گیا تھا یہ محض مضمون نگار کی نرالی فہم ہے جو کہ سرتا پا غلط ہے۔ اس لیے یہ اثر بخاری کی روایت کے خلاف ہرگز نہیں اس کے بعد کہتا ہے کہ ثانیاً اگر جابرؓ کے قول کے وہ معنی بھی لیں جو حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ان کی آخر عمر میں نابینائی تک وہ درخت بعینہٖ باقی تھا یعنی ۷۴ھ کے لگ بھگ تک تب بھی قطع و برید محال ہے اس لیے کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ۲۳ھ میں ہوا ہے الخ

اس کا جواب بجز اس کے کیا دوں کہ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ یا یوں کہوں کہ دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔ یا یوں کہوں کہ مضمون نگار کی عقل آئمہ شافعیہ، حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی شان میں گستاخی کرنے کی وجہ سے مسخ ہو گئی ہے کیونکہ حافظ نے ہرگز نہیں کہا کہ وہ درخت حضرت جابرؓ کی آخری عمر نابینائی تک باقی تھا۔ وہ تو اس کے خلاف تصریح فرمارہے ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں۔ وفیه دلالة علی انه کان یعرفها بعینها لان الظاهر انه حسن مقالته کانت هلکت اما بجفاف او بغیره واستمر هو یعرف موضعها بعینه ثم وجدت عند ابن سعد باسناد صحیح الخ (ج ۷، ص ۳۲۲، ۳۲۵)

اس میں صاف تصریح ہے کہ حافظ کے نزدیک حضرت جابر کی بینائی کے وقت وہ درخت ہلاک ہو گیا تھا۔ تب ہی تو حضرت جابر نے یہ فرمایا کہ اگر میں بینا ہوتا تو درخت کی جگہ جتلا دیتا۔ اگر اس وقت درخت بعینہ موجود ہوتا تو یوں نہ فرماتے کہ تم کو دکھلا دیتا پس اس اعتراض کی لغویت اور مضمون نگار کی فہم کا حال معلوم ہو گیا۔

اس کے بعد مضمون نگار کہتا ہے۔

ثانیاً جس نے اس حکایت کو پیش کیا ہے وہ طبقات ابن سعد سے پیش کیا ہے اس جمع سے اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن سعد کاتب واقدی کی روایت بخاری کی روایت کے سامنے قابل قبول نہیں چنانچہ اس لیئے اس نے آخر میں کہا ہے کہ اب سمجھنا چاہیئے کہ کجا امام محمد بخاری و کجا کاتب واقدی شتان بینھما۔

مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بات تو مضمون نگار کو اس وقت زبان سے نکالنی چاہئے تھی جب کہ وہ اس اثر کو روایت کے معارض ثابت کر دیتا۔ حالانکہ ہم دکھلا چکے ہیں کہ اس نے کسی دلیل سے بھی اس کا معارض ہونا ثابت نہیں کیا۔ محض خیالی ڈھکوسلوں سے وہ اس کو معارض سمجھتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ کاتب واقدی کی طرح مجروح و مطعون نہیں ہے۔ بلکہ اس کو تمام محدثین نے حافظ، ثقہ، عدل ومتحری مانا ہے۔ ملاحظہ ہو تہذیب التھذیب (ج ۹۔ ص۱۸۲)

محمد بن سعد بن منیع الھاشمی مولاھم ابو عبد اللہ البصری المتحری قال الخطیب ومحمد عندنا من اھل العدالة وحدیثه یدل علی صدقه فانه یتحری فی کثیر من روایاته اھ

تیسرے ہم مضمون نگار کو اس کی قلت نظر پر تنبیہ کرتے ہیں کہ اس اثر کو سب طبقات ابن سعد ہی سے پیش نہیں کیا بلکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم نے اس کو کتاب محمد بن وضاح سے نقل کر کے پیش کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا۔ اور محمد بن وضاح کا حال طبقات مالکیہ لابن فرحون جس کا نام الدیباج المذھب ہے۔ اس طرح مذکور ہے۔ وبه وبقی بن مخلد صارت الاندلس دار حدیث وکان اماما ثبتاً عالماً بالحدیث بصیراً به متکلما علی

عاشیہ ۱۵ (ج ۔ ص ۲۴۰، ۲۴۱)

اس کے بعد مضمون نگار نے نہایت دلیری سے اس اثر کے راویوں پر کلام شروع کیا ہے۔ کہ اس میں عبد الوہاب بن عطاء ضعیف ہے جس کو بخاری نے لیس بالقوۃ کہا ہے۔ اور تقریب میں صدوق ربما اخطاء کہا ہے۔ یہی وجوہات ہیں کہ امام بخاری نے ان سے کوئی روایت نہ کی اور نہ مسلم نے ادھر توجہ کی الخ

اس کا جواب یہ ہے کہ مضمون نگار کو ایسی سند پر کلام کرنے کا کوئی حق نہیں جس کی اسناد کو حافظ ابن حجر و علامہ عینی صحیح فرما چکے ہیں کیونکہ تہذیب التقریب کے مصنف خود حافظ ابن حجر ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ کون سے جرح سے راوی ضعیف ہوتا ہے اور کس سے نہیں ہوتا۔ اور ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ حافظ ابن حجر و علامہ عینی دونوں نے اس اسناد کو اسناد صحیح فرمایا ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار کو یہ معلوم کرکے اپنی قلت بضاعت پر رونا چاہیئے کہ امام محمد بن وضاح نے اس روایت کو بواسطہ عیسیٰ بن یونس روایت کیا ہے جو صحیح بخاری و مسلم دونوں کے رواۃ ہیں۔ اعلیٰ درجے کے ثقہ ہیں ان کی سند میں عبد الوہاب بن عطاء کے متعلق کہنا ہے کہ نہ مسلم نے اس طرف توجہ دی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلم نے عبد الوہاب کی روایت کو صحیح مسلم میں نہیں لیا۔ حالانکہ تہذیب و تقریب۔ دونوں میں رمز مسلم ہے اور کتاب الجمع بین رجال الصحیحین للمقدسی میں صراحت کے ساتھ ان کا رجال مسلم سے ہونا مذکور ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے اس پر زور دیا ہے کہ یہ اثر بقاعدہ محدثین منقطع ہیں۔ کیونکہ نافع نے حضرت عمر کو نہیں پایا اور منقطع تو بلا اعتماد و استناد نہیں ہوتا۔ اس کے بعد یا سرداران نجدیہ کی دیانت پر حملہ کیا ہے کہ یہ لوگ اپنے عقیدۂ مخترعہ کو ثابت کرنے کیلئے رطب و یابس کی تمیز بھی نہیں کرتے لیکن مضمون نگار کو اس کی خبر نہیں کہ یہ سرداران نجدیہ سے پہلے خود ان کے مسلم علماء عینی اور حافظ جیسے محدثین جو نجدی یا وہابی نہیں۔ بلکہ حنفی اور شافعی مقلد ہیں اس اثر کو نقل کرکے اس کی اسناد کو صحیح کہہ چکے ہیں۔ تو کیا ان کی بھی رطب و یابس کی

تمیز نہیں رہی اس کو پہلے اپنے گھر کی خبر لینا چاہیئے۔ پھر پاسداران تقلید کو الزام دینا زیبا ہوگا۔

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد۔

نیز ان کو اپنے مذہب کے اصول کو بھی پڑھنا چاہیئے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ حنفیہ کے یہاں قرون ثلاثہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا منقطع بھی حجت ہے وہ اس کو مرسل ہی کہتے ہیں ملاحظہ ہو نور الانوار صفحہ ۱۵۰ التقسيم الثاني في الانقطاع وهو نوعان ظاهر وباطن أما الظاهر فهو المرسل من الأخبار فإن كان من الصحابي فمقبول بالإجماع ومن القرن الثاني والثالث بمنزلة المشهور عندنا الخ ملخصاً۔

اور اصلی تحدید جنکو حنبلی کہتے ہیں اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی مرسل بلکہ منقطع حجت ہے۔ ملاحظہ ہو اعلام الموقعین لابن القیم ج ۱ صفحہ ... اور پاسداران تقلید کے نزدیک منقطع ضعیف ہے تو مطلقاً ضعیف نہیں بلکہ وہ منقطع ضعیف ہے جس کا ارسال کرنے والا ثقہ و غیر ثقہ ہر ایک سے ارسال کرتا ہو اور اگر ارسال کرنے والا صرف ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہو یا وہ امام متفق علیہ ہو تو اس کا ارسال و انقطاع محدثین کے یہاں مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلاغات مالک ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ اور بخاری کی تعلیقات مجزومہ بھی بحکم موصول صحیح ہیں۔ اور اصول حدیث میں پاسداران تقلید محدثین ہی کے متبع ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ نافع کا ارسال کس قسم میں داخل ہے تو ظاہر ہے کہ نافع متفق علیہ امام و ثقہ ہیں جب کوئی وجہ نہیں کہ مالک کا بلاغ حجت ہو اور نافع کا بلاغ و ارسال حجت نہ ہو۔ حالانکہ امام مالک نے جس سند کو اصح الاسانید کہا ہے وہ نافع کے واسطے سے ہے اور دوسرے نافع کا صحیح الروایۃ ہونا اور ان کی روایت میں خطا نہ ہونا بھی ایک مسلم امر ہے۔ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۴۱۲)

وقال الخليلي نافع من أئمة التابعين بالمدينة إمام في العلم متفق عليه صحيح الرواية ولا يعرف له الخطأ في جميع ما رواه اهـ ملخصاً۔

اس تصریح کے بعد نافع کے ارسال و انقطاع کے مقبول ہونے میں کیا کلام ہے۔ حیرت ہے کہ احمد بن حنبل اور بخاری اور مالک وغیرہ کسی بات کو جزم کے ساتھ بلا نما یا تعلیقات بلا سند بیان کریں تو ان کا تمام جزم و حجت ہو اور نافع جیسے امام التابعین متفق علیہ ثقہ صحیح الروایۃ کا جزم حجت نہ ہو۔ اس کو کوئی محدث تسلیم نہ کریگا۔ علاوہ ازیں کہ جن پاسداران بدعیہ نے مقابر و قبب کے قابل انہدام ہونے کی تائید میں نافع کا یہ اثر پیش کیا ہے ان کا مدعیٰ صرف اسی پر موقوف نہیں بلکہ اس کو تو محض تائید کے درجہ میں وہ پیش کرتے ہیں اور منقطع سے تائید کرنا اتفاقاً سب کے نزدیک درست ہے۔ اور ان کا اصل مدعا احادیث مرفوعہ صحیح سے ثابت ہے۔ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو قبروں کے پختہ کرنے اور ان پر عمارت بنانے اور چراغاں کرنے سے منع فرمایا۔ ہمیں اگر مضمون نگار کو ہمت ہے تو ان احادیث کا جواب دے کر اپنی مبتدع جماعت کی دستگیری کرے محض اثر نافع کی تردید میں اتنا زور کیوں دکھلایا جاتا ہے۔ جس سے پاسداران بدعیہ اتنا کہہ سکتے ہیں اور پھر سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ اس کو تو ہم نے محض تائید میں بیان کیا تھا۔ اور ہمارا اصل اعتماد احادیث مرفوعہ صحیحہ پر ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار علم دین کے میدان سے نکل کر نئی (مغربی) روشنی کی پناہ لیتا ہے جو غالباً اس کا اصلی مذاق ہے اور پہلا رنگ محض پختہ کاران اسلام کو دھوکہ دینے کیلئے اختیار کیا گیا تھا وہ کہتا ہے۔

(خاکش بدہن) ملاحدہ و جہال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وسیع الخیالی کی پست خیالی ثابت کرنیکے لئے اس قسم کی باتیں اس جناب کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ وہ آثار قدیم و مہتم بالشان یادگاروں کو مٹاتے تھے کتب خانہ اسکندریہ جلادیا اور تبرک آثار رسول کو مٹا دیا پھر کہتا ہے کہ آثار قدیمہ کی حفاظت کا مسئلہ اس زمانہ میں مسلم الثبوت ہو گیا ہے۔ اور ناموران ملک و ملت کا اسٹیچو (مجسم) نصب کیا جاتا ہے اور اس کے نصب کرنے میں مسلمان لیڈران بھی فراخدلی سے شرکت کرتے ہیں۔ اور تصویر کے جواز پر رسالہ لکھا جاتا ہے۔

مگر ذریات نجدیہ جب آثار انبیاء کو اور آثار سلف صالحین کو مسمار کرتے ہیں تو اس کو سنت فاروقی و مشرب شافعی و مسلک حنبلی بنا کر اس عمل کو مستحسن بتاتے ہیں اس کے بعد پھر علم دین کی پناہ میں آکر کہتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو آثار انبیاء کی ایسی قدر کرتے تھے کہ مقام ابراہیم جہاں حضرت ابراہیم کے قدم مبارک کے نشان تھے اس کو مصلی بنانے کی تمنا کرتے تھے حالانکہ بت پرستی کا خوف تو مقام میں تو بہت زیادہ تھا کیونکہ اس کے پوجنے والے وہاں بہت باقی تھے۔ اس کے بعد واقعہ رمل کا ذکر کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کعبہ میں رمل کیا تھا تاکہ مشرکین قوت اسلامی کو دیکھ لیں پھر حضرت عمرؓ اپنے زمانہ میں فرماتے ہیں کہ اب تو اس کی ضرورت نہیں رہی یہاں نہ مشرکین ہیں نہ مخالفین لیکن یہ ہمارے حضور کا فعل ہے ہم تو اسے نہ چھوڑیں گے بے ضرورت شئی کو قائم رکھنا فقط آثار رسول کی قدردانی تھی پس ایسے بزرگ کو شجرۃ الرضوان کا قاطع بتانا قطعی بہتان و افتراء ہے اور ایسے آثار پر مسجد بنانا اور وہاں نماز پڑھنا اگر حضرت فاروق کے نزدیک ایک ناجائز و موہم شرک تھا تو سب سے پہلے اپنے فرزند کو تنبیہ فرماتے جن سے بروایت صحیحہ یہ باتیں ثابت ہیں۔ اھ ملخصاً۔

اس خبط عشواء اور کفر و اسلام سے مرکب کلام کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے شک وسیع الخیال تھے مگر اسی حد تک جہاں تک اسلام میں اور شریعت میں وسعت ہو اور جن باتوں سے اسلام و توحید میں رخنہ پڑنے کا خطرہ ہوتا اُن کے مٹانے میں وہ تمام صحابہ سے زیادہ شدید تھے۔ اسی لیے شیطان اُن کے سایہ سے بلکہ نام سے بھی بھاگتا تھا۔ مضمون نگار کے نزدیک تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وسیع الخیال اس وقت ہوتے جبکہ وہ اپنے زمانہ کے بہادر اور دلیر صحابہ کا مجسمہ تیار کراتے جیسے حضرت خالد بن ولید و ضرار بن ازور و ذوالکلاع حمیری وغیرہم۔ بلکہ پورے وسیع الخیال تو جب ہوتے کہ دشمنان اسلام میں بھی جو نامور اور بہادر تھے جیسے ابوجہل وغیرہ ان کے مجسمے تیار کراتے یا کم از کم ان کی قبروں کو پختہ ہی بنادیتے تاکہ آجکل کی محافظ آثار قدیمہ کمیٹی

کی معلومات میں اضافہ ہوتا جو فرعون کی لاش کو بھی بڑی احتیاط سے عجائب خانہ میں رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے تو خزانہ فارس سے حضرت دانیال پیغمبر علیہ السلام کا جسم مبارک آیا تھا آپؓ نے اس کو بھی اسی طرح دفن کیا کہ آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ ان کی قبر کس جگہ ہے۔ کیونکہ آپؓ نے دن میں تیرہ قبریں کھدوا کر رات کو ایک قبر میں ان کا جسم مبارک دفن کرا کے سب پر مٹی برابر کر دی ذرا سا نشان بھی تو نہ بنایا جو مبتدع مضمون نگار کی جماعت کے لیئے سجدہ گاہ بنانے میں معین ہوتا اور شاید مقدمہ میں اضافہ کا سبب بن جاتا۔ دیکھو اغاثۃ اللھفان لابن القیم (ص۱۲۳)

جس میں سند صحیح کے ساتھ یہ واقعہ مذکور ہے۔ اور حضرت خالد جیسے بہادر و شیر دل کا مجسمہ تو کیا تیار کراتے یا ان کی قبر کو پختہ و عالی شان تو کیا تیار کرتے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اُن کو قیادت عساکر سے بھی معزول کر دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے نزدیک وسیع الخیال کس طرح ہو سکتے ہیں۔ بس ایسی وسیع الخیالی مضمون نگار اور اس کے فراخ دل جیالک لیڈروں کو ہی مبارک ہو۔ جو اسٹیچو نصب کرنے میں شرکت کرتے اور جوازِ تصویر کی کوشش کر کے توحید اسلامی کو مٹانا چاہتے ہیں۔

اور ہاں مضمون نگار کے نزدیک جب ایک مبارک درخت کا کاٹنا تنگ خیالی اور اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا تنگ خیالی ثابت کرتا ہے تو یقیناً ان مصاحف قرآنیہ کو نیست و نابود کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لکھے گئے تھے۔ یا اُن صحابہ کے مصاحف کو دھلوا کر چاک کر دینا جو ترتیب نزول وحی پر انہوں نے لکھے تھے۔ مضمون نگار کے نزدیک بہت بڑی تنگ خیالی ہوگی مگر تاریخ و احادیث شاہد ہیں کہ حضرت عثمان نے قرآن کو بترتیب موجودہ مرتب کر کے بقیہ مصاحف کو نیست و نابود کر دیا تاکہ بعد میں اُمت کے اندر فتنہ رونما نہ ہو بس مضمون نگار کو سمجھ لینا چاہیئے کہ حضرات صحابہ کی نظر میں آثار قدیمہ سے زیادہ احکام و اعتقادات کی حفاظت ضروری تھی وہ اس کی حفاظت کیلئے آثار قدیمہ کی زیادہ پرواہ نہ کرتے تھے۔

رہا واقعہ رمل و قصہ مقام ابراہیم تو اس سے مضمون نگار کا مدعا کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ ضروری آثار کا باقی رکھنا بھی جائز نہیں یا ان کی زیارت ممنوع ہے۔ اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرقہ نجدیہ یا پاسداران نجدیہ کا یہ گمان ہے کہ وہ تمام آثار نبویہ کو مٹایا کرتے تھے۔ بلکہ ان کا دعویٰ (ملاحظہ ہو اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ ص ۱۸۵، ۱۸۶ جس میں بہت تفصیل کے ساتھ اس بحث کو بیان کیا گیا ہے) صرف اس قدر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضروری آثار کو باقی رکھتے تھے اور غیر ضروری کو مٹا دیا کرتے تھے۔ جبکہ ان کے ساتھ ضروری آثار جیسا معاملہ کیا جاتا۔ اور ضروری آثار وہ ہیں جن کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً توجہ فرمائی ہو یا ان کے متعلق امر فرمایا ہو۔ یا نص میں ان کی عظمت کی طرف اشارہ ہو۔ چنانچہ مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محراب اور منبر کی جگہ محفوظ رکھی گئی۔ وہ ستون محفوظ رکھا گیا جس کی آڑ میں آپ بالقصد نماز پڑھتے تھے۔ اسی طرح مقام ابراہیم کو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلی بنانا چاہا۔ کیونکہ رسول اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کا احترام ظاہر فرمایا تھا۔ ادھر نص قرآنی میں فیہ آیات بینات مقام ابراہیم۔ نازل ہو چکا تھا۔ اور اس کے پوجنے والے وہاں بہت باقی تھے۔ محض افتراء و بہتان ہے۔ وہ کسی معتبر تاریخی کتاب یا حدیث سے بھی اس کا ثبوت نہیں دے سکتا کہ مشرکین عرب مقام ابراہیم کی پرستش کرتے تھے۔ مشرکین جن بتوں کی پوجا کرتے تھے فتح مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو خانہ کعبہ سے نکال کر پھینک دیا تھا مقام ابراہیم کسی قبیلہ کا بت نہیں تھا۔ اور اگر محض احترام کا نام عبادت ہے تو احترام تو مشرکین کعبۃ اللہ اور حجر اسود کا بھی کرتے تھے جب خدا و رسول نے کعبہ و حجر اسود کے احترام کو بت پرستی کا سبب یا ذریعہ نہ سمجھا تو حضرت عمر مقام ابراہیم ہی میں ایسا خطرہ کیوں کرتے۔

اور واقعہ رمل میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کی طرف عمداً توجہ فرمائی تھی۔ اور نہ صرف توجہ فرمائی بلکہ صحابہ کو اس کا امر فرمایا تھا پھر حکم کے

ہوتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو کیسے موقوف کر دیتے۔ البتہ ان کو بعد
میں یہ شبہ ہوا تھا کہ شاید یہ حکم اس وقت کیلئے مخصوص ہو۔ کیونکہ اس وقت
اس کی ضرورت تھی اور اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور قاعدہ ہے الضرورۃ
تتقدر بقدر الضرورۃ۔ جو کام کسی ضرورت سے کیا جاتا ہے وہ ضرورت
ہی کے ساتھ مقید ہوتا ہے تو اب شاید اس حکم کا باقی رکھنا حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کے مقصود کے خلاف ہو۔ پھر آپ کے ذہن میں کوئی دوسری بات آ گئی
جس سے اس حکم کا اسی وقت کیلئے مخصوص ہونا واضح ہو گیا۔ اس لئے حکم
ظاہری عموم پر رکھا۔ اور اجتہاد سے اس کو مخصوص نہیں کیا۔ بہرحال ضروری
آثار کے ابقاء میں ان افعال واماکن کی حفاظت میں کسی کو کلام نہیں جنکی طرف
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالقصد توجہ فرمائی یا ان کی عظمت وحرمت کی طرف
اشارہ فرمایا یا ان کے متعلق حکم فرمایا ہو۔

گفتگو ان غیر ضروری آثار میں ہے جنکی طرف حضور نے بالقصد توجہ نہیں
فرمائی نہ ان کی عظمت وحرمت کی طرف اشارہ فرمایا نہ ان کے بارے میں کوئی حکم
فرمایا۔ مثلاً سفر میں اتفاقاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ قیام فرمایا، یا نماز
کا وقت ہو جانے کی وجہ سے نماز پڑھی ہو یا سایہ کی غرض سے کسی درخت کے نیچے
بیٹھے ہوں۔ ایسے اتفاقی آثار کے متعلق حضرت عمر کی تاکید تھی کہ ان کو ان آثار
کی طرح نہ بنایا جائے جنکی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص توجہ وارادہ ثابت
ہے۔ اور ان مقامات کا نماز وغیرہ کیلئے خصوصیت سے قصد نہ کیا جائے۔ ملاحظہ
ہو اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ ص ۱۸۵۔

جس میں سنن سعید بن المنصور سے بسند صحیح یہ اثر حضرت عمر رضی اللہ
عنہ سے منقول ہے۔

حدثنا معاویۃ حدثنا الاعمش عن المعرور بن سعید عن عمر
رضی اللہ عنہ قال خرجنا معہ فی حجۃ حجھا فقرأ بنا فی الفجر بالم تر کیف
فعل ربک باصحاب الفیل ولایلاف قریش فی الثانیۃ فلما رجع من حجتہ

---

سہ مثلاً یہ کہ دل میں اظہار شوق ورغبت ہے جو مقامات میں دائماً مطلوب ہے ۱۲ ظفر احمد

بن عمر رضی اللہ عنہ لم یوافقہ علیہ احد من الصحابۃ فلم ینقل عن الخلفاء الراشدین ولا غیرہم حتی المهاجرین والانصار انہ کان یتحری قصد الامکنۃ التی نزلها النبی صلی اللہ علیہ وسلم والصواب مع جمهور الصحابۃ لان متابعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم تکون بطاعۃ امرہ وتکون فی فعلہ بان یفعل مثل ما فعل علی الوجہ الذی فعلہ فاذا قصد العبادۃ فی مکان کان قصد العبادۃ فیہ متابعۃ لہ واما اذا نزل فی مکان بحکم الاتفاق لکونہ صادف وقت النزول او غیر ذلک مما یعلم انہ لم یتحر ذلک المکان فانا اذا تحرینا ذلک المکان لم یکن متبعین لہ فان الاعمال بالنیات اھ (ص ۱۸۵)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس فعل میں تمام جمہور صحابہ سے منفرد تھے۔ حضرات صحابہ کا عموماً ہرگز یہ طریقہ نہ تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کا اہتمام کے ساتھ تتبع وقصد کریں۔ پھر علامہ ابن تیمیہ فیصلہ فرماتے ہیں کہ صواب جمہور صحابہ ہی کے ساتھ ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع دو طرح ہے۔ ایک یہ کہ آپ کے امر کا اتباع کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ آپ کے فعل کا اتباع اسی طرح کیا جائے جس طرح حضور نے وہ فعل کیا ہے اگر حضور نے کسی خاص جگہ کی عبادت کیلئے قصد کیا ہو وہاں کا قصد کرنا ہمارے لئے بھی عبادت ہے۔ اور جس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کیلئے قصد نہ کیا ہو بلکہ اتفاقاً وہاں نماز پڑھی ہو یا قیام فرمایا ہو تو اس کا اہتمام کرنا اس میں قصد کرکے جانا یا نماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اہتمام یا قصد نہ کیا تھا باقی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے غلبۂ محبت میں جو کچھ کیا ہے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اگر غلبۂ محبت میں کوئی ایسا کرے اور حدود سے تجاوز نہ کرے تو اس کا یہ فعل جائز ہے۔

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک معلوم ہوگیا۔ اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ آثار نبویہ کے بارے میں حضرت عمر کا مسلک اپنے صاحبزادے سے الگ تھلگ تھا تو اب مضمون نگار یہ بتلائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شجرۂ رضوان کا قاطع بتانا بہتان کدھر سے ہے۔ بلکہ ہر منصف اس کہنے پر مجبور ہوگا کہ اس واقعہ کی نسبت حضرت عمر کے مسلک کے موافق اور اُن کے طریقہ اجتہاد کے عین مطابق ہے۔ اور واقعۂ رمل اور واقعہ مقام ابراھیم سے مضمون نگار نے جو استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آثار انبیاء ایسی قدر و منزلت کرتے تھے کہ مقام ابراھیمؑ کے قدم مبارک کا نشان تھا اس کو مصلیٰ بنانے کی تمنا کرتے تھے۔ خیال کرنے کی جاہے کہ جو حضرت ابراھیمؑ کے مقام کی یوں عزت کرے وہ مقام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکر برباد کرسکتا ہے۔ بت پرستی کا خوف تو مقام ابراھیمؑ میں بہت زیادہ تھا کیونکہ اس کے پوجنے والے وہاں بہت باقی تھے اور ابھی اسلام بالکل تازہ تھا۔ اسی طرح رمل کے بارے میں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کعبہ میں رمل کیا تھا کہ تاکہ مشرکین قوتِ اسلامی کو دیکھ لیں اور مسلمانوں کو ضعیف اور کمزور نہ سمجھیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں فرماتے ہیں کہ اب تو اس کی ضرورت نہ رہی ہمارے لئے حضورؐ کا فعل ہے ہم تو اسے نہ چھوڑیں گے الخ

اس کا جواب اوپر کی تقریر پر غور کرنے سے ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ گفتگو اُن آثار انبیاء میں ہے جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یا کسی نبی کا اتفاقاً وہاں گزر ہوگیا ہو۔ یا انہوں نے اتفاقاً وہاں قیام کیا ہو۔ یا اتفاقاً نماز پڑھی ہو کر اُن کا اہتمام و قصد و تحری کرنا کیسا ہے۔ اور مقام ابراھیمؑ اس بحث سے خارج ہے۔ کیونکہ بناء کعبہ میں حضرت ابراھیمؑ کا کھڑے ہو کر بیت اللہ کی تعمیر کرنا اتفاقاً نہ تھا بلکہ یہ پتھر خاص جنت سے اس کام کیلئے بھیجا گیا تھا۔ جس میں آیاتِ بینات تھیں۔ جیسا کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے در منثور میں متعدد روایات اس کے متعلق نقل کی ہیں جن سے اس پتھر کا جنت سے آنا ثابت ہوتا ہے۔

(ج ۱، ص ۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶)

پس مقام ابراہیم کی قریب قریب وہی شان ہے جو اسود کی ہے۔ اور جو ایسے آثار انبیاء میں سے ہوں جن کا خود انبیاء نے اہتمام و قصد کیا ہو اُن کی عظمت و اہتمام کی حق تعالیٰ نے تاکید کی ہو جیسا کہ فیہ آیات بینات مقام ابراہیم اشارۃً معلوم ہو رہا ہے۔ اُن کے اہتمام و تعظیم اور قصد سے کوئی منع نہیں کرتا۔ نہ وہابی نہ نجدی نہ حنفیہ متبع سنت اور مضمون نگار کا یہ کہنا کہ مقام ابراہیم میں بت پرستی کا خوف زیادہ تھا اور اس کے پوجنے والے وہاں بہت باقی تھے۔ الخ یہ بالکل غلط و لغو مضمون ہے۔ وہ کسی معتبر سند سے ہرگز اس کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ کہ مشرکین عرب نے حجر اسود و مقام ابراہیم میں سے کسی کو اپنا معبود بنایا ہو۔ یا ان کو بت کی طرح پوجا ہو کعبہ میں مشرکین نے سینکڑوں بت رکھے ہوئے تھے۔ جن کی وہ پرستش کرتے تھے مگر حجر اسود یا مقام ابراہیم کی پرستش کرنا کسی طرح ثابت نہیں ہے اور بالفرض اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو جو لوگ مقام ابراہیم کو پوجتے ہوں گے وہ حجر اسود کو بھی ضرور پوجتے ہوں گے اور کعبہ کو بھی پوجتے ہوں گے تو جب خدا اور رسول نے حجر اسود و کعبہ کی پرستش کی پرواہ نہ کی اور دونوں کو بدستور قبلہ نماز بنا دیا تو حضرت عمرؓ کو مقام ابراہیم میں اس کی رعایت کی کیا ضرورت تھی۔ اور اس واقعہ رمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اتفاقی طور پر نہ تھا۔ بلکہ عمداً اور قصداً تھا۔ اور صرف فعل ہی نہ تھا بلکہ امر بھی تھا۔ حضور نے عمرۃ القضاء میں مسلمانوں کو صیغۂ امر سے رمل کا حکم فرمایا تھا۔ پس یہ بھی بحث سے خارج ہے خصوصاً جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں صحابہ کو رمل سے منع نہیں کیا بلکہ حضور نے خود اور صحابہ کرام نے آپ کے ساتھ حج وداع میں بھی رمل کیا حالانکہ عمرۃ القضاء میں جو اس کی علت تھی وہ حجۃ الوداع میں باقی نہ رہی تھی۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس کا باقی رکھنا منظور ہے اس لیے حضرت عمرؓ اس کو کیونکر موقوف کر سکتے تھے۔

بہرحال مقام ابراہیم اور رمل کے واقعہ کو ذکر کر کے مضمون نگار نے غلط بحث کی ہے۔ دوسرے جو لوگ ایسے آثار و شاہد کی جن پر اتفاقاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہو گیا ہو زیارت وغیرہ سے منع کرتے ہیں وہ کب کہتے ہیں کہ اُن کی عظمت دل سے بھی نکال دی جائے۔ یا معاذ اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کی عظمت نہ تھی

وہ تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ان آثار سے محبت ضرور کی جائے مگر زیارت کا قصد اتنا نہ کیا جائے کہ اس میں حد سے تجاوز اور دین میں غلو ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے تعدی ہے۔ اور اگر محض زیارت ہی کی حد تک بات رہتی تو مضائقہ نہ تھا جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ لیکن اب تو لوگ حد سے بڑھنے لگے اور ان آثار کو عبادت گاہ بنانے لگے اور ایسی حالت میں حضرت عمرؓ نے اپنی دوربین نگاہ سے دیکھ کر ان آثار کے قصد و اجتماع سے منع فرمایا تھا۔ اس کے بعد شرط خامس کی تحقیق بھی اثر نافع میں دکھلانا چاہتا ہوں۔ اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک مرسل و منقطع کے مقبول ہونے کی پانچویں شرط یہ ہے کہ ارسال کرنے والا کسی مجہول یا ضعیف سے ارسال نہ کرتا ہو۔ بلکہ ثقہ سے ارسال کرتا ہو۔ جیسے کہ سعید بن المسیبؒ

میں کہتا ہوں کہ نافع بھی اسی درجہ کے ارسال کرنے والے ہیں۔ تہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۴۱۲) میں حافظ خلیلی صاحب الارشاد کا قول ملاحظہ ہو۔

قال الخليلي نافع من ائمة التابعين بالمدينة امام في العلم متفق عليه - صحيح الرواية منهم من يقدمه على سالم ومنهم من يقارنه به ولا يعرف به خطاء في جميع ما رواه اھ

اس میں چند باتیں ہیں۔ نمبر ۱ نافع متفق علیہ امام ہیں۔ ۲: صحیح الروایت ہیں۔ ۳: ان کی تمام مرویات میں کوئی خطا نہیں پائی گئی۔ اس تصریح کے بعد نافع کے ارسال و انقطاع کے مقبول ہونے میں کیا کلام ہے۔ حیرت یہ ہے کہ امام مالک کی بلاغات تو حجت ہوں امام محمد بن حسن الشیبانی کی بلاغات حکم میں مسند ہوں اور امام بخاری کی تعلیقات صحیح ہوں اور نافع مولی ابن عمر کا بلاغ حجت نہ ہو۔ جو امام مالک کے شیخ اور اعلیٰ درجے کے استاذ ہیں۔

حتی کہ محدثین نے مالک عن نافع عن ابن عمر کو اصح الاسانید میں شمار کیا ہے۔ نافع کے سوا امام مالک کا اور کوئی شیخ ایسا نہیں جس کی سند کو اصح الاسانید کہا گیا ہو۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایسے متفق علیہ صحیح الروایت کا بلاغ حجت اور صحیح نہ ہو۔ بلکہ خلیلی کے قول پر جس روایت کی سند نافع تک صحیح ہو جائے پھر اس کی صحت میں کوئی کلام باقی نہیں رہتا کیونکہ وہ تصریح کرتے ہیں کہ نافع کی تمام مرویات

میں کوئی خطا نہیں پہچانی گئی۔
اور شجرۃ الرضوان کے قاطع کی اسناد نافع تک بلاشبہ صحیح ہے جیسا کہ اوپر بتلایا گیا ہے۔ اور حافظ ابن حجر نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ اب اس کی صحت میں کچھ بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہم اس اشکال کا جواب بھی دینا چاہتے ہیں جو ظاہر میں بہت سخت اشکال ہے وہ یہ کہ نافع کا اثر جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قاطع شجرہ رضوان بتلاتا ہے صحیح بخاری کی روایت سے متعارض ہے۔ کیونکہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شجرۃ رضوان بیعت حدیبیہ کے اگلے ہی سال لوگوں کی نظروں سے مخفی اور گم ہو گیا تھا۔ تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں کیونکر کٹوا دیا۔ یہ اشکال کی تقریر ہے جو مضمون نگار کی بھی تقریر کا خلاصہ ہے۔
اب جواب ملاحظہ ہو۔ تعارض کے معنی یہ ہیں کہ دو مفہوم باہم ایک دوسرے کی نقیض ہوں یا ایک سے دوسرے کی نقیض لازم آتی ہو اور دونوں میں تطبیق اور جمع ممکن نہ ہو۔ اب ہم مضمون نگار سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ کو بروایت بخاری حضرت عمرؓ کا قاطع شجرہ نہ ہونا معلوم ہوتا ہے وہ یقیناً اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ بخاری کی کسی روایت میں لم یقطع عمر الشجرۃ البیعۃ وارد نہیں ہے۔ پھر کیا آپ کو ان روایات سے کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے۔ جس سے حضرت عمرؓ کا قاطع شجرہ نہ ہونا لازم آئے۔ بظاہر مضمون نگار اس کا مدعی ہے۔ اور اس نے بخاری کی روایت سے یہ سمجھا ہے کہ شجرۃ رضوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی مخفی اور گم ہو گیا تھا۔ پھر مخفی اور مفقود کا قطع کیونکر ممکن ہے۔ مگر میں اس سے پوچھتا ہوں کہ اس نے شجرہ کا مخفی اور مفقود ہونا کس روایت سے اور کس لفظ سے سمجھا ہے۔
اس کے متعلق اس نے عبداللہ بن عمرؓ اور مسیبؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے مگر دونوں میں اس کے دعویٰ کی کچھ دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں۔ رجعنا من العام المقبل فما اجتمع منا اثنان علی الشجرۃ التی بایعنا تحتہا کانت رحمۃ من اللہ اھ بخاری مع فتح الباری ج ۶ ص ۹۰
ترجمہ: اگر ہم اگلے سال لوٹے تو ہم سے دو آدمی بھی اس درخت کی شناخت پر متفق نہ ہو سکے۔ جس کے نیچے ہم نے بیعت کی تھی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت تھا۔

(یعنی اس کا یقینی طور پر معلوم نہ ہونا یا خود وہ درخت رحمت تھا۔ دونوں احتمال ہیں جیسا کہ حافظ نے بیان کیا ہے)

اس سے صراحۃً یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس درخت کے یقینی طور پر مخفی یا مفقود ہوجانے کے مدعی تھے بلکہ اس کا حاصل صرف اتنا ہے کہ اس کی پہچان میں اختلاف ہوگیا۔ اور ابن عمرؓ کے سامنے جس تدریش اُن میں سے دو آدمی بھی اس کی شناخت پر اتفاق نہ کر سکے۔ اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ فی نفسہ یقینی طور پر وہ درخت مخفی یا مفقود ہوگیا یا اٹھا لیا گیا تھا۔ اور سعید بن المسیب کے والد مسیبؓ کے الفاظ یہ ہیں

عن قتادة عن سعيد بن المسيب عن ابيه قال رأيت الشجرة ثم اتيتها بعد فلم اعرفها قال محمود ثم انسيتها بعد (بخاری مع فتح الباری ج ۷، ص ۳۴۴)

ترجمہ: میں نے اس درخت کو دیکھا پھر بعد میں اس کے پاس گیا تو میں نے اس کو نہیں پہچانا اور ایک راوی کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر بعد میں اس کو بھلا دیا گیا۔

اس سے صرف حضرت مسیب کا نہ پہچاننا اور بھول جانا ثابت ہوا۔ یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ فی الواقع یقینی طور پر سب کی نگاہوں سے مخفی ہوگیا تھا۔ یا زمین سے اٹھا لیا گیا۔ یا مفقود ہوگیا تھا۔ اور طارق بن عبدالرحمٰن کی روایت میں حضرت مسیب کے الفاظ ہیں۔

عن سعيد بن المسيب عن ابيه انه كان فيمن بايع تحت الشجرة فرجعنا اليها العام المقبل فعميت علينا اه. صفحہ مذکورہ کہ انہوں نے شجرہ کے نیچے بیعت کی تھی۔ پھر ہم اگلے سال اس کی طرف لوٹے تو وہ ہم پر مشتبہ ہوگیا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ حضرت مسیب نے اس کو نہ پہچانا۔ اور ان کو اشتباہ ہوگیا اور یقین کے ساتھ اس کی تعیین نہ کر سکے۔ اور لفظ رجعنا و علینا صیغہ جمع متکلم میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ واحد متکلم کی جگہ جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔ کیونکہ محاورات میں کبھی ایک آدمی بھی اپنے کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہی ظاہر ہے۔ کیونکہ اوپر قتادہ کی روایت میں ثم لم اعرفها یا ثم انسيتها

مذکور ہے۔ اس سے احتمال کی تقویت ہوتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت مسیب کے ساتھ چند رفقاء اور بھی ہوں اور ان کو بھی اشتباہ ہو گیا ہو۔

باقی اس پر کوئی دلیل نہیں کہ صیغہ جمع سے تمام صحابہ مراد ہیں جو اس کا مدعی ہو وہ اس کی دلیل بیان کرے۔ کیونکہ صیغہ جمع متکلم کا استغراق و تمام پر دلالت کرنا لغت دانوں سے ثابت نہیں۔ مگر یہ بات مقرر قابل تسلیم ہے کہ حضرت مسیب کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ درخت اصل سے کلی طور پر اٹھا لیا گیا تھا۔ یا چھپا لیا گیا تھا۔ بلکہ ان کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہم کو اس میں اشتباہ ہو گیا۔ چنانچہ روایت مغازی میں حضرت مسیب کے الفاظ یہ ہیں: فعمی علینا مکانہا۔ (فتح الباری ج [illegible]) کہ ہم پر اس کی جگہ مشتبہ ہو گئی۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا تعین نہ کر سکنا بتلا رہے ہیں۔ طارق بن عبدالرحمن کی دوسری روایت میں اس سے زیادہ تفصیل ہے۔

قال انطلقت حاجا فمررت بقوم يصلون قلت ما هذا المسجد قالوا هذه الشجرة حيث بايع رسول الله صلى الله عليه وسلم بيعة الرضوان فاتيت سعيد بن المسيب فاخبرته فقال سعيد بن المسيب حدثني ابي انه كان فيمن بايع رسول الله صلى الله عليه وسلم تحت الشجرة قال فلما خرجنا من العام المقبل نسيتها فلم نقدر عليها فقال سعيد ان اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم لم يعلموها وعلمتموها انتم فانتم اعلم.

(بخاری مع فتح الباری، صفحہ مذکورہ)

وہ فرماتے ہیں کہ میں حج کیلئے چلا تو ایک قوم پر گذر ہوا جو نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ مسجد کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ درخت (کی جگہ) ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان لی تھی۔ تو میں سعید بن مسیب کے پاس گیا اور ان کو اس کی خبر کی انہوں نے کہا کہ مجھ کو میرے باپ نے خبر دی ہے وہ بھی ان لوگوں میں سے جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی وہ فرماتے ہیں کہ پھر جب ہم سال آئندہ مکہ کی طرف نکلے تو اس درخت کو بھلا دیے

سکے۔ اور اس کی تعیین پر قادر نہ ہوئے۔ سعید نے کہا کہ حضور کے صحابہ نے تو اس درخت کو نہیچانا اور تم نے جان لیا پس تم اُن سے زیادہ جاننے والے ہوئے۔

اس روایت میں اول تو حضرت مسیب کے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں کہ اس میں بھی صرف اپنا بھول جانا بیان فرماتے ہیں۔ اس کے بعد سعید بن المسیب کے الفاظ قابلِ غور ہیں کہ صحابہ نے تو اس درخت کو نہ جانا اس میں دو احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ صحابہ سے مراد صرف سعید بن المسیب ہوں یا ابن المسیب اور اُن کے چند رفقاء یا تمام صحابہ۔ تیسرے احتمال پر کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ جمع معرف باللام عموم کیلئے ہوتی ہے اور جمع مضاف کو بھی عموم و استغراق کے لئے اصول میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کلام اس میں ہے کہ سعید بن المسیب کے قول میں عموم و استغراق حقیقی ہے یا عرفی۔ یقیناً استغراق حقیقی مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ سعید بن المسیب نے تمام صحابہ کو نہیں پایا۔ وہ اُنہیں صحابہ کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں جن سے ان کا لقاء ثابت ہے۔ اور جن سے لقاء نہیں وہ کچھ ان کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ پس اصحاب محمد سے مراد اُن کے قول میں وہی صحابہ ہو سکتے ہیں جنہوں نے اُن سے درخت کا بھول جانا بیان کیا ذکر سب اور یہ کوئی خدا اور رسول کی خبر نہیں جس میں استغراقِ حقیقی مراد لیا جائے۔ بلکہ یہ ایک تابعی کا قول ہے جو اپنے علم ہی کے موافق استغراق کر سکتے ہیں۔ پس احتمال اول و ثانی ہی ممکن ہے اور تیسرا احتمال باوجود اس کے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں خلاف دلیل بھی ہے۔ کیونکہ سعید بن المسیب کبار تابعین اور خیر القرون میں سے ہیں اُن کے زمانہ میں جو تابعین تھے بدون صحابہ سے تحقیق کیئے محض خیال سے مقامِ شجرہ پر مسجد بنا دیتے یقیناً جو لوگ اس مسجد کے بانی تھے اور جو اس کو مسجدِ شجرہ کہتے تھے انہوں نے صحابہ سے تحقیق کر کے اس کی جگہ کو معلوم کیا ہوگا۔ پس سعید بن المسیب کے قول کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ صحابہ میں سے کسی کو بھی شجرہ یا مکان کا علم نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے والد یا اُن کے چند رفقاء کا نہ جاننا بیان فرماتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اُن کے نہ جاننے پر دیگر صحابہ کو قیاس کرتے ہوں۔ کہ اُن کی طرح دوسروں کو بھی معلوم نہ تھا۔ پھر تابعین کو

اس کا علم کیسے ہو گیا مگر اس قیاس پر بھی یہ کلام ہو سکتا ہے کہ آن کا سب صحابہ کو
اپنے والد یا جد یا اُن کے چند رفقاء پر قیاس کرنا صحیح نہیں اُن کی عدم معرفت
دوسروں کی عدم معرفت کو مستلزم نہیں خصوصاً جبکہ اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا جائے۔
یہ اہل مدینہ مدینہ کے آثار سے زیادہ واقف تھے۔ اور اہل مکہ مکہ کے آثار سے
زیادہ واقف تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر اور مسیب اہل مدینہ تھے۔ اور حدیبیہ
مکہ کے قریب تھا۔ پس اہل مدینہ کا اس کو نہ پہچاننا اور بھول جانا اس کو مستلزم
نہیں کہ اہل حرم بھی اس کو بھول گئے ہوں۔ جبکہ بخاری کی روایت سے یہ ثابت ہے کہ
زمانہ تابعین میں اس درخت کی جگہ مسجد بن گئی تھی۔ اور لوگ وہاں نماز پڑھتے
تھے۔ تو دوسرا احتمال قوی ہو جاتا ہے۔ غالباً اہل مکہ و اہل حرم کو وہ درخت اور
اس کی جگہ محفوظ تھی۔ اور سعید بن مسیب کا محض اپنے والد کے نہ پہچاننے سے اُن
لوگوں پر انکار کرنا درست نہ تھا۔ بالخصوص جبکہ اہل مدینہ بھی سب کے سب
اس درخت کو نہ بھولے تھے۔ کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے خود بخاری میں روایت
ہے کہ لو کنت ابصر الیوم لاریتکم مکان الشجرۃ الخ۔ اگر میں اس وقت
بینا ہوتا تو میں تمہیں اس درخت کی جگہ بتلا دیتا۔ اور جب آن کو یہی نابینائی کے
وقت جو اخیر عمر میں پیدا ہو گئی تھی اس درخت کی جگہ محفوظ تھی تو یقیناً بینائی کے
زمانہ میں اس درخت کو پہچانتے تھے۔ کیونکہ ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ حضرت مسیب
ابن عمر کے قول سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ وہ درخت غیبی طور پر اٹھا لیا
گیا یا مخفی کر دیا گیا تھا۔ بلکہ اُن کے اقوال سے آن کا بھول جانا اور جگہ کا مشتبہ
ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔ پس جو شخص اس کی جگہ کا یاد رکھنا بتلاتا ہے یقیناً وہ
درخت کو بھی پہچانتا تھا۔ البتہ اگر روایت سے غیبی طور پر اس کا دنیا سے اُٹھا
لیا جانا یا مخفی کر دیا جانا ثابت ہو جاتا تو پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا جگہ کو
یاد رکھنا خود اس درخت کی معرفت کو مستلزم نہ ہوتا۔ مگر غیبی اخفاء یا غیبی رفع
کا ثبوت کسی روایت میں نہیں۔ بلکہ صرف ایک دو صحابی اپنا نسیان یا ذہنی اشتباہ
ظاہر کرتے ہیں اس سے یہ کیونکر مان لیا جائے کہ تمام صحابہ اس سے ناواقف تھے۔
اور اُن کی طرح سب ہی بھول گئے تھے۔ اس تقریر سے حافظ ابن حجر کے اس قول

کی صحت واضح ہو گئی۔

لکن إنكار سعيد بن المسيب على من زعم أنه عرفها معتمداً على قول أبيه إنهم لم يعرفوها في العام المقبل لا يدل على رفع معرفتها أصلاً فقد وقع عند المصنف من حديث جابر الذي قبل هذا لو كنت أبصر اليوم لأريتكم مكان الشجرة فهذا يدل على أنه كان يضبط مكانها بعينه وإذا كان في آخر عمره بعد الزمان الطويل يضبط موضعها ففيه دلالة على أنه كان يعرفها بعينها لأن الظاهر أنها حين مقالته تلك كانت هلكت إما بجفاف أو بغيره واستمر هو يعرف موضعها بعينه ثم وجدت عند ابن سعد بإسناد صحيح عن نافع أن عمر بلغه الخ

حافظ ابن حجرؒ کے اس قول پر مضمون نگار نے ایک دقیق اعتراض کیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مکان الشجرہ فرمایا ہے بعین الشجرہ نہیں فرمایا۔ دراصل درخت کی شناخت اور ہے اور جگہ کی شناخت اور، پہچان اور ہے اور یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس درخت کو پہچانتے تھے الخ

مگر یہ سرد یا تقریر محض اس خیال کا نتیجہ ہے کہ مضمون نگار نے عبداللہ بن عمرؓ و مسیبؓ کی روایات سے یہ مطلب نکالا ہے کہ وہ درخت غیبی طور پر زمین سے اٹھا لیا گیا یا تمام صحابہ کی نظروں سے غائب کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ محض دعویٰ بلا دلیل اور خیالی ڈھکوسلا ہے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ ان حضرات کے قول سے صرف ان کا بھول جانا اور جگہ کا مشتبہ ہو جانا معلوم ہوتا ہے۔ نہ وہ تمام صحابہ کے متعلق استغراق اور عموم کے ساتھ نسیان کے مدعی ہیں نہ غیبی اختفاء اور رفع کے قائل ہیں۔ اور جب سب کا نسیان اور غیبی اخفاء ثابت نہیں تو یقیناً کسی صحابی کا اس کو اس کی جگہ کو پہچاننا خود اس درخت کو پہچاننے کو بھی مستلزم ہے۔

دوسرا اشکال مضمون نگار نے حافظ صاحب کے قول پر کیا ہے کہ اگر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے قول کے وہ معانی ہیں جو حافظ ابن حجر نے بیان فرمائے کہ ان کی آخر عمر نابینائی تک وہ درخت بعینہٖ باقی تھا یعنی سنہ اٹھتر کے

کے الفاظ یہ ہیں جو خود مضمون نگار نے طبقات ابن سعد سے نقل کیے ہیں۔

قال کان الناس یأتون الشجرة التی یقال لها شجرة الرضوان فیصلون عندها فبلغ ذلک عمر بن الخطاب فاوعدهم فیها وامر بها فقطعت۔

اس میں نافع نے یہ کہاں دعویٰ کیا ہے کہ لوگ حقیقی شجرۃ الرضوان کے نیچے نماز پڑھنے جایا کرتے تھے بلکہ وہ تو صرف یہ فرماتے ہیں کہ ایک درخت جس کو شجرۃ الرضوان کہا جاتا تھا کے نیچے لوگ نماز پڑھتے تھے اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ وہ واقعی وہی حقیقی شجرہ ہو جس کے نیچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی تھی یا اور کوئی درخت ہو جس کو لوگوں نے شجرۃ الرضوان سمجھ کر اس لقب سے مشہور کر دیا۔ پس مضمون نگار کے نزدیک اگر حقیقی شجرہ مخفی یا مفقود یا مرفوع من الدنیا ہو چکا ہے۔ اس کو اثر نافع کو رد کرنے اور صحیح سند کو ضعیف کر کے اپنی لیاقت ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی وہ بخاری کی روایات اور اس اثر میں [illegible] مطابقت دے سکتا تھا کہ بعد میں لوگوں نے اپنے قیاس و ظن غالب سے کسی اور درخت کو شجرۃ رضوان سمجھ کر متبرک قرار دے لیا ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو کٹوا دیا۔ اگر مضمون نگار یوں تقریر کرتا اور اثر نافع کے ماننے والوں کو لا مذہب و جہال نہ بناتا تو ہم کو اس سے الجھنے کی ضرورت نہ تھی اور اس کو بھی اس فضول بحث میں پھنسنے کی نوبت نہ آتی جس میں وہ کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا۔ هذا والله اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۸ رجب المرجب سنہ ۱۳[illegible]ھ

| رومال کا گرہ دیکر یا دونوں پر چھوڑنا سدل میں داخل ہے۔ | السوال : چند مسئلے درج ذیل ہیں |
|---|---|

۱۔ اول یہ کہ کسی نے سر یا کندھوں کے دونوں جانب رومال یا اس قسم سے کوئی اور کپڑا ایک دو گرہ دیکر یا یوں ہی گلے میں لپیٹ کر پھر کپڑے کے دونوں گوشوں کو چھوڑ دے تو آیا یہ سدل توب میں داخل ہے یا نہیں ؟

۲۔ دوسرے یہ کہ من تشبہ بقوم فھو منھم کا خلاصہ مضمون بیان فرمائیے کہ مشابہت کسے کہتے ہیں اور کسی عارض کی وجہ سے کبھی مرتفع بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔

# الجواب

رومال وغیرہ کا اس طرح گلے میں دیکر گوشوں کو چھوڑ دینا سدل میں داخل ہے قال فی الطحطاوی فی حاشیتہ علی مراقی الفلاح : وفی البحر عن فتح القدیر ان السدل یصدق علی ان کون المندیل مرسلاً من کتفیہ کما یعتادہ کثیر فینبغی لمن علی عنقہ مندیل ان یضعہ عند الصلاۃ ولا فرق بین ان یکون محفوظاً من الوقوع اولا اھ

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ رومال خواہ گرنے سے محفوظ ہو (جیسے گرہ لگی ہوئی ہو) یا محفوظ نہ ہو بہر حال سدل میں داخل ہے۔

۲۔ تشبہ بالکفار کی چند صورتیں ہیں :

۱ : فطری امور میں مشابہت مثلاً کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، لیٹنا، صفائی رکھنا وغیرہ یہ مشابہت حرام نہیں۔

قال فی الدر : فان التشبیہ بھم لایکرہ فی کل شئ بل فی المذموم وفیما یقصد بہ التشبہ کما فی البحر اھ وقال الشامی تحت قولہ لایکرہ فی کل شئ ۔ فانا ناکل ونشرب کما یفعلون اھ ج ۱ ۔ ص ۴۵۲

۲ : عادات میں مشابہت ۔ مثلاً جس ہیئت سے وہ کھانا کھاتے ہیں اسی ہیئت سے کھانا یا لباس ان کی وضع پر پہننا ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ہماری کوئی وضع پہلے سے ہو اور کفار نے بھی اس کو اختیار کر لیا ہو خواہ ہمارا اتباع کرکے یا ویسے ہی تو اس صورت میں یہ مشابہت اتفاقیہ ہے ۔ اور اگر ہمارے وضع پہلے سے جدا ہو اور

اس کو چھوڑ کر ہم کفار کی وضع اختیار کریں یہ ناجائز ہے۔ اگر ان کی مشابہت کا قصد بھی ہے تب تو کراہت تحریمی ہے اور اگر مشابہت کا قصد نہیں ہے بلکہ اس لباس و وضع کو کسی اور مصلحت سے اختیار کیا گیا ہے تو اس صورت میں تشبہ کا گناہ نہ ہوگا مگر چونکہ تشبہ کی صورت ہے اس لئے کراہت تنزیہی سے خالی نہیں۔

قال هشام رأيت على ابى يوسف نعلين مخصوفين بمسامير فقلت اترى بهذا الحديد بأسا قال لا قلت سفيان وثور بن يزيد كرها ذلك لان فيه تشبها بالرهبان فقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يلبس النعال التى لها شعر وانها من لباس الرهبان فقد اشار الى ان صورة المشابهة فيما تعلق به صلاح العباد لا يضر فان الارض مما لا يمكن قطع المسافة البعيدة فيها الا بهذا النوع اھ قلت وفعله عليه السلام محمول على بيان الجواز اذا كان بدون القصد اھ

مگر چونکہ آجکل عوام جواز کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں ان کا قصد تشبہ ہی کا ہوتا ہے اس لئے اکثر احتیاط کے لئے عادات میں بھی مطلقاً تشبہ سے منع کیا جاتا ہے خواہ تشبہ کا قصد ہو یا نہ ہو۔

تک ان امور میں تشبہ جو کفار کا مذہبی شعار ہے یا دینی رسم اور قومی رواج ہے جیسے زنار وغیرہ پہننا یا مجوس کی خاص ٹوپی جو ان کی مذہب کا شعار ہے اس میں تشبہ حرام بلکہ بعض صورتوں میں کفر ہے۔ عالمگیریہ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۳ر جمادی الاولیٰ

# کتاب الوصیۃ

**فقراء کو کھانا کھلانے کی وصیت کرنے کی ایک صورت کا حکم**

**السؤال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین اس معاملہ میں کہ اہل اسلام میں سے ایک شخص فوت ہوگیا اور وہ مرحوم قرضدار تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری وصیت پر روز اول یکصد روپیہ خرچ اٹھا کر لوگوں کو روٹی کھلانا تاکہ مجھ کو ثواب ملے۔ اور مرحوم کی جائیداد معمولی ہے۔ آیا میت مذکور یکصد اٹھا کر روز اول صدقہ کرکے عام لوگوں کو کھلانا درست ہے یا نہیں؟

## الجواب

اگر وہ وصیت کرکے مرگیا جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو اگر سو روپیہ اس کے کل ترکہ کی تہائی میں سے نکل سکے تو ۱۰۰ روپیہ کی مقدار میں اس کے ترکہ کی کچھ چیزیں فروخت کرکے سو روپیہ سے فقراء کو کھانا کھلانا ورثہ کے ذمہ ضروری ہے۔ اگر کھانا نہ کھلاویں تو فقراء کو اتنی رقم صدقہ کردی جاوے اور اگر ثلث ترکہ میں پورے سو روپیہ کی گنجائش نہ ہو تو جتنی گنجائش ہو اتنا ہی خرچ کردیں اور قرض کرکے کھلانا ورثہ کے ذمہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۲ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ

**زانیہ کی امور خیر میں صرف کرنے کی وصیت اور اس مال کا حکم**

**السؤال:** ایک لونڈی طوائف مرتے وقت وصیت رنڈیوں کو کر گئی کہ میرے مال میں سے ایک ہزار روپیہ فی سبیل اللہ دینا اور کچھ میرے ختم درود پر صرف کرکے بقیہ مال میرے وارثوں کو

دیدینا۔ چنانچہ بعد وفات مذکورہ کے تمام مالی انجمن کے ممبروں نے اپنے قبضہ تحویل میں لے لیا ہے سب کا ارادہ یہ ہے کہ اس روپیہ سے متوفاۃ نے اللہ کے واسطے دینے کی وصیت کی ہے اس لیے پانی کا ایک نل قبرستان میں پہنچایا جائے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے روپیہ سے جو نل پہنچایا جاوے گا اس کا پانی جائز ہے یا ناجائز۔ صاف طور پر آیت و حدیث نبوی کا حوالہ دیکر جواب عنایت فرمادیں مکرر عرض ہے کہ یہ عورت مذکورہ پیشہ زنا کرتی تھی اور اخیر تک زنا کرتی رہی جس قدر روپیہ اس کے پاس ہے وہ زنا کی کمائی کا ہے۔ کیا ایسا روپیہ مسجد میں لگ سکتا ہے یا انجمن جو لڑکے تعلیم قرآن اور تعلیم دینیات پاتے ہیں وہ روپیہ تعلیم دینے والوں کو کھانا جائز ہے یا نہیں۔ قبرستان میں نماز جنازہ اس پانی کے ساتھ جائز ہے یا نہیں۔ بعض قبرستان میں حدود سے باہر عصر و مغرب کی نماز بھی پڑھ لیتے ہیں اس پانی سے وضو کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

عاجز کریم بخش لوہار

مدرسہ ایمن بہادر ملکہ وار۔ از کالکا

# الجواب

صورت مذکورہ میں جب اہل انجمن کو معلوم تھا کہ یہ مال کسب خبیث کا ہے تو اس کا لینا ناجائز تھا۔ اور لینے کے بعد اس کو مصارف خیر میں لگانا بھی جائز نہیں۔ اور اگر اس پر بھی وہ اس مال سے پانی کا نل لگا دیں گے تو اس نل سے بلا واسطہ یعنی استعمال بالمس کے ساتھ وضو وغیرہ کرنا بہتر نہیں ہوگا۔ ثواب میں کمی رہے گی۔ لیکن وضو صحیح ہو جائے گا۔

لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم مھر البغی حرام قلت ونظیرہ الحوض فی الارض المغصوبۃ یکرہ التوضی بمائہ مع الحکم بصحۃ الوضوء والصلوٰۃ البتہ ایک حیلہ سے یہ کراہت وغیرہ مرتفع ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اس متوفاۃ کے ورثہ کو یہ رقم خبیث واپس کرکے ان سے یہ کہا جائے کہ تم کسی ہندو سے ہمارے سامنے اتنی ہی رقم قرض لے کر ہمیں دیدو پھر تم اس کا قرضہ ادا کر دینا۔ اس صورت میں وہ

رقم حلال ہوگی۔ اس سے نل وغیرہ جو کچھ چاہیں بنا دیا جائے اور اس طرح ہندو سے قرض لی ہوئی رقم کو مسجد میں بھی لگا سکتے ہیں۔ انجمن کے بچوں کو بھی دے سکتے ہیں، مدرسین کی تنخواہوں میں بھی صرف کر سکتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ کیا گیا تو خاص کسب زنا کو کسی کام میں صرف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ حرام ہے اور حرام مال میں تصرف بھی حرام ہے۔

فلیس سبیلہ الا ان یتصدق الورثۃ او الوصی او وکیلھم علی من لم یکن عندہ قوت یومہ وکان مضطراً الی اکلہ۔ واللہ اعلم۔

اور اگر وصیت ثلث سے زائد کی ہے تو زائد میں ورثہ کی رضامندی بھی شرط ہے اور نابالغ ورثاء کی رضامندی معتبر نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۳ جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ

**وصیت کی ایک خاص صورت**

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس بارے میں کہ ہندہ نے کچھ اپنا زیور اپنی حیات میں زید کے پاس بطور امانت رکھا اور کچھ پہنے رہی اور امانت کے وقت یہ کہہ دیا کہ میں اپنا سارا زیور جو امانت ہے اور جو میں پہن رہی ہوں خیرات کروں گی اور کچھ دنوں کے بعد ہندہ کا انتقال ہوگیا اور وہ زیور جو پہن رہی تھی وہ بھی امانت زید میں آگیا اور ہندہ نے مرض الوفات یعنی مرنے سے ایک روز پہلے زید سے یہ کہا کہ میرا سارا زیور خیرات کر دینا لہٰذا صورت مذکورہ بالا میں زید کو کیا کرنا چاہیے۔ کیا وہ کل زیور خیرات کر دے یا بحیثیت وصیت ثلث خیرات کرے اور دو حصہ ورثاء کو موافق فرائض تقسیم کر دے۔

نوٹ: اس ہندہ کا کچھ مہر اور آٹھواں حصہ اس کے زوج کے مال میں نکلتا ہے جس کے آجانے کے بعد یہ کل زیور ثلث مال میں آسکتا ہے۔ تو یہ کل زیور خیرات ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور جو نا قابل وصول ہے اس کو ورثاء دعویٰ کر کے وصول کریں۔ لیکن کچھ وارث یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے واسطے سب مال ایسا کیوں چھوڑا جاتا ہے جو ہم وصول نہ کر سکیں جو مال زید کے قبضہ میں ہے۔ اس میں سے بھی تو کچھ دینا

چاہئے۔ بینوا توجروا۔

السائل:
عبدالرحیم ولد لال محمد۔ مرادآباد
۵ محرم الحرام ۱۳۴۴ھ

## الجواب

حامدًا و مصلیًا

صورت مذکورہ میں یہ زیور کل وصیت ہے کیونکہ میت کے کل مال میں سے ثلث کے اندر نکل سکتا ہے۔ لہٰذا اس میں وصیت کو نافذ کرنا ضروری ہے ورثہ میں سے کسی کا اس میں حق نہیں۔ بشرطیکہ یہ خوب محقق ہو کر یہ کل زیور ثلث میں سے نکل سکتا ہے۔

قال فی الدر، و بثلث دراهمه او غنمه او ثیابه متفاوتة ای الدراهم والغنم ان خرج من ثلث جمیع باقی اصناف ماله و بثلث الباقی فی الاخیرین ای الثیاب والعبید وان خرج الباقی من ثلث الکل اھ دل کلامه علی انه اذا اوصی بشیئ وله من المال اصناف متعددة وخرج الموصی به من ثلث الکل فالوصیة جائزة۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ

مرض الموت میں اس کہنے کا حکم کہ میرا روپیہ جو میرے پاس ہے میرے بھائی کے لڑکے کو دینا

السوال: زید کا کچھ روپیہ بطور امانت بکر کے پاس جمع ہے۔ زید جو بہت بیمار ہوا تو اس نے بکر سے کہا کہ اگر میں مر جاؤں تو جو روپیہ آپ کے پاس ہے ہمارے بھائیوں کو دیدینا۔ چونکہ ملک میں نہ یکایک اس کے ایک بھائی کا لڑکا ملک سے بتلاش روزگار یہاں پہنچ گیا عین سکرات میں زید نے بکر سے یہ کہا کہ جو روپیہ ہمارا تمہارے پاس ہے ہمارے بھائی کے اس لڑکے کو دینا۔ اب وہ شخص مر گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میت کے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ اور میت کے بھائیوں نے ایک تار بھی بھیجا کہ روپیہ اور سامان کسی کو نہ دینا۔ پس آنجناب ارشاد فرما دیں کہ اس روپیہ اور سامان وغیرہ

کا حصہ زکون ہوگا۔ بینوا توجروا

# الجواب

حامدًا و مصلیًا

صورت مسئولہ میں اگر بحالت ہوش وحواس بیمار نے امانت کا روپیہ بھائی کے لڑکے (بھتیجے) کو دلایا ہے تو ظاہر ہے کہ بیمار کے دونوں قول وصیت کے حکم میں ہیں۔ اور وصیت میں بلا اجازت ورثاء تہائی پر زیادتی جائز نہیں، نیز وصیت بحق ورثاء باطل ہوتی ہے۔ پس امانت میں سے نصف رقم بھتیجے کو بحکم وصیت دینا چاہئے بشرطیکہ یہ نصف رقم میت کے کل ترکہ کی تہائی سے زائد نہ ہو اور اگر تہائی پر زائد ہوتی ہے تو اس زیادتی کی مقدار کو کم کر کے دین بقیہ ترکہ جس میں امانت کا روپیہ بھی شامل ہے میت کے دو بھتیجوں اور ایک بہن میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ پانچ حصے کر کے دو دو حصے ہر ایک بھائی کو اور ایک حصہ بہن کو دیا جائے۔

والدلیل هذا اوصی لاجنبی ووارثه فللاجنبی نصف الوصیة وبطل وصیته للوارث وانما تبطل لانها من اهل الوصیة علی ما مر ولذا تصح بالاجازة۔ (درمختار)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب موصی نے کسی اجنبی اور وارث کے لئے وصیت کی تو نصف حق اجنبی کا حق ہوا اور وارث کے حق میں بقیہ نصف وصیت باطل قرار پاوے گی رہا یہ امر کہ بھتیجے کے حق میں پچھلا قول پہلے قول سے رجوع قرار دیا جاوے لہذا اس میں قابل التفات نہیں ہے کہ رجوع کے لیے قول صریح ہونا چاہئے محض دلالت معتبر نہیں ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ اس صورت میں جب کسی نے کل مال کی وصیت ایک شخص کے لیے کی ہو اور تہائی مال کی وصیت دوسرے شخص کے لیے کی ہو تو پچھلی صورت میں پہلی وصیت کے لیے رجوع قرار دی جائے حالانکہ فقہاء کرام اس کے برخلاف یہ حکم دیتے ہیں۔ فتدبره سبحانه تعالیٰ: فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

عہ جب وصیت نصف کی بنا صحیح مان لی ہے تو یہ نصف رقم کل ترکہ کا سدس ہونا چاہئے کہ لا یخفی۔ عبدالکریم عفی عنہ

عہ درمختار ... ج ۵ - ص ۶۳۴ - عبدالکریم عفی عنہ

## الکلام علی الجواب

ہمارے نزدیک متوفی کا سکرات میں یہ کہنا: "جو ہمارا روپیہ ہے تمہارے پاس، وہ ہمارے بھائی کے اس لڑکے کو دیدینا" بھتیجے کے لیے وصیت میں صریح نہیں ہے۔ بلکہ احتمال ہے کہ اس کو اس نیت سے دلانا چاہتا ہو کہ اس کے ذریعہ سے حقداروں کے پاس بسہولت پہنچ جائے گا۔ اور احتمال کی صورت میں وصیت کا ثبوت نہیں ہو سکتا پس اس روپیہ اور سامان کے حقدار میت کے دونوں بھائی اور بہن ہیں، بھتیجے کا اس میں کچھ حق نہیں۔

قال فی العالمگیریۃ فہٰذہ المسائل انہ اذا اتی بلفظ ینبئی عن تملیک الرقبۃ یکون ھبۃ و اذا کان منبئا عن تملیک المنفعۃ یکون عاریۃ و اذا احتمل ھٰذا و ذاک ینوی کذا فی المستصفی۔ اھ۔

(ج ۵ - ص ۳۲۹)

قلت والوصیۃ اخت الھبۃ فی لانھا تکونھا تملیکا بعد الموت فلا تصح مالم تکن بلفظ صریح فیھا - واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون - ۵ جمادی الاخری ۱۳۴۳ھ

**حکم الوصیۃ بوقف حصۃ من مالہ** السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ قبلہ والد صاحب حج کو تشریف لے گئے اور اشیاء ذیل احقر کے سپرد فرما گئے۔ نقد و مال تجارت -/۳۰۰ مکانات سکنائی -/۲۰۰ جائیداد صحرائی -/۲۰۰ - کل تخمینات -/۷۰۰

ایک پاکٹ بک میں بطور وصیت فرما گئے جس کا خلاصہ یہ ہے: ایک حصہ وقف کر دیا جائے مال وغیرہ کا۔ ۱۹۱۲ء کو واپس تشریف لے آئے۔ اور جزوی طور پر دوکان پر تشریف لاتے رہے۔ کچھ دنوں بعد بیمار ہو گئے جس سے دوکان کا آنا ترک ہو گیا احقر نے اپنی مدد کے واسطے ایک دیانتدار تجربہ کار کو دکان میں شریک کر لیا اور منافع کے تین حصے کیے۔ ایک حصہ قبلہ والد صاحب کا، ایک احقر کا اور ایک حصہ شریک کا۔ اور قبلہ والد صاحب کو اطلاع بھی کر دی جس پر خاموشی فرمائی۔

دسمبر ۱۹۱۳ء کو قبلہ والد صاحب شب کو بحالت بیماری جوکہ مجنونانہ تھی لاپتہ ہوگئے۔ احقر ان کی اصل رقم اور منافع درج کرتا رہا۔ ۱۹۲۱ء کو ان کے منافع کی رقم سے ایک جائیداد -/۳۰۰۰ تین ہزار روپے سے کچھ زائد کی خریدلی۔
جب وہ لاپتہ ہوئے تھے ان کی عمر تخمیناً ۷۵ برس کی تھی، بعد دس برس کے علماء کرام سے دریافت کیا گیا تو فرمایا گیا کہ عمر طبعی پوری ہوچکی ہے۔ نیز تلاش بھی بہت کی گئی مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ دیگر کوئی وارث بھی سوائے احقر کے نہیں چھوڑا اس پر یہ خیال ہوا کہ اب بظاہر ناامیدی ہے۔
۱۹۲۳ء کو احقر نے ملکیت اپنی تصور کی اور اس وقت موجود مالیت حسب ذیل بھی تھی:
مال ونقد -/۲۰۰۰ سابقہ جائیداد صحرائی -/۱۰۰۰۰ + جائید خریدکردہ -/۳۰۰۰ کل تخمیناً -/۱۵۰۰۰ پندرہ ہزار ہے
لہٰذا یہ ارادہ بھی کرلیا ہے کہ پانچ ہزار روپیہ تدریجاً خرچ کردیجئے جاویں لہٰذا ۱۹۲۵ء سے اس کا نفاذ جاری کردیا گیا۔ اور اب تک اللہ واسطے تقریباً -/۱۰۰۰ ہزار کے قریب خرچ بھی ہوگئے۔ اب ۱۹۳۲ء میں ہر جائیداد کی حالت گرگئی ہے اور مالیت میں کمی بھی ہوگئی ہے۔ اس لیے اب تین امور دریافت طلب ہیں۔ براہ کرم ان کا جواب جلد مرحمت فرمادیں
۱۔ یہ وصیت صحیح ہوگی یا نہیں؟
۲۔ ایک حصہ سے احقر نے ⅓ حصہ مراد لیا ہے آیا یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟
۳۔ اگر یہ وصیت صحیح ہے تو کس رقم کو اصل مالیت لگایا جاوے، سابقہ یا درمیانی یا موجودہ۔

السائل:
احقر نہال الدین غفرلہ مرادآبادی
چوک بازار ۲۵ر شوال ۱۳۵۲ھ

# الجواب

قال في الدر عن واقعات المفتين معزيًا للقنية انه انما يحكم بموته بقضاء لانه امر محتمل فما لم ينضم اليه القضاء لايكون حجة اهـ

قال الشامي قوله بقضاء هو احد قولين - قال القهستاني وفي القاعدين قوله فتعتد عرسه دلالة على انه يحكم بموته بمجرد انقضاء المدة فلا يتوقف على قضاء القاضي كما قال شرف الائمة وقال نجم الائمة القاضي عبد الرحيم نص على انه يتوقف عليه كما في المنية اهـ وقال شرف الائمة موافق للمتون سائحاني قلت لكن المتبادر من العبارة ان المنصوص عليه في المذهب الثاني اهـ (ج ٣ - ص ٥٣ - كتاب المفقود)

وفي البدائع من باب الوصايا وسواء كان الموصى به معلومًا او مجهولًا فالوصية جائزة لان هذه جهالة تمكن ازالتها من جهة الموصي ما دام حيًا ومن جهة ورثته بعد موته فاشبهت جهالة المقر به في باب الاقرار وانها لا تمنع صحة الاقرار كذا جهالة الموصى له تمنع صحة الوصية ايضًا وعلى هذا مسائل منها ما اذا اوصى الرجل بجزء من ماله او بنصيب من ماله فان بين في حياته شيئًا والا اعطاه الورثة ما شاءوا بعد موته لان هذا الالفاظ تحتمل القليل والكثير فيصح البيان فيه ما دام حيًا ومن ورثته اذا مات لانهم قائمون مقامه ولو اوصى له بسهم من ماله فله مثل اخس الانصباء ويزاد على الفريضة ما لم يزد على السدس عند ابي حنيفة رحمه الله وعندهما ما لم يزد على الثلث فعلى رواية الاصل يجوز النقصان عن السدس عنده وعلى رواية الجامع الصغير لا يجوز وبيانه اذا مات الموصي وترك زوجة وابنا فللموصى له على رواية الاصل اخس سهام الورثة وهو الثمن ويزاد على ثمانية اسهم سهم آخر فيصير تسعة فيعطى تسع المال وعلى رواية الجامع الصغير يعطى السدس لانه اخس سهام الورثة - الى ان قال وجه قولهما ان السهام اسم لنصيب مطلق ليس له حد مقدر بل يقع على القليل والكثير كاسم الجزء الا انه يسمى سهمًا الا بعد القسمة فيتقدر

بواحد من انصباء الورثة والاقل متيقن به فيقدر به الا اذا كان يزيد على الثلث فيزاد الى الثلث (الا ان يزيد منه) لان الوصية لا جواز لها باكثر من الثلث من غير اجازة الورثة۔

ووجه قول ابی حنیفة ما روی عن ابن مسعود انه سئل عن رجل اوصی بسهم من ماله فقال له السدس۔ وروی عن ایاس بن ابی معاویة انه قال السهام فی کلام العرب السدس اھ (ج ۳۔ ص ۳۵۶)

قلت ولفظ الحصة فی لسان الهند کلفظ الطائفة۔ والجزء والبعض والشقص فی العربیة ولیس مثل السهم کما لا یخفی۔

حاصل یہ ہوا کہ صورت مسئولہ میں بعد موت اقران کے بدون قضاء قاضی کے ورثہ کا مال مفقود پر قبضہ مالکانہ کرلینا جائز ہے علی قول شرف الائمة۔ واختاروہ فی حق الاموال تیسیرا۔ واما فی حق الزوجة فنختار قول نجم الائمة احتیاطا فی باب الفروج۔

۲۔ اور ایک حصہ کی وصیت شرعا صحیح ہوگی اور وارث کو اختیار ہے کہ جتنا چاہے اور جس مال میں سے چاہے جتنا حصہ چاہے وقف کردے۔ اور سائل نے جو ایک حصہ سے ایک ثلث مراد لے کر وقف ثلث کا ارادہ کیا ہے اس میں غایت احتیاط ہے

واللہ اعلم

تنبیہ: نقد روپیہ صدقہ کرنے سے وصیت ادا ہوگی بلکہ وقف کرنے سے وصیت ادا ہوگی۔ اور وقف کا محل اعیان ہیں دراہم و نقود نہیں۔ فقط۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴ر شوال ۱۳۴۵ھ

**وصیت کے متعلق چند سوالات پر مشتمل ایک استفتاء**

السؤال: مرحوم نے مرتے وقت وصیت کی کہ میرا مکان نصف۔ نصف میری دونوں بیٹیوں کو دیا جائے اور زیور کے متعلق یہ وصیت کی کہ ۱/۲ حصہ خیرات کیا جائے باقی ۱/۲ حصہ نصف دونوں بیٹیوں کو دیا جائے

## الجواب

لڑکیوں کے بارے میں وصیت باطل ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور خیرات کی وصیت درست ہے۔ اگر مرحومہ کی مملوک زیور وغیرہ میں سے اس کا ذاتی قرضہ ادا کر کے زیور بچے تو اس بقیہ میں سے ۱/۳ حصہ خیرات کرنا ضروری ہے۔ باقی ۲/۳ سب وارثوں کا حق ہے۔

سوال ۲ مکان اور زیور کی حقیقت یہ ہے کہ شوہر مرحومہ نے دو مکان اپنی کمائی سے خریدے مگر بیع نامہ بجائے اپنے نام کے اپنی زوجہ مرحومہ کے نام کر دیا۔ بعدہٗ ان مکانات کو مسمار کرا کر ان کے ملبے سے اور نیز اپنی کمائی ہوئی زر کثیر سے ایک بڑا مکان تعمیر کرا دیا۔ مرحومہ نے اپنا مہر معاف کر دیا تھا۔ مرحومہ کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا نہ اس کو کوئی ترکہ اپنے باپ یا کسی اور رشتہ دار سے پہنچا تھا۔ وقتاً فوقتاً حسب خواہش مرحومہ شوہر مرحومہ نے زیور بنوایا جو مرحومہ کے پاس رہتا تھا۔ اور مرحومہ اس کو پہنا کرتی تھیں لیکن اس زیور کی زکوٰۃ ہمیشہ شوہر مرحومہ نے اپنی کمائی کے پیسے سے سالانہ خود حساب کر کے ادا کی ہے کوئی گفتگو مرحومہ اور اس کے شوہر کے درمیان اس زیور کے متعلق ایسی نہیں آئی کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ اس زیور کے خورد برد کرنے کا یا علیحدہ کرنے کا کوئی حق مرحومہ کو حاصل تھا۔

## الجواب

فقط بیع نامہ کسی کے نام لکھوانے سے اس کی ملک ثابت نہیں ہوتی بلکہ جس کے نام سے زبانی بیع ہوئی ہو اسی کی ملک ہے۔ البتہ اس کے سوا اور کسی طرح ہبہ وغیرہ سے مع اس کے شرائط کے اگر مالک کر دیا ہو تو دوسری بات ہے۔ اور اگر زیور وغیرہ میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے۔ اگر آپ کے یہاں عام دستور ہے کہ فقط پہننے کے لیے دیا کرتے ہیں تب تو مرحومہ کی ملک نہیں ہوئی۔ اور اگر یہ دستور ہے کہ عورت کو مالک بنا دیتے ہیں تو وہ زیور اور کپڑے وغیرہ ملک مرحومہ کے ہو گئے۔ اور نیز جو اثاثہ بیت اور زیور وغیرہ مرحومہ کے والدین نے اس کو دیا ہے وہ اس کی ملک ہے۔

---

عـہ اگر یہ معافی مرض الموت میں ہوئی ہو تو معتبر نہیں۔ مہر کی رقم مرحومہ کے ترکہ میں داخل کی جائے۔

منہ

سوال ۳ : اب سوال یہ ہے کہ درج کردہ بالا حالات میں مرحومہ کو مکان اور زیور پر ایسی ملکیت شرعًا حاصل تھی یا نہیں کہ مرحومہ ان کے متعلق مذکورہ بالا وصیت باختیار خود بلا مشورہ یا رضامندی اپنے شوہر کر سکتی تھی۔

## الجواب

اپنی ملک یا خیرات کی وصیت صحیح ہے، دختروں کے متعلق کسی حالت میں صحیح نہیں جیسا کہ جواب نمبر ۲ میں تفصیل گزر چکی۔ واللہ اعلم۔

سوال ۴ : اگر یہ وصیت کر سکتی تھی تو کہاں تک شرعًا اس کا شوہر اس وصیت پر عمل کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اور درصورت عمل نہ کرنے کے وہ کس گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اور قیامت میں اس سے کیا مواخذہ ہوگا۔ وصیت کے وقت شوہر مرحومہ کا موجود تھا۔ اس نے وصیت کو سنا مگر کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموش رہا۔

## الجواب

جس صورت میں موافق نمبر ۳ وصیت صحیح ہوگئی ہے اس میں اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ پورا نہ کیا جاوے تو سخت گناہ ہے اور اس مال کو رکھنا حرام ہے اور جس وصیت کا اس کو حق نہ تھا یعنی دختران کے بارے میں، اس میں آپ کی خاموشی سے وہ وصیت لازم نہیں۔ البتہ اگر انتقال کے بعد آپ نے کہہ دیا ہو کہ ہم کو وصیت منظور ہے تو اس کی مملوک چیزوں میں وہ وصیت پورا کرنا آپ کے ذمہ اپنے حصہ کے مطابق واجب ہوگی۔ باقی ورثاء مثل اب وغیرہ کا حصہ برقرار رہے گا۔ آپ کی منظوری سے اس میں تغیر ہوگا یعنی اس کی مملوک زیور وغیرہ موافق نمبر ۲ میں سے اس کا ذاتی قرضہ ادا کرکے اور قرضہ کے بعد جو باقی رہے اس میں سے ۱/۳ خیرات کرے۔ باقی میں سے آپ کو ۱/۴ جو میراث میں سے پہنچتا ہے وہ ان دونوں لڑکیوں کو دیدیا جائے۔ اور ۲۱/۸۴ ہر دختر کو میراث میں سے جو ملے گا وہ اس سے الگ ہے۔ اور جو چیزیں حسب تفصیل نمبر ۳ مرحومہ کی ملک ہی نہ تھیں بلکہ آپ کی ملک تھیں ان کی بابت جب کہ وصیت کرنے کے وقت آپ کے سکوت سے اُس وصیت کا نفاذ ضروری نہ ہوا تھا۔ اسی طرح اگر بعد انتقال مرحومہ منظوری ظاہر کردی ہو تب بھی ان

اشیاء کی بابت اس وصیت کا پورا کرنا ضروری نہیں ہوا۔

ہاں اگر اس وصیت کے مطابق کوئی چیز دختران کو دیدی ہو تو اب اس کا واپس لے لینا جائز نہیں ہے۔

فی الدر (الا ان یجیز ورثتہ بعد موتہ) ولا تعتبر اجازتھم حال حیاتہ اصلاً بل بعد وفاتہ اھ (ج ۵ ـ ص ۴۲۶)

وفیہ ایضاً (ج ۵ ـ ص ۶۶۵) (وبالعین) ای معینۃ بان کانت ودیعۃ عند الوصی (من مال آخر فاجاز رب المال الوصیۃ بعد موت الموصی و دفعہ الیہ (صح و لہ المنع بعد الاجازۃ) لان اجازتہ تبرع فلہ ان یمتنع من التسلیم و اما بعد الدفع فلا رجوع لہ۔ شرح تکملہ (بخلاف ما اذا اوصی بالزیادۃ علی الثلث او لقاتلہ او لوارثہ فاجازتھا الورثۃ) حیث لا یکون لھم المنع بعد الاجازۃ بل یجبرو اعلی التسلیم الخ

کتبہ عبد الکریم عفی عنہ

از مفتاہ امداد یہ تھانہ بھون

۱۴ ربیع الاول سنہ [illegible]ھ

**فوت شدہ نمازوں کے فدیہ کے متعلق ایک وصیت اور اس کا حکم**

**السوال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے متعلق از روئے شرع شریف کے کہ: زید بیت اللہ شریف سے مشرف ہو کر مرض استسقاء میں چار ماہ کے قریب مبتلا رہ کر دنیا فانی سے کوچ کر گیا مگر دوران مرض میں انتقال ہونے کے قریب تک اس کے ہوش و حواس نہایت درست رہے۔ چنانچہ انتقال کے قریب اپنے والد بزرگوار سے اپنے قصور معاف کرا کر انہیں راضی کیا اور کاغذ قلم دوات منگوا کر اپنی مخفی نقدی وغیرہ مفصل لکھوادی اور اپنی عمر بھر کی فوت شدہ نمازوں کے فدیہ کے ادا کرنے کی وصیت کی کہ بارہ سال نابالغی کے منہا کر کے فلاں سال سے فلاں سال تک کی فوت شدہ نمازوں کو حساب کر کے ادا کر دینا اور دوران مرض میں بھی [illegible] بار اس کی ادائیگی کی نسبت تاکید کی تھی اس پر زید مرحوم کے والد نے آخری وصیت نزع کے قریب یہ بھی کہا کہ پچیس سال ہوتے ہیں اور پچیس سال کی نمازوں کے فدیہ کے غلہ کی قیمت اس وقت کے نرخ سے تخمینہ $2\frac{1}{2}$ ہزار

روپے ہوتے ہیں۔ اس پر زید نے جواب دیا کچھ پرواہ نہیں کہ میری نقد متروکہ میں سے کل نمازوں کا ادا کر دینا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد زید کا انتقال ہوگیا۔ زید مذکور نے باپ، زوجہ ایک دختر، ایک بہن ۱۲ سال سے مفقود الخبر وارث چھوڑے ہیں ان میں سے تین موجودہ وارث زید کی نمازہائے فائتہ کی فدیہ دینے پر بخوشی خاطر راضی ہیں۔ لیکن قبل ادائیگی چند سوال شرعی علماء دین سے دریافت طلب ہیں۔

۱: زید کے عمر بالغی کے بارہ سال منہا ہوں گے یا ۱۹، ۱۷، ۱۸ حسب فقہ و قانون ہو۔

۲: زید کی وصیت کے موافق اس کے ترکہ نقد میں سے کل نمازوں کا فدیہ ادا کیا جاوے گا یا کچھ کم۔

۳: غلہ کا نرخ نمازوں کے فوت ہونے کے زمانہ کا لگایا جاوے یا اس زمانہ ادائیگی کے وقت کا

۴: اس فدیہ کے مصارف کیا ہوں گے بینوا توجروا۔

نیازمند: کنور محمد یسین خان

زا سلام نگر ڈاکخانہ رامپور سہارنپور

۴ اکتوبر ۳۳ء

## الجواب

حامداً ومصلیاً۔

صورت مسئولہ میں پورے پچیس سالوں کی نمازوں کا فدیہ دیا جاوے۔ جو جب ثلث ترکہ سے وصیت پوری ہو سکے تو ورثاء کی رضامندی شرط نہیں اور اگر وصیت میں حساب غلط ہو جائے یعنی کوئی شخص اپنے ذمہ زائد نمازیں سمجھ کر وصیت کر دے باوجود کہ اس کے ذمہ اتنی نمازیں نہ ہوں تب بھی تمام وصیت کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور صورت مسئولہ میں تو حساب کی غلطی بھی ثابت نہیں ہوتی کیونکہ بارہ سال کی عمر میں بالغ ہونا ممکن ہے۔ پس جب میت نے اس عمر سے اپنا بلوغ ظاہر کیا (کیونکہ نابالغی کے بارہ سال منہا کرنے کا یہی مطلب ہے کہ میں بارہ سال کی عمر میں بالغ ہو گیا تھا اس کے خلاف کوئی وجہ نہیں) تو اس کی تکذیب کیسے کر سکتے ہیں۔ نیز صحت وصیت کے واسطے

وجوب ضروری نہیں۔ اگر اُن نمازوں کے فدیہ کی وصیت کر دے جو واجب نہیں تب بھی وصیت صحیح ہے۔ اور مصارف فدیہ کے وہی ہیں جو زکوۃ کے ہیں۔

قال فی الدر: وفی اوصیت له بجمیع ما فی هذا الكيس وهو الف فاذا فيه الفان ودنانیر وجواهر فكله له ان خرج من الثلث مجتبی۔ انتہی

قال الشامی: وكذا اوصیت بثلث مالی وهو الف فله الثلث بالغًا ما بلغ لان قوله وهو الف غیر محتاج اليه والوجيه وكذا اذا اوصیت بنصیبی من هذه الدار وهو الثلث فاذا نصيبه النصف فهو له او بجميع ما في هذ الدار وهو كرّ طعام فاذا فيه اكثر وعلله فی المحیط بانه اضاف الايجاب التمليك الى الثلث مطلقًا والى جميع ما فی الكیس تحت الاضافة الا انه غلط فی الحساب فلا يقدح فی الايجاب اھ ج ۵۔ ص ۶۵۳

وفی البحر ج ۲۔ ص ۲۸۵ وقيد نا بكونهما ادركا عدة من ايام اخر اذ لو ماتا قبله لا يجب عليهما الايصاء لما قدمناه ولكن لو اوصيا به صحت وصيتهما لانها لا تتوقف على الوجوب۔ كذا فی البدائع۔ وقال الشامی تحت قوله (مصرف الزكوة) وهو مصرف ايضًا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة كما فی القهستانی ج ۲۔ ص ۹۲

كتبه عبد الكريم عفی عنہ
۳ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ

باقی رہا یہ سوال کہ اگر فدیہ میں گندم وغیرہ نہ دیا جائے بلکہ نقد وغیرہ دیا جاوے تو کس وقت کی قیمت کا اعتبار کیا جاویگا۔ انتقال موصی کے وقت جو نرخ تھا اس سے حساب لگایا جاوے یا فدیہ ادا کرنے کے وقت جو نرخ ہو اس سے حساب لگایا جاوے۔

اس میں دو قول ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ وقت وجوب کی قیمت معتبر ہوگی۔ اس لیے ان کے نزدیک انتقال موصی کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔ لانہ وقت وجوب الفدیۃ۔ اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ وقت ادا کی۔

قال فی القنیۃ فی باب فدیۃ الجنایات بالصدقۃ: وتعتبر قیمۃ وقت الوجوب وقالا وقت الاداء۔ کذا قالوا فی زکات وفطرۃ فینبغی ان یکون

هذا الخ (ص ۱۳۱)

وفي الشامية تحت قوله فدى عنه وليه كالفطرة قدرًا اي التشبيه
بالفطرة من حيث القدر اذ لا يشترط التمليك هنا بل تكفي الاباحة وكذا
هي مثل الفطرة من حيث الجنس وجواز اداء القيمة۔ قال القهستاني: واطلاق
كلامه يدل على انه لو دفع الى فقير جملة جاز ولم يشترط العدد ولا المقدار
لكن لو دفع اليه اقل من نصف صاع لم يعتد به وبه يفتى اھ ص۷۲ ج۲

اور ان دونوں میں سے کسی کے قول کو کسی پر صراحۃً ترجیح نہیں دی گئی البتہ اشارۃً
کلام شامی سے قول صاحبین کو ترجیح معلوم ہوتی ہے پس ان دونوں صورتوں میں سے
جس صورت کو چاہے اختیار کیا جاوے۔ اور نماز میں فوت ہونے کے وقت کی قیمت کا
لگانا کسی کا بھی قول نہیں۔

رہا یہ کہ وقت ادا کس وقت کو شمار کیا جاویگا۔ آیا اس وقت کو جب کہ مسکین
کے ہاتھ میں رقم پہنچ جائے یا اس وقت کو جس میں وصی اپنے قبضے سے فدیہ کی رقم نکال کر
کسی ایسے شخص کے حوالہ کردے جو وہاں اقامت مساکین کا منتظم اور نگران ہو۔ تو ظاہر یہ
ہے کہ وقت ادا اول ہی ہے یعنی جب کہ مسکین کے ہاتھ میں رقم پہنچے نہ کہ ثانی۔ پس
لازم قیمت دینے میں اس وقت کی رعایت ہے جس میں مسکین کے ہاتھ میں رقم پہنچے۔

قال في الدر: ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء اھ
قال الشامي: فلو ضاعت لا تسقط عنه الزكوٰة بخلاف ما اذا ضاعت في
يد الساعي لان يده كيد الفقراء۔ بحر عن المحيط اھ ج۲ ص۱۸

قلت: وليس مهتم المدرسة كالساعي لان الاصل بطلان الوكالة عن
المجهولين الا في الولاية العامة والامام له ولاية عامة والساعي نائب عنه
فيد الساعي كيد الامام وهو وكيل عن الفقراء بالولاية العامة ولا كذلك
هذا فافترقا۔

ولو كان وكيلا عن الفقراء المعلومين يشترط ان لا يكون ما بيده
زائدا على قدر النصاب اي لا يكون ما يبلغ كل واحد من الفقراء زائدا

عن ان تکون بیدہ کید الفقیر فان زاد لا یجوز لاحد دفع الزکاۃ و نحوھا الی هذا الوکیل بعد صرح به فی الشامیۃ ج ۲ - ص ۱۷ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ

**وارث کے متعلق وصیت اور اس سے متعلق امانت کا ایک ضمنی سوال**

**السوال ۱:** مجھ مسماۃ اشرفی کے خاوند کی حقیقی پھوپھی مسماۃ عصمت نے بندی کو اپنی حیات میں وصیت کی کہ میرا زیور، برتن اور کپڑے جب میرا لڑکا امیر محمد بالغ ہو جاوے گا، کو دیدینا۔ اور میری لڑکی مسماۃ سعیدی کو نتھ، بلاق، بالے وغیرہ کو فلاں فلاں چیزیں دیدینا مگر بحکم خدائے بزرگ کے بندی بیوہ ہوگئی۔ بندی نے عصمت کی لڑکی سے کہا کہ فلاں فلاں چیزیں تیری والدہ نے بندی کے سپرد کی تھیں کہ میرے لڑکے امیر محمد کو بوقت بلوغ دیدینا اور اب تیری والدہ بھی مسماۃ عصمت انتقال کر گئی ہے اور بندی بیوہ ہوگئی۔ جس کی وجہ سے اب میرا ارادہ یہاں قیام کا نہیں۔ اور نہ کوئی سامان لیجا سکتی ہوں جو جو تیری والدہ نے تیرے دینے کو کہا تھا وہ تو اپنے کام میں لا اور باقی اپنے بھائی کو سن تمیز کے وقت دیدینا۔ مگر امیر محمد کے حصہ کی اشیاء بہن نے قبول نہ کیں اور کہا کہ تو ہی دیدینا بعدہ مسماۃ عصمت کے انتقال کے دس سال بعد بندی بحالت بیوگی اپنے میکہ چلی آئی۔ اس وقت اس لڑکے کی عمر یعنی امیر محمد کی تقریباً ۱۸ سال کی تھی۔ بندی کو اس کے بلوغ کا علم اس وقت نہ تھا اور وصیت بھی یہی تھی کہ جب میرے لڑکے کا بیاہ ہو جائے اور زوجہ گھر پر رہنے لگے تو اس وقت دیدینا۔ میرے میکہ آنے کے دو سال بعد میری نند مسماۃ عصمت کی حقیقی بھتیجی میرے میکہ میں میرے ملنے کو خود آئی تو بندی نے کنجی اس کو دیکر وہ تمام چیزیں بتلا کر کہدیا کہ امیر محمد کو دیدینا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے کپڑے برتن خود رکھ کر اور لڑکے امیر محمد کو نامعلوم کس قدر اشیاء ملیں، تمام ملیں یا کم۔ دریافت کرنے سے تو میری نند یہ کہتی ہے کہ میں نے کچھ نہیں لیا تو ایسی حالت میں بندی گناہ گار ہے یا مال وصیت کے بوجھ اور امانت کے ذمہ سے بری ہوگئی، بندی کو بہت فکر ہے۔

۲ عورتوں کو اوپرسے یا نیچے کی جانب سے سرگوندوانا جائز ہے یا نہیں بعض کہتی ہیں صرف چوٹی بنوالے ویسے ہی کھلے بالوں کی مینڈھیاں بنوا کر سر نہ گندھوائے اس کا کیا حکم ہے؟

## الجواب

۱ اول تو یہ وصیت باطل ہے، جو کچھ مرحوم نے کہا اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔ بلکہ سب مال کل ورثاء میں مشترک رہے گا۔ وہ آپس میں باقاعدہ عمومی تقسیم کرنے کے مختار ہیں اس لیے دونوں بہن بھائی کو مسئلہ کی اطلاع کر دو۔ دوسرے جس طریقہ سے تم نے امانت پہنچائی ہے اسی طریقہ سے تم بری نہیں ہوئیں بلکہ لازم ہے کہ اپنی نند اور عصمت کے لڑکے سے خوب تحقیق کرو۔ اگر پہنچانا ثابت ہو جائے تو خیر ورنہ اپنی نند سے وصول کر کے دلوانا تمہارے ذمہ ہے اگر وہ نہ دے تو تمہارے ذمہ تاوان ادا کرنا لازم ہے۔ یا عصمت کے کل ورثاء سے معاف کرا لو۔

فی العالمگیریہ ، ولو قال رددتہا بید اجنبی وصل الیک وانکر ذلک صاحب المال فہو ضامن الا ان یقر بہ رب الودیعۃ او یقیم المودع بینۃ علی ذلک۔ کذا فی المحیط۔ واللہ اعلم۔ ج ۵ ص ۲۱۶

۲ خواہ صرف چوٹی بنا دیں یا مینڈھیاں یہ دونوں جائز ہیں۔ البتہ کفار اور فساق کی مشابہت نہ ہو۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفا اللہ عنہ

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

۳ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

**وصیت للوارث والاجنبی کی ایک صورت** | السؤال: ایک شخص نے اپنی زوجہ کے واسطے نصف متروکہ اور ایک اجنبی کے واسطے نصف متروکہ کی وصیت کی۔ زوجہ کے علاوہ دیگر وارث بھی موجود ہیں۔ وہ اس وصیت کو جائز نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں وصیت ثلث میں نافذ ہوگی اور اجنبی کو ثلث سالم ملے گا یا چھٹا حصہ ملے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ اجنبی کو سدس ملے گا۔ اور عالمگیریہ کے اس جزئیہ سے استدلال کرتے ہیں:

اذا اوصی لاجنبی و وارثہ کان للاجنبی نصف الوصیۃ الخ | مولوی محمد فاروق

شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور

# الجواب

قال فى البدائع ج ۷ ص ۳۳۲ ولو اوصى بالثلث لرجلين ومات الموصى فرد احدهما وقبل الآخر كان للآخر حصته من الوصية لانه اضاف الثلث اليهما وقد صحت الاضافة فانصرف الى كل واحد منهما نصف الثلث فاذا رد احدهما الوصية ارتد فى نصفه وبقى النصف الآخر لصاحبه الذى قبل . كمن اقر بألف لرجلين فرد احدهما اقراره ارتد فى نصيبه خاصة وكان للآخر نصف الاقرار كذا ههنا بخلاف ما اذا اوصى بالثلث لهذا والثلث لهذا فرد احدهما وقبل الآخر ان كل الثلث للذى قبل الا انه اذا قبل صاحبه يقسم الثلث لضرورة المزاحمة اذ ليس احدهما اولى من الآخر فاذا رد احدهما زالت المزاحمة فكان جميع الثلث له .

ع۱ قلت ، ولا يخفى ان رد الشارع الوصية لاحدهما كرد الموصى له الوصية بل فوقه يدل على ذلك ان صاحب البدائع ذكر بعد ذلك مسئلة الوصية لبعض ورثته ولاجنبى ثم مثله بمسئلة الرد اھ ج ۷ ص ۳۳۸

ع۲ ثبت بقول البدائع ان المزاحمة انما تكون اذا كان اوصى بالثلث لاثنين واما اذا اوصى بالثلث لواحد وبالثلث لآخر لم تقع المزاحمة الا اذا استحقا جميعا وهو ظاهر .

ع۳ وكذلك اذا اوصى بالنصف لواحد وبالنصف للآخر كما لا يخفى . فما فى العالمگيرية اذا اوصى لاجنبى ولوارثه كان للاجنبى نصف الوصية الخ محمول على ما اذا اوصى لهما بالثلث لثبوت المزاحمة فى الثلث فافهم .

پس صورت مسئولہ میں زوجہ کے لیے وصیت باطل ہے اور اجنبی کے لیے ثلث میں نافذ ہے اور ورثاء جائز رکھیں تو زائد میں بھی صحیح ہے بشرطیکہ سب بالغ ہوں ۔ اور اگر کوئی نابالغ ہو تو اس کی اجازت معتبر نہیں صرف بالغین کے حصے میں ہی اجازت صحیح ہوگی ۔ هذا واللہ اعلم وعلمہ احکم ۔

# كتاب الفرائض

**اپنی بیٹی کو میراث سے عاق کردینے کا حکم**

السوال: علیم الدین حسین کا ایک لڑکا دو لڑکیاں ہیں انہوں نے ایک لڑکی کو بوجہ اس کی بدعنوانی و بداخلاقی کے ناراض ہو کر عاق کر دیا ہے جسے عرصہ دراز گزرا اور بارہا وصیت کی کہ اس کا حق نامبردہ نے میری لڑکی کو دیا ہے جس کی شادی کی اپنے پاس رکھا۔ اب نامبردہ مر گیا ہے تو ایسی صورت میں عاق شدہ لڑکی مستحق پانیوالی شرعی کے برابر ہے یا بموجب وصیت علیم الدین کے عاق شدہ لڑکی کا حصہ پاویگی۔

## الجواب

صورت مسئولہ میں میراث لڑکی ہی کو ملے گی۔ پوتی کی لڑکی کو کچھ نہ ملے گا۔ نہ بنا بر ترکہ نہ وصیت کیونکہ وارث تو وہ ہے ہی نہیں۔ اور وصیت مذکورہ بھی باطل ہے۔

في العالمگيرية: فان اوصى له بنصيب ابنه اى ابنته وله ابن او بنت فانه لا تصح الوصية ولو اوصى بنصيب ابنه او ابنته وليس له ابن او بنت فانه تجوز الوصية ولو اوصى بمثل نصيب ابنه او ابنته وله ابن او بنت تجوز لان مثل الشيء غيره لا عينه الخ۔ ج ۶ ص [illegible] والله اعلم۔

ظفر احمد
۹ صفر سنہ ۱۳[illegible]ھ

**نافرمان اولاد کو عاق کرنے کا حکم**

السوال: عمر زید کا بیٹا ہے اور زید ضعیف ہے تو عمر پر اس کے خورد و نوش کی خبر لے مگر عمر بوجہ اپنی زوجہ کے اغواء کے زید کی خبر نہیں لیتا بلکہ شرارت سے پیش آتا ہے۔ اور زوجہ سے زید کو سب بھی کرا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ زید اگر میرے مکان پر آیا تو اس کے گھٹنوں سے

پر کاٹ لوں گا اور جو کچھ اس نے اس کے باپ زید پر اور اس کی بہن پر صرف کیا ہے بذریعہ اپنی زوجہ کے قرضہ بتلا کر طلب کرتا ہے۔ زید مجبور ہے۔ اور اگر زید کہتا ہے کہ میں تجھ کو ایسے وجوہات سے عاق کر دوں گا تو کہتا ہے کہ میں نے علماء سے دریافت کر لیا ہے عاق کر دینے سے میرا کوئی نقصان دینی نہیں ہے تو ایسا باپ اگر بیٹے کو عاق کر دے تو حسب مضمون حدیث شریف گناہ گار تو نہیں۔ یعنی مستحق دوزخ کا تو نہیں بنا بلا حساب جنت میں داخل ہوگا۔

## الجواب

جو لڑکا اپنے باپ سے اسطرح پیش آتا ہو وہ عاق ہو گیا باپ کے عاق کرنے کی ضرورت نہیں مگر شریعت میں عاق لڑکے کو میراث سے محرومی نہیں ہوتی بلکہ جہنم کا سخت عذاب ہوتا ہے اگر باپ ایسے بیٹے کو میراث سے محروم کرنا چاہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی حیات میں زمین، جائیداد دوسرے ورثاء کے نام کر دے اور اُن کو قبضہ بھی دلا دے۔ اور کچھ اپنے گذر کے واسطے رکھ کر اس کو وقف کر دے اور تاحیات اس کی آمدنی اپنے صرف میں لانے کی شرط کر دے واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۷ ربیع الثانی

مسئلہ میراث کی دو صورتیں | السوال: مسئلہ ذیل کے متعلق ارشاد شرعی فرمادیں۔ زید، عمر، بکر تینوں ایک شخص کے بیٹے ہیں۔ عمر اور بکر سگے یعنی حقیقی بھائی ہیں۔ یعنی ان کی والدہ ایک ہے۔ زید جو اُن سے عمر میں بڑا ہے سوتیلا بھائی یعنی اس کی والدہ جدا ہے۔ عمر منجھلا بھائی (درمیانی عمر کا) اس وقت فوت ہو گیا ہے۔ زید عمر بکر کی جائیداد جدی زمین و کوٹھا اس وقت مشترک ہے اور مشترک بحصہ برابر درج کاغذات ہے البتہ حاصل زمین کو بحصہ برابر تقسیم کرکے علیحدہ علیحدہ خرچ کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ عمر کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کسطرح تقسیم ہوگی۔ زید کو اس سے کسقدر حصہ ملے گا اور بکر کو کسقدر ملے گا عمر کے ورثاء زید اور بکر ہی ہیں اور والد یا والدہ وغیرہ کوئی نہیں البتہ

اس کے ماموں اور نانا ہیں۔

**السوال ۲:** مسماۃ صاحب نور لاولد مر گئی ہے اس کے ورثہ یہ ہیں۔ جمال نام اس کا خاوند، عیسیٰ، موسیٰ، یحییٰ اس کے بھائی۔ آزاد مسماۃ صاحب نور کا سوتیلا بیٹا ہے۔ اور کوئی وارث زندہ نہیں ہے۔ مسماۃ صاحب نور کی وصیت کی نسبت یہ ہے کہ اس نے کہا تھا کہ میرے مبلغ یک صد روپیہ مہر دائے سے مبلغ اس کے خاوند کو دیا جائے اور باقی پچاس روپیہ مہر والا اور باقی نقد روپیہ قریباً ماعشہ ایک سو بیس اور زیور مالیت سٹھ روپیہ اور کپڑے وغیرہ مسماۃ مذکورہ کے پیچھے تجہیز و تکفین و خیرات بابعد موت کیا وے۔ اب اس وقت یعنی مسماۃ صاحب نور کے مرنے کے بعد اس کا خاوند تین ماہ زندہ رہ کر فوت ہو گیا ہے مگر اس کا بیٹا آزاد جو مسماۃ متوفیہ کے شکم سے نہیں ہے وہ زندہ ہے۔ اب سوال شرعی یہ ہے کہ مسماۃ مذکورہ کی جائیداد کس طرح تقسیم کی جاوے کس کس وارث کو کس قدر حصہ بار وپیہ پہنچے گا تا کہ اس کے مطابق عمل درآمد ہو۔ بینوا توجروا

غلام یحییٰ سیکنڈ ماسٹر
بفہ ضلع ہزارہ صوبہ سرحد

## الجواب

**۱:** صورت مسئولہ میں عمر متوفی کا وارث شرعی اوسکا حقیقی بھائی بکر ہے علاتی بھائی یعنی زید وارث نہیں ہے اسیطرح ماموں اور نانا بھی محروم الارث ہیں پس عمر کی تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ بکر کو ملے گی واللہ اعلم

مسئلہ عمر

| نانا | ماموں | بھائی علاتی | بھائی حقیقی |
| --- | --- | --- | --- |
| م | م | زید<br>م | بکر<br>۱ |

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۰ھ

**۲:** مسماۃ صاحب نور نے اپنے شوہر کے واسطے جو وصیت کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وارث کیلئے وصیت باطل ہے اور خیرات کی وصیت مسماۃ کے

ترکہ میں سے تجہیز وتکفین کے بعد جو مال بچے اس کی ایک تہائی میں جاری کی جائے اس کے بعد جو مال باقی بچے جس میں مساۃ کا مہر بھی داخل ہے اس کے چھ سہام کرکے تین سہام یعنی نصف خاوند کا ہے اور باقی نصف میں سے ایک ایک سہام اس کے علاتی بھائی کی اولاد کو ملے گا۔ اور سوتیلا بیٹا محروم ہے۔ اور جمال خان کا حصہ اس کے شرعی وارثوں کو دیا جاوے جس کا استفسار علیحدہ کرنا چاہیئے۔ واللہ اعلم

مسئلہ ۲

مساۃ نور

| شوہر | ابن الاخ لاب | ابن الاخ لاب | ابن الاخ لاب | متبنی |
|---|---|---|---|---|
| جمال خان | عیسیٰ | موسیٰ | یحییٰ | آزاد |
| ۱/۲ | ۱ | ۱ | ۱ | |

ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۸ رجمادی الاول سنہ ۴۳ھ

ایک عورت مرگئی اس نے شوہر، ایک لڑکی، والدہ، والد اور ایک ہمشیرہ چھوڑی بعد میں شوہر کا بھی انتقال ہوگیا۔ کیا حکم؟

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مساۃ ہندی کا انتقال ہوگیا اس نے ایک شوہر اور ایک لڑکی عنایت فاطمہ اور والدہ اور والد اور ایک ہمشیرہ چھوڑی بعدہ اس کے شوہر کا بھی انتقال ہوگیا اس نے ایک لڑکی عنایت فاطمہ مذکورہ اور ایک بھائی اور ایک چچا چھوڑا اب موافق شرع شریف مساۃ ہندی مرحومہ کی ملک کس طرح منقسم ہونی چاہیئے۔ بینوا توجروا۔

## الجواب

بعد تقدیم ما حقہ التقدم علی تقسیم الترکۃ کصرف التجہیز والتکفین واداء الدین عن المیت ان کان علیہ وانفاذ الوصیۃ من الثلث ان کان اوصی بشیٔ۔

مساۃ ہندی کے تمام ترکہ کو چھ سہام پر منقسم کرکے ۱۵ سہام مساۃ

عنایت ناظر کو اور چار چار سہام ہندی کے باپ ماں کو، تین سہام شوہر مسماۃ ہندی کے بھائی کو دیئے جائیں گے۔ اگر مسماۃ ہندی نے اپنے شوہر کو مہر معاف نہ کیا ہو یا مرض الموت میں معاف کیا ہو بہر صورت وہ مہر بھی ترکہ میں شمار ہوگا۔ ہاں اگر صحت میں معاف کر دیا ہو تو شمار نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

مسئلہ ۱۲ مسماۃ ہندی

| زوج | بنت عنایت ناظر | ام | اب | اخت |
| --- | --- | --- | --- | --- |
| ۳ | ۶ | ۲ | ۲ | م |

مسئلہ ۲ زوج مسماۃ ہندی

| بنت عنایت ناظر | اخ | عم |
| --- | --- | --- |
| ۱ | ۱ | م |

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۲ جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ

**مناسخہ کی ایک صورت اور زوجہ اگر مرض وفات میں مہر معاف کرے تو اسکا حکم**

**السوال:** یہاں بابت ایک متروکہ کے نزاع ہے اس کا مناسخہ کرنا ہے جس کی صورت ذیل میں درج ہے گو مناسخہ کیا گیا ہے مگر ممکن ہے کہ اس کی تصحیح وغیرہ میں غلطی ہو آپ اس کو ملاحظہ فرما کر اور اس کی صحت فرما کر حضرت مولانا مولوی حافظ قاری شاہ محمد اشرف علی صاحب قبلہ دام فیوضہم سے بھی تصحیح فرما کر جس قدر جلد ممکن ہو سکے واپس فرمائیں۔ واپسی کا پتہ حسب ذیل ہے

السائل
مولوی سید احمد صاحب وکیل بھوکردن ضلع اورنگ آباد دکن

مسئلہ محمد حنیف مرحوم

| ابن بدیع الدین | ابن کریم الدین | بنت نعمت بی | بنت رحمت بی | بنت کمال النساء بیگم |
| --- | --- | --- | --- | --- |
| ۲ | ۲ | ۱ | ۱ | ۱ |

الاحیاء ـــــ ۵۳۷۶۰ ـــــ مبلغ سہام

| | | | |
|---|---|---|---|
| کریم الدین | ۲۱۲۸۰ | فرید بیگم | ۱۵۹۶ |
| فصیح الدین | ۲۳۳۶۰ | بسم اللہ بیگم | ۱۵۹۶ |
| رحیم الدین | ۵۴۶۰ | حمید النساء بیگم | ۲۲۳۰ |
| جمال الدین | ۶۷۱۰ | محمد مریم الشرف | ۱۱۹۶ |
| شرف الدین | ۵۷۱۹ | اکرام الدین | ۳۱۹۲ |

یہ مناسخہ صحیح ہے اور سہام صحیح ہیں

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔

۵ ذی قعدہ سنہ ھ

اس کے بعد اس قدر اور عرض کر دینے کی ضرورت ہے کہ اصل نزاع حمید النساء بیگم زوجہ بدیع الدین مرحوم اور دیگر ورثہ میں ہے اور بمقابلہ دیگر ورثہ حمید النساء بیگم کا حصہ معلوم کرنا ہے جو اس صورت مسئلہ میں اُن کو مل سکتا ہے۔

دوسرے یہ امر کہ یہاں ریاست حیدر آباد میں بعض اشخاص کو منصب ملتا ہے جو عطیہ شاہی کہلاتا ہے اور اس میں یہاں کے قانون کے لحاظ سے توریث نافذ نہیں ہوتی۔ بدیع الدین مرحوم بھی صاحب منصب تھے تو آیا شرعاً ان کے حصے منصب میں توریث ہوگی یا نہیں اور زوجہ بھی مستحق ہے یا نہ؟

تیسرے مہر کے متعلق یہ مسئلہ دریافت طلب ہے کہ اگر زوجہ اپنی مرض الموت میں جب کہ وہ شدید بیمار ہو ایسی حالت میں اگر مہر معاف کرے تو وہ معاف ہو جاتا ہے یا نہیں۔ اور اگر اس طرح زوجہ مہر معاف کر دے تو پھر اس کے ورثاء اس مہر کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر زوجہ کی زندگی میں زوج مر جائے اور زوجہ یہاں کے رواج کے مطابق جبکہ زوج کا جنازہ تیار ہو جائے۔ تو مہر معاف ہو جائے گا یا نہیں۔

چوتھے:- اس صورت مسئولہ میں سماۃ حمید النساء بیگم اپنے شوہر بدیع الدین مرحوم کے ورثاء سے مہر کی اس طریق پر طالب ہے کہ کل متروکہ محمد حنیف مرحوم سے اوّلاً مہر ادا کر دیا جائے۔ اس کے بعد تعین سہام یا تقسیم متروکہ ہو۔ کیا یہ مطالبہ شرعاً صحیح ہے یا بعد تعین سہام وہ صرف اپنے شوہر کے سہام اور متروکہ سے مہر کی طالب ہو سکتی ہے۔

پانچویں: میت ثالث (بدیع الدین مرحوم) یہ مسئلہ دریافت طلب ہے کہ مرحوم بدیع الدین کی دو زوجہ تھیں ایک بشارت بیگم اور دوسری حمید النساء بیگم۔ بشارت بیگم بحیات زوج ہی فوت ہوگئیں اور حمید النساء بقید حیات اب تک زندہ ہیں۔ بشارت بیگم زوجہ اولیٰ تھیں ان کے ورثا میں دو بھائی ایک بہن ایک بیٹی اور باپ ہے۔ بشارت بیگم کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی و والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب دونوں بھائی، اور بیٹی کا نواسہ طالب ہیں کہ بشارت بیگم کا مہر جو بذمہ بدیع الدین مرحوم واجب الادا ہے وہ دلایا جائے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا دونوں بیویوں کے مہر میں تقدم و تاخر کا لحاظ ہوگا یا دونوں دین مہر یکساں واجب الادا ہوں گے۔

یہ امر بھی تصفیہ طلب ہے کہ پہلی بیوی بشارت بیگم کا مہر زیادہ ہے اور بعد کی دوسری بیوی حمید النساء بیگم کا مہر کم ہے ایسی حالت میں متروکہ بدیع الدین سے بلحاظ مناسبت تعداد مہر ادا ہوگی یا مساوی۔

حبیب احمد طالب علم جامع العلوم

## (اجوبۃ الاسئلۃ)

۱: اگر بدیع الدین مرحوم کا ترکہ وہی ہے جو ان کو محمد حنیف مرحوم کے ترکہ میں پہونچا تو حمید النساء کو بحیثیت میراث کے ۲۲۴۰ سہام منجملہ ۲۴۲۰۵ سہام کے ملیں گے اور اگر بدیع الدین مرحوم کا ترکہ پدری ترکہ کے علاوہ اور بھی ہے تو اس کا بھی آٹھواں حصہ مسماۃ موصوفہ کو میراث میں ملے گا۔ اور دین مہر کا حکم آگے آوے گا۔

۲: اگر منصب صاحب منصب کی ملک کردیا جاتا ہے درآں حالیکہ وہ ملکیت کے قابل بھی ہے مثلاً منصب میں بطور جاگیر کے زمین ملے تو اس میں توریث کا نفاذ ہوگا۔ اور اگر وہ صاحب منصب کی ملک نہیں کیا جاتا یا وہ ملکیت کے قابل ہی نہیں مثلاً ماہوار وظیفہ مقرر کردیا گیا ان دونوں صورتوں میں بعد موت کے منصب میں توریث کا نفاذ نہ ہوگا۔ ریاست کو حق ہے کہ اس کے ورثاء جس کو چاہے عطا کردے۔

۳: اگر زوجہ مرض الموت میں جس میں زندگی سے مایوس ہوجائے مہر معاف کردے تو مہر بالکل معاف نہ ہوگا اس میں زوجہ کے تمام وارثوں کو سہام میراث کے موافق حصہ ملے گا جن میں شوہر بھی ایک وارث ہے اور اگر زوج پہلے مرجائے اور زوجہ جنازہ تیار ہونے کے وقت

مہر معاف کردے تو مہر معاف ہوگیا اب اس کو شرعاً مہر لینے کا حق نہیں۔

۳: حمید النساء کا محمد حنیف کے ترکہ میں یہ مطالبہ کرنا درست نہیں اوّلاً محمد حنیف کے تمام ورثاء کا حصہ نکال کر جس قدر بدیع الدین مرحوم کا حصہ اس میں آیا ہے اس میں دین مہر حمید النساء بیگم اور بشارت بیگم کو مقدم کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر اور کسی کا قرض ہو اس کو بھی تقسیم ترکہ سے مقدم کیا جائے گا۔ علیٰ ہٰذا تجہیز و تکفین بھی تقسیم ترکہ سے مقدم ہوگی اس کے بعد جو بچے اس میں توریث نافذ ہوگی البتہ اگر بدیع الدین مرحوم کے ترکہ میں محمد حنیف کے ترکہ سے علاوہ بھی کچھ سامان وغیرہ ہو تو اس میں حمید النساء کا یہ مطالبہ درست ہے۔

۴: دونوں بیویوں کے مہر لزوم میں مساوی ہیں۔ کسی کو مقدم و مؤخر نہ کیا جاوے گا اگر دونوں کے مہر کم و بیش ہیں تو باہم ان کی نسبت معلوم کر کے ترکہ کو اس نسبت پر تقسیم کیا جاوے گا جبکہ مجموعہ ترکہ ہر دو مہر سے زیادہ نہ ہو اور اگر زیادہ ہو تو دونوں مہر دینے کے بعد جو بچے گا وہ ورثہ پر تقسیم ہوگا۔ واللہ اعلم

| حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ | التصحیح والاجوبۃ صحیح |
| --- | --- |
| ۱۵؍ ذی قعدہ سنہ ۴۳ھ | اشرف علی ۔ ۱۶؍ ذیقعدہ سنہ ۴۳ھ |

**ایک میت کے ورثاء میں صرف ایک لڑکی اور ایک حقیقی خالہ ہے**

السوال:۔ ایک میت کے ورثاء میں صرف ایک لڑکی اور ایک حقیقی خالہ ہے اور اعزہ دور کے رشتہ کے ہیں اور وہ بھی ننہالی رشتہ دار ہیں ددھیالی رشتہ کا کوئی بھی نہیں ہے اس صورت مذکورہ میں اس کا متروکہ سامان کیونکر تقسیم ہوگا۔

## الجواب

کل ترکہ لڑکی کو ملے گا۔

۱۹؍ رمضان سنہ

**دین مہر ترکہ میں داخل ہے اور اس کے تقسیم کی ایک صورت**

السوال: ایک شخص مسمّٰی زید نے اپنی دختر کا نکاح مثلاً بعوض پانچسو روپیہ مہر کے کردیا اتفاقاً دختر بقضاء الٰہی فوت ہوگئی۔ باپ اور شوہر موجود ہیں اور ایک لڑکا بھی ہے، ہر دو صورتوں میں مہر کیا سے علیحدہ علیحدہ شرعاً کیا حق ہے۔

**الجواب:۔** حامداً ومصلیاً: دین مہر مثل دیگر اموال متروکہ ترکہ میں داخل ہے

پس کل ترکہ درصورت باپ و شوہر و لڑکا وارث ہونے کے بارہ سہام پر منقسم ہوکر تین سہام شوہر کے ذمہ سے ساقط ہوجائیں گے اور دو سہام باپ کو ملیں گے۔ باقی سات سہام متوفیہ کے لڑکے کو اور اگر اولاد نہیں ہے تو کل ترکہ دو سہام ہوکر نصف یعنی ایک سہام شوہر کا اور بقیہ ایک سہام باپ کا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

احقر عبد اللطیف عفا اللہ عنہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

الجواب صحیح

عنایت اللہ عفی عنہ

الجواب صحیح

مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ ۸ شوال ۱۳۵۱ھ

**اس عورت کے ترکہ کا حکم جس کا شوہر مجنون پہلے ڈوب کر مر گیا اور پھر یہ خود گم ہوگئی!**

**السوال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کو جنون ہوگیا اور جنون ہی کی حالت میں کہیں چلا گیا بعد جستجو زید کی نعش چار روز کے بعد دریا سے برآمد ہوئی نعش سڑ گل گئی تھی، زید کو جب جنون ہوا تو اکثر اپنی زوجہ سے کہا کرتا تھا کہ میں دریا میں ڈوب کر مر جاؤں گا مجھ کو تیرا خیال ہے کہ تیری کیا حالت ہوگی۔ اور میاں بیوی میں اخلاص و محبت غایت درجہ کی تھی۔ زید کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ وہ گھر سے نکل کر فوراً دریا میں ڈوبا ہے کیونکہ زید کا مکان تقریباً دو سو قدم دریا کے کنارہ پر واقع ہے مرد کے چلے جانے کے بعد دو گھنٹہ کے عورت بھی چلی گئی جستجو کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ زید کی عورت کو دریا کے کنارے پر چند آدمیوں نے دیکھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تقریباً آدھ پون گھنٹہ تک عورت نے دریا کے کنارہ پر چکر لگائے مگر ڈوبتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، مگر اندازہ لگاتے ہوئے یقین کیا جاسکتا ہے کہ عورت بھی مرد کے فراق میں ڈوب کر مری ہے اور آج ۲۳ یوم ہوئے مفقود الخبر ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ مرد و عورت کے پاس جو کچھ زر و زیور تھا سب چھوڑ گئے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کی ترکہ کا عورت مستحق ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہوسکتی ہے تو عورت کے ورثاء پر تقسیم کرسکتے ہیں یا نہیں، اور عورت کے ورثاء مہر طلب کرسکتے ہیں یا نہیں۔ جواب مع حوالہ کتب تحریر فرماکر عنداللہ ماجور ہوں و عندالناس مشکور ہوں۔

✢ ✢ ✢

## الجواب

صورت مسئولہ میں یہ واقع کسی حاکم مسلم کی اجلاس میں پیش کیا جائے۔ اگر وہ اپنی رائے سے یہ سمجھ کر بظاہر عورت ہلاک ہو چکی ہے اور عورت کی موت کا حکم کردے تو وقت حکم حاکم کے اس کو میت مان کر جتنے ورثہ عورت کے موجود ہوں اُن میں اس کا ترکہ تقسیم ہوگا اور ترکہ میں مہر بھی داخل ہے۔ اگر وصول یا معاف نہ کیا ہو۔

قال فی الدر المختار: وعند احمد ان کان یغلب علی حالة الهلاك کمن فقد بین الصفین او فی مرکب قد انکسر او خروج الحاجة قریبة فلم یرجع ولم یعلم خبره فهذا بعد اربع سنین یقسم ماله الخ

(ج ۳، صفحہ ۵۱۰)

وفیه ایضاً: واختیار الزیلعی تفویضه للامام قال فی الفتح فای وقت رأی المصلحة حکم بموته وفی الینابیع قیل تفوض الی رأی القاضی ولا تقدیر فیه فی ظاهر الروایة وفی القنیة جعل هذا روایة عن الامام اه ج ۳ ص ۵۱۱)

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از خانقاہ امدادیہ اشرفیہ ۲۴ شوال ۱۳۴۲ھ

میراث ذوی الارحام کے متعلق ایک صورت | السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ الندری نے انتقال کیا ایک بھائی ماموں زاد مسمی شیخ محمد اور ایک بھائی خالہ زاد مسمی شیخ میتا اور تایا زاد بہن کی دو لڑکیاں وحیدن وجیدن اور دوسری تایا زاد بہن کے دو لڑکے حبیب احمد و مشتاق احمد اور شوہر مرحوم کا ایک بھتیجا مسمی مہدی حسن وارث چھوڑا ہے ترکہ شرعاً کس طرح تقسیم ہوگا۔ بینوا توجروا۔

المستفتی

نور محمد پسر الشیخ محمد قوم شیخ ساکن تھانہ بھون

## الجواب

بعد تقدیم حقوق متقدمہ علی المیراث کے کل ترکہ مسماۃ الندری کا تین حصوں پر تقسیم کر کے ماموں زاد بھائی شیخ محمد کو دو حصے اور خالہ زاد بھائی شیخ میتا کو ایک حصہ دیا جائے

باقی سب محروم ہیں۔ فقط

وفی العالمگیریۃ: اعلم بان الاقرب من اولاد العمات والاخوال والخالات تقدم علی الابعد فی الاستحقاق سواء اتحدت الجہۃ او اختلفت والتفاوت بالقرب بالتفاوت فی البطون ممن یکون ذو بطنین اھ

قال: فان استووا فی القرابۃ فالقسمۃ بینہم علی الابدان فی قول ابی یوسف الآخر وعلی اول من یقع الخلاف الخ (ج ۶، ص ۴۹۸، ۴۹۹) ایضاً

قال وقول محمد اشہر الروایتین عن ابی حنیفۃ فی جمیع ذوی الارحام وعلیہ الفتوی اھ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۱ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

**نابالغ ورثا کو دین میت سے بری الذمہ کرنا اور بعد میں کسی بالغ وارث کے اس کی ادائیگی کا حکم کرنے کے بقصد رجوع کے ادائیگی**

السوال:- زید کا انتقال ہوا اس کے وارث حسب ذیل ہیں:-

زوجہ، بنت، ابن بالغ، ابن نابالغ۔ متوفی نے کچھ جائیداد چھوڑی اور کچھ قرضہ بھی اپنے ذمہ چھوڑا۔ وارثوں نے قبل ادائے دین کے جائیداد کو سہام شرعیہ پر تقسیم کر لیا۔ اور دین کو ورثاء بالغین نے اپنے حصہ سے ادا کیا اور میت کے ذمہ کو دین سے بری کر دیا۔ نابالغ کی جائیداد پر دین کا کچھ حصہ نہیں ڈالا اور نہیں شرعاً و قانوناً مجبور تھے اگر چاہتے تو سرٹیفکیٹ حاصل کر کے نابالغ کے حصہ پر بھی دین ڈال سکتے تھے مگر باہم بالغین نے کل دین کو اپنی طرف منتقل کر کے اپنی اپنی زمین محسوب کر کے ادا کر دیا اب ورثاء بالغین میں اختلاف ہے بعض ورثاء تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سب نے نابالغ کو دین سے بری الذمہ کرنے کا باہم فیصلہ کیا تھا اور اس نیت سے کل دین ادا کیا اور ایک وارث کہتا ہے کہ مجھے یہ فیصلہ یاد نہیں۔ میں نے تو اس نیت سے نابالغ کے حصہ دین کی ضمانت دی اور ادائگی کی کہ بعد بلوغ کے اس سے رجوع کروں گا، اب نابالغ بلوغ کو پہنچ گیا ہے تو کیا اس وارث کو جو ضمانت بقصد رجوع کا مدعی ہے نابالغ سے بعد بلوغ کے اسی قدر دین کے مطالبہ کا حق ہے جو اس نے نابالغ کی طرف سے ادا کیا ہے۔ بینوا توجروا۔

## الجواب

جب کسی میت پر دین ہو اور اس کا ترکہ قبل ادائے دین کے ورثہ میں باہم اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک وارث یا چند وارث کل دین کے ضامن ہو جائیں اور میت کو دین سے بری الذمہ کرکے کل دین کو اپنی ذمہ کی طرف منتقل کرکے ادا کر دیں تو اس صورت میں تقسیم ترکہ صحیح ہے اور ترکہ دین سے خالی ہو جائے گا۔ لہٰذا نابالغ مذکور کے حصہ پر شرعاً یہ دین باقی نہیں رہا۔ رہا یہ کہ اس کے ذمہ بھی قرض باقی ہے یا نہیں، سو قاعدۂ شرعی یہ ہے کہ اگر کوئی بالغ دوسرے بالغ کا بھی قرض بدون اس کے امر کے ادا کردے تو وہ متبرع ہوتا ہے۔ اور نابالغ میں تو بدرجۂ اولیٰ یہی حکم ہوگا۔ پس ورثہ بالغین میں سے کسی کو نابالغ مذکور سے بعد بلوغ کے مطالبۂ دین کا حق نہیں۔ نہ ان کو جو برأت میت کے مدعی ہیں اور نہ ان کو جو ضمانت وادا بدون ضرورت اور بدون امر و اذن کے کی ہے جو تبرع محض ہے۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ: اجاز الغریم قسمۃ الترکۃ قبل قضاء الدین له (امر الغریم) نقضها وکذا اذا ضمن بعض الورثۃ دین المیت برضاء الغریم إلا ان یکون بشرط براءۃ المیت لانها تصیر حوالۃ فینتقل الدین علیه وتخلو الترکۃ عنه وهی الحیلۃ لقسمۃ ترکۃ فیها دین کما بسط فی البزازیۃ وغیرها اھ

(ج ۲، ص ۱۴۹)

وفیه ایضاً عن الحمادیۃ: المتبرع لا یرجع بما تبرع به علی غیرہ کما لو قضیٰ دین غیرہ بغیر امرہ اھ (ج ۱، ص ۲۸۸)

وفی الهدایۃ: وتجوز الکفالۃ بامر المکفول عنه وبغیر امرہ فان کفل بامرہ رجع بما ادیٰ علیه وان کفل بغیر امرہ لم یرجع بما یؤدیه لانه متبرع اھ

(ج ۳، ص ۱۰۲)

وفی العالمگیریۃ: واذا کان الدین علی المیت واقتسموها علی ان ضمن احدهم ما علی المیت فان کان الضمان مشروطاً فی القسمۃ فالقسمۃ فاسدۃ وان لم یکن الضمان مشروطاً فی القسمۃ ضمن قبل القسمۃ بغیر شرط الخ (ج ۶، ص ۱۵۰)

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

**توریث ذوی الارحام کی ایک صورت** | السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسولہ محمد خان کا انتقال ہوا۔ اس کا ترکہ اس کے بیٹے فرض اللہ خان کو ملا، پھر فرض اللہ خان کا انتقال ہوا اس کا ترکہ اس کے فرزند مقصود علی خان و صادق علی خان کو ملا۔ مقصود علی خان نے لاولد انتقال کیا۔ صادق علی خان نے ایک دختر چھوڑی جسکا نام رفیقہ ہے، یہ دختر نابالغ فوت ہوگئی۔ اس نے کچھ نہیں چھوڑا۔ دختر کا صرف ایک ماموں زندہ ہے جو اس کے ترکہ کا حقدار بننا چاہتا ہے اور یہ مسمی عطا محمد خان اس کا پھوپی زاد بھائی ہے، مجھے اس ترکہ میں سے کچھ حصہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ اور کل ترکہ کا حقدار کون ہوگا۔

السائل

عطا محمد خان ۔ ۳ صفر ۴۵ھ

## الجواب

صورت مسئولہ میں اگر مسماۃ رفیقہ کا کوئی عصبہ قریب یا بعید زندہ نہیں اور یہ جب معلوم ہوسکتا ہے کہ مسماۃ رفیقہ کے باپ دادا، پردادا وغیرہ کی اولاد کا پورے طور پر خوب تفتیش کر لیا جاوے تو اس وقت بھی اگر کوئی عصبہ نہ ملے اور صرف ماموں اور پھوپی زاد بھائی ہی وارث ہوں تو کل ترکہ کا مستحق ماموں ہوگا اگر وہ ماموں حقیقی ہے۔ کیونکہ اس کی قرابت قریب ہے۔ وہ میت کی ماں کا بھائی ہے اور پھوپی زلد بھائی باپ کی بہن کا لڑکا ہے اس کی قرابت بعید ہوگئی۔ ماموں ذوی الارحام کی قسم رابع میں نمبر اول ہے اور پھوپی زاد بھائی نمبر دوم ہے۔ اور نمبر اول کے سامنے نمبر دوم محروم رہتے ہیں۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۵ صفر ۴۵ھ

## تتمہ سوال بالا

مسماۃ مذکورہ کی پھوپی اور چچی حقیقی بھی زندہ ہے اور ماموں بھی حقیقی ہے اب یہ تحریر کیجئے کہ ان دونوں میں سے کسی کو حق پہنچتا ہے یا نہیں۔ اور پھوپی حق لینا چاہتی ہے لو چچی یہاں موجود نہیں صرف پھوپی کے متعلق تحریر فرما دیجئے فقط

عطا محمد خان

نائب ملازم پوسٹ آفس نانوتہ

## الجواب

اس صورت میں سماۃ مذکورہ کا ترکہ تین سہام میں کرکے دو سہام پھوپی کو اور ایک حصہ ماموں کو ملے گا۔ اور چچی کو محض چچا کی بیوی ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں مل سکتا ہاں اگر اس کو سماۃ مرحومہ کے ساتھ خود بھی کچھ قرابت ہو تو اس کو بیان کرکے سوال دوبارہ کریں۔

واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ بقلم خود

از تھانہ بھون۔ ۹ صفر سنہ ۵۲ھ

### شوہر کی ماہانہ تنخواہ اور اولیاء کے عطیات سے خریدی ہوئی زوجہ کی اشیاء کا حکم اور اس کے متعلق مزید چند سوالات کے جوابات

السوال: معروض یہ ہے کہ پہلے ایک عریضے سے اہلیہ کے انتقال کی خبر حضرت کو کر چکا ہوں۔ انتقال اس مرحومہ کا قریب قریب اچانک ہوا۔ کل دو روز بیمار رہیں۔ مرجانے کا مجھ کو ایسا احساس نہ ہوا اگرچہ اور دیکھنے والوں کو ہوگیا تھا اس وجہ سے خانگی سامان واثاث کے بارے میں نہ اس مرحومہ نے کچھ کہا اور نہ میں دریافت کرسکا اس مرحومہ نے اپنے کپڑوں کی تو وصیت کی کہ کپڑا استعمالی کے سب خیرات کردینا اور امانت کے دینے کے متعلق کہا۔ اور اپنے ذمہ بعض رشتہ داروں کا قرض جتلا دیا لیکن خانگی سامان مبہم رہ گیا اور کچھ ابہام امانت و قرض میں رہ گیا اس لئے اس کے متعلق دریافت کرتا ہے۔ اور تجہیز وتکفین اور دواؤں میں روپیہ صرف ہوا ہے اس میں کچھ تردد ہے ان امور کے علاوہ اور باتیں بھی قابل دریافت کرنے کے ہیں ان سب کو ذرا تفصیل سے حضرت کی خدمت میں عرض کروں گا۔

حضرت اس صدمہ سے قلب بے حد کمزور ہوگیا ہے، بلکہ طاقت جسمی پر بھی اثر ہے۔ معمولی سے معمولی شبہ اور خلجان جو ان امور میں ہو رہا ہے خود اس کو حل نہیں کرسکتا۔ جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد یہ باتیں صاف ہوجائیں اور ہر ایک امر کا حکم شرعی معلوم ہوجائے تاکہ قلب کو یکسوئی ہو۔ اور حکم شرعی کے مطابق آئندہ عمل کرتا رہوں وباللہ التوفیق۔

سوال نمبر ۱: خانگی سامان میں مرحومہ کا جہیز ہے اس میں تو کچھ تردد نہیں کہ ان کا مملوک ہے اور بعض کتابیں اور کچھ سامان ایسا ہے کہ رخصتی کے قریب ہی خود خریدا ہے یا مجھ کو اپنے پاس سے روپیہ دے کر منگوایا ہے۔ اس کے متعلق میرا گمان غالب یہ ہے کہ یہ ان کا

ذاتی روپیہ تھا لہٰذا وہ بھی اس کا مملوک ہے اور اس وقت سے لے کر اب تک ان کا مملوک سمجھا رہا گو تصرف میں میرے بھی آتا رہا۔

۳: اور کچھ سامان ایسا ہے کہ بہ حسب ضرورت ذاتی روپیہ سے خریدتا رہا اور وہ مرحومہ بھی میرے روپیہ سے خریدتی رہی۔ اُن کی خریداری کی دو صورتیں ہیں۔ میری موجودگی میں تو مجھ سے اجازت لیکر یا مطلع کر کے اور جب میں باہر ملازم رہا اور اُن کے خرچ کے لئے روپیہ ماہ بماہ دیتا رہا تو بے اطلاع۔ اگرچہ ضرورت کی خریداری کی مجملاً اجازت تھی۔ اس دوسری صورت میں احتمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی روپیہ سے خریدا ہو۔ لیکن چونکہ بظاہر اُن کی آمدنی ذاتی ایسی نہیں تھی اس لئے بظن غالب میرے روپیہ سے خریدا ہے۔ کچھ سامان ایسا بھی ہے کہ بالفعل اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اور زندگی میں مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ بلکہ مرنے کے بعد معلوم ہوا۔

۴: اور کچھ سامان ایسا ہے کہ ماقبل کی تینوں قسموں سے ایک قسم کا یقیناً معلوم نہیں ہوتا۔ ۵: بعض اشیاء ایسی ہیں کہ مرحومہ نے صحت میں کہا تھا کہ میرے عشیروں نے دی ہیں مرنے کے بعد بعض واقعات سے شبہ ہوا کہ انہوں نے خریدی ہیں لیکن کسی مصلحت سے یہ کہدیا ہے اور خریداری ظاہر نہ کی۔ چنانچہ ایک عشیرہ سے دریافت مجملاً کیا تو اس نے انکار کردیا کہ مجھ سے کوئی چیز مفت نہیں لی۔ قیمت میں کچھ تخفیف کردی ہو یا کوئی پیسے کی چیز ہو تو یہ دوسری بات ہے۔

اب اگر اس بارے میں عشیرہ کا انکار معتبر ہو تو دونوں عشیروں سے تفصیلاً تحقیق کروں اور یہ شبہ اُن اشیاء کے متعلق ہے جو زیادہ قیمتی ہیں اور جو معمولی ہیں یا خوردنی یا ایسی کہ ان کا لین دین آپس میں مروج ہے مثلاً کنگھی صابون اس کے متعلق نہیں۔ ہاں اشیاء خوردنی جیسے کنگھی صابون اور جو شئی ایسی ہو کہ اس کا استعمال استہلاک العین کے ساتھ ہوتا ہے اور گھر میں سب استعمال کرتے ہیں کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی خواہ زوج کے خاندان سے آئی ہو یا زوجہ کے خاندان سے ایسی اشیاء جو باقی ہیں ان میں تردد ہے کہ آیا وہ سب ورثہ کا حق سمجھا جاوے گا یا نہیں۔ اور ایک نابالغ بچی گھر میں ہے ان میں سے کوئی استعمال کرے باقی ورثہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے بعد گزارش یہ ہے کہ عموماً دستور یہ ہے اور میرا بھی یہی معمول رہا ہے کہ

عورت کو کوئی خاص شئی یا معین رقم ماہواری یا بخشش ماہی اس طور سے نہیں دی جاتی کہ وہ
اس کی مالک سمجھی جاوے بلکہ لباس و طعام سب خاوند کا مملوک سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی
میں جو کچھ کھایا پہنا وہ کھانا پہننا اور جو کچھ بچا سب کا مالک خاوند حتیٰ کہ رخصتی کے وقت جو کپڑے
وغیرہ خاوند کی طرف سے بنائے جاتے ہیں ان کا بھی خاوند مالک سمجھا جاتا ہے پس لباس خود استعمال
کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

دوسرا دستور یہ ہے (اس کا بھی اوّل دستور ہی سمجھ میں آتا ہے) کہ عورت کچھ پس انداز
کرتی ہے اور بالا بالا لڑکے لڑکی کی شادی کے لئے سامان خریدتی رہتی ہے۔ خاوند سے مخفی
کرنے میں پوری کوشش کرتی ہے شادی یا کسی اور تقریب میں وہ سامان نکلتا ہے اور خاوند کے
روبرو سرخروئی حاصل کی جاتی ہے اور خاوند بھی شکر گزار ہوتا ہے اور اس کو سچا خیر خواہ
خیال کرتا ہے۔ اور سب خاندان والے اس کی تعریف کرتے ہیں۔

سوال ۲: ان دونوں دستوروں کو پیش نظر رکھ کر ما قبل کے ۲ کے متعلق سوال
یہ ہے کہ آیا اس سامان کا مالک سمجھا جاؤں گا یا نہیں اس مرحومہ نے زندگی میں معلوم نہ ہونے
دیا انتقال کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ضرور پس انداز کرتی تھیں۔ کچھ روپے زیور کی تھیلی سے
برآمد ہوئے۔ اور کچھ زیور اور کچھ سامان ایک عزیزہ کا کچھ روپیہ یا رہن نکلا۔ مرنے کے
قریب اس عزیزہ نے دریافت کیا کہ وہ زیور اور سامان کس کے پاس ہے تو میری والدہ صاحبہ
اور اس عزیزہ کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنی بڑی ہمشیرہ کے پاس بتلایا۔ بڑی ہمشیرہ نے انکار
کر دیا۔ وہ زیور ان کی تھیلی سے برآمد ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یقیناً اس عزیزہ کو انہوں نے
اپنے پاس سے روپے دیئے ہیں۔

نیز ایک رضائی تیار شدہ جدید اور ایک پلنگ کی نواڑ اور کچھ سوت نکلا۔ جو پیشتر
مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے بھائی کی شادی میں کچھ
نقد اور جوڑے دیئے ان وجوہات سے ظن غالب یہ ہے کہ یہ سب پس انداز ہے کیونکہ میری
تنخواہ کے علاوہ ان کی آمدنی ایسی نہیں تھی یہ دوسری بات ہے کہ عید البقرعید کی بھائی نے نقد رقم
دیدی ہے یہ سب تنخواہ اس کے ہاتھ میں رہتی تھی حساب کتاب کوئی باقاعدہ نہ تھا۔ اس ۳ میں
سامان مختلف اقسام کا ہے ایک وہ کہ جو میرے خاص استعمال کا ہے اور ایک وہ کہ مشترک الاستعمال
ہے اور ایک وہ جو خاص ان مرحومہ کے استعمال کا تھا تو اگر وہ مرحومہ شرعاً اس میں مالک تصور

ہوں گی تو دونوں قسمیں اخیر بین میں سے کسی ضرورت کے سامان کی۔

سوال ۳ ۔ میں اپنے ظن غالب یا کسی رشتہ دار وارث غیر وارث وغیرہ کی شہادت کا اعتبار ہوگا یا نہیں اور اگر یہ صورت نہ ہو یا شرعاً معتبر نہ ہو تو پھر شرعاً قطع اشتباہ کا سہل طریقہ کیا ہے۔

سوال ۴ : وصیت میں تو مرحومہ نے کہا کہ علاوہ تین مخصوص دو جوڑوں کے میرے سب کپڑے خیرات کر دینا۔ قیمت ان کپڑوں کی ثلث ترکہ سے بہت کم ہے تو آیا اس وصیت میں دری جائے نماز، لحاف، توشک، ہلکی رضائی، روئی کی کرتی، صدری، دستی رومال وغیرہ داخل سمجھے جائیں گے یا صرف دوپٹہ، کرتی، پاجامہ، دلائی، چادر اور برقعہ وغیرہ داخل ہیں۔

سوال ۵ : غیر منقولات میں سے اس بچی کے ماموں کے قبضہ میں بھی ہے اور ان کا حصہ اس طرف نکلے گا آیا تبادلہ بچی کے حصہ کے ساتھ شرعاً جائز ہے اور کس صورت سے ان سب امور کا ایک دستور العمل جامع مانع تحریر فرمایا جاوے تاکہ احقر اطمینان سے آئندہ اس پر عمل کرتا رہے۔

فقط

سراج احمد از سوہار ۲۹ محرم

## الجواب

۱ : سامان نمبر ۱، ۳ تو یقیناً ترکہ میں شمار کیا جاوے اور حسب فرائض تقسیم کیا جاوے اور سامان ۲ میں جب ظن غالب یہ ہے کہ زوج کے روپیہ سے خریدا گیا ہے اور زوج نے یہ روپیہ ان کو تملیکاً نہ دیا تھا جیسا کہ آگے ظاہر ہے تو مرحومہ اس کے خریدنے میں وکیل زوج تھیں اور یہ سامان ملک زوج ہے۔ اور سامان ۴ کو ترکہ میں شمار کر کے حسب فرائض تقسیم کرنا چاہیے کیونکہ اس میں ظن غالب کسی قرینہ پر مبنی نہ ہوگا۔ اور قبضہ دلیل ملک ہے اور سامان ۵ میں مرحومہ کے قول پر عمل کر کے اس کو بھی ترکہ میں شمار کرنا چاہیے کیونکہ مرنے کے بعد اس کے قول کی تکذیب کی کوئی صورت نہیں بجز اس کے اس کے قول کی تکذیب کرنا قضاء علی المیت الغائب ہے وھو باطل۔ اور عدم بینہ کی صورت میں حلف کس سے لیا جائے۔ پس یہ سامان مملوک زوج شمار نہیں ہو سکتا۔ اور جو اشیاء استہلاک عین کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں ایسے ہی جملہ منقولات ان کا استعمال مشترکاً اس وقت جائز ہے جبکہ سب ورثاء بالغ ہوں اور سب راضی ہوں۔ اور اگر نابالغ ہے تو ہر چیز تقسیم کر کے ہر حصہ والا اپنے حصہ کو استعمال کرے۔

## جواب سوال دوم

۲ کے متعلق ظن غالب کا اعتبار ہے۔ بشرطیکہ ظن غالب میں اغراض نفس کو دخل نہ ہو محض آثار و قرائن و عرف سے ظن پیدا ہوا ہو۔ پس جو نقد روپیہ مرحوم کے پاس سے نکلا وہ بظاہر اس کی خاص آمدنی سے بچا ہوا نہیں ہے۔ یا تو طوب مال جس قدر نکلا یہ سب بظاہر زوجہ کی ملک ہے ترکہ میں داخل نہیں۔

## جواب سوال سوم

۳ میں حکم یہ ہے کہ جو چیز کسی دلیل شرعی سے ملک غیر ثابت ہو جیسے مثلاً ملک زوجہ ہونا معلوم ہو جاوے تو ترکہ نہ ہوگی۔ باقی سب ترکہ ہوگی۔ اور دلیل بینہ ہونی چاہیے ایک کا قول کافی نہیں۔ کیونکہ نابالغ ورثاء کا حق فوت ہوتا ہے۔

## جواب سوال چہارم

عورتوں کا عرف معلوم کیا جاوے کہ وہ وصیت میں کپڑوں سے روزانہ پہننے کے کپڑے مراد لیا کرتے ہیں یا ہر قسم کے کپڑے۔ اگر عرف سے کسی خاص قسم (نوع) کو ترجیح ہو تو وصیت کو اسی پر محمول کیا جاوے۔ اگر عرف مشتبہ ہو تو سب کپڑے مراد ہوں گے جتنے کہ ثلث میں آسکیں۔

## جواب سوال ہشتم

یتیم کی جائیداد کو تبادلہ دوسری جائیداد سے اب یا جد یا اُن کا وصی کر سکتا ہے بشرطیکہ خیر ہو۔ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم

وکل ما کتبہ اکثرہ بالمنقول عند العامة۔ حررہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۱ صفر سنہ ۱۳۴۵ھ

**تقسیم ترکہ کی ایک صورت**

**السوال:** زید کا انتقال ہوگیا ہے۔ اور جائیداد ۲۰/- ہزار کی ملکیت چھوڑی۔ دفن کے بعد ۹ حصوں میں تقسیم ہوئی۔ تین ہزار قرض خواہوں کو ۱۰ ہزار والدہ کو۔ اور ۵۰۰۰ ہزار دو بھائیوں کو اور دو۔ دو ہزار پانچ بہنوں کو۔ اس وقت مرحوم کے ایک بھائی عمرو نے ۵۰۰۰/- ہزار نقد لے لیا۔ اور دستاویز لکھا کہ ہم نے اپنے مرحوم برادر کے حصص سے ۵۰۰۰/- ہزار بخوشی لے لیا۔ اور کورٹ میں بھی رجسٹر کیا گیا۔ بقایا والدہ اور ایک بھائی اور ۵ بہنوں نے تقسیم مال کر جدا نہیں کیا بلکہ اس نے یوں عرض کیا کہ ہمارے برادر مرحوم

کا قرض ادا ہو جائے گا اس وقت ہم لوگ لیں گے۔ بعد عرصہ نو سال کے والدہ مرحوم کے برادر عمرو نے پہلے جو پانچ ہزار روپیہ لیا تھا۔ وہ برابر ہے۔ مگر زائد ملنا تھا۔ ہماری بیماری کے سبب سے لینا ہوا۔ اور ہم کو ملنا چاہیے۔

جناب مولوی صاحب برائے خدا بہت جلد حکم شریعت صادر فرمادیں۔ نوٹ: جس وقت ۵۰۰۰/- ہزار عمرو نے لیا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے لوگوں نے تقسیم کر دی تھی۔ جب بھی عمرو نے ہر طرف سے زبردستی کر کے نوٹس وغیرہ دیا کہ مجھے پانچ ہزار ملتا ہے ورنہ کورٹ سے لے لیں گے۔ اب پھر زبردستی کر رہا ہے۔ اور پہلے بھی اس کی زبردستی کی بناء پر اس کو دیئے گئے۔

## الجواب

مسئلہ ۵۴ / ۶

| والدہ | بھائی | بہن | بہن | بہن | بہن | بہن |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۹ | ۱۰ | ۱۰ ۵ | ۵ | ۵ | ۵ | ۵ |

صورت مسئولہ میں بعد ادائے دین و تجہیز و تکفین وغیرہ کے خرچ کرنے کے جو چوبیس ہزار روپیہ بچتا ہے اس کو چوّن سہام پر تقسیم کرے۔ والدہ کو ۹ سہام دیئے جائیں جس کی مقدار ۴۰۰۰/- تین پائی۔ ہوتی ہے اور ہر بھائی کو ۱۰ دس سہام دیئے جائیں۔ جس کی مقدار ۴۴۴۴ ہے ۶ آنہ ایک پائی۔ اور پانچ پانچ سہام ہر بہن کو دیئے جائیں یعنی ہر بہن کو دو ہزار سات سو ستتر روپے (۲۷۷۷ ۱۱/۱۲ ۲ پائی)

ہمارے حساب میں یوں ہی نکلتا ہے۔ کسی محاسب سے دوبارہ حساب درست کرا لیا جائے۔ پس عمرو نے جو پانچ ہزار روپیہ جو لیا ہے وہ اس کے علاوہ شرعاً ۴۴۴۴ روپے ۶ آنہ ایک پائی کا مستحق ہے۔ والدہ کو جو دس ہزار روپے دیئے گئے ہیں وہ اس کے حق شرعی سے زیادہ دیئے گئے ہیں۔ اور بھائی بہنوں کو حق شرعی سے کم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب جو اتنی تقسیم شرعی کے تیس ہزار کی رقم کو چوّن سہام پر تقسیم کر کے بانٹنا چاہیے۔ واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۵ شعبان ۱۳۵۲ھ

**مرض الموت کی تعریف اور اس سے متعلق چند سوالات**

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین بیچ ان مسائل کے کہ زید کو بیس برس کی عمر سے مرض شانہ ہوا مگر وہ اپنا کاروبار برابر انجام دیتا رہا۔ اور اس کے علاج معالجے سے بھی غافل نہیں رہا۔ پچاس سال کی عمر میں اس کو دنبل زیریں مخرج پیدا ہو گیا۔ اور اس نے اس قدر ترقی کی بالآخر دنبل نکلنے کے دو ماہ بعد انتقال ہو گیا۔ دو ہفتہ قبل از انتقال زید نے ایک تحریر اس مضمون کی اسٹامپ پر اپنی زوجہ کے نام لکھ دی کہ تم میری قانونی زوجہ ہو اور تمہارا مہر ایک لاکھ اسی ہزار اشرفی دو دینار سرخ مقرر ہوا تھا۔ اور اس کا ادا کرنا میرے اوپر ضروری ہے۔ اس لئے میں نے اپنی کل جائیداد بعوض نصف مہر کے تجھے دے دی۔ اور یہ تحریر اپنی عین حیات بہ ثبات حقیقی و نقل بھی ہے۔ واضح ہو کہ زید انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اور یہ تحریر انگریزی میں اسٹامپ پہ کسی دوسرے شخص سے لکھوا کر اس پر دستخط ثبت کر دیئے۔ اور اس کا غذ پر چند گواہوں کے بھی دستخط ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کرتا ہے کہ زید ایسی جائیداد کا مالک ہے جو شاہان مغلیہ بعوض قضاۃ عطا فرمائی ہے۔ جب برطانیہ کا تسلط ہوا۔ تو اس نے بجملہ اختیارات شرعی صرف اقامت جمعہ و عیدین بحال رکھے۔ اور دیگر اختیارات مثلاً حفاظت و تولیت وغیرہ اپنے اختیار میں رکھے اور اس نے اپنے انتظام کی وجہ سے ۳/۲ کی بیج معافی بھی لے لے اور بقیہ بطور استمرار اس خاندان کے لئے بخدمت عہدۂ قضاۃ یعنی خدمت اقامت جمعہ و عیدین حسب ذیل شرائط پر جاری رکھے۔

۱ۓ یہ جائیداد منتقل نہیں کی جا سکتی۔

۲ۓ جب تک خدمت کی ضرورت ہے اور بحالت وفاداری سرکار برطانیہ بحال رکھی جائیگی خاندان میں یہ طریقہ اب تک جاری ہے کہ اولاد کو جائیداد علی السویہ تقسیم کی جاتی ہے، اور اناث میں کبھی تقسیم ہوئی اور نہ کبھی انہوں نے مطالبہ کیا۔

۱ۓ کیا مرض مذکور مرض الموت میں شمار ہو سکتی ہے۔

۲ۓ کیا مذکورہ تحریر تامہ جائز ہے۔ جبکہ زید ایک دوسرے شخص کا بھی مقروض ہے۔

۳ۓ کیا جائیداد مذکورہ ایسے قرض میں دین مہر میں زوجہ کو منتقل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ جائیداد منتقل ہو سکتی ہے تو بعد انتقال زوجہ زید اس جائیداد کے پانے کا کون مستحق ہے۔

۴ۓ اگر مرض الموت ہے تو زوجہ کو کتنا مہر مل سکتا ہے۔ جبکہ دوسرے ورثاء موجود ہیں اگرچہ

زید لاولد فوت ہوا۔

۵ مہر اگر حیثیت سے بہت زیادہ ہو تو نیا شرعاً جائز ہے۔ اور قابل ادائیگی ہے یا نہیں اگر قابل ادائیگی ہے تو کس مقدار میں۔ امید ہے کہ پانچوں امور کا جواب صحیح نام ہر ثبت۔

بحوالہ عبارت و ترجمہ اردو مرحمت فرماویں۔ اور عند اللہ ماجور ہوں۔ فقط

مشیر الحسن مکان قاضی محب الرحمن

سب جج برہان پور ضلع نیماڑ

## الجواب

قال في الدر وشرحه الغرر في تعريف المريض بمرض الموت ما نصه من غالب حاله الهلاك كمريض عجز عن إقامة مصالحه خارج البيت فمن يقضيها في خارج البيت وهو يشتكي لا يكون فاراً لأن الإنسان قلما يخلو عنه هو الصحيح اهـ وفي حاشية الشرنبلالي عليه قال الزيلعي وهو الصحيح اهـ وخالفه ما قال الكمال: إذا أمكنه القيام بها في البيت لا في خارجه فالصحيح أنه صحيح اهـ هذا في حق الرجال أما في حق المرأة فقال في النهر عن الزيلعي فبأن تعجز عن المصالح الداخلة اهـ (ج ۱ ص ۲۸۰)

پس اس صورت مذکورہ میں اگر زید اس تحریر کے وقت گھر سے باہر آنے جانے اور اپنی ضرورت کے امور کو بجا لانے پر قادر تھا تو وہ مریض مرض الموت نہ تھا۔ اور اگر عاجز تھا تو وہ مریض مرض موت تھا۔

وفي الهداية: يجب العشرة إن سماها أو دونها ويجب الأكثر منها إن سمى الأكثر۔ قال الشامي: لأنه بالغ ما يلزم فيتقرر بالعشرة لمنع النقصان اهـ وتتأكد عند وطء أو خلوة صحت من الزوج أو موت أحدهما اهـ وفي كشف الغمة للشعراني وفي المقاصد للسخاوي: وكان عمر بن الخطاب رضي الله عنه كثيراً ما يقول لا تغلوا صدق النساء فإنها لو كانت مكرمة في الدنيا أو تقوى في الآخرة كان أولاكم بها رسول الله صلى الله عليه وسلم وصعد مرة على المنبر فقال لا تزيدوا في صداق على أربعمائة درهم فاعترضته امرأة من قريش فقالت تنهى الناس عن شيء أباحه الله لهم فقال كيف فقالت أما سمعت قول الله

تبارك وتعالى واتيتم احداهن قنطارا فلا تاخذوا الخ - فقال اللهم عفوا كل الناس افقه من عمر قال ثم رجع فركب المنبر فقال ايها الناس اني كنت نهيتكم ان تزيدوا النساء في صدقاتهن على اربعمائة درهم فمن شاء ان يعطي من ماله ما احب قال ابو يعلى واظنه قال فمن طابت نفسه فليفعل اھ (مقاصد ١٥٠) قال السخاوي وسنده جيد قوي اھ وفي الدر (ج ٢، ص ٣٦٧) دين صحة مطلقا ودين مرض موته بسبب فيه معروف فيقدم ان على ما اقر به فيه والكل عن الارث وتقدم تخصيص غريم بقضاء دينه اھ -

ان نصوص کے بعد جواب سوالات معروض ہے۔ جب خاندان میں اُس کی جائیداد کا ذکور پر تقسیم ہونا متعارف ہے۔ تو یہ علامت ملک مورث کی ہے۔ اناث پر منحصرہ ہونا۔ مانع ملکیت سے نہیں۔ کیونکہ جہالت کی وجہ سے عموماً ہندوستان میں لڑکیوں کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا یہ طرح قابل اعتبار نہیں ہے۔

۲: اس کا جواب اوپر گزر چکا ہے ملاحظہ ہو۔

۳: اگر زید اس تحریر کے وقت گھر کے اندر باہر اپنے کام کر سکتا تھا تو یہ تحریر درست ہے اور دوسرے قرض خواہوں کے قرض ادا نہ کرنے کا گناہ زید کے ذمہ رہا مگر اسٹامپ کے حجت ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کی اس پر گواہی درج ہے وہ زبانی کہیں کہ زید نے اس کو ہمارے سامنے سُن کر اقرار کیا ہے۔ یا اُس نے ہمارے سامنے املا کرایا ہے۔ اور املا کے موافق ہی اسٹامپ میں لکھا گیا ہے۔ اور اگر ورثا زید اور اسٹامپ کے گواہوں میں اختلاف ہو تو یہ گواہی بدون مجلس حاکم یا پنچ ہونے کے معتبر نہ ہوگی۔

وقال في الحامدية: ومنها مجلس القضاء فلا تسمع هي اي الدعوى والشهادة الا بين يدي الحاكم اھ (ج ٢، ص ٧)

اور اگر زید اس تحریر کے وقت باہر آنے جانے سے عاجز تھا تو یہ تحریر درست نہیں ہے۔ بلکہ سب قرض خواہوں کو جن میں عورت بھی داخل ہے۔ جائیداد مذکور تقسیم کرلیں۔

۴: جائیداد مذکور دین مہر زوجہ میں منتقل ہو سکتی ہے۔ اور اس کے مالک بعد وفات زوجہ کے وارثان زوجہ ہوں گے۔

۵: زوجہ اپنے پورے مہر ایک لاکھ ٹھ ہزار دہ دینار سرخ کی مستحق ہے۔ اگر اس سے

کچھ بچے گا تو ورثا کو دے گا۔ ورنہ نہیں۔

ف : مہر جتنا باندھ دیا جائے وہی معتبر ہے۔ چاہے حیثیت سے کتنا ہی زیادہ ہو۔

واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ از تھانہ بھون

۲۹ شعبان ۱۳۴۲ھ

**عصبات کی انتہا اولاد جد الجد پر ہوتی ہے یا اس کے اوپر کے رشتے بھی اس میں داخل ہیں؟**

السوال: عصبات کی انتہا اولاد جد سوم پر ہو جاتی ہے یا اس سے اوپر کے رشتہ دار بھی عصبہ ہوتے ہیں۔

## الجواب

ذکر الطحاوی فی مشکل الآثار بسندہ عن عبد اللہ بن بریدۃ عن ابیہ قال جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل فقال عندی میراث رجل من الازد ولا اجد ازدیا ادفعہ الیہ قال تربص بہ حولا قال ففعل ثم اتاہ فقال اذہب فادفعہ الی اکبر خزاعۃ وذکر لہ طرقا عدیدۃ ثم قال ورواہ شریک وزاد فقال اطلبوا لہ وارثا فلم یجدوا فقال اطلبوا لہ ذا رحم فطلبوا فلم یجدوا فقال ادفعوا مالہ الی اکبر خزاعۃ اھ۔

قال الطحاوی فکان ما رواہ سوی شریک اولی عندنا مما رواہ شریک لعددھم ولان ثلثۃ اولی بالحفظ من واحد ولا منحصافۃ بعض ما فی حدیث شریک مما ذکر فیہ من قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اطلبوا لہ ذا رحم وھذا الازدی فی العرب لان العرب لا تورث بالارحام وانما تورث بالعصبات الا حیث ورث اللہ تعالی ذوی الفرائض المسماۃ منھم لانہ اذا لم توجد عصباتھم من افخاذھم وجدت من الافخاذ التی تتلوا افخاذھم کما یعقل فی عقول جنایاتھم افخاذھم الذین یعقلون اروش الجنایات فان تصر عددھم عن احتمال اروش جنایاتھم رد ذلک الی من یلیھم من الافخاذ وان یکون التوارث بالارحام المخالفۃ لما ذکرنا فی غیر العرب من العجم الذین لا ینتمون الی شعوب ولا قبائل وانما ینتمون الی بلدان لا الی سواھا قال ابوجعفر فالعرب مترجع الی الشعوب والی القبائل والی

وفي الاختيار وبها يتوارثون والعجم لا ترجع الى ذلك وانما يجمعهم بلدانهم لا ما سواها وكذلك كان ابو يوسف يقول في التوارث بالارحام التي ليست عصبات. فما يكون في العجم لا في العرب اھ (من ص ۱۲۱ ف ص ۲۱۲ ج ۳)

قلت ويلحق بالعرب شيوخ العجم الذين انسابهم محفوظة وكذا الملك الاقوام التي تراعي حفظ انسابها من اهل العجم. والله تعالى اعلم. فلا يتوارث ارحامهم مادام يوجد احد من عصباتهم من الجد الادنى او الابعد فالابعد.

۲ ذی الحجہ ۳۴ھ

**مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اور اس کے متعلق مزید دو سوالات**

**السوال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین رحمکم اللہ اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک ہندو مشرک کا بیٹا مسلمان ہوا ہے۔ اس کا باپ ہندو ایک کثیر جائیداد کا مالک ہے۔ کیا زید اپنے باپ کے بعد اس کی جائیداد کا وارث شرعاً ہو سکتا ہے یا نہیں۔ حالانکہ زید از روئے قانون گورنمنٹ بنا بر جائیداد جدی ہونے کے (یعنی زید کے دادا ہندو کی جائیداد ہونے کے باعث) وارث ہو سکتا ہے اور اگر زید از روئے وراثت مذہب شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جس کی بنا اس امر پر ہے کہ اختلاف دینین موانع ارث ہے وارث نہ ہو سکے تو بنا بر مرجوح مذہب جو کہ حدیث الاسلام یعلو ولا یعلی سے بعض صحابہ مثل حضرت معاذ بن جبل و معاویہ بن ابی سفیان، محمد بن الحنفیہ، محمد بن علی بن الحسین و مسروق رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کہتے ہیں کہ مسلم اپنے باپ کافر کا وارث ہو سکتا ہے کافر اپنے باپ مسلم کا وارث نہیں ہو سکتا اگر اپنا ورثہ لے تو کیا اس کا یہ ورثہ لینا جائز ہے یا نہ اور اس کا یہ حاصل کردہ مال حلال ہوگا یا حرام یا مشتبہ۔

(۲) چونکہ ضلع ہذا میں بعض نو مسلموں نے اپنے ہندو باپ کی جائیداد سے از روئے قانون سرکاری ورثہ حاصل کر لیا۔ لہٰذا زید مذکور اپنے باپ ہندو (جو کہ اس وقت زندہ ہے اور اپنے ہندو بیٹے کو اپنی جائیداد تملیک کرنا چاہتا ہے) پھر یہ دباؤ ڈال کر کہ میں آپ کی وفات کے بعد از روئے قانون سرکار ضرور ہی وارث ہو جاؤں گا۔ تو آپ مجھے پورا حصہ نہ دیں۔ اور کچھ حصہ دیں مثلاً بجائے نصف حصہ کے ثلث دیں۔ تو کیا یہ مصالحت جائز ہے؟ اس لئے کہ اس میں ایک گونہ دباؤ ہے اور کیا ایسا دباؤ جائز ہے چونکہ کافر کسی مسلم کو کچھ مال تملیک کر دے تو شرعاً مسلم کو اس مال کا حاصل کرنا جائز ہے۔

لہٰذا صورت مذکورہ بالا میں جو کہ ایک گونہ دباؤ کی صورت ہے بطور مصالحت مال حاصل کرنا جائز ہے یا نہ یہ دوسری صورت یعنی بطور مصالحت کے زید مال حاصل کرے اسلئے اختیار کرتا ہے کہ اگر بنا بر مذہب راجح بطور ورثہ مال حاصل کرتے ہیں حلت مال میں کچھ شبہ ہو تو بطور مصالحت مذکورہ مال حاصل کرے۔

(۳) عمرو ایک نومسلم شخص از ہندو مذہب ہے اس نے ایک کثیر جائیداد جدی بموجب قانون گورنمنٹ اپنے ہندو باپ کے ورثے سے حاصل کی ہے اب اس کی اولاد جو قبل از اسلام تھی یعنی ہندو اولاد بھی از روئے قانون سرکاری عمرو کے مرنے کے بعد ضروری ہے وارث ہوگی چونکہ عمرو کی ہندو اولاد آریہ ہے جو کہ سخت ترین دشمنان اسلام سے ہے۔ لہٰذا کیا عمرو کو اس امر کی کوشش کرنا کسی طرح اس کی ہندو اولاد اس کے مرنے کے بعد وارث نہ ہو واجب نہیں ہے۔ جبکہ شرعاً کافر مسلم کا کسی صورت میں وارث نہیں ہو سکتا۔ اور اس عدم کوشش سے کیا عمرو عند اللہ گنہگار نہیں ہے۔ واضح رہے کہ عمرو کی اس وقت دو مسلمان بیویاں، دو مسلم بیٹے اور دو مسلم لڑکیاں صاحب اولاد ہیں۔ عمرو کی ہندو اولاد نے عمرو کے ساتھ مقدمہ کیا۔ حتیٰ کہ نوبت چیف کورٹ تک پہنچی۔ قانوناً سرکاری یہ ہے کہ مورث کی جدی جائیداد یعنی وارث کے دادا کی جائیداد سے مسلم کافر کا اور کافر مسلم کا وارث ہو سکتا ہے اگرچہ مورث اپنے حین حیات میں اسے محروم کرنے کی وصیت بھی کر جائے۔ یعنی اختلاف دینین مانع ارث نہیں۔

بینوا توجروا

غلام محمد عفی عنہ ضلع ڈیرہ غازی خان

محلہ سگران

## الجواب

(۱) مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ کما ھو مصرح فی کتب الحدیث والفرائض۔ اور جب بدون استحقاق کافر کے ورثہ لیا تو حلال کیسے ہوگا۔

(۲) کافر اگر اپنی خوشی سے کسی کو دیدے تو حلال ہو جاتا ہے لیکن جب اس پر دباؤ ڈالا تو رضامندی کہاں رہی۔ پس یہ مصالحت معتبر نہیں ہے پس صورت جواز یہ ہے کہ ہندو باپ کے صاف صاف کہدے کہ گو قانوناً میں آپ کا وارث ہو سکتا ہوں مگر میرا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں آپ کا وارث بنوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے جو کچھ دینا چاہیں

اپنی زندگی میں دیدیں۔ اور مجھے وارث نہ بنائیں۔ بلکہ جو کچھ دیا کریں نے اپنے نومسلم بیٹے کو اپنی زندگی میں حصہ دیدیا ہے۔ لہٰذا میرے بعد وارث نہ ہوگا اور سائل بھی یہی کہے کہ یہ دینا اپنی خوشی پر ہے۔ اگر آپ نہ دیں تو نہ میں قانونی چارہ جوئی کروں گا اور نہ ناخوش ہوں گا (۳) یہ معلوم ہوا کہ خود عمرو ہی کو اس جائیداد میں سے میراث نہیں ملی تو اس میں وہ تصرف کیسے کرے گا۔ فقط واللہ اعلم

عبدالکریم عفی عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ اشرفیہ

۱۶ / جمادی الاول ۱۳۴۳ھ

**صرف عاق لکھ دینے سے وارث محروم نہیں ہوگا اور فاسق بیٹے کو جائیداد سے محروم کرنے کا طریقہ**

**السوال:** علماء دین مسئلہ ذیل میں بموجب حکم اللہ اور اس کے رسول کے کیا فرماتے ہیں۔ سائل اپنی جائیداد ذیل کا مالک ہے۔ دو عدد مکانات اور کچھ اسباب خانہ داری ظروف رکھتا ہے ایک مکان خود پیدا کردہ سائل ہے۔ دوسرا مکان جدی جس میں بذریعہ وراثت سائل منجملہ پانچ سہام سے دو سہام کا مالک ہوا۔ باقی ماندہ تین سہام اور حصہ داران شرعی سے بیع خرید کرے۔ اب سائل کو کچھ قرضہ بھی ادا کرنا ہے۔ اولاد موجودہ حسب ذیل ہے۔ پسر، ایک بیوہ دختر زوجۂ اوّل سے۔ چار پسر منجملہ چھ پسران۔ تین پسران کی شادی ہو چکی ہے۔ تین پسران کا عقد نہیں ہوا ہے۔ ایک پسر سب سے بڑا جس کا نام ..... ہے وہ عرصہ سے خلاف شرع کے نشہ وغیرہ کرتا ہے۔ اور میری فرمانبرداری نہیں کرتا اور ناشائستہ جو حرام شرع شریف نے کیا ہے وہ نہیں چھوڑتا ہے۔ سائل کو شرعاً اختیار ہے کہ ایسے نافرمان پسر کو جو خلاف شرع کام کرتا ہے اپنی جائیداد اور مال سے محروم کر سکتا ہے یا نہیں۔ فقط

المستفتی

محمد حنیف خلف شیخ محمد رحیم بخش کرنال

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ

## الجواب

عاق اور محروم الارث کرنے جو دستور ہے مثلاً والد کہہ دیتا ہے کہ میرے فلاں بیٹے کو میرے ترکہ میں سے کچھ حصہ نہ ملے اس کی شرع میں کوئی اصل نہیں۔ اس طرح کہنے کے بعد بھی

وہ وارث ہوگا ۔ اگر عاق کردینے کی وجہ سے دوسرے ورثاء نے اس کا حصہ نہ دیا تو وہ گناہگار ہوں گے ۔ اس لئے محروم الارث کرنا بالکل فضول ہے ۔

البتہ اگر اپنے نیک بخت بچوں کی زندگی میں ہبہ دیدے اور ہبہ تمام شرائط کے ساتھ پورا کردے پھر اس فاسق کو کوئی حق نہ ہوگا ۔ اور اس ہبہ میں کوئی گناہ نہیں ۔ بلکہ بہتر ہے ۔

فی العالمگیریۃ : (ص ۳۹۲-۱۹۵۱ - ج ۳) ولوکان ولدہ فاسقا واراد ان یصرف مالہ الی وجوہ الخیر ویحرمہ عن المیراث ھذا خیر من ترکہ کذا فی الخلاصۃ (فتاوی امدادیۃ ص ۱۰۰ ج ۳)

و فی الدر المختار : ولوکان ولدہ فاسقا دون البعض لزیادۃ رشدہ لا باس بہ ولو کانا سواء یجوز فی القضاء ولکن ھو آثم (مجموعۃ الفتاوی مع خلاصۃ الفتاوی ص ۳۹۳ - ج ۳) ۔ فقط

واللہ اعلم
عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح
ظفر احمد عفی عنہ
۱۱ شعبان سنہ ۴۳ھ

مسئلہ میراث وحکم المیراث من القادیاں وغیرہ | السوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک مسمی کرم علی خان کا انتقال ہوا اور اس نے اپنی وفات پر ایک زوجہ ذی مہر مسماۃ جیبا اور ایک بھائی حقیقی مسمی فخرن علی خان کو وارث چھوڑا ۔ متروکہ کرم علی خان پر جیبا بعوض اپنے دین مہر پر قابض ہوگئی ۔ اور اس کے بعد مسماۃ جیبا کا انتقال ہوگیا اس نے اپنی وفات پر دو حقیقی بھانجے مسمی الطاف علی خان ، یوسف علی خان چھوڑے ۔ اور ایک لڑکی نابالغ مسماۃ عزیزا جو جیبا کے حقیقی بھتیجے کی لڑکی ہے چھوڑی ۔ بھتیجے کا نام ابرار خان تھا ۔ اور ابرار خان اور اس کے والد عبداللہ خان حیات مسماۃ جیبا میں فوت ہوگئے ۔ فخرن خان زندہ ہیں اور ترکہ متروکہ کرم علی خان کو لینا چاہتے ہیں ۔ دریافت طلب امور حسب ذیل ہیں ۔

(۱) : آیا فخرن خان اور جو حصے میں سے جو مسماۃ جیبا کو شرعاً بعد وفات کرم علی خان پہنچا ۔ پھر بعد وفات جیبا کے بمقابلہ الطاف علی خان و یوسف خان پر پاسکتے ہیں یا نہیں ؟

(۲) : اگر مسماۃ جیبا کل متروکہ کرم علی خان پر بعوض اپنے دین مہر کے قابض تھی ، تو یوسف علی خان اور الطاف علی خان متروکہ جیبا مسماۃ کا بشمول اس کے دین مہر غیر ادا ی

کے مالک ہیں۔ متروکہ مذکورہ بعض متروکہ کرم علی خان پر تا ادائیگی دین مہر مساۃ جیبا قابض رہے گی یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

بعد کو معلوم ہوا کہ مسمیٰ کرم علی خان مرزائی قادیانی تھا۔

## الجواب

مسئلہ ۸

| زوجہ | | ام |
|---|---|---|
| | کرم علی خان | |
| جیبا | | محزن خان |
| ۱ | | ۳ |
| | | ۶ |

مسئلہ ۲ جیبا سر ۱

| ابن الاخت | ابن الاخت | بنت ابن الاخ |
|---|---|---|
| الطاف علی خان | یوسف علی خان | کنیز |
| ۱ | ۱ | م |

بصورت مذکورہ سوال بعد ادائے حقوق متقدمہ علی الارث تجہیز وتکفین وادائیگی دین مہر دین مال متروکہ کے آٹھ سہام میں سے چھ سہام محزن خان کو اور ایک ایک سہام الطاف علی خان اور یوسف علی خان کو ملے گا۔ کنیز محروم ہے جیبا کے حصے میں سے۔ محزن خان کچھ نہیں پا سکتے۔ واللہ اعلم

یہ تقسیم اس صورت میں ہے کہ ادائیگی دین مہر وغیرہ کے بعد متروکہ کرم علی خان باقی رہے۔ ورنہ دین مہر میں جیبا کل متروکہ کی مالک ہوگی۔ محزن خان محروم ہوں گے۔ پھر جیبا کے بعد جائیداد دو سہام پر منقسم ہوکر ایک ایک سہام الطاف علی خان اور یوسف علی خان کو ملے گا۔ اور وہ بجائے جیبا متروکہ پر قابض ہوں گے۔

**سوال نمبر ۲:** سوال دوم کا جواب صاف نہیں ہے۔ سوال پھر پڑھ لیا جائے۔ اگر مساۃ جیبا کل متروکہ کرم علی خان پر بعوض اپنے دین مہر کے قابض تھی تو گویا یہ قبضہ بمنزلہ ملکیت ہے جو بعد اس کے الطاف علی خان و یوسف علی خان کو مالک بنائے گا۔

یا یہ صورت ہے کہ قبضہ مذکورہ ملک نہیں بناتا اور صرف ایسے وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک دین مہر ادا نہ ہو اور بعد وفات مسماۃ جیمنا تا ادائیگی دین مہر الطاف علی خاں و یوسف علی خاں صرف قابض ہی رہ سکتے ہیں۔

از علی خان صاحب محلہ علی پورہ

الجواب

مسماۃ جیمنا اپنا دین مہر متروکہ کرم علی خان صاحب سے وصول کرے گی۔ اگر ترکہ دین مہر سے فاضل نہ بچے تو جیمنا متروکہ کی بلا شرکت غیر مالک ہوگی۔ اور اس کا قبضہ مالکانہ سمجھا جائے گا پھر مسماۃ کی انتقال کے بعد اس کے متروکہ کے اس کے وارث مالک ہوں گے۔ اور اب اس کے ورثاء کا قبضہ بھی جائز ہوگا۔ واللہ اعلم۔

محمد کفایت اللہ مدرس مدرسہ جامع مسجد

شاہجہاں پور

تنقیح الجواب: جب کہ کرم علی خان قادیانی تھا تو اس کا بھائی اور اس کی زوجہ متروکہ کرم علی خان میں حق میراث کے مستحق نہیں جبکہ یہ دونوں مسلمان ہیں۔ کیونکہ قادیانی فرقہ مرتد و کافر ہیں۔ اور کافر و مسلم میں توارث جاری نہیں ہو سکتا۔

قال فی السراجیۃ: فی الموانع: و اختلاف الدینین اھ وقال المحشی فلایرث الکافر من المسلم اجماعا ولا المسلم من الکافر علی قول علی و زید و عامۃ الصحابۃ لقولہ علیہ السلام ولا یتوارث اھل ملتین شتّٰی اھ (ص)

البتہ کرم علی خان کی زوجہ جیمنا اپنے دین مہر کی مستحق ہے۔ کیونکہ دین مہر میراث نہیں بلکہ قرض ہے اور مسلمان کا کافر اور مرتد پر دین ہو تو وہ ردت سے ساقط نہ ہوگا۔ پس اگر مسمی کرم علی خان پر کسی اور کا دین نہیں تھا صرف زوجہ کا دین مہر تھا اور متروکہ دین مہر سے فاضل نہیں تھا تو مسماۃ مذکورہ اس متروکہ پر قبضہ مالکانہ کی مستحق ہے۔ اور سب متروکہ اس کی ملک ہو گیا۔

قال فی الشامیۃ عن الطحطاوی: ان الدین تعلق بعین الترکۃ بعد ما تعلق بذمۃ المیت اھ (ص ۲۶۰، ج ۵)

البتہ اگر مسمی کرم علی خان قادیانی نہ ہوتا اور اس کا بھائی اس کا وارث ہوتا

تو اس صورت میں بھائی کو یہ حق ہوتا کہ مسماۃ کا دین مہر نقد کی صورت میں ادا کرتا اور جائیداد کو مہر میں نہ دیتا۔ بشرطیکہ وہ اس وقت دین مہر یکمشت ادا کرتا اور تاخیر نہ کرتا اور اگر تاخیر سے ادا کرنا چاہتا تو اس صورت میں اس کو تقسیم جائیداد کا بدون رضائے زوجہ کے حق نہ ہوتا بلکہ عورت کو اپنا مہر جائیداد سے وصول کرنے کا حق تھا۔

قال فی الدر: ظهر الدين فی التركة المقسومة تفسخ القسمة الا اذا قضوه ای الدين او ابراء الغرماء الورثة او يبقى منها ای من التركة ما يفی به لزوال المانع الى ان قال تتعلق الدين بالمعنى اه۔ قال الشامی: وهی مالية التركة ولذا كان لهم ان يقضوا الغرماء ويستخلصوا بها كما مر اه مختصرا

مگر جب بوجہ ارتداد کے تو وارث نہیں ہے تو بھائی کا حق جائیداد میں پختہ نہیں، بلکہ اب قرض خواہ کا حق عین ترکہ سے متعلق ہو گیا ہے اور مسماۃ جیٹھا متروکہ کی اپنے دین مہر کے عوض میں مالک ہو گئی اور مسماۃ جیٹھا کے بعد اس کے بھانجے حسب تفصیل مسئلہ ثانی شرائط کے اس متروکہ پر نصفا نصف مالک ہو گئے اب کسی کرم علی خان کا بھائی ان سے اس متروکہ کو نہیں لے سکتا۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفی عنہ

از تھانہ بھون - ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ

ایک عورت نے مہر معاف کیا جبکہ گواہ موجود نہیں تو عورت کے انتقال کے بعد بحق وراثت عورت کے ورثاء مہر کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

السوال: مندرجہ مسائل میں حکم شرع شریف علماء دین و مفتیان عظام کیا فرماتے ہیں؟

(۱): ایک عورت کا مہر بوقت نکاح پانچ ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت مقرر ہوا تھا۔ جس میں سے اس نے اپنی خوشی اور رغبت سے بغیر کسی دباؤ کے بحالت صحت و شباب عقل خود زبانی اپنے خاوند کو دو ہزار روپے معاف کر دیئے جس پر کوئی گواہ شاہد نہیں۔ کیونکہ سوائے خاوند اور بیوی کے کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا کیا یہ معافی از روئے شرع برقرار رہے گی یا کالعدم ہو جائے گی۔

(۲): اس عورت کے خاوند نے مقررہ مہر میں سے دو ہزار کی معافی تصور کر کے بقیہ تین ہزار کی رقم اپنی بیوی کو اس طور پر پوری کر دی کہ علاوہ ان زیورات کے جو بوقت نکاح بطور ہدیہ دیئے جاتے ہیں۔ زائد ایک ہزار روپیہ کے زیورات ایک ایک دو دو کر کے بنوا دیئے۔

اور دو ہزار روپیہ نقد بر ایما اپنی بیوی کے اس عورت کے بھائی کو بغرض خریداری مکان اس عورت کے لئے دیدیئے۔ بعد میں کیا عورت دعویٰ مہر کر سکتی ہے یا مہر یا اس کی کچھ جزو کی نسبت وصیت کر سکتی ہے یا نہیں؟۔

۳: وہ عورت اپنی نازک حالت میں قریب ۳۶ گھنٹے قبل اپنی موت کے اپنے بھائیوں کے دباؤ سے بغیر اطلاع دیئے خاوند اور خسر کے حالانکہ وہ اس وقت موجود تھے مگر اس وقت مکان سے باہر تھے۔ یہ وصیت کرتی ہے کہ اس کے مہر کا ایک ثلث بمد خیرات بعد اس کی وفات کے دلایا جاوے۔

کیا اس کی یہ وصیت جبکہ اس کا مہر پورا ہو چکا جائز ہو سکتی ہے اور کیا ایسی حالت کی وصیت جبکہ ہوش و حواس مختل ہو چکے ہیں۔ جائز ہے اور نیز کسی دباؤ سے وصیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

## الجواب

۱: یہ معافی عورت پر تو حجت ہے کہ اس کو ان دو ہزار کا پھر لینا جائز نہیں لیکن جب کوئی گواہ نہیں تو دوسرے ورثاء کے سامنے محض شوہر کا دعویٰ ہے جس کو وہ یہ کہہ کر رد کر سکتے ہیں کہ اس دعویٰ پر شاہد پیش کرو۔

۲: ہاں اس صورت میں اگر شوہر نے تصریح کر دی تھی کہ یہ سب زیورات اور نقد روپیہ تیرے مہر میں دیا جاتا ہے تو شوہر مہر سے بری الذمہ ہو جائے گا (بشرطیکہ زیورات میں سے کچھ زیور سونے کا بھی ہو۔ ورنہ سوال دوبارہ کیا جائے) یعنی عنداللہ باقی عورت کے ورثاء یہاں بھی اس سے شہادت کا مطالبہ کر سکتے ہیں کہ شوہر نے یہ زیور جدید میں بنا نا بیان کیا ہے یہ وہی نہیں جو جہیز میں آیا تھا۔ اور اس نے عورت کے بھائی کو دو ہزار روپیہ مکان بنانے کے لئے دیئے یا نہیں۔ اگر وہ شہادت سے ان امور کو ثابت نہ کر سکے تو ورثہ کو مہر لینے کا حق باقی ہے۔

۳: جب شوہر عنداللہ مہر ادا کر چکا ہے تو اس کے ذمہ اس وصیت کا ادا کرنا لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ ۱۲۔ رجب ۱۳۴۶ الثانی ۱۳۴۶ھ

ابن قاتل قاتل کی موجودگی میں محروم نہیں ہوگا | السوال: فرائض میں ہے القاتل محروم عن الارث آیا ابن القاتل باوجود قاتل موجود ہونے کے محروم ہے یا نہیں۔ اسکی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا اب اس مقتول کی ایک زوجہ اور ایک ابن الاخ ہے جو قاتل کا بیٹا ہے اب یہ ابن الاخ کو وراثت ملے گی یا نہیں۔

عرض گذار

محمد عبدالمجید غفرلہ۔ دولت خان ہائی اسکول بیالہ

## الجواب

صورت مسئولہ میں زوجہ کو ربع اور ابن الاخ کو باقی ملے گا کیونکہ قاتل محروم عن الارث ہوکر بحکم عدم ہوگیا اب اس کا بیٹا جو بوجہ قاتل کے محجوب تھا وارث ہوجائے گا۔

قال فی السراجیة فی باب الحجب والمحروم لایحجب عندنا وعند ابن مسعود یحجب حجب النقصان کالکافر والقاتل والرقیق۔ قال المحشی والفرق بین المحروم والمحجوب ان المحروم لایکون فیه صلاحیة الارث لکنه حجب عنها بسبب الحاجب والمحروم بمنزلة المیت ولا الحجب کذافی اه ص۔

قلت فکان ابن الاخ محجوبا بسبب الحاجب وهو ابوه فلما حرم ابوه عن المیراث لکونه صار کالمیت زال الحجب وصار ابن الاخ وارثا۔

واللّٰه اعلم

ظفر احمد عفا اللّٰه عنه

۲۴ رجب ۱۳۴۶ھ

استفتاء متعلق فرائض و مال مفقود وغیرہ | السوال: دادا صاحب کے پاس جو جائیداد ہے اس کے متعلق بڑے دادا صاحب (دادا صاحب کے بھائی) سے دریافت کیا گیا کہ ترکہ شرعی طور پر سب نے تقسیم نہیں ہوا۔ تو فرمایا کہ ان اطراف میں ترمدت سے رواج لڑکیوں کو حصہ میراث نہ دینے کا ہے مگر مجھے اتنا معلوم ہے کہ ہمارے دادا صاحب تین بھائی تھے جن میں تو ایک صاحب گھر وغیرہ چھوڑ کر مفقود الخبر ہوگئے تھے باقی دو بھائیوں کو ہمارے پردادا کی جائیداد میں سے ترکہ ملا اور ہمارے دادا صاحب کی کوئی بہن نہ تھی بعد دادا صاحب کے اُن کی جائیداد

ہمارے والد صاحب دو بھائی تھے اُن دونوں کو ملی والد صاحب کی بھی کوئی بہن نہ تھی۔
بعد والد صاحب کے اُن کی جائیداد ہم دو بھائیوں کو ملی۔ اور ہماری تین بہنیں بھی تھیں
جن کو حصۂ میراث نہیں دیا گیا۔ لہٰذا صورت مذکورہ بالا میں جو حکم شرعی ہو مطلع کیا جائے تاکہ
والد صاحب کو اطلاع کر دیں۔ دادا صاحب کی تین بہنوں سے دو کا انتقال ہو چکا ہے البتہ
اُن کی اولاد موجود ہے اور ایک ابھی زندہ ہے۔

سائل

احقر عبد الجلیل پسر مولوی عنایت اختر

## الجواب

اگر مفقود وقت مفقود ہونے کے کسی چیز کا مالک تھا اور اس کے فقدان کو ابھی
اتنی مدت نہیں گزری جس میں اقران مر جاویں تو مفقود کی ملکیت کو اس کے ورثہ میں تقسیم
نہ کیا جاوے بلکہ محفوظ رکھا جاوے بشرطیکہ اس کے مفقود ہونے پر سب ورثہ متفق ہوں۔
کوئی مدعی موت کا نہ ہو۔ ورنہ اس دعوی کے ثبوت بدلیل شرعی کے بعد اس کا ترکہ حسب
فرائض تقسیم ہو جائے گا۔ یہ حکم تو مفقود کی ملکیت کا ہے۔

قال فی الدر: لو مات عن بنتین و ابن مفقود و للمفقود بنتان
و ابناء و الترکۃ فی ید البنتین و الکل مقرون بفقد الذین و اختصموا للقاضی
لا ینبغی لہ ان یحرک المال عن موضعہ الی الایتربعہ من ید البنتین اھ ص ۳۰۰ ج ۳۔

پس اگر پردادا کی جائیداد سے مفقود کو حصہ مل چکا تھا مثلاً وہ پردادا کے انتقال کے
بعد مفقود ہوا تب تو پردادا کی جائیداد تین سہام پر منقسم ہو کر ایک حصہ مفقود کا محفوظ کیا
جاوے اور بقیہ دو حصے دو بھائیوں میں تقسیم کئے جائیں۔ اور اگر وہ پردادا کی حیات ہی میں
مفقود ہو گیا تو اب گو پردادا کی جائیداد کا یہ وارث نہیں ہے لانہ میت فی غیرہ
لیکن اس کا حصہ محفوظ رکھنا پھر بھی ضروری ہے حتی تبین الامر وفی الدر ایضاً۔ اس کے
بعد پھر دو بھائی بہن ان کو ان کے باپ کا حصہ مساوی دیا جائے۔ اس کے بعد سائل کے
بڑے دادا صاحب کا بیان ہے کہ ہم دو بھائی تھے ہم کو والد صاحب کی زمین ملی اور ان دونوں
کی تین بہنیں بھی تھیں جن کو حصہ نہیں دیا گیا تو اب سائل کے پردادا کی زمین وغیرہ اس طرح
تقسیم کیا جائے کہ:

مسئلہ ۷ صورت زید

| ابن | ابن | بنت | بنت | بنت |
|---|---|---|---|---|
| ۲ | ۲ | ۱ | ۱ | ۱ |

سائل کے پردادا کی ملکیت کو سات سہام پر تقسیم کیا جائے جس میں سے دو، دو سہام ہر لڑکے کو ملیں گے اور ایک ایک سہام (حصہ) ہر لڑکی کو۔ جو بہن دادا کی موجود ہے اس کو حصہ اس کا دیا جائے اور جو مرگئی ہے اس کا حصہ اُن کے ورثا کو دیدیا جائے۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ میت نے یہی وارث چھوڑے ہوں یعنی لڑکے اور لڑکیاں۔ اور اگر زوجہ بھی چھوڑی تھی اور ماں بھی۔ تو سوال دوبارہ کیا جائے جبکہ زوجہ اور والدہ کے ورثہ علاوہ ان لڑکے اور لڑکیوں کے اور بھی کوئی ہوں۔ ورنہ ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ

۸ شعبان ۱۳۴۶ھ

مسئلہ فرائض | السوال: ایک شخص کی پہلی شادی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر اس کی بیوی فوت ہوگئی۔ بعد میں دوسری شادی کی اس سے بھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اور پھر وہ شخص مرگیا۔ اس کے بعد وہ دوسری بیوی بھی فوت ہوگئی۔ اور اس شخص کی چاروں اولاد علیحدہ علیحدہ ہیں اور شادی شدہ ہیں۔ اب تھوڑا عرصہ ہوا ہے کہ پہلے بیوی سے جو لڑکا تھا اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ اور پھر ایک ہفتہ کے بعد اس کا بھی پھر پہلی بیوی کے لڑکے کا اور اس کی کوئی اولاد نہیں لہٰذا اُمید ہے بلاحظ عریضہ ہٰذا تحریر فرمائیے گا کہ اس آدمی کی چیزوں میں مال وغیرہ کا کون حقدار ہے آیا اس کی حقیقی بہن ہے یا سوتیلے بھائی، بہن ہیں۔ اور اگر بہن ہے تو حصہ کس کس کا ہوتا ہے۔ فقط والسلام

احقر مبارک علی

۱۲ اپریل ۱۹۲۸ء

*

## الجواب

مسئلہ ۶ / ۲ — زید جو شخص مذکورہ کی پہلی بیوی کا لڑکا ہے

| اخت لاب و ام | اخ لاب | اخت لاب |
| --- | --- | --- |
| ۱/۲ | ۲ | ۱ |
| ۳ | | |

صورت مسئولہ میں شخص مذکور کی پہلی بیوی کے لڑکے کا ترکہ چھ سہام پر تقسیم ہو کر اس کی حقیقی بہن کو نصف، یعنی تین سہام دیئے جائیں۔ اور نصف باقی کو، علاتی بھائی بہن پر للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق تقسیم کیا جاوے کہ علاتی بھائی کو دو سہام دیئے جائیں اور علاتی بہن کو ایک سہام اور یہ تقسیم بعد ادائے حقوق متقدمہ علی المیراث کے ہوگی یعنی تجہیز و تکفین و ادائے دیون (جس میں مہر بھی داخل ہے) اگر ادا یا ابرا نہ ہوا ہو اور انفاذ وصیت من الثلث کے بعد اگر وصیت کی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۴ شوال ۱۳۴۶ھ

مسئلہ فرائض | السوال ۷: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ حاجی نور محمد نے انتقال کیا اس نے اپنے ورثاء میں ایک زوجہ، ایک لڑکی، ایک علاتی بھائی (مگر علاتی بھائی کو حاجی نور محمد نے اپنی زندگی میں دو مکان دیدیا تھا اور یہ اقرار نامہ لکھوا لیا تھا کہ شریعت کے مطابق میں نے تیرا حصہ تجھ کو دیدیا ہے اور اگر تو اب دوبارہ حصہ طلب کرے تو از روئے قانون باطل ہوگا) دو نواسے بنام احمد رضا و محمد (یہ دونوں لڑکے حاجی نور محمد کی اس لڑکی سے ہیں جو ان کی حیات میں ہی انتقال کر گئی تھی) پانچ نواسے اور چار نواسیاں (یہ نواسے اور نواسیاں حاجی نور محمد صاحب کی اس بیٹی سے ہیں جو فی الحال زندہ ہے) شرعاً ان لوگوں کا کیا حصہ بنتا ہے۔

(۲) اور حاجی نور محمد کی طرف آٹھ سو روپیہ قرض بھی ہے کیا قرض ادا کرنے

کے بعد حصہ تقسیم ہو سکتا یا نہیں ہے؟ بینوا توجروا۔

المستفتی:

عبدالسلام محلہ اسلام پورہ شہر مالیگاؤں

## الجواب

قال في شرح السير الكبير: ان المريض متى اعطى بعض ورثته ليكون ذلك حصته من الميراث او اوصى بان يدفع ذلك اليه بحصته من الميراث فان ذلك باطل لا يجوز البتة اھ ج ۴ ص ۲۰

مسئلہ ۸ — مرحوم نور محمد

| زوجہ | بنت | اخ علاتی |
| --- | --- | --- |
| ۱ | ۴ | ۳ |

صورت مسئولہ میں حاجی نور محمد کے ترکہ میں سے اول تجہیز وتکفین کا خرچ نکالا جاوے اس کے بعد دین کو ادا کیا جائے اگر اس کے ذمہ ہو جس میں زوجہ کا دین مہر بھی داخل ہے اگر اس نے وصول یا معاف نہ کیا ہو۔ اس کے ثلث سے وصیت کو نافذ کیا جاوے۔ اگر اس نے اللہ واسطے کچھ وصیت کی ہو۔ اس کے بعد کل ترکہ کے آٹھ ۸ حصے کر کے بیوی کو ایک حصہ، بیٹی کو چار حصے اور علاتی بھائی کو تین حصے دیئے جائیں۔ اور حاجی نور محمد نے جو اپنے علاتی بھائی کو اپنی زندگی میں دو مکان دیئے ہیں اور یہ اقرار نامہ لکھوایا تھا کہ شریعت کے مطابق میں نے تیرا حصہ تجھ کو دیدیا الخ۔ اس اقرار نامے کے لکھنے سے علاتی بھائی کا حق میراث باطل نہیں ہوا۔ اس کا ایسا لکھوانا لغو ہے بلکہ وہ بدستور وارث شرعی ہے۔ اور وہ مکان جو نور محمد کی حیات میں اس کو مل چکے ہیں وہ بھی ترکہ میں شمار ہوں گے۔ وہ خالص علاتی بھائی کا حق نہیں بلکہ سب ورثہ کا حق ہے جو موافق سہام مذکورہ کے تقسیم کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

اور نواسے اور نواسی سب محروم ہیں کیونکہ ذوالفروض وعصبات کے سامنے ذوالارحام کو میراث نہیں مل سکتی۔ فقط

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ از تھانہ بھون ۲۴ ذی قعدہ ۵۶ھ

**حکم کسب حرام برائے ورثہ** | السوال: بعد از سلام مسنون معروض یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک سود خور نے انتقال کیا ہے اس کے وارث بھی ہیں بعض ان میں سے بالغ ہیں اور بعض اُن میں نابالغ۔ بالغوں کو خبر ہے کہ باپ سود خور تھا اور یہ بھی یقین ہے کہ اکثر مال سود کا ہے۔ اب بعض مولوی فتویٰ دیتے ہیں کہ وارثان کے یہ مال حلال کیونکہ اولاً تبدیل ملک ہے ثانیاً خود بخود مالک ہوا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حلال نہیں کیونکہ تبدیل ملک سے تبدیل عین جو ہوتا ہے اگر فی نفسہ حلال ہو مثلاً صدقہ اور اس میں چونکہ سود کا مال حلال نہیں لہٰذا یہ حلال نہیں اب جناب والا سے یہ مدعا ہے کہ جناب والا جو فرماویں ہم اس پر خاطر جمع کریں۔

عبدالقادر، نواکھالی سوناپور

## الجواب

جب ورثہ زید کو معلوم ہے کہ اُن کا مورث سود خور تھا اور غالب کسب سود کا ہے تو اُن کو واجب ہے کہ اس ترکہ میں سے اولاً اُن لوگوں کا روپیہ واپس کریں جن سے زید نے سود لیا ہے اگر وہ لوگ معلوم ہوں اور سود کا مال حلال سے مخلوط نہ ہو۔ اور اگر سود کا مال مخلوط ہے تو خلط استہلاک ہے اس لئے یہ سب روپیہ زید کی ملک ہو گیا ہے اور جن سے سود لیا ہے ان کا حق زید کے ذمہ رہا ورثاء کو یہ ترکہ مخلوط بالحرام باہم تقسیم کر لینا جائز ہے لیکن بعد تقسیم کے بطور ورع کے لازم ہے کہ اگر وہ لوگ معلوم ہوں جن سے سود لیا ہے تو ورثہ بالغین اپنے اپنے حصہ میں سے ان کا روپیہ ان کو واپس کریں۔ اگر وہ لوگ معلوم نہ ہوں تو ان کی نیت سے فقراء پر اس مال کا تصدق کریں اور جو وارث خود فقیر ہو وہ اپنے نابالغ بیٹے یا بیوی پر تصدق کر کے بھی اس سے بری ہو سکتا ہے بشرطیکہ بیوی اور بیٹا فقیر ہو اور جو ورثاء نابالغ ہیں ان کے حصہ میں سے نہ اُن لوگوں کو ابھی دیا جاوے جن سے مورث نے سود لیا تھا اور نہ تصدق کیا جاوے بلکہ یہ نابالغ بعد بلوغ کے خود اُن لوگوں کا روپیہ واپس کریں یا صدقہ کریں کیونکہ یہ رد اور صدقہ تورع ہے فتویٰ سے لازم نہیں۔

قال في الهندية: وان كان كسبه من حيث لا يحل وابنه يعلم ذلك ومات الاب ولا يعلم الابن ذلك بعينه فهو حلال له في الشرع والورع ان يتصدق به بنية الخصماء كذا في الينابيع اهـ۔

وفيه ايضاً قبله: واذا مات الرجل وكسبه خبيث فالاولىٰ لورثته ان يرد

والمال الی اربابها فان لم یوفوا اربابها تصدقوا بها اھ۔ قلت وهذا کله اذا کان کسبه الحرام مخلوطا بالحلال حیث لا یعرف الحرام بعینه ولذا قال فالاولی الخ وان کان معلوما بعینه فالرد واجب کما لا یخفی ودلیله قوله ولا یعلم الا بعد ذلک بعینه اھ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنه
از تھانہ بھون ۲۸ محرم الحرام سنہ ۱۳۴۴ھ

**مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں**

السوال نمبر ۱: زید ایک ہندو خاندان سے مسلمان ہوا ہے۔ چونکہ زید اپنے ہندو باپ کی میراث سے شرعاً وارث نہیں ہو سکتا لیکن قانوناً بنا بر جائیداد جدی ہونے کے وارث ہو سکتا ہے۔ تو وہ اپنے باپ کی جائیداد سے قانوناً اپنا حصہ لیکر کسی مدرسہ اسلامی یا کسی اور اسلامی کام میں تصدق کر دے یا رفاہ عام کے کاموں مثلاً ضرورت کے مقاموں پر کنواں نکلوا دے تو کیا وہ ثواب ہوگا۔ جبکہ اس کے باقی شرکاء یعنی جائیداد سے حصہ لینے والے آریہ جو کہ سخت ترین اعداء دین ہیں۔

## الجواب

زید کو اپنے باپ کی جائیداد سے حصہ میراث لینا جائز نہیں بلکہ اس جائیداد کو مورث کے کافر ورثہ پر رد کرنا لازم ہے اور بدون اس کے زید بھی اس میں تصرف کرنے سے گنہگار ہے۔ اور جو مدرسہ و مسجد والے اس واقعہ کو جانتے ہوئے اس جائیداد کی رقم لیں وہ بھی گنہگار ہیں۔

السوال نمبر ۲: عمرو اپنے ہندو باپ کے عین حیات میں مسلمان ہوا۔ اس کے ہندو باپ نے اس اپنے بیٹے عمرو کی شادی مسلمانوں میں اپنے خرچ سے کرائی۔ عمرو حج کو تیار ہوا تو اس کو زاد راہ دیا۔ علاقہ کے ایک مسلمان رئیس کے کہنے پر اپنی جائیداد کا چوتھا حصہ (کیونکہ اس ہندو باپ کے چار بیٹے تھے) اپنے بیٹے عمرو کو ایک دستاویز لکھ کر دیا کہ میرے بعد ¼ حصہ کا یہ وارث ہوگا۔ کچھ عرصہ بعد عمرو کا دوسرا بھائی بکر بھی مع ایک بیوی و عیال بچوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ اسے بھی نان نفقہ اس کا اور اس کے اہل و عیال کا خرچ دیتا رہا بلکہ سواری کے لئے گھوڑے اور دودھ کے لئے گائے بکری کا بھی گھاس چارہ کے دیتا رہا لیکن اپنے اس بیٹے بکر کو جائیداد وغیرہ سے ¼ حصہ نہ لکھ کر دیا۔ کیونکہ کسی مسلمان رئیس نے

اس کے لئے اُسے ذبح کیا۔ ہندو باپ کے مرنے کے بعد عمرو، بکر کے دو ہندو بھائیوں نے اور بکر کے دو ہندو بیٹوں نے (کیونکہ بکر کی دو ہندو بیویاں تھیں اور دونوں صاحب اولاد تھیں جن میں سے ایک تو بعد بال بچوں کے بکر کے ساتھ مسلمان ہو گئی اور دوسری بال بچوں سمیت بدستور ہندو ہے) مقدمہ دائر کیا کہ عمرو و بکر کو جائیداد نہ ملنی چاہیئے۔ کیونکہ انہوں نے مذہب تبدیل کیا ہے۔ لیکن ہندوؤں کا دعویٰ خارج ہوا۔ اور جائیداد مسلموں کو مل گئی۔ ہندو بھائیوں نے اور بیٹوں نے چیف کورٹ میں اپیل دائر کی۔ تو پھر بھی خارج ہو گئے۔ اب وہ دونوں نو مسلم عمرو و بکر اپنی جائیداد پر قابض ہیں لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ:

۱: ان دونوں نومسلموں کا اس طرح سے حاصل کردہ مال مشتبہ تو نہیں ہے؟ جبکہ وہ شرعاً اپنے ہندو باپ کی وفات کے بعد وارث نہیں ہو سکتے تھے اس بنا پر کہ اختلاف دین مانع ارث ہے۔

۲: بکر کی اس وقت میں تین بیویاں ہیں۔ دو مسلمان بیویاں اور ایک ہندو بیوی۔ تینوں صاحب اولاد ہیں۔ چونکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا لہٰذا کیا بکر پر یہ امر واجب نہیں کہ وہ اپنے ہندو ورثاء آریہ کو جو کہ قانوناً وارث ہو سکتے ہیں بنا بر جائیداد جدی سے کس طرح محروم کرے۔

## الجواب

۱: مشتبہ کا معنی یہ مال حرام ہے نہ کونہ مغصوبا۔

۲: جب یہ جائیداد وہی ہے جو بکر نے اپنے ہندو باپ کے ترکہ سے حاصل کی ہے تو اس کا ہندو ورثہ پر واپس کرنا بکر کے ذمہ لازم ہے اور اس جائیداد سے وہ ہندو ورثہ کو محروم نہیں کر سکتا۔ ہاں جو جائیداد بکر کی خود حاصل کردہ ہے اس سے ہندو ورثہ کا حق قانونی منقطع کر دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

## تتمہ

یہ فتویٰ احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے اول لکھا پھر حضرت حکیم الامت کو دکھایا، تو حضرت نے فرمایا کہ ہندوستان میں بحالت موجودہ مسلمان کو کافر کی میراث لینا جائز ہے لہٰذا میں اپنے فتویٰ سابقہ سے رجوع کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ صورت مسئولہ میں زید کو اپنے ہندو باپ کی جائیداد سے حصہ میراث لینا جائز ہے۔ اور اس میں کچھ شبہ بھی نہیں جس کی وجہ سے

زید کے ذمہ رد یا تصدق واجب ہو بلکہ وہ اس حق میراث کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے اسی طرح عمرو و بکر کو اپنے جد و باپ کی جائیداد سے حق لینا جائز ہے اور وہ اس میں بلا تکلف تصرف مالکانہ کر سکتے ہیں اور مسلمان کا اس طرح کا حاصل کردہ مال مشتبہ نہیں۔

والدليل ما في الشريفية: والثالث اختلاف الدينين فلا يرث الكافر من المسلم إجماعا ولا المسلم من الكافر على قول علي وزيد وعامة الصحابة وإليه ذهب علماؤنا والشافعي لقوله صلى الله عليه وسلم لا يتوارث أهل ملتين شتى (أخرجه الدارمي وأبو داود والشافعي بسند صحيح) والقياس أن يرث لقوله عليه السلام يعلو ولا يعلى وإليه ذهب معاذ بن جبل ومعاوية بن أبي سفيان والحسن ومحمد بن الحنفية ومحمد بن علي بن الحسين ومسروق رحمهم الله اهـ ص ۱۴۔

قلت روى الشافعي ذلك عن أكثر هؤلاء المذكورين في الأم تعليقا ونقله حجة فمن قبل هؤلاء كلهم متقدمون على الأئمة الأربعة المقتدى بأقوالهم والأربعة كلهم متفقون على عدم إرث المسلم من الكافر ولم نعلم أحدا خالفهم من معاصريهم ومن بعدهم والإجماع اللاحق يرفع الخلاف السابق قلنا كلام الإمام الشافعي في الأم مشعر بخلاف بعض أهل عصره في المسئلة وأخذه بقول معاوية وعلي ومعاذ بن جبل رضي الله عنهم وإن سلمنا عدم الخلاف فيما بعدهم فنقول ليس مدار الإفتاء على ذلك بل يجوز للمسلم أن يرث من الكافر بسبب استيلاء الحكومة الكافرة على مال الكافر أولا ثم دفعها إلى المسلم بقانونها واستيلاء الكافر سبب للملك عندنا والله أعلم. أو يقال استولى المسلم على مال الكافر بقوة سلطان أهل الحرب وصار متملكا له بالاستيلاء ودليل التملك بقوة سلطان أهل الحرب ما ذكر في شرح السير اهـ۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ صفر سنہ ۴۶ھ

**مورث کے انتقال کے وقت کسی وارث کے زندہ ہونے میں شک ہو تو وراثت کی تقسیم کس طور پر کی جاوے گی۔**

**السوال:** کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ امیرن کے صرف ایک شوہر اور دو بھائی تھے شوہر اور ایک بھائی کا وقت وفات زندہ ہونا محقق ہے۔ دوسرے بھائی کے زندہ ہونے میں شک ہے تقسیم ترکہ کس طور پر ہوگی۔

## الجواب

صورت مسئولہ میں مسماۃ امیرن کا ترکہ دو سہام پر تقسیم ہوگا۔ ایک سہم یعنی نصف شوہر کو دیا جائے اور دوسرا سہم اس کے بھائی کو دیا جائے جس کا زندہ ہونا بوقت وفات امیرن کے محقق ہے اور جس بھائی کے زندہ ہونے میں اس وقت شک ہے اس کو اس میں سے کچھ نہ ملے گا۔ اور نہ امیرن کو اس کے ترکہ سے دیا جائے۔ اور یہ جواب اس وقت ہے جب کہ اس کے زندہ ہونے میں شک ہی ہو۔ جیسا کہ سوال میں ہے۔ اور اگر غالب گمان زندہ ہونے کا ہو مرنے میں شک ہو تو سوال دوبارہ کیا جاوے۔

قال في السراجية: اذا ماتت جماعة ولا ادري ايهم مات اولاً جعلوا كانهم ماتوا معاً فمال كل واحد منهم لورثته الاحياء ولا يرث بعضهم من بعض هذا هو المختار وقال علي وابن مسعود يرث بعضهم من بعض الا فيما ورث كل واحد منهما من صاحبه اهـ۔

قال المحشي: والوجه في ذلك اي في قول ابن مسعودؓ وعليؓ ان شرط استحقاق كل واحد منهما ميراث صاحبه هو حيوته بعد موت صاحبه وقد عرف حيوته يقيناً فيجب التمسك به وسبب الحرمان موته قبله او معه وذلك مشكوك فيه ولا يثبت الحرمان بالشك وهذا الذي ذكر من ان اليقين لا يزول بالشك اصل كبير في الفقه ونحن نقول ان الشرط المذكور غير معلوم يقيناً ومالم يتيقن به لا يثبت الاستحقاق اذ لا توريث بالشك وتفصيله ان الشرط ههنا بقاؤه حياً بعد موت مورثه وانما علم ذلك بطريق الظاهر وهو استصحاب الحال دون اليقين فان الظاهر بقاء ما كان على ما كان عليه وهذا البقاء لا لعدم الدليل المزيل لا لوجود الدليل المبقي فيعتبر به في ابقاء ما كان لا في اثبات مالم يكن كحيوة المفقود تجعل ثابتة في نفي التوريث

عنہ لانتفاء استحقاق المیراث من مورثہ ۔ واللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۴ھ

**تحقیق مسئلہ عصبات**

السوال:- امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۱۸۱ و ص ۱۹۱ میں
ایک معترض کا اعتراض لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی میت کے عصبہ نہ ہوں تب اس
کے ذوی الارحام ترکہ پا سکتے ہیں حالانکہ دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہوگا کہ اس کے کسی درجہ
کے کسی جد اعلیٰ کی کوئی اولاد موجود نہ ہو جسے باصطلاح شرع عصبہ کہا جاوے۔ تو لازم آیا
کہ ذوی الارحام کا حصہ کسی وقت بھی مقصود نہیں اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد ہوا اسکے
حاصل اور جواب کا اصل مدار اس پر ہے کہ حسب تصریح علماء معلوم ہوا کہ عصبات کی تعمیم
اتنی نہیں ہے جتنا کہ معترض نے سمجھا ہے بلکہ سلسلۂ اعمام، عم الجد تک چل کر ختم ہو جاتا
ہے اور عم الجد کے اولاد ذکور تو عصبات بن سکتے نہیں اس کے اوپر کسی عم یا اس کی اولاد
ذکور کا مرتبہ عصبہ ہونے کا نہیں ہے۔ مثلاً عم اب الجد وابنہ وان سفل کو عصبہ نہیں
کہیں گے۔ یہ خاکسار عرض کرتا ہے کہ امداد الفتاویٰ میں یہ مسئلہ دیکھ کر شامی و عالمگیری،
مبسوط امام سرخسی، مجمع الانہر وغیرہ دیکھ کر تو واقعی عم الجد کے اوپر سلسلۂ اعمام کو کوئی
نہیں بڑھاتا مگر فتاویٰ بزازیہ[عہ] میں مصرح لکھا ہے کہ سلسلۂ اعمام عم الجد کے اوپر بھی بڑھا
یا جا سکتا ہے۔

جب بزازیہ میں یہ تصریح ملی تو پھر تردد بڑھا کہ آخر معترض کے اعتراض مذکور کا
جواب بھی کچھ ہونا چاہیئے کتب مذکورہ میں جہاں تک دیکھا جواب کا کوئی سامان نہ ملا مگر
بزازیہ[عہ] ہی میں موانع ارث کے تحت میں ملا کہ جہالت وارث مانع ارث ہے اور جہالت
کی چند صورتیں لکھی ہیں۔ اب اعتراض کا جواب یوں سمجھ میں آتا ہے کہ بے شک دنیا میں ہر
میت کے عصبہ کا موجود ہونا تو ممکن ہے مگر وہ مجہول ہے یعنی وہ سلسلۂ نسب کو ثابت نہیں
کر سکتا ہے۔ ہاں اگر سلسلۂ نسب کو ثابت کر دے کہ وہ میت سے فلاں پشت میں ملتا ہے تو پھر وہ

---

عہ فتاویٰ بزازیہ کی اس عبارت کو دیکھ کر امداد الفتاویٰ کے جواب سابق سے رجوع کر لیا گیا تھا جو ترجیح الراجح
میں شائع ہو چکا ہے ۱۲ منہ۔

عہ ان موانع خمسہ کو تو شامی نے بھی ذکر کیا ہے اور در مختار میں ان کی طرف اشارہ موجود ہے۔ ظفر

جو مکلف وارث ہے اور اگر ثابت نہ کر سکے تو محض اس لئے کہ وہ شیخ ہے یا سید ہے یا صدیقی ہے یا عثمانی ہے مستحق ارث نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسے تو سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ جبتک کہ ترتیب وار سلسلۂ نسب معلوم نہ ہو تو کوئی حاجب اور کوئی محجوب معلوم نہ ہو سکے گا اور بسبب سے اقرب اور احق عصبات مجہول رہے گا پس مستحق ارث نہ ہو سکے گا جب وہ وارث نہ ہو سکا تو اب ذوی الارحام وارث بنیں گے۔ خدام بارگاہ عالی کو تکلیف دیتا ہوں کہ ارشاد ہو کہ اعمام کی تعمیم صریح مان لینے کی تقدیر پر اعتراض کا جواب یہ درست ہوا کہ جیسے بزازیہ کی عبارت ہوتے ہوئے اعمام کی تعمیم نہ ماننے کی کوئی وجہ ہو تو وہ بھی ارشاد ہو۔ بزازیہ کی عبارت تعمیم اعمام کی نسبت اور جہالت وارث کے مانع ارث ہونے کی نسبت علی الترتیب درج ہے:-

(الثانی فی عصبات المحضة) اقربهم الابن ثم ابن الابن وان سفل ثم الاب ثم الجد وان علا على اختلاف قد مضى ثم الاخ لاب و ام ثم الاخ لاب ثم ابن الاخ لاب و ام ثم ابن الاخ لاب وكذا بنوهما وان سفلوا ثم عم الاب لاب و ام ثم عم الاب لاب ثم ابن عم الاب لاب و ام ثم ابن عم الاب لاب وكذا بنوهما وان سفلوا وهكذا عمومة الجد وان علوا و اولادهم الذكران وان سفلوا فتاوی بزازیہ ج/۳ برحاشیہ عالمگیری مصری ج/۶ ص/۴۰۶۔

وفی الفصل الخامس فی موانع الارث من الفتاوی البزازیة المطبوعة المصری ج/۳۔ علی هامش الفتاوی العالمگیریة ج/۶ ص/۴۴۳۔

و منها جهالة الوارث و ذلك فی خمس مسائل او اكثر احدها رجل وضع ولده فی فناء المسجد ليلا ثم ندم صباحا ثم جاء ليرفعه ما ذا به ولدان ولا يعرف ولده من غيره و مات قبل الظهور لا يرث واحد منهما و يوضع ماله فی بيت المال و نفقتهما على بيت المال ولا يرث احدهما من صاحبه و ثانيهما ارضعت صبيا مع ولدها و ماتت ولا يعرف ولدها من غيره لا يرثها واحد منهما ولا من صاحبه۔

و ثالثها حرة و امة ولدت كل واحد ولدا فی بيت مظلم ولا يعرف ولد الحرة من ولد الامة لا يرث واحد منهما يسعى كل واحد منهما فی نصف قيمته

المولى الامة۔

ورابعها: استاجر نصراني ومسلم ظئرا واحدا لولديهما فكبر لا يعرف ولد النصراني من ولد المسلم فالولدان مسلمان لا يرثان من ابويهما ولا كل من صاحبه۔

وخامسها: رجل له ابن من حرة وابن من امة لانسان ارضعتهما ظئر حتى كبر ولا يعرف ولد الحرة من ولد الامة فهما حران ويسعى كل واحد منهما في نصف قيمته لمولى الامة ولا يرثان زيادة حد ادب۔

بندۂ نیازمند

نذیر الدین غفرلہ ۲۸/۱۰/۱۲ھ

## الجواب

قلت اخرج الطحاوي في مشكله حدثنا فهد بن سليمان حدثنا ابو غسان مالك بن اسمعيل النهدي قال حدثنا موسى بن محمد الانصاري قال انا جبرائيل بن احمد عن عبد الله بن بريدة عن ابيه قال جاء الى النبي صلى الله عليه وسلم رجل فقال عندي ميراث رجل من الازد ولا اجد ازديا ادفعه اليه قال تربص به حولا قال ففعل ثم اتاه فقال اذهب فادفعه الى اكبر خزاعة قال الطحاوي ومعنى اكبر خزاعة عندنا والله اعلم اكبرها في النسب منه قال الولاء للكبير قال ابو جعفر فتأملنا هذا الحديث فوجدنا ما امر به رسول الله صلى الله عليه وسلم فيه من ايقافه ازدى حولا قد امر في ذلك كمثل ما امر به في اللقطة في ابتغاء صاحبها حولا ثم تصرف فيما يجب صرفها فيه بعد الحول ومن رد ذلك الميراث ان لم يجد ذويه حتى يمضي الحول الى الاكبر من خزاعة لانهم من الازد قال ومعنى قول السائل لم اجد ازديا اي ازديا مسلما وكان ذلك قبل اسلام قبائل الازد والنبي صلى الله عليه وسلم بمكة وكان اسلام خزاعة والنبي صلى الله عليه وسلم بها وفي ذلك ما قد دل ان ذلك المتوفى كان ممن قد اسلم فرد رسول الله صلى الله عليه وسلم ميراثه الى الاقرب من مسلمي خزاعة قال الطحاوي ورواه شريك عن جبرئيل بن احمد بلفظ اتى النبي

صلی اللہ علیہ وسلم بمیراث رجل من خزاعة فقال اطلبوا له وارثا فلم یجدوا فقال اطلبوا له ذا رحم فطلبوا فلم یجدوا فقال ادفعوه الی اکبر خزاعة فقال وما رواه سوی شریک اولی عندنا مما رواه شریک لعددهم ولان ثلثة اولی بالحفظ من واحد ولاستحالة بعض ما فی حدیث شریک مما ذکر فیه من قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اطلبوا له ذا رحم وهذا لا یجوز فی العرب لان العرب لا تورث بالارحام وانما تورث بالعصبات الاحیث ورث اللہ تعالی ذوی الفرائض المسماة منهم لانه اذ لم توجد عصباتهم من افخاذهم وجدت من الافخاذ التی تتلوا افخاذهم کما یعقل فی عقول جنایاتهم افخاذهم الذین یحملون اروش الجنایات فان قصرت عنهم احتمال اروشها او ذلک الی من یلونهم من الافخاذ وانما یکون التوارث بالارحام المخالفة لما ذکرنا فی غیر العرب من العجم الذین لا یرجعون الی شعوب وقبائل وانما یرجعون الی بلدان لا الی ما سواها کما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما قد حمله من رواه من اصحابه من ذلک ثم سرد الآثار فی تفسیر قول اللہ عزوجل وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ثم قال فالعرب ترجع الی شعوب والی القبائل والی الافخاذ وبها یتوارثون والعجم لا ترجع الی ذلک وانما یجمعهم بلدانهم لا ما سواها وکذلک کان ابو یوسفؒ یقول فی التوارث بالارحام التی لیست عصبات انما یکون فی العجم لا فی العرب فاستحال بذلک ما فی حدیث شریک مما اضافه الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من طلب ذی الرحم لیدفع الیه میراث الاسلمی الذی نسبه شریک الی خزاعة واللہ سبحانه وتعالی اعلم اھ [illegible]

اس کلام سے چند امور مستفاد ہوئے۔

(۱) توارث بالارحام غالباً عرب میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان میں قبائل و شعوب و افخاذ عادۃً موجود ہوتے ہیں پس اہل عرب میں عصبات مفقود نہیں ہو سکتے الا نادراً۔

(۲) جس شخص کا عصبہ اس کے خاندان قریب میں موجود نہ ہو اس کے عصبہ کی تلاش سال بھر تک کرنی چاہیے تقسیم ترکہ میں عجلت نہ کی جاوے۔

(۳) اگر سال بھر تلاش و انتظار کے بعد بھی خاندان قریب میں کوئی عصبہ نہ

ملے تو اس کے خاندان کی دوسری شاخ میں جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہوگا اس کو اور اس کے شقیق کو اسی کا ترکہ دیدیا جائے کیونکہ جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہوگا وہ ظاہراً اپنی چھوٹوں کی نسبت سے اقرب الی المیت ہوگا۔ و الاصغرون ابناء الاعمام و الاکبر بمنزلة العم مثلاً الا ان یثبت خلافه۔

④ عجم میں جو قبائل عرب موجود ہیں ان میں جن کا سید اور صدیقی و فاروقی و عثمانی و علوی وغیرہ سے ہونا متواتر ہے اُن کا بھی وہی حکم ہے جو اہل عرب کا ہے۔ لاشتراک العلة وهی رجوعهم الی قبائل وشعوب واضحة۔

⑤ پس ان خاندانوں میں اگر کسی کا عصبہ قریب موجود نہ ہو تو اس صورت کو جہات وارث میں داخل کرکے ذوی الارحام کو وارث نہیں کرسکتے کیونکہ جب عصبات کا وجود متیقن ہے اور ترجیح کی صورت بھی حدیث سے معلوم ہے تو پھر جہالت کہاں رہی۔ فقہاء نے جو صورتیں جہالت وارث کی بیان کی ہیں ان سب کا مرجع اس طرف ہے کہ ترجیح کی کوئی صورت موجود نہ ہو اور صورت مسئولہ میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ مثلاً ایک شخص فاروقی ہے اور اس کا عصبہ موجود نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ اس شہر میں خاندان فاروقی کے بہت آدمی ہیں پس اول تو شہرت سے (اور یہ درجہ ثانیہ میں ہیں) اور لوگوں کی روایات سے (اور یہ درجہ دلیل میں ہوں گے جب رواة رواة میں تواتر ہو یا عدالت و عدد وشاہدہ) منہ اسی صفت کی ہی تحقیق کرنا لازم ہے کہ میت سے سا تھ زیادہ قریب کس کو ہے اور مدت معلومہ تک اس کی تحقیق کرنی چاہیے اگر کوئی اقرب معلوم ہو جائے فبہا ورنہ اس شخص کے شہر میں جتنے فاروقی ہیں ان میں جو عمر میں سب سے بڑا ہو اس کو اور جو اس کا شقیق ہو گو عمر میں کم ہو اس کو ترکہ دے دیا جائے۔ کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ اس شہر کے فاروقی دوسرے شہروں کے فاروقیوں سے اقرب الی المیت ہے۔ اور جو ان میں سب سے بڑا ہے وہ چھوٹوں کے لئے حاجب ہے۔ کما قال الصحابی وهو مذکور فی الحدیث۔ ہٰذا و اللہ اعلم۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

از تھانہ بھون ۲۳ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ

مورث کے انتقال کے بعد اگر کوئی وارث مرتد ہو جائے تو اس کو ترکۂ مورث سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

السوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل

ذیل میں کہ ایک مسلمان بھائی گزر گیا۔ اور اس مرحوم کے تین لڑکے دو بہن بالغ موجود ہیں اور عورت بھی مسلمان تھی اور زندہ ہے۔ مگر اب وہ عورت برہما شرک قوم میں چلی گئی ہے اور اب وہ عورت شوہر کے حصہ ترکہ کی خواستگار ہے حصہ ملنا چاہئے یا نہیں۔ عورت کے لڑکے آمادہ کرتے ہیں کہ عدالت میں عورت دعویٰ کرے کہ اسے حصہ شوہر سے۔ تو کیا اسے ترکہ ملے گا۔ اور شرعی حکم اس بارے میں کیا ہے؟

مستفتی

بندہ جمال الدین

## الجواب

قال فی الدر: ویبطل منه اتفاقا ما یعتمد الملة وهی خمس النکاح و الذبح والصید والشهادة والارث اھ

قال الشامی: فلا یرث احدا ولا یرثه احد مما اکتسبه فی ردته بخلاف کسب اسلامه فانه یرثه ورثته (ای لان ارتداد المسلم کموته فکانه مات المورث المسلم فیرثه وارثه المسلم فی کسب اسلامه)۔ (ج ۳ ص ۳۹۶)

وفی البدائع: واما المرتدة فلا یزول ملکها عن اموالها بلاخلاف فیجوز تصرفاتها فی مالها بالاجماع لانها لا تقتل فلم تکن ردتها سببا لزوال ملکها عن اموالها بلاخلاف اھ ج ۷ ص ۱۳۶۔

واما حکم المیراث فنقول لا خلاف بین اصحابنا رضی الله عنهم فی المال الذی اکتسبه فی حالة الاسلام یکون میراثا لورثته المسلمین اذا مات او قتل او لحق وقضی باللحاق وقال الشافعی وهو فی الی ان قال وعلی هذا الاختلاف المرتدة اذا لحقت بدار الحرب لان اللحق لا یوجب الفصل اھ

(ج ۳ ص ۱۳۹)

قلت واما ما قاله الفقهاء ان المرتد لا یرث احدا فمعناه اذا کان مرتدا وقت موت مورثه واما اذا کان مسلما وقت موته فیرثه وان ارتد بعد موته لان المانع لم یوجد وقت الارث۔

صورت مسئولہ میں یہ عورت اپنے شوہر سے میراث کا حق پانے کی مستحق ہے کیونکہ

اس کی موت کے وقت یہ مسلمان تھی اور عورت کی ملک ارتداد سے زائل نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کا حق میراث اس کی ملک میں باقی ہے اسی طرح اگر اس نے دین مہر وصول و معاف نہیں کیا تو وہ دین مہر کی بھی مستحق ہے۔

قلت واما علة اللحاق فلم توجد لانها ما انتقلت من دار الاسلام الى دار الحرب بل هى مسلمة فى دار الحرب قد ارتدت فيها والله اعلم۔

حررہ الاحقر

ظفر احمد عفا اللہ عنہ از تھانہ بھون

۲ر جمادی الثانی ۴۳ھ

### امانت کی رقم سب ورثاء میں حسب سہام تقسیم کرنا ضروری ہے یا کسی ایک وارث کو دینا بھی درست ہے اور اسی سے متعلق مزید چند سوالات کے جوابات

**السوال:** (۱) زید نے وفات پائی اس کا روپیہ بکر کے پاس امانت تھا۔ اور زید نے ایک بیوی۔ ایک نابالغ لڑکا ایک نابالغہ لڑکی۔ اور باپ کو وارث چھوڑا ہے۔ اب زید کا باپ چاہتا ہے کہ بکر کے پاس جو روپیہ امانت ہے ہم کو ملے اور زید کی بیوی چاہتی ہے کہ ہم کو ملے اس صورت میں مطابق حصہ شرعی فرائض ہر ایک کو دیدیا جائے یا کیا حکم ہے؟۔

(۲) بر تقدیر تقسیم مطابق حصہ شرعی زید کے نابالغ لڑکے اور لڑکی کا حصہ ماں کو دیا جاوے یا باپ کو۔

(۳) زید مرحوم کا باپ کہتا ہے کہ کل روپیہ ہم کو ملے اور اس کے عوض میں ہم کچھ زمین پوتے کے نام لکھ دیتے ہیں۔ جائز ہے یا نہیں؟۔

(۴) زید کی بیوی کی مملوک چیزوں میں سے کچھ اپنے بیٹے نے لی ہے اس کے عوض میں زید کا باپ جتنا اس کا اس چیز میں سے حصہ ہوگا اس روپیہ میں سے لے سکتا ہے یا نہیں۔ اور بکر جو کہ امانت دار ہے دے یا نہیں؟۔

## الجواب

(۱) بکر پر لازم ہے کہ امانت کو زید کے سب ورثاء پر حسب سہام شرعیہ تقسیم کر دے کل رقم کسی کو نہ دے۔

(۲) چونکہ حق حضانت و پرورش ماں کو حاصل ہے اس لئے نابالغ بچوں کا روپیہ

ماں ہی کو دیا جائے۔ اور اگر اس پر اطمینان نہ ہو تو دادا کو دیا جاوے۔ اور جس کو بھی دیا جائے اس سے باقاعدہ تحریر مع گواہوں کے لے لی جاوے۔ جو اپنے پاس بھی رکھی جاوے تاکہ بالغ ہونے کے بعد اُن بچوں کے حوالہ کر دی جائے کہ اگر ولی نے ان کو روپیہ نہ دیا ہو تو وہ وصول کر سکیں۔

③ سب روپیہ دینا تو اس طرح جائز نہیں کیونکہ اس میں زید کی بیوی اور لڑکی کا بھی حق ہے اور پوتے کے نام زمین کرنے سے ان کا حق ادا نہ ہوگا ہاں پوتے کی رقم زید کے باپ کو اس طرح دی جا سکتی ہے کہ وہ اوّل اس کے نام زمین لکھدے اور رجسٹری کے وقت روپیہ لے لے۔

④ بکر کو جائز نہیں کہ زید کی بیوی کا حقِ امانت کی رقم میں سے کم کرے بلکہ اسکو پورا حق دیدے۔ اس کے بعد زید کا باپ اپنا حق خود اس سے وصول کرے۔

واللہ اعلم

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔

از تھانہ بھون۔ ۱۶ محرم الحرام ۵۳ھ

مسئلہ فرائض | السوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ بکر لاولد فوت ہوگیا ہے اور اس نے اپنے تین سوتیلے بھائی جن کا باپ ایک ہے اور دو زوجہ وارثان چھوڑے ہیں۔ متوفی مذکور کے ذمہ قرضہ متفرقات اور مہر دو زوجہ کا دین مہر باقی ہے۔ ترکہ کے تقسیم کی شرعاً کیا صورت ہوگی اور کس کس قدر حصہ ہر ایک وارث کو شرعاً ملے گا۔ دینِ مہر و قرضہ کی ادائیگی کی کیا سبیل ہوگی۔ جواب جلد مرحمت فرمائیں۔

## الجواب

مسئلہ ۸

مورث بکر

| زوجہ | زوجہ | اخ علاتی | اخ علاتی | اخ علاتی |
| --- | --- | --- | --- | --- |
| ۱ | ۱ | ۲ | ۲ | ۲ |

اوّل بکر کا سب قرضہ ادا کیا جاوے۔ مہر بھی دونوں بیویوں کا اور متفرق قرض بھی اور سب قرض ادا کرنے کے بعد جو ترکہ باقی رہے اس کو اس طرح تقسیم کیا جائے

کر کے ۸ سہام کرکے ایک ایک سہام پر دو زوجہ کو اور دو دو۔ دو سہام ہر ترکہ بھائیوں کو دیا جاوے

اور اگر ترکہ نقد نہیں ہے اور ورثہ یہ چاہتے ہیں کہ جائیداد ہم رکھیں اور قرضہ اپنے پاس سے پھیر

ادا کر دیں گے۔ تب بھی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ قرضخواہ اس پر راضی ہوں۔ اور اگر قرضخواہ

تاخیر پر راضی نہ ہوں تو ان کا قرضہ ابھی ادا کر دیا جاوے۔ خواہ جائیداد فروخت کر کے یا

اور کہیں سے انتظام کر کے۔ غرض یہ کہ بدون رضامندی قرضخواہ کے ترکہ ورثا میں تقسیم

نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ورثا قرضہ ادا کرنے پر اس وقت تیار ہوں تو قرضخواہوں کو جائیداد

لینے یا فروخت کرانے کا حق نہیں کیونکہ ان کا حق عین ترکہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ مالیت

سے متعلق ہے۔

قال فی الدر المختار: (ظهر دين فی التركة المقسومة تفسخ) القسمة ((إلا إذا قضوه) أی الدين (أو أبرأ الغرماء) (الورثة أو بقی منها) أی من التركة (ما يفی به) لزوال المانع۔

وفی الشامية: و (قوله ذمم الورثة) كذا فی الدر قال ط فيه أن الدين تعلق بعين التركة بعد تعلقه بذمة الميت اهـ تتمة أجاز الغريم قسمة الورثة قبل قضاء الدين له أخذ - ج ۵، ص، ۲۶۰۔

وفيه أيضاً بعد قليل (قوله تعلق الدين بالمعنى) وهی مالية التركة ولذا كان لهم أن يقضوا الغريم ويستقلوا بها كما مر اهـ۔

قلت ولعل المراد مما مر قول الدر المذكور أنفاً تفسخ القسمة إلا أن قضوه۔ والله أعلم۔

| کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ | الجواب صحیح |
|---|---|
| از تھانہ بھون۔ خانقاہ امدادیہ | ظفر احمد عفا اللہ عنہ |
| ۲۸ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ | ۲۸ ج ۲ ۱۳۴۵ھ |

## الافحام فی بعض احکام ذوی الارحام

السوال :-

مسئلہ ۵ ج ۳۲

زوجہ - بنت - اخت حقیقیہ - وابن - وابن - وابن - اخت شقیقہ اخری، بنت وبنت الاخ الغیر الحقیقی

۸/۱ ۲ ۲ ۲ ۲ ۹ ۹

در صورت مسطورہ بعض چنیں تخریج میکنند و بعضے برخلاف ۔ فریق اول ایں چنیں ۔

مسئلہ ۱۱۶ ج ۳ ص ۲۲۴

| زوجہ | بنت اخت شقیقہ | ابن | وابن | وابن لاخت شقیقہ اخری | بنت | وبنت الاخ الشقیق |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱/۸ ۵۶ | ۱۲ | ۱۴ | ۲۴ | ۲۴ | ۶/۴۲ | ۶/۴۲ |

سوال آن ست کہ ازیں ہر دو فریق قول کدام صحیح ست ۔

القول و باللہ التوفیق ۔ در صورت مذکورہ تخریج اول صحیح ست آنچہ مخرج ثانی در اولاد اخوات للذکر مثل حظ الانثیین کردہ وجہے ندارد چراکہ ایں تقسیم باولاد دو کس فقط ۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح کتبہ عزیز الرحمن مفتی دار العلوم دیوبند

مسعود احمد دار العلوم دیوبند ۲۲ رجمادی الاول ۱۳۴۵ھ

۲۲ جمادی الاول ۱۳۴۵ھ

## الجواب الملقب بالافحام فی بعض احکام ذوی الارحام

ہمارے نزدیک تخریج ثانی صحیح ہے کیونکہ اختین کو ایک طائفہ بنایا جاوے گا ۔ اور پھر ان کے کل سہام کو ان کی اولاد میں للذکر مثل حظ الانثیین کے موافق تقسیم کیا جاوے گا ۔ سراجی میں ہے ۔

وعند محمد رحمہ اللہ یقسم المال علی الاخوۃ و الاخوات مع اعتبار عدد الفروع و الجہات فی الاصول فما اصاب کل فریق یقسم بین فروعہم کما فی الصنف الاول ۔ اور صنف اول میں جو صورت چند بطون کی فرض کی ہے اس کا پیشتر لکھا ہے ۔

وعند محمد رحمہ اللہ تعالیٰ المال بین الاصول اعنی فی البطن الثانی اثلاثا ثلثاہ لبنت ابن البنت نصیب ابیہا وثلثہ لابن بنت البنت نصیب امہ وکذلک عند محمد رحمہ اللہ اذا کان فی اولاد البنات بطون مختلفۃ

يقسم المال على اول بطن اختلف فى الاصول ثم يجعل الذكور طائفة و الاناث طائفة بعد القسمة فما اصاب الذكور يقسم على اعلى الخلاف الذى وقع فى اولادهم وكذلك ما اصاب الاناث و هكذا يعمل الى ان ينتهى بهذا الصورة

اس کے بعد صورت درج کی ہے جس میں ہر موقع اختلاف کر ذکور کو ایک طائفہ اور اناث کو ایک طائفہ بنایا گیا ہے۔ اور طائفہ اناث کی اولاد میں للذکر مثل حظ الانثیین پر عمل کیا گیا ہے۔ اور ایسا ہی طائفہ ذکور کی اولاد میں۔ حالانکہ وہ اولاد ایک شخص کی نہیں ہے چنانچہ بطن سادس سے شروع ہوا ہیں بنت وابن ہے اور ان کے اصول بطن خامس میں بنت و بنت ہے۔ اور اس بطن سادس والے ابن کو دو سہام اور بنت کو ایک سہام دیا گیا حاشیہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

فوجدنا بازاء البنتين فى البطن السادس ابنا و بنتا فقسمنا الثلاثة (اى التى وصل الى البنتين فى الخامس) بينهما فاصاب الابن اثنين والبنت واحد الخ۔

پس تخریج ثانی کے متعلق "و جہ تدارد" کہنا سمجھ میں نہیں آیا اور اسی طرح اس دلیل میں "جہاں تقسیم باولاد یک کس الخ" کہنا بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ واللہ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
۴ رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

میں نے بھی دیکھتے ہی تخریج ثانی کو صحیح سمجھا تھا۔ اور اسی کے موافق میرا عمل تھا۔ مفتی صاحب کی تحریر سے کچھ تردد ہوا تھا جو اس توضیح سے رفع ہو گیا۔ اب بلا تردد تخریج ثانی میرے نزدیک صحیح ہے۔

فقط ظفر احمد عفا اللہ عنہ از تھانہ بھون
۴ رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

## اعتراض بر جواب مذکور از سائل

آنکہ تخریج ثانی را تصحیح می فرمایند خلاصۂ دلیل ایشان آنست کہ در ما نحن فیہ بعد تقسیم علی الاصول اخوات را طائفہ ولغ را باعتبار عدد فرع طائفہ و دیگر اعتبار کردہ آنچہ باخوات میرسد در اولادِ آن بلحاظِ کہ مِثل حظِ الانثیین کردہ شود۔
چنانچہ در سراجیہ در صنف اول در صورتِ فرضِ شش بطون کردہ شد۔ لیکن معلوم است کہ حکم ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ در آنان صورت است کہ در چند بطون از اصول اختلاف صنف واقع گردد۔ اما در ما نحن فیہ کہ در یک بطن از اصول اختلاف صنف واقع شدہ حکم ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ جاری کردن خلافِ ظاہر است۔ بلکہ در ما نحن فیہ اعنی صورت اختلاف صنف یک بطن از اصول بعد تقسیم علی الاصول حکم ویجعل ما اصاب کل اصل بفرعہ جاری کردہ شود۔
الحاصل آنکہ فرق است درمیانِ آنکہ یک بطن از اصول در صنف مختلف شود و در بیان آنان کہ چند بطن از اصول در صنف مختلف شود۔ و در بیان آنکہ چند بطن از اصول در صنف مختلف شود کہ در صورتِ اولیٰ حکم ویجعل ما اصاب کل اصل بفرعہ کردہ شود و در صورتِ ثانیہ بعد تقسیم علی اعلی الخلاف ویجعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ کردہ شود۔ تصریح این تفصیل در کتاب حاشیۂ درمختار اعنی ردّ المحتار موجود است۔ چنانچہ قدرے از عبارتِ او نقل میکنم۔
فان وجدت ولیس فیھم ذو جھتین کبنت ابن بنت بنت فابو یوسف قسم المال علی ابدان الفروع الی قولہ ومحمد یقسم علی اعلی بطن اختلف وھو البطن الثانی ھنا ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ ان لم یقع بعدہ اختلاف کما فی المثال المذکور الی قولہ اما اذا وقع بعدہ اختلاف بالذکورۃ والانوثۃ فی بطن آخر او اکثر فان محمدًا بعد ما قسم علی اعلی بطن اختلف جعل الذکور طائفۃ والاناث طائفۃ اھ

(باب توریث ذوی الارحام۔ ردالمحتار)

قوله ويجعل ما اصاب كل اصل بفرعه ان لم يقع بعده اختلاف كما في المثال المذكور - الى قوله اما اذا وقع بعده اختلاف الى قوله جعل الذكور طائفة اه نص است درين كه اگر در يک بطن اصول اختلاف صنف واقع شود در آن صورت بعد تقسيم على الاصول جعل ما اصاب كل اصل بفرعه كرده شود - و در آنجا كه چند بطن از اصول در صنف مختلف شود در آنجا بعد تقسيم على اعلى الخلاف يجعل الذكور طائفة والاناث طائفة كرده شود و در ما نحن فيه چونكه يک بطن از اصول مختلف است در آن بعد تقسيم على الاصول آنچه بهر يک اصول رسد بفرع او منتقل كرده شود - مثلاً بعد از اخراج فرض زوجه از تصحيح اول كه ۲۴ را است سه باخت مى رسد پس آن سه به بنت منتقل گردد - براين تقدير احتياج بر تصحيح ديگر نيست - و آنچه مخرج ثانى در اولاد اخوات للذكر مثل حظ الانثيين كرده خلاف تصريح و يجعل ما اصاب كل اصل بفرعه است - ظاهر قول سراجى كه مخرج ثانى تصحيح كنندگان تخريج نقل مى فرمايند مؤيد تحقيق مذكور است چنانچه از شريفيه واضح مى گردد - قال في السراجية : وعند محمد يكون المال بين الاصول اعنى في البطن الثانى اثلاثا -

قال في الشريفية : وحينئذ يكون ثلثاه لبنت ابن البنت لان ذلك نصيب ابيها قد انتقل اليه وثلثه لابن بنت البنت فانه نصيب امه فانتقل اليه الى قوله وكذلك عند محمد رحمه الله تعالى - اى كما اعتبر عنده حال الاصول في البطن الثانى على ما عرفت كذلك يعتبر عنده حال الاصل في البطون المتعددة اذا كانت في اولاد البنات المتساوية في الدرجة بطون مختلفة وحينئذ يقسم المال الى ثم يجعل الذكور طائفة والاناث طائفة اه

پس صاحب سراجيه در صورت اولى ( ولو ترك بنت ابن بنت وابن بنت بنت ) كه در صورت اختلاف صنف در يک بطن از اصول است بحكم يجعل ما اصاب كل اصل بفرعه اه تقسيم فرموده چنانچه از قول شريفيه لان ذلك نصيب ابيه قد انتقل اليها ظاهر است و در صورت ثانيه كذلك عند محمد اذا كانت في اولاد البنات بطون مختلفة اه كه صورت اختلاف صنف در چند بطن از اصول

است بعد تقسیم علی اعلی الخلاف بالطریق ویجعل الذکور طائفة والاناث طائفة تقسیم
فرموده و نیز وکذلک الخ حسب تصریح شرح لیثان است که امام محمد بنا کرده در بطن از
اصول صفة اصول را اعتبار می کند۔ همچنین در بطون مختلفه از اصول عدد اصول را اعتبار
می کند پس وجه شبه در صورت بعین قدر است که چنانچه در صورت اولی صفة اصول
اعتبار کرده می شود، همچنین در صورت ثانیه ویجعل الذکور طائفة والاناث
طائفة حکم دیگر است که علی الخصوص به صورت ثانیه که صورت اختلاف البطون از اصول است
تعلق دارد۔ واین حکم در صورت اولی جاری نیست۔ چنانچه این امر از عبارت مذکوره مراجعه
ظاهر است۔ پس از قوله کذلک الخ در صورت اولی حکم ویجعل الذکور طائفة
والاناث طائفة الخ جاری دانستن خلاف عقل وعرف است۔ واللہ اعلم
کتبہ الفقیر عبدالخالق اخوند یارانی۔

## جواب اعتراض مذکور

اقول وباللہ التوفیق۔ شامی کی جو عبارت (یعنی ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعه)
تخریج اول کی تصحیح کے لیے نقل کی گئی ہے وہ صورت مسئولہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی
کیونکہ صورت مسئولہ میں فروع متوحد نہیں بلکہ بعض کے فروع متعدد ہیں ونیز فروع
میں اختلاف ہے ذکورة اور انوثت کا۔ اور عبارت مندرجہ میں اس صورت کا حکم ہے
جبکہ فروع متوحدہ ہوں یعنی ہر ایک اصل کی ایک ایک فرع ہو اور فرع میں ذکورة وانوثة کا
اختلاف بھی نہ ہو چنانچہ عبارت مندرجہ سے پیشتر اس طرح ہے وان اختلفت صفة الاصول
فی بطن او اکثر فاما ان تتوحد الفروع بان یکون لکل اصل فرع واحد واما ان
تتعدد وعلی کل فاما ان یکون الفرع ذوجهتین اولا فان توحدت الخ
اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ حکم ویجعل ما اصاب کل اس صورت میں ہے جبکہ ہر ایک اصل کی ایک ہی
فرع ہو اور ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعه کے ساتھ ان لم یقع بعده اختلاف کی
قید خود اشکال میں بھی نقل کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان فروع متوحدہ میں اس حکم
کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ مختلف فی الذکورة والانوثة نہ ہوں اور اس توحد فروع ہی کی شق
میں آگے چل کر علامہ شامی خود کہتے ہیں:

اما اذا وقع بعده اختلاف بالذکورۃ والانوثۃ فی بطن آخر او اکثر فان محمدا بعد ما قسم علی اعلی بطن اختلف جعل الذکور والاناث طائفۃ الخ
اس سے معلوم ہوگیا کہ باوجود تعدد فرع بھی فروع میں اختلاف ذکورۃ وانوثۃ کی وجہ سے اناث وذکور کو الگ الگ طائفہ بنایا جاویگا - اور فی بطن آخر او اکثر کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ فقط دو بطون میں اختلاف ہونے کی وجہ سے بھی طائفہ بنایا جاوے گا ۔

مثلاً مسئلہ ۶

| | | |
|---|---|---|
| بنت | بنت | بنت |
| بنت | بنت | ابن |
| بنت | ابن | بنت |
| ۱ | ۲ | ۳ |

کی صورت میں بطن ثانی کی بنتین کو طائفہ بنایا جاوے گا اور ان کے سہام ان کی اولاد میں للذکر مثل حظ الانثیین کے موافق تقسیم ہوں گے ۔ اگر ایسا نہ ہو تو بطن کا آخر مصداق کیا ہوگا ۔ پس طائفہ بنانے کے واسطے اصول کے کئی بطون میں اختلاف ہونا ضروری نہیں بلکہ جب فرع مختلف فی الصفۃ ہوں تو اصول کے ایک بطن میں اختلاف ہونا ہی طائفہ بنانے کے واسطے کافی ہے اور یجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ یہ جانہیں ہے کہ اصول کے ایک ہی بطن میں اختلاف سے زیادہ میں نہیں ۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ فروع میں اختلاف نہیں ہے جن کے واسطے طائفہ بنایا جاتا اور کچھ ثمرہ مرتب ہوتا اور ظاہر بات ہے کہ باوجود تعدد اور اتفاق فرع کے طائفہ بنانے میں کوئی تفاوت نہیں ہے مثلاً صورت ذیل میں بطن ثانی کی بنتین کو طائفہ بنادیں تب وہی حاصل ہے اور نہ بناویں تب ۔ وھی کما لا یخفی ۔

مسئلہ ۴

| | | |
|---|---|---|
| بنت | بنت | بنت |
| ابن | بنت | بنت |
| بنت | بنت | بنت |
| ۲ | ۱ | ۱ |

یہ قوشاہی کی عبارت کے متعلق عرض تھی جس میں ضرورت سے بھی کسی قدر زیادہ

وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ عبارت سوال سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اور نیز اس توضیح سے شریفیہ کی عبارت مندرجہ اشکال کا محل بھی معلوم ہو گیا اور شریفیہ یہاں موجود نہیں ورنہ ممکن ہے کہ اس کے متعلق بھی کچھ مفصل عرض کیا جاتا۔ اب شامی سے وہ عبارت نقل کرتا ہوں جو صورت مسئولہ پر منطبق ہے۔ عبارت مندرجہ اشکال کے بعد بھی جب توجیہ فروع کا باعتبار شق حکم بیان کر چکے تو علامہ شامیؒ دوسری شق یعنی تعدد فروع کی بابت تحریر فرماتے ہیں۔

وان تعددت فروع الاولی المختلفین کلهم او بعضهم ولیس فیهم ذو جهتین ایضاً و ذلک کابنی بنت بنت بنت و بنت ابن بنت بنت و بنتی بنت ابن بنت اخی۔ قوله ثم جعلنا الذکور طائفة والاناث طائفة الخ

اور گو اس مثال میں اصول کے دو بطون میں اختلاف ہے لیکن اس پر مدار نہیں مدار تو فقط تعدد فروع مع اختلاف صفت فروع واصول پر ہے۔ جیسا کہ عبارت سے ظاہر ہے۔ حاصل یہ کہ ہمارے نزدیک تخریج ثانی ہی صحیح ہے۔ اور ان عبارات مذکورہ فی الاشکال سے اس میں کوئی خدشہ نہیں۔ اور آپ نے وکذلک۔ الخ کے جو معنی بحوالہ شریفیہ لکھے ہیں وہ معنی صحیح نہیں اور واقعی اس کذلک سے وہ شبہ حال اصول کا اعتبار کرنا ہی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آگے ثم یجعل الذکور طائفة الخ بھی موجود ہے جیسا کہ احقر نے پوری عبارت جواب اول میں نقل کی ہے۔ پس جب صنف اول کا حکم منقح ہو گیا تو صنف ثالث کا حکم بھی معلوم ہو گیا جس کی بابت اصل سوال ہے۔ کیونکہ سراجی وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم میں صنف ثالث مثل صنف اول کے ہے، جیسا کہ سراجی کی عبارت اصل جواب میں موجود ہے اور شامی میں بھی صنف ثالث کے تحت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ قول سراجی سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ صنف اول کے مثل ہے۔ لیکن علامہ شامی نے یہ لکھا ہے ولم ار من تعرض لذلک فلیراجع۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر عبدالکریم

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

١٢ رجب [illegible]

الجواب صحیح

بعد التتبع والامعان فی عبارۃ الشامی

ظفر احمد عفا اللہ عنہ ٢٠ رجب [illegible]

**سوال بر جواب مذکور از سائل** | **مولوی صاحب موصوف بر نہ جاری کردن حکم**

و یجعل ما اصاب کل اصل لفرعه اتفاق صفت فروع شرط قرار می دہند یعنی
اگر فروع متعددہ باشند و اتفاق در صفت فروع نباشد حکم و یجعل ما اصاب الخ
کا سے جاری کردہ نمی شود۔ چنانچہ میفرمایند۔ اور یجعل ما اصاب کل اصل لفرعه
کے ساتھ ان لم یقع بعده اختلاف کی قید خود اشکال میں بھی نقل کی گئی ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ ان فروع متعددہ میں اس حکم کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ مختلف
فی الذکورة والانوثة نہ ہوں۔ قرار دادن این شرط برای اجراء حکم مذکور یجعل
ما اصاب الخ از قید ان لم یقع بعده اختلاف افادہ کردہ اند الا مشکل
آن است کہ عبارت شامی برای حق فان تعددت ولیس فیهم ذو جهتين الخ
و یجعل ما اصاب کل اصل لفرعه ذکر ازان مولوی صاحب موصوف استدلال
برای بودن شرط مذکور برای حکم مذکور می فرمایند، مثالیکہ بیان کردہ ہست در آن
نحو اتفاق صفت فروع نیست بلکہ اختلاف در صفت فروع است چنانچہ تمام عبارت شامی
اینست فان تعددت ولیس فیهم ذو جهتين کبنت ابن بنت وابن بنت بنت
فابو یوسف قسم المال على ابدان الفروع هنا ایضا۔ فثلثاه للانثى وثلثاه
للذكر مثل حظ الانثيين ومحمد يقسم على اعلى بطن اختلف وهو البطن
الثاني هنا ويجعل ما اصاب كل اصل لفرعه ان لم يقع بعده اختلاف كما في
المثال المذکور۔ و مثال مذکور کہ علامہ شامی در و حکم و یجعل ما اصاب کل
اصل لفرعه جاری فرماید کبنت ابن بنت وابن بنت بنت است در این مثال
اختلاف صفت فروع بدیہی است چنانچہ از قول فثلثه للانثى وثلثاه للذكر مثل
فیک واضح است۔ پس اگر تحقیق مولوی صاحب کہ برای حکم و یجعل ما اصاب
اتفاق فروع لازم می باشد صحیح تسلیم کردہ شود۔ مثال آوردن علامہ شامی صورت
مذکورہ بنت ابن بنت وابن بنت بنت، جاری کردن بر و حکم و یجعل ما اصاب الخ
صریح غلط خواہد بود۔ ازین جا واضح می گردد کہ برای حکم و یجعل ما اصاب کل اصل
لفرعه شرط اتفاق صفت فروع کہ موصوف قرار کردہ معنی بر غفلت است از عبارت
مذکورہ و بہ تفسیر بما لا یرضی قائلہ می مانند۔ و تنہا وحدت را مولوی صاحب موصوف

برای حکم مذکور و یجعل ما اصاب الخ شرط قرار نمی دہد پس حکم جاری نکردن ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ درصورت ما نحن فیہ ہنوز جواب طلب ست درحقیقت منشا این غلط فہمی کہ مولوی موصوف را واقع شدہ است قولہ ان لم یقع بعدہ اختلاف است کہ موصوف ازاں عدم وقوع اختلاف درصفت فروع می دانند و این صحیح نیست بلکہ مراد از قولہ ان لم یقع بعدہ اختلاف وقوع اختلاف درصفت اصول بعد از یک بطن است چنانچہ درمثال مذکوراست کہ بنت ابن بنت و ابن بنت بنت است علاوہ آنکہ کلام دراختلاف صفت اصول است چنانچہ ازیں پیشتر می فرمایند وان اختلفت صفۃ الاصول فی بطن اوأکثر فاما ان تتوحد الفروع الخ پس از عبارت مذکورہ بصراحت معلوم شود کہ برای حکم ویجعل ما اصاب الخ ثبوت اختلاف درصفت اصول بعد از یک بطن شرط است ۔ وآن شرط درما نحن فیہ موجود است پس درصورت ما نحن فیہ حکم ویجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ جاری لازم آمد درتحقیق مولوی صاحب گزارشات بخاطر خطور میکند اما از خوف طوالت برین اکتفا می کنم اگر حضرت ایشان بنفس نفیس کہ غلط فہمی کہ طرفین را واقع شدہ رفع فرمایند نہایت لطف وکرم

رقیمہ نیازمند فقیر عبدالخالق کمبلاری

۸ر شعبان المعظم ۱۳۴۲ھ

مسئلہ ۴-۲۲

زوجہ ۔ بنت الاخت ۔ ابن الاخت ۔ ابن الاخت ۔ بنت الاخ ۔ بنت الاخ

$\frac{1}{8}$ ٣ ٣ ٣ ٣ ٦ ٩

درخواست تحقیق از حضرت ایشان برای صورت مذکورہ است بصورت مذکورہ وحدت فروع پیشتر نبودن ذوجہتین درآنان وعدم وقوع اختلاف صفت در

مـہ اس صورت میں توحد فروع کہاں ہے ۔ توحد فروع کو شامی نے لکھا ہے ۔ یان یکون لکل اصل فرع واحد اور صورت مسئولہ میں ایک ہمشیرہ کی تو ایک دختر ہے لیکن دوسری ہمشیرہ کے تین بیٹے ہیں ۔ نیز بھائی کی دو بیٹیاں ہیں جیسا کہ مستفتی کے دونوں سوالوں میں اس کی تصریح ہے اب نہ معلوم کہ کس بناء پر یہ اختصار کیا کہ صورت اس طرح درج کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار اخوات اور دو اخوۃ کی اولاد ہے ۔ اگر پہلا سوال یہاں نقل نہ ہوتا تو اس اصل صورت کا پتہ کیسے چلتا ، اس لیے احتیاط ضروری ہے کہ جتنی مرتبہ سوال کیا جائے سوال پورا اور مفصل نقل کیا جائے ۔ فقط عبدالکریم عفی عنہ

اصول بعد از یک بطن بر ین ہمہ امور منطبق است کہ علامہ شامی برائی حکم و یجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ متر ادف قرار دادہ است۔ فقط

## الجواب

بعد حمد و صلوٰۃ کے گزارش یہ ہے کہ جو شبہ جواب پر کیا گیا ہے وہ وارد نہیں ہوتا کیونکہ ان لم یقع بعدہ اختلاف: کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ اختلاف کے لیں پھر آئندہ کسی بطن میں بالکل ہی اختلاف نہ ہو۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ ایک مرتبہ اختلاف کے بعد صنف واحد کی فروع میں اختلاف نہ ہو۔ اور یہ امر علامہ شامی کی ذکر کی گئی مثال میں موجود ہے کہ بطن ثانی میں اختلاف ہو کر پھر آئندہ نہ بنت کی فروع میں اختلاف ہے نہ ابن کی فروع میں۔ کیونکہ ہر دو کی فروع میں ایک ایک ہے۔ کسی صنف کی فروع متعددہ کو ہی تحقق نہیں تا اختلاف چہ رسد۔ پس ان لم یقع بعدہ اختلاف کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اختلاف صنف اصول کے بعد ہر دو اصناف کے یا صنف واحد کے فروع متعدد تو ہوں لیکن وہ فروع مختلف فی الصفۃ نہ ہوں۔ مثلاً

| بنت | بنت | بنت | بنت |
|---|---|---|---|
| ابن | ابن | بنت | بنت |
| بنت | بنت | ابن | ابن |

کہ اس میں نہ ابناء کے فروع مختلف ہیں نہ بنات کے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہر دو اصناف کی ایک ہی فرع ہے اس وجہ سے اختلاف صفۃ کا فروع میں تحقق نہ ہو۔ جیسا کہ شامی کی مثال میں ہے۔

غرض یہ کہ علامہ شامی کی مثال میں ان لم یقع بعدہ اختلاف کی قید ملحوظ ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ اگر تحقیق مولوی صاحب کے برائے حکم یجعلون ما اصاب اتفاق صفت کو فروع لازم می دانند صحیح تسلیم کردہ شود۔ مثال آوردن علامہ شامی کی صورت مذکورہ بنت ابن بنت و ابن بنت بنت را، و جاری کردن بر و حکم یجعل ما اصاب الخ صریح غلط خواہد بود۔ اور اگر ان لم یقع بعدہ اختلاف کے وہ معنی مراد لیے جاویں جو اشکال میں ظاہر کیے گئے ہیں تو سراجی اور علامہ شامی کی مثال ذیل میں کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

عہ یہ صورت ہی ان لم یقع بعدہ اختلاف کا مصداق ہے للقاعدۃ المشہورۃ لا یقتضی وجود الموضوع۔

بنت     بنت     بنت

بنت     بنت     ابن

ابن     بنتی

۶     ۲۲
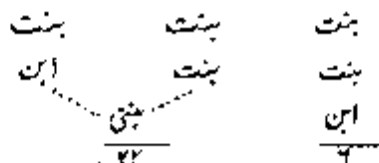
اس مثال میں اناث کو الگ طائفہ بنایا گیا ہے۔ جس کی سند سراجی اور سراجی میں تصریح موجود ہے۔ اگر یہاں یجعل ما اصاب کل اصل لفرعہ پر عمل ہوتا تو ابن بنت بنت کو ۲۸ سہام ملتے۔ کما لا یحتاج الی البیان۔

خلاصہ یہ کہ ان لم یقع بعدہ خلاف کے وہ معنی قرار دینا صحیح نہیں جو اشکال میں ان لفظوں سے بیان کیے گئے ہیں۔ مراد از قولہ ان لم یقع بعدہ اختلاف عدم وقوع اختلاف در صفت اصول بعد از یک بطن است۔ یہ تمام تر گفتگو ان لم یقع بعدہ اختلاف کے متعلق تھی جس سے معلوم ہو گیا کہ صورت مسئولہ میں یہ شرط عدم اختلاف موجود نہیں اور اگر اس معنی کے موافق جو کہ اشکال میں بیان کیے گئے ہیں بالفرض اس شرط کا وجود بھی تسلیم کیا جاوے تو بھی صورت مسئولہ میں یجعل ما اصاب الخ جاری کرنا درست نہیں ہے کیونکہ شرط تو حد فروع کی جس کو صاحب اشکال بھی تسلیم کرتے ہیں اس جگہ موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ جواب سابق میں بھی عرض کر چکا ہوں۔

فقط والسلام

احقر عبد الکریم عفی عنہ

از خانقاہ امدادیہ۔ تھانہ بھون

۱۴ شعبان ۱۳۴۳ھ

**مسئلہ فرائض** الســوال: اشرف دے متوفی کے ترکہ میں شرعی شریک پانچ ہیں۔ اشرف دے کی دو بہنیں حقیقی شریفن و سکینہ ایک بہن دوسری ماں سے اشرف دی ہے۔ زوجہ متوفی کی شریفن، چچا حقیقی سلارو مگر ترکہ نامزد صرف چار کے کر دیا گیا۔ مسماۃ اشرف دی کو تحصیل میں مردہ ٹھہرا دیا یہ فعل چچا سلارو نے کرایا تھا۔ مسماۃ شریفن زوجہ ۳۷ بیگھہ ۸ بوہ

شریفن ہمشیرہ     سکینہ ہمشیرہ     حقیقی چچا سلارو

۲۸ بیگھہ ۶ بوہ ۱۰ [illegible]     ۲۸ بیگھہ ۲ بوہ ۱۰ [illegible]     ۵۶ بیگھہ ۵ بوہ

کل میزان = ۱۴۹ بیگھہ ۱۸ بوہ

چچا سالارو نے متوفی کی دونوں بہنوں شریفن اور سکینہ کو بلا کر یہ کہا کہ مبلغ
۲۲۰۰ دو ہزار دو سو روپیہ اس ترکہ کے ذمہ قرض ہے۔ تم سب شرکاء اپنے اپنے
حصے کا قرض ادا کرو اور جائیداد تقسیم کر لو۔ تب بہنوں نے کہا کہ ہم نہ قرض دیں اور نہ
زمین لیں ہمیں تو صرف روٹی کپڑے کی ضرورت ہے۔ شریفن بہن نے اپنے بچے کی قسم بھی
کھائی تھی کہ میں کچھ نہ لوں گی۔ دوسرے مجھے یعنی مسماۃ شریفن زوجہ متوفی سے بھی قرض دینے کو کہا
گیا تھا۔ بندی نے چچا سے کہا یعنی سالارو سے کہ تم قرض ادا کر دو میں اپنے حصے کی جائیداد
تمہارے لڑکوں کے نام کرا دوں گی۔ بندی ابھی بھی اپنے قول پر ہے جب چاہے مجھ سے اپنے
قول پر پورا کر لو اور ان دونوں بہنوں نے دیکھا کہ قرض ادا کر دیا گیا ہے تب اپنا حصہ طلب
کیا کہ ہماری زمین ہمیں واپس دیدو۔ حالانکہ سالارو نے اپنی بچی زمین اسباب گھر کا
بیچ کر قرضہ ادا کیا تھا۔ قضاء الٰہی سے ایک بہن شریفن کا انتقال ہو گیا اور اس کے دو
لڑکے ہیں زمین تو ان کے نام ہو گئی ہے۔ مگر کھانا پینا سالارو کے تین لڑکے کر رہے ہیں۔ ان
بچوں کو کوئی دیتا نہیں۔ اور ایک بہن جس کا شوہر اللہ رکھی مرحوم لکھوائی تھی۔ تیسری بہن مسماۃ سکینہ جو
ہے وہ انہیں چچا سالارو کی اولاد میں رہتی ہے۔ اور کبھی ناراضگی میں کہتی ہے کہ کیوں؟ میری بھی
زمین ہے۔ اب سالارو کے ایک لڑکے کی تحریک سے بندی کا نکاح ثانی ہوا ہے اور تمام ترکہ اللہ دتہ
متوفی کا تینوں بھائی بحصہ مساوی تقسیم کر لینے پر تیار ہیں۔ بندی کا بھی کھانا پینا ہے مگر بندی کے اختیار میں
نہیں کرتے ہیں زمین کرائے۔ دیگر شرکاء سے معافی چاہتی ہوں۔ وہ مسئلہ بتا کر اڑاتے ہیں مگر اب مجھے
میری جائیداد سے بھی کم آمدنی مل رہی ہے۔ میرے خاوند کی اور میری زمین مل کر تہائی سے زائد ہے
مگر آمدنی تہائی کی مل رہی ہے تو کیا بندی عند اللہ گنہگار اور حق العباد میں گرفتار ہے۔ بندی کو
حق العباد کا فکر ہے۔

## الجواب

| زوجہ | اخت عینیہ | اخت عینیہ | اخت علاتیہ | عم |
|---|---|---|---|---|
| ۳ | ۴ | ۴ | محروم | ۱ |

شرعاً صحیح حساب یہ ہے

| | بسوانسی | بوہ | بیگھ |
| --- | --- | --- | --- |
| زوجہ | ۱۰ | ۹ | ۳۷ |
| ہمشیرہ | ۶⅔ | ۱۹ | ۴۰ |
| ہمشیرہ | ۶⅔ | ۱۹ | ۴۹ |
| چچا | ۱۶⅔ | ۹ | ۱۲ |
| | | ۱۸ | ۱۳۹ |

جس بہن کو یعنی سوتیلی بہن مساۃ اللہ دتی کو جو مردہ لکھوا دیا ہے اس سے حصوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر اللہ دتی کو لکھواتے تب بھی وہ محروم رہتی جب سگی دو بہنیں موجود ہیں اور چچا عصبہ ہے تو سوتیلی بہن کو شرعاً کچھ نہیں ملتا۔ لہذا یہ جھوٹ بے نتیجہ ہی رہا۔ خواہ مخواہ گناہ کمایا

البتہ چار وارثوں میں جو تقسیم کی گئی وہ تقسیم بالکل غلط ہے نہ معلوم کس طرح حساب لگایا گیا ہے۔ اصل مسئلہ کی رو سے ایک تہائی (۴ سہام) ایک بہن کو ایک تہائی (۴ سہام) دوسری بہن کو اور چوتھائی (۳ سہام) بیوی کو ملنے چاہئیں۔ اور باقی $\frac{1}{12}$ سالارو کو پہنچتا ہے۔ کل سہام ۱۲ ہوتے ہیں۔ شرعاً جتنا جتنا ملتا ہے وہ اوپر لکھ دیا ہے۔

اب یہ تو معلوم ہو گیا کہ اللہ دتہ کی بیوہ کو ۳۷ بیگہ ۹ بوہ جو حق ملا ہے اس میں کسی کا حق نہیں ہے بلکہ خود بیوہ کا ½ ۱ بسوہ اور حق نکلتا ہے جو سالارو کے پاس ہے۔ اسی طرح اللہ دتہ کی بہنوں کا حق بھی سالارو کے پاس نکلتا ہے اور سالارو کا حق شرعی صرف ساڑھے بارہ بیگہ کے قریب ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم نے جو لکھا ہے کہ میری اور میرے خاوند کی زمین مل کر تہائی سے زیادہ ہے وہ غلط ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ ہوا کہ قرض کل سالارو نے ادا کیا اس سے بھی سالارو دوسروں کے حصہ کا مالک نہیں ہوا۔ البتہ حصہ رسد قرض سب کے ذمہ ہے۔ اب شریفن اور سکینہ اور شریفن مرحومہ کے لڑکے مختار ہیں خواہ اپنا حصہ خود رکھیں اور حصہ رسد قرض سالارو کو دیدیں خواہ قرض کی وجہ سے اپنا حصہ سالارو کے ہاتھ بیچ دیں جو کچھ رکھتا ہے معاملہ صاف

کرلیں فقط وعدہ سے کچھ نہیں ہوتا۔ گول مول بات ٹھیک نہیں۔ وعدہ کی وجہ سے سلار و مالک نہیں بنا۔ اگر کسی کو منظور ہو کہ اپنا حصہ دے تو باقاعدہ ہبہ کرنا لازم ہے۔ خوب سمجھ لو۔ حق الوسع بہت آسان کر کے لکھا ہے۔ وھٰذا کلّہ ظاھر۔

اب رہی یہ بات کہ تمہارا خاوند اور خسر تمہاری نہیں مانتے اور ناحق دوسروں کا حصہ دبا رکھا ہے اور اس کی آمدنی تمہیں بھی کھانی پڑتی ہے۔ اس کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ تم اپنی طاقت کے موافق کوشش کرتی رہو اور حتی الوسع دوسروں کے حق سے بچو باوجود اس کے مجبوراً اگر مشترک جائیداد مذکورہ کی آمدنی میں سے کچھ اپنے حصہ سے زائد تمہارا خاوند تم کو کھلا دے تو اس کا گناہ اس کے ذمہ ہی رہے گا۔ تم بوجہ عذر کے بری الذمہ ہوگی۔ اور تم نے اگر کوشش میں کمی کی تو خدا علام الغیوب ہے وہ دلوں کے بھید کو جانتا ہے۔

فی الشامیۃ: وفی الخانیۃ: امرأۃ زوجہا فی ارض الجور اذا اکلت من طعامہ ولم یکن عینہ غصبا او اشتری طعاما او کسوۃ من مال اصلہ لیس بطیب فھی فی سعۃ من ذلک والاثم علی الزوج اھ (ج ۵ - ص ۳۸۰)

کتبہ الاحقر عبدالکریم

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

| | |
|---|---|
| **بیماری میں طلاق دی پھر اچھا ہو کر مرگیا اور عورت عدت میں تھی تو وہ خاوند کے ترکہ سے حصہ پائے گی یا نہیں** | **السؤال:** زید نے اپنی عورت ھندہ کو بیماری میں طلاق دی اور اس بیماری میں نہیں مرا بلکہ اچھا ہوگیا اور پھر بیمار ہوا اور مرگیا اور موت |

کے وقت زید کی بیوی ھندہ عدت میں ہے تو زید کے مال سے حصہ میراث پائے گی یا نہیں؟

## الجواب

اس صورت میں عورت کو میراث سے حصہ نہ ملے گا۔ کما فی الدر المختار: فلو صح ثم مات فی عدتھا لم ترث اھ واللہ اعلم۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ
از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
۲۶ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

**تحقیق مرض الموت** السؤال : زید کافی عرصہ سے بیمار تھا۔ دمہ اور بھی کچھ کچھ مرض اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ وہ کبھی مرض زیادہ ہونے کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتا تھا اور کبھی مرض کم ہونے کی وجہ سے دل بہلانے کے لیے باہر نکل کر تیس چالیس قدم چل بھی لیتا اور اسی مرض میں گذر گیا۔ اب مرض الموت کب سے شمار ہوگی۔ جب سے زید دل بہلانے کے لیے مکان سے باہر نہیں نکل سکا تب سے یا جب سے کہ وہ بیمار پڑا تھا مرض کے مضمون کو مہربانی فرما کر ذرا تفصیل سے لکھا جائے۔

## الجواب

امراض مذکورہ میں موت سے قبل اگر زیادتی اور تغیر ہو جائے تو اس تغیر اور زیادتی کے وقت سے مرض الموت شمار کیا جاوے گا کما قال العلامۃ الشامی فی رد المحتار علی الدر المختار (ج ۲ ص ۸۵۶)

قلت وحاصلہ انہ ان صار قدیماً بان تطاول سنۃ ولم یحصل فیہ ازدیاد فھو صحیح۔ اما لو مات حالۃ الازدیاد الواقع قبل التطاول او بعدہ فھو مریض اھ

پس صورت مسئولہ میں جب اس شخص کو مرض کی زیادتی کا وہ دورہ پڑا جس میں اس کا انتقال ہو گیا ہے اس وقت سے مرض الموت قرار دیا جاویگا۔ واللہ اعلم۔

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

از خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۱ھ

**مسئلہ فرائض** السؤال : ایک عورت دو لڑکے، ماں باپ مردہ کا ۱۶ روپیہ قرض رہ گیا ہے۔ اور ۴ روپیہ خاوند پر قرض ہے۔ تقسیم ترکہ کے وقت خاوند نے کہا کہ ۱۲ روپیہ اور ۴ روپیہ سے ۱۲ روپیہ مجھے آتے ہیں ۴ روپیہ جو میرے قرض ہیں چھ ۶ روپیہ میں نے اپنا حصہ رکھ لیا ہے اور دو روپیہ لڑکوں کو دوں گا۔ اور ماں باپ دونوں نے کہا کہ ہم کو ۱۶ روپیہ میں سے چار چار روپیہ آتے ہیں ہمارے اوپر جو ۱۲ روپیہ تھا ہم آٹھ روپیہ اپنے دو حصہ رکھ لیے ہیں اور آٹھ روپیہ

لڑکوں کو دیں گے ۔ ماں، باپ اور خاوند نے روپیہ لڑکوں کو حاضری دیا نہیں اور اپنے اوپر لازم کرلیا ہے تو کیا حاضری بوقت تقسیم نہ دینے کی وجہ سے اس قسمت میں کوئی بطلان یا فساد ہے یا نہیں ۔

## الجواب

قال فی الدر و شرحها ای القسمة هو الفعل الذی یحصل به الافراز والتمییز بین الانصباء وحکمها تعیین نصیب کل من الشرکاء علی حدة اھ

( ج ۵ ۔ ص ۲۴۷ )

چونکہ واجب فی الذمہ ہوتا ہے اس کی تقسیم اس طرح بھی درست ہے کہ ہر مدیون جو واجب ہے وہ متعین ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ واجب کس وارث کے حصہ میں لگایا گیا ہے ۔ اور یہ بات صورت موجودہ میں پائی گئی اس لیے تقسیم دین صحیح ہو گئی ۔ واللہ اعلم ۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۷ ، ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اجمالی فہرست امداد الاحکام

## جلد اول تا چہارم

## فہرست ابواب جلد سوم

## فہرست ابواب جلد چہارم

تالیف

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ نگرانی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ